اردو میں لسانی تحقیق

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو (ریگولر)

(سال ۲۰۱۶ء)

مقالہ نگار

فائزہ بٹ

لیکچرار شعبۂ اردو

کنیئرڈ کالج برائے خواتین، لاہور

نگران

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو

اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

URDU MAEN LISANI TEHQIQ

(YEAR 2016)

A THESIS FOR THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY IN URDU

By

FAIZA BUTT

ASSISTANT PROFESSOR, DEPARTMENT OF URDU

KINNAIRD COLLEGE FOR WOMEN, LAHORE

Supervisor

DR. NASIR ABBAS NAYYAR

ASSISTANT PROFESSOR, DEPARTMENT OF URDU,

ORIENTAL COLLEGE, LAHORE

DEPARTMENT OF URDU, ORIENTAL COLLEGE

UNIVERSITY OF THE PUNJAB, LAHORE.

فہرستِ ابواب

باب پنجم: اردولسانیات (قواعد ولغت کے مباحث)

پیش لفظ

الحمداللہ! آج سے چند برس قبل جس اُمید اور خواب کے ساتھ مادرِ علمی، اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی میں قدم رکھا، اُسے ربِ کائنات نے ثمر آور کیا۔ ایم فل کے کلاس ورک میں کام یابی کے بعد یونی ورسٹی کے قوانین کی رو سے، متعین 'CGPA' حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو ایم فل کا تحقیقی مقالہ تفویض کرنے کے بہ جائے براہِ راست پی ایچ ڈی ڈگری کلاس میں منتقل کر دیا گیا۔ چناں چہ ایم فل کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنے کی خواہش دل کی دل ہی میں رہی۔ یہ خواہش اِس لیے بھی تھی کہ ایم اے کی پرائیویٹ طالبہ ہونے کی وجہ سے تحقیق اور اس کی مبادیات سے لاعلمی کو رفع کر سکوں تا کہ بعد ازاں ڈاکٹریٹ کی سطح پر تحقیقی کام کی صحت اور معیار کے معاملات سے بہ طریقِ احسن نمٹا جا سکے۔ بہ ہر حال اِس خواہش کی ناتمامی کو قدرت کی مصلحت جانتے ہوئے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے من پسند شعبۂ علم اور موضوع کے انتخاب کی طرف توجہ مبذول کی۔

ابتدا ہی سے مزاج میں تکنیکی اور سائنسی امور سے دل چسپی کا عنصر غالب رہا ہے۔ لہٰذا طبعی رجحان اور دلی میلان کا تقاضا یہی تھا کہ املا، ترجمہ، قواعد، لغت، اصطلاح سازی اور لسانیات جیسے تکنیکی و سائنسی نوعیت کے حامل شعبہ ہائے علوم کی طرف رجوع کیا جائے۔ چناں چہ اساتذہ سے مشاورت اور راہ نمائی کے بعد 'اردو لسانیات' پر تحقیق کا فیصلہ کیا، اور اس حوالے سے 'اردو میں لسانی تحقیق' کا عنوان طے پایا۔ شعبۂ اردو کی جانب سے معمول کی رسمی کارروائی کے بعد ڈاکٹر ناصر عباس نیّر میرے تحقیقی کام کے نگران مقرر ہوئے۔ موضوع کی طرح نگران کے انتخاب میں بھی بنیادی دخل میری پسند اور رائے ہی کو حاصل رہا۔ الحمداللہ! قدرت نے میرے فیصلے کی آبرو رکھی اور مجھے سرخ رو کیا۔

'اردو میں لسانی تحقیق' کو بہ طور موضوع منتخب کرتے وقت اِس کی پیچیدگیوں، گہرائیوں اور وسعتوں کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ جیسے جیسے تحقیقی سلسلہ چلا تو یہ موضوع اپنی تمام تر مشکلات، وسعت اور متعدد مسائل کے ساتھ میرے سامنے تھا۔ مقدم مسئلہ مواد اور کتب کی دست یابی اور فراہمی کے حوالے سے تھا۔ دراصل اردو لسانیات پر تحقیقی کام زیادہ تر سرحد پار یعنی بھارت کے ماہرینِ لسانیات اور علما نے کیا ہے۔ ظاہر ہے بیرونِ ملک، خصوصاً بھارت سے کتابوں کی درآمد کا معاملہ آسان نہیں تھا۔ بہ ہر حال کچھ صاحبانِ مہر و کرم کی بہ دولت موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ کتابیں بھارت سے حاصل کرنے میں کام یاب رہی۔ باقی کام لاہور کے چند اہم کتب خانوں کی مدد سے کیا۔ علاوہ ازیں متعدد کتابیں کتب فروشوں سے بھی خریدیں۔

دورانِ مطالعہ اندازہ ہوا کہ اگر چہ برِصغیر پاک و ہند میں اردو لسانیات پر بین الاقوامی شہرت کی حامل کوئی کتاب اور تحقیق تا حال منظرِ عام پر نہیں آ سکی مگر اِس کے باوجود اردو کے ماہرینِ لسانیات کا معیاری، مستند اور قابلِ قدر تحقیقاتی سرمایہ متعدد و متنوع موضوعات کے تحت کتب اور رسائل و جرائد میں منتشر حالت میں موجود ہے، جس کے اجتماع، انتقاد اور تجزیاتی مطالعے کے بعد ہی اردو لسانیات پر تحقیق کی قدر و قیمت متعین کی جا سکتی تھی۔ یہ تحقیقی مقالہ اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے۔

دورانِ مطالعہ درپیش اُن لسانی مسائل کا ذکر یہاں ضروری ہے جن کی وضاحت اور تشریح کے بغیر بالخصوص لسانیاتی مباحث کو پیش کرنا ممکن نہیں تھا۔ اِس نوع کی ایک آدھ نہیں بلکہ متعدد رکاوٹیں دامن گیر ہوئیں۔ ایسے میں قدرت کا شفیق ہاتھ میرے 'مہربان دوست' کی صورت ذہن کی گرہیں کھولتا رہا اور راہِ حق و جستجو میں آگے دھکیلتا رہا۔ ظاہر ہے بین السطور اشارہ اساتذہ کے ساتھ ہونے والی طویل علمی نشستوں کی طرف ہے، جن کے فیضان سے پیش آنے والی ہر رکاوٹ میرے علم میں اضافے کا سبب بنتی چلی گئی۔

زیرِ نظر مقالہ پانچ ابواب اور ایک محاکمے پر مشتمل ہے۔ باب اوّل 'لسان اور لسانیات' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب تعارفی نوعیت کا ہے جو مزید دو فصلوں میں منقسم ہے۔ فصل اوّل میں زبان کے آغاز و ارتقا، زبان میں ہونے والے تغیرات اور اُن کی نوعیت اور اسباب، بولی اور زبان کا باہمی تعلق اور امتیاز، معیاری بولی کی وضاحت اور اسی نوع کے عام لسانی مباحث شامل ہیں۔ فصل دُوُم میں زبان کے سائنسی مطالعے، 'لسانیات' کا تعارف و وضاحت اور دیگر شعبہ ہائے علوم اور لسانیات کے تعلق سے وجود پانے والے نئے علوم کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب دُوُم کا عنوان 'دنیا کی زبانیں' ہے۔ فصل اوّل کے تحت دنیا کی زبانوں کی خاندانی درجہ بندی کے مباحث زیرِ بحث لائے گئے ہیں، اور فصل دُوُم ہند آریائی زبانوں کے تفصیلی جائزے پر مشتمل ہے۔

باب سوُم میں اردو زبان وادب کے حوالے سے مستشرقین اور ہندشناسوں کی لسانی تحقیقات قلم بند کی گئی ہیں۔'اردو میں مستشرقین کی لسانی تحقیقات' کے عنوان سے یہ باب چار فصلوں پر مشتمل ہے، جن میں مستشرقین کی بر صغیر آمد کے بعد ۱۹۴۷ء تک عہد بہ عہد اردو زبان کا ارتقا، مستشرق قواعد نگاروں اور لغت نویسوں کی تالیفات کا تعارف اور مستشرق ماہرینِ لسانیات کی دیگر لسانی و لسانیاتی تحقیقات کے جائزے کے بعد ان کی قدر اور تحقیقی معیار کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم 'اردو لسانیات: اردو کی آفرینش اور نشوونما' کے عنوان سے ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اِس باب کے تحت اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کے مباحث کو شامل کیا گیا ہے۔ زبان چوں کہ ٹھوس شے نہیں کہ جس کی پیدائش کے حوالے سے کسی خاص نقطۂ زمان و مکاں کا تعین کیا جا سکے، لہٰذا اِس حوالے سے کوئی بھی حتمی رائے قائم کیے بغیر ماہرین کے اختلافی بیانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب پنجم میں اردو زبان کے مقامی قواعد نگاروں اور لغت نویسوں کی تحقیقات و تالیفات پر مباحث قلم بند کیے گئے ہیں۔'اردو لسانیات: قواعد و لغت کے مباحث' کے عنوان سے یہ باب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔

مقالے کے آخر میں محاکمہ ہے جس کے تحت تمام مباحث کا اجمال مع تنقیدی تبصرے کے پیش کر دیا گیا ہے، جس سے اردو لسانیات میں اب تک کی جانے والی تحقیقات کی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ اِس سے اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ اردو لسانیات پر اب تک کیا کچھ تحقیقات ہوئیں؟ اور کون کون سے پہلو اب بھی تشنۂ تحقیق ہیں؟ شاید یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اِس مقالے کے تحت اردو میں تا حال ہونے والی لسانی تحقیق کا احاطہ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ اِس کے باوجود مطالعے کی زد سے بچ جانے والی بحثوں کے امکانات موجود ہیں۔ ایک محدود دورانیے میں تمام مباحث کا احاطہ کرنا ممکن بھی تو نہیں۔

مقالے کی تکمیل پر خالقِ کائنات کی بے حد سپاس گزار ہوں جس کی اَن گنت عنایتیں خاکے کی تیاری کے ابتدائی ایام سے مقالے کی تکمیل تک کے اختتامی مراحل میں ہر لحظہ میرے ساتھ رہیں، اور اب بھی میں اُنھیں کے حصار میں ہوں۔ قدرت کی ایسی عنایت پر خود میں شکر گزاری کی سکت نہیں پاتی۔

اپنے محترم استاد اور نگرانِ مقالہ، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کی تہِ دل سے شکر گزار ہوں جن کی شفقت اور توجہ سے مجھے دورانِ مطالعہ ہر نوع کی رکاوٹ اور مشکل کو بہ آسانی پار کرنے کی ہمت ملتی رہی۔ اکثر میری کاہلی اور کوتاہی پہ اُن کا مزاج برہم ضرور ہوا، لیکن بہ ہر حال شفقت و عنایت کا رنگ غالب رہا۔

متعدد کم یاب کتب کی فراہمی پر استاد الاساتذہ، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی بھی شکر گزار ہوں۔

صدر شعبۂ اردو کنیئرڈ کالج، ڈاکٹر شیبا عالم کی سپاس گزار ہوں کہ تحقیقی معاملات کی پیچیدگیوں سے نمٹنے کے لیے جب بھی اپنی تدریسی ذمے داریوں کے تسلسل میں تعطل چاہا، مل گیا۔ اور وہ بھی ایسے لطف و کرم سے کہ کبھی وضاحت طلب نہ کی۔

تمام اساتذہ، اہلِ خانہ، عزیز و اقارب، احباب، اور بالخصوص والدِ محترم کی شکر گزار ہوں کہ جن کی دعائیں اور خواہشیں دورانِ تحقیق نہ صرف میرا حوصلہ بڑھاتی رہیں بلکہ ہر مشکل کو آسانی میں بدلتی رہیں۔ سپاسِ خاص میری پیاری بھانجی تحریم بٹ کا، جو مقالے کی تکمیل کے آخری مراحل کے رت جگوں میں میری شریک رہی۔

کہا جاتا ہے کہ پی ایچ ڈی کا مقالہ دراصل طویل تحقیقی سفر میں پہلا قدم ہوتا ہے۔ اِس موضوع پر کام کرنے سے مجھے متعدد ایسی کتابوں کے مطالعے کا موقع میسّر آیا، جن کے پہلے صرف نام سُنے تھے۔ مثال کے طور پر گریرسن کی 'لنگوئسٹک سروے آف انڈیا'۔ اِس تحقیقی کارنامے کے مکمل سیٹ کا حصول اور اُس کے متعلقہ حصّوں کے مطالعے سے تعجب ہوا کہ بعض محققین نے عظیم لسانی منصوبوں پر اپنی ساری زندگی صرف کر دی ہے۔ یہ اِس سلسلے کی صرف ایک نمایاں مثال ہے۔ تحقیقی تجسس اور لگن کی ایسی کئی دیگر کاوشوں نے بھی متاثر کرنے کے علاوہ شوقِ تحقیق کو مہمیز کیا۔ محققین کہتے ہیں کہ جس موضوع پر ایک دفعہ کام شروع کر دیا جائے وہ بہ قدرِ شوق سدا جاری رہتا ہے۔ خواہش ہے کہ میں آئندہ بھی اِس موضوع پر جست جو اور مطالعہ جاری رکھوں۔ اللہ سے استدعا اور اُمید ہے کہ زیرِ نظر مقالے کی صورت میں میرا یہ پہلا تحقیقی قدم بہ خیر اُٹھا ہو۔ (آمین)

فائزہ بٹ

لیکچرار شعبہ اردو

کنیئرڈ کالج برائے خواتین، لاہور

باب اوّل۔لسان اور لسانیات
فصل اوّل

زبان کیا ہے؟

زبان کیا ہے؟ آج تک کوئی بھی اِس کا ایسا جامع جواب نہیں دے سکا جو زبان کے دائرہ کار کا مکمل احاطہ اور اِس کے بنیادی نظام کی توضیح کر سکے۔ زبان بہت پیچیدہ نظام ہے۔ایسا نظام جس کے اجزا نہایت منظّم اور مناسب ہیں۔

زبان بنی بنائی صورت میں انسان کو نہیں ملی، بلکہ وہ انسان کی سال ہا سال کی تجرباتی کوششوں سے وجود میں آنے والی روایت کے نسل در نسل انتقال اور متغیر ہوتے رہنے کا نتیجہ ہے۔اِس کی حیثیت ایک پیہم عمل کی ہے[۱]۔زبان فکر کی اُن صوتی علامتوں سے ترکیب پاتی ہے جو ایک مکمل نظام کے اجزا ہونے کے ساتھ ساتھ جداگانہ اور خودمختار حیثیت رکھتی ہیں۔اِن میں سے ہر علامت یا کلمہ ایک خاص غرض سے تخلیق کیا جاتا ہے اور اپنی صلاحیت اور استعمال کے لحاظ سے حک و اصلاح، تراش خراش اور ترک و اختیار کی منزل سے گزرتا ہے۔کم و بیش ہر لفظ کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔جس کے دھندلکے میں گوناگوں لسانی تغیرات کو ڈھونڈا جا سکتا ہے[۲]۔

لغوی اعتبار سے لفظ 'زبان' کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے۔اوّل: وہ عضو یا گوشت کا لوتھڑا جو منہ کے جوف میں ہے اور جس کے ذریعے بولنے کا عمل سرانجام دیا جاتا ہے۔دُوم: وہ بول جو عضوِ مذکور کے اُس مخصوص عمل کا نتیجہ ہوتا ہے، جس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔خواہ وہ ایک آواز ہو یا کئی آوازوں کا مجموعہ۔یہ آوازیں یا تو بولنے والے کے اپنے کسی تقاضے کے سبب پیدا ہوتی ہیں یا پھر کسی خارجی تقاضے کے ردِّعمل کی صورت میں۔اِس لحاظ سے زبان میں مہمل اور بامعنی دونوں طرح کی آوازیں شامل ہو جاتی ہیں[۳]۔

اصطلاحی اعتبار سے زبان وہ ذریعہ ہے جس کے توسط سے انسان اپنی ذات اور اپنے ماحول کے تقاضوں کے مطابق اظہار و اخذ کرتا ہے۔یہ اظہار خاموش علامتوں کی صورت میں لکھ کر بھی ہو سکتا ہے اور آواز و کلمات کی صورت میں بول کر بھی کیا جا سکتا ہے۔البتہ اظہار و اخذ کا یہ عمل اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک کہ لکھی ہوئی علامات اور بولے جانے والے الفاظ بامعنی نہ ہوں۔گویا زبان سے مراد وہ بامعنی آوازیں یا علامتیں ہیں جن کی وساطت سے انسان بہ صورتِ تقریر یا بہ صورتِ تحریر اپنے خیالات کا اظہار کرتا اور دوسروں سے بہ ذریعہ سماع یا مطالعہ معلومات حاصل کرتا ہے[۴]۔اسی سبب زبان کو تبادلۂ خیالات اور اظہارِ خودی کا آلہ کہا جاتا ہے۔اِس لحاظ سے تمام حروف اور الفاظ و مرکبات (تقریری ہوں یا تحریری) زبان کے دائرے میں داخل ہیں اور زبان کے عناصر سمجھے جاتے ہیں۔

لسانیات کی رو سے زبان ایک ایسے خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اپنے سماج میں اظہارِ خیال کے لیے استعمال کرتا ہے۔زبان اصوات کا مجموعہ اور ترتیب ہے۔لسانیات میں انسان کے اعضائے تکلم سے ادا کی جانے والی آوازیں ہی اہم ہیں۔اشاروں کی زبان یا تحریر لسانیات میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتے۔انسان کے منہ سے ادا ہونے والے کلمات کا لسانیات میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔لسانیات میں تکلمی زبان کو بہ مقابلہ تحریری زبان کے زیادہ اہمیت اِس لیے دی جاتی ہے کیوں کہ زبان پہلے وجود میں آئی اور تحریر بعد میں[۵]۔

درج بالا تعریفات کے مطالعے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ زبان کا اصطلاحی مفہوم زبان سے متعلق دراصل قدیم نظریے کا ترجمان ہے، جس کی رو سے

زبان ایک ایسا محدود نظام ہے جو حروف، الفاظ، مرکبات اور تحریری علامات کے مختلف بامعنی عناصر پر مشتمل ہے۔ گویا زبان کے اِس محدود نظام میں ایک داخلی منطق (قواعد) ہے۔ قدیم نظریہ اس داخلی منطق کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اِس نظریے کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ زبان علامات وکلمات کا ایک منطقی نظام ہے۔ اِس کے برعکس علمِ لسانیات کے مطابق زبان کی تعریف دراصل زبان کے جدید تصور کو پیش کرتی ہے۔ جس کے مطابق زبان علامات وکلمات کے منطقی نظام سے بالاتر ایک ایسا آلہ ہے جس کی مدد سے انسان بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں کے مطابق ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ زبان اختیاری صوتی علامتوں کا ایک نظام ہے جسے کسی سماج میں انسانوں کی ایک جماعت نے مل کر تسلسلِ روایت اور رواجِ عام کی بنا پر اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کے طور پر تسلیم کیا ہو۔ گویا اصل اور حقیقی زبان درحقیقت بول چال کی زبان ہے۔[۶]

زبان کی پیدائش اور ابتدا سے متعلق نظریات

زبان کے آغاز اور تمام زبانوں کی اصل قدیمی زبان (Proto-Language) کی دریافت کا مسئلہ ہمیشہ ہی سے لسانیات کی تاریخ میں وسیع پیمانے پر زیرِ بحث رہا ہے۔ یہ موضوع ہر دور میں مختلف دبستانِ فکر اور ماہرین کی دل چسپی اور توجہ کا مرکز بنا، مگر اس ضمن میں تحقیق وتدقیق کا سلسلہ زیادہ ثمر آور نہ ہوسکا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس حوالے سے ماہرین کا بیش تر کام قیاسات اور مفروضات پر مبنی ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے دینی توجیہات اور اساطیر (Myths) سے ہے۔

یونانی مفکرین نے آغازِ زبان کے مسئلے پر فلسفیانہ انداز سے سوچا۔ اُس زمانے میں فلسفے اور سائنس کے مابین کوئی حدِ فاصل مقرر نہ ہونے کے باعث سائنس کو فلسفے ہی کی ایک شاخ مانا جاتا تھا اس لیے مسائل السنہ پر قدمائے یونان کے سائنسی نظریات کو فلسفیانہ نظریات ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ اُن کے پیش کردہ کئی نظریات تاریخِ لسانیات کے مطالعے کا اہم جزو ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں جدید لسانیات کے مطالعے کی ابتدا نے کئی فلسفیوں اور ماہرینِ لسانیات کو آغازِ زبان کے مسئلے پر غور وخوض کے لیے اُکسایا جس کے نتیجے میں متعدد نظریات سامنے آئے۔ خصوصاً انیسویں صدی کے آغاز میں جب تقابلی طریقہ اور داخلی بازتشکیل (Internal Composition) کے قاعدے وضع ہوئے تو اکثر غیر تربیت یافتہ لسانیات دانوں نے سوچا کہ ان قاعدوں کے اطلاق سے موجودہ زبانوں اور خطِ رمز میں لکھی دست یاب عبارتوں میں اصل قدیمی زبان کے الفاظ تلاش کریں گے اور ان کے تقابلی مطالعے سے وہ تاریخِ زبان میں ماضی بعید تک رسائی حاصل کریں گے جس سے نہ صرف قدیم ترین زبان کا سراغ لگا سکیں گے بلکہ آغازِ زبان جیسے راز کو بھی منکشف کرسکیں گے، مگر یہ خیال خام تھا اور بے سود بھی۔ دراصل ماہرینِ بشریات (Anthropologists) کی تحقیق کے مطابق زمین پر انسان کا وجود کم از کم دس یا بیس لاکھ سال سے ہے اور زیادہ سے زیادہ غالباً پچاس یا ساٹھ لاکھ سال سے۔ اسی طرح لسانیات کی تاریخ سے ملنے والے شواہد کے مطابق قریباً اتنی ہی مدت سے زبانوں کا استعمال بول چال کی سطح پر ہوتا رہا ہے، جب کہ ہمارے پاس معلوم زبانوں کا تحریری مواد قریباً پانچ یا چھ ہزار سال پہلے تک کا ملتا ہے اور بس۔ لہٰذا موجودہ مواد اور لسانیاتی طریقوں سے زبان کی ابتدا تک رسائی ممکن نہیں۔

علت ومعلول کے اصولوں پر مبنی کوئی بھی ٹھوس سائنسی تحقیق مذکورہ انتہائی قدیم زمانے کے لوازمات ورموز پر سے پردہ کشائی کی مجاز نہیں۔ گویا اس ضمن میں قیاس اور تخیل کا سہارا لیے بنا چارہ نہیں[۷]۔ ان قباحتوں کے پیشِ نظر انیسویں صدی کی آخری دہائی میں خالص سائنسی ومنطقی نقطۂ نظر کے حامل تمام ماہرین نے 'آغازِ زبان' کے مبحث سے روگردانی کرتے ہوئے اسے ممنوع قرار دے دیا۔ اسی سبب پیرس میں ۱۸۶۶ء میں جب لسانیاتی سوسائٹی 'Societe De Linguistique De Paris' کا قیام عمل میں آیا تو اس کے دستور کی دفعہ ۲ میں لکھ دیا گیا:

سوسائٹی زبان کے آغاز یا ایک عالم گیر زبان کی تخلیق کے بارے میں کوئی مراسلہ منظور نہیں کرے گی۔[۸]

اس قرارداد کے علی الرغم دونوں ممنوع موضوعات ماہرینِ لسانیات کی دل چسپی اور بحث کا مرکز بنے رہے۔ یہاں تک کہ 'اسپرنٹو' (Esperanto)[۹] اور 'اِڈو' (Ido)[۱۰] اور دیگر کئی عالم گیر زبانوں کی تخلیق ۱۸۶۶ء کے بعد ہوئی اور آغازِ زبان کے نظریات انیسویں یا بیسویں صدی کے اوائل ہی میں نہیں بلکہ بیسویں

صدی کے نصف دوّم میں بھی منظرِ عام پر آئے۔

اس میں شک نہیں کہ آغازِ زبان سے متعلق حقائق کی سائنسی بنیادوں پر بازیابی میں حائل مشکلات کے برعکس قیاسی توجیہات اس ضمن میں اس حدتک مددگار ثابت ہوئیں کہ ڈنمارک سے تعلق رکھنے والے ماہرِ لسانیات، آٹو یسپرسن (Otto Jesperson) نے یہ بیان دیا:

Linguistic science can not refrain forever form asking about the whence (and about the whither) of Linguistic Evolution.[11]

جرمن کے مشہور ماہرِ لسانیات، میکس مُلر (Max Muller) نے زبان کی پیدائش سے متعلق مباحث سے ماہرین کی فطری دل چسپی کو اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

Nothing, no doubt, would be more interesting than to know from historical documents the exact process by which the first man began to lisp his first words,andthustoberidforeverofallthetheoriesontheoriginofspeech.[12]

ذیل میں آغازِ زبان سے متعلق سائنسی نظریوں اور قیاس آرائیوں پر مبنی لامتناہی سلسلے کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

(ا) فلسفیانہ اور الہیاتی نظریات:

آغازِ زبان سے متعلق قدیم ترین نظریہ مذاہب کا ہے جو تاریخِ زبان میں 'الہامی نظریۓ' (Divine Theory) کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔اس کی رو سے زبان خدا کی عطا ہے۔یورپ میں 'علم اللسان' کے ارتقا سے قبل قریباً اٹھارھویں صدی تک آغازِ زبان کا الہامی نظریہ کسی نہ کسی صورت عام رہا۔اکثر مذاہب نے اپنی زبان کو قدیم ترین قرار دیا۔انجیل اور قرآن کی تعلیمات کے مطابق خالقِ حقیقی نے آدمؑ کو قوتِ تکوین بخشی اور اشیا کے نام سکھائے:

☆ ''**علم الآدم الاسما کلھا**'' (سورہ البقرہ۔آیت ۳۱)

ترجمہ: ''اور (اللہ نے) آدم کو تمام اشیا کے نام سکھائے۔''

☆ ''**ومن آیاتہ خلق السمٰوات والارض و اختلاف السنتکم و امو الکم**'' (سورہ روم۔آیت ۲۲)

ترجمہ: ''آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق اور زبانوں اور رنگوں کے اختلاف اللہ کی نشانیاں ہیں۔''

And out of the ground the Lord God formed every beast of the field, and every fowl of the air, and brought them unto Adam to see what he would call them; and whatsoever Adam called every living creature, that was the name thereof.

(Genesis 2:19)

اسلامی عقیدہ عربی زبان کو پہلی، آسمانی اور آدمؑ کی زبان قرار دیتا ہے جب کہ انجیل کے مطابق وہ ابتدائی زبان جس میں آدم نے پہلے پہل بات کی، عبرانی تھی۔مزید یہ کہ عبرانی نوعِ انساں کی عالم گیر زبان کی حیثیت سے ہمیشہ قائم ودائم رہتی اگر حضرتِ نوح کے مخالفین نے ازراہِ تکبر مینارِ بابل تعمیر نہ کیا ہوتا[۱۳]۔عہد نامہ قدیم میں بیان ہوا ہے کہ اہلِ بابل نے ایک بلند مینار تعمیر کیا تا کہ آسمان پر چڑھ کر خدا سے معرکہ آرا ہو سکیں۔خدا نے انھیں سزا دینے کی غرض سے یہ عتاب نازل کیا کہ مینار پر چڑھے ہر فرد کی زبان دوسرے سے مختلف کر دی، جس کے نتیجے میں کوئی بھی کسی کی بات سننے اور سمجھنے کا قابل نہ رہا[۱۴]۔انگریزی زبان کا محاورہ

'Bable of Tongues'اسی روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی مختلف زبانوں کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانوں نے جنم لیا۔
ہندو دھرم میں زبان کو خالقِ کائنات، برہما دیوتا کی اردھانگی، سرسوتی دیوی کی ایجاد اور دین قرار دیا جاتا ہے[۱۵]۔ ہندوؤں میں سنسکرت کو 'دیوبانی' یا 'دیو بھاشا' کہا جاتا ہے۔بعض افراد کا ماننا ہے کہ سنسکرت زبان اور سنسکرت قواعد کے وہ بنیادی اصول جو پانِنی(Panini) کے چودہ سوتروں میں منظوم ہیں، دراصل شیو جی کی ڈگڈگی سے نکلے تھے۔

جرمن مفکرین، ہرڈر(Herder)اور جیکب گرم(Jacob Grimm) نے زبان کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی کو الہامی نظریے کے منافی قرار دے کر اِسے رد کر دیا۔

زبان کی تخلیق سے متعلق مذہبی بنیاد پر الہامی نظریات پیش کیے جانے کے علاوہ اکثر افراد نے بنا کسی تقدس کی آمیزش کے کسی بھی زبان کو، جو عموماً اُن کی اپنی ہی ہوتی تھی، ازلی یا قدیم ترین قرار دیا ہے۔

> Imagine the Lord talking French! Aside from a few odd words in Hebrew, I took it completely for granted that God had never spoken anything but the most dignified English.[16]

دو جرمن عالموں، جوہانس (Johannes) اور میگنس (Magnus) نے قدیم جرمن زبان کو دنیا کی پہلی زبان قرار دیا۔اسی طرح ڈچ عالم، جے جی بیکانس (J.G. Becanus) ڈچ زبان کو قدیم قرار دیتا تھا۔اس نے اس زبان کو 'Cymbrian' کا نام دیا تھا[۱۷]۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۴ء میں ترکی کی لسانی کانگرس نے ترکی زبان کے تقدم کے حوالے سے یہ فرمان جاری کیا:

> Turkish is at the root of all languages, all words being derived from 'gunes', the Turkish word for 'Sun', The first object to strike the human fancy and demand on name.[18]

علاوہ ازیں کئی بادشاہوں کو انسان کی سب سے پہلی یا فطری زبان کی دریافت کی تشویش ہوئی۔اس مقصد کے لیے نوزائیدہ بچوں پر تجربات کیے گئے۔ بچوں کو جنگل میں اس طرح پرورش کرایا گیا کہ ان کے کانوں میں کسی بھی زبان کا کوئی لفظ نہ پڑ سکے۔ان تجربات کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ بنا کوئی زبان سُنے اور بولے بچے فطری طور پر کون سی زبان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی غرض سے اپناتے ہیں۔بادشاہوں کا خیال تھا کہ اس طرح سے سامنے آنے والی زبان فطری ہوگی اور یقیناً انسان کی پہلی زبان بھی۔اس حوالے سے یونانی تاریخ دان،'Herodotus' (پانچویں صدی قبل مسیح) کے مطابق قدیم مصری بادشاہ سام 'Psammetichus'(۶۶۴-۶۱۰ ق م) نے دو نوزائیدہ بچوں کو ایک فریجین (Phrygian)[۱۹] خادم کی زیرِ نگرانی جنگل میں پرورش کروایا۔بولنے کی عمر کو پہنچنے پر بچوں کو دربار میں حاضر کیا گیا تو ان میں سے ایک نے لفظ 'بیکوس' (Bekos) سے ملتا جلتا لفظ ادا کیا جو فریجین زبان میں روٹی کو کہتے ہیں۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ 'فریجین' ازلی زبان ہے۔اکثر ماہرین کا خیال ہے کہ اُس فریجین خادم کے مُنہ سے اکثر و بیش تر لفظ 'بیکوس' نکل جاتا ہوگا جو بچوں نے سنا اور یاد رکھا۔مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا کہ بچوں نے کسی انسانی ذریعے سے کچھ سُنا، اپنایا اور ویسا ہی بولنے کی کوشش کی۔بہت ممکن ہے کہ بچوں کے مُنہ سے ادا ہونے والی، لفظ 'بیکوس' سے ملتی جلتی آواز وہاں موجود بکریوں کی بنا پر ہو:

> They must have heard what the goats were saying. First remove the *-kos* ending, which was added in the Greek version of the story, then pronounce

be-as you would the English word *bed* without -*d* at the end.[20]

اس نوع کے مزید تجربات زبان کی پیدائش پر قطعاً خاطر خواہ نتائج پیش نہ کر سکے۔

تین یونانی مفکرین، فیثا غورث (Pythagoras)، ہیریکلیٹس (Heraclitus) اور افلاطون (Plato) کا عقیدہ تھا کہ زبان فطری اور با قاعدہ ہے اور لفظ کے صحیح معنی اس کی ہیئت سے ہویدا ہو جاتے ہیں۔ گویا لفظ اور اس کے نام میں کوئی فطری اور لازمی تعلق ہوتا ہے۔

At some ancient time there was a 'Legislator' who gave the correct, natural name to everything, and that words echoed the essence of their meanings.[21]

دراصل اس نظریے کے حامیوں کے سامنے فقط یونانی زبان تھی۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ ہر چیز کے مختلف زبانوں میں مختلف نام ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات کہ اشیا اور اُن کے ناموں میں پراسرار فطری تعلق ہوتا ہے، قطعی بے تکی ہے[۲۲]۔ اسی طرح پانچویں صدی قبل مسیح میں ڈیموکریٹس (Democritus) اور چوتھی صدی قبل مسیح میں ارسطو (Aristotle) نے زبان کو باہمی قول و قرار سے مستخرج کیا۔ روسو (Rousseau) نے بھی ۱۷۵۴ء میں یہ تصور پیش کیا کہ قدیم انسانوں نے اُسی طرح سے مفاہمانہ انداز میں زبان کی تشکیل کی جو تمام عمرانی نظاموں کی بنیاد ہے لیکن اس نے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا کہ زبان سے محروم قدیم ترین انسان کس صورت یک جا ہوئے ہوں گے اور وہ کیا محرکات تھے جن کی بنا پر وہ کسی ایک آواز کو کسی خاص خیال کی ترجمان سمجھنے پر متفق ہوئے؟ گویا روسو کا نظریہ فقط زبان کی بالیدگی کی تاویل کر سکتا ہے ابتدا کی نہیں۔

چیزوں کو نام دینے کا معاہدہ بہ جائے خود تبادلۂ خیالات کا متقاضی ہے اور یہ اُسی صورت ممکن ہے جب زبان پہلے سے موجود ہو اور جس کے وسیلے سے ایک دوسرے کو سمجھا جا سکے اور خیالات کا اظہار کیا جا سکے۔[۲۳]

(۲) فطری اصوات کی نقل پر مبنی نظریات:

اصل قدیمی زبان کے نقطۂ آغاز کی کھوج میں متعدد ایسے نظریات سامنے آئے جن میں انسان ، جانور اور دیگر مظاہرِ فطرت کی بے ساختہ اور قدرتی اصوات کو زبان کی پیدائش کا مؤجب قرار دیا گیا۔ اس حوالے سے ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان نے تقلید و نقل کی فطری صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے جانوروں کی بولیوں، مظاہرِ قدرت اور انسانی مصنوعات کی مخصوص گونج یا جھنکار نما آوازوں کی نقل میں زبان کے اوّلین الفاظ اختراع کیے، جن سے انسانی زبان کے ابتدائی کلمات وجود میں آئے۔ بعد ازاں اِن سے دوسرے کئی الفاظ مشتق ہوئے، مثلاً اردو میں بھوں بھوں سے بھونکنا اور میں میں سے ممیانا جیسے الفاظ اور انگریزی زبان میں کوکو سے 'Cuckold' اور کاک سے 'Coquet' جیسے با قاعدہ اسمائے اصوات پیدا کیے گئے۔ اسی طرح سمعی تاثر کے حامل اردو الفاظ: ٹن ٹن، کھٹ کھٹ، گڑ گڑاہٹ، گرج وغیرہ اور انگریزی الفاظ: Sizzle, Thunder, Flutter, Drizzle وغیرہ ہیں۔ جب کہ بصری تاثر کے حامل اردو الفاظ: جگ مگ، زرق برق، جھلمل، چکا چوند وغیرہ اور انگریزی الفاظ: Zigzag, Glimmer, Glow, Flash وغیرہ ہیں۔

کسی بھی زبان کے ایسے تمام الفاظ جن کی ادائیگی سے کچھ اس نوع کے سمعی و بصری پیکر ظاہر ہوں جو معنی کی ایک جھلک پیش کریں، 'صوت نما الفاظ' (Onomatopoiec) کہلاتے ہیں[۲۴]۔ تاریخِ زبان میں یہ نظریہ 'Bow-Wow Theory' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نظریے کے اطلاق سے ہر زبان کے فقط دس بیس الفاظ کی اصل معلوم کرنے میں راہ نمائی حاصل کی جا سکتی ہے مگر بقیہ الفاظ کی بابت یہ نظریہ کوئی اصول وضع نہیں کرتا۔ اس لیے یہ امر قابلِ قبول نہیں کہ زبان محض تقلید و نقل کی پیداوار ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کی انسان کی تقلیدی عادت نے زبان کی ساخت اور بناوٹ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔[۲۵]

اصوات کی بنیاد پر ایک نظریہ شدتِ جذبات میں انسانی دہن سے ادا ہونے والے فجائی نعروں پر مبنی ہے۔ اردو میں فجائیہ آوازیں: ہائے، آہ، واہ، اُف وغیرہ اور انگریزی زبان میں: Oh, Pooh Pooh وغیرہ ہیں۔ اسی سبب یہ نظریہ تاریخِ زبان میں 'Pooh Pooh Theory' کے نام سے مشہور

ہے۔ اکثر ماہرین کا ماننا ہے کہ فجائیہ نعروں کی صفائی سے زبان میں آوازیں یعنی مصوتے اور مصمتے پیدا ہوئے اور انھیں سے دیگر الفاظ بنے، مگر درحقیقت فجائی کلمات زبان کا تخم تو درکنار، زبان کا جزو بھی نہیں۔ یہ زبان ہی سے بروئے کار آتے ہیں۔ اشتقاق کے نقطۂ نظر سے یہ بالکل جامد کلمات ہیں۔ ان پر تصرف کا عمل نہیں ہو سکتا تو پھر ان سے زبان کیوں کر تشکیل پا سکتی ہے؟

نطقِ انسانی پر گیتوں اور غنائی آوازوں کا تصور بھی ماہرینِ لسانیات کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ڈارون (Darwin) نے پہلی بار سائنسی افکار میں اس تصور کو جگہ دی اور انسان کی غنائی آوازوں کو زبان کا نقطۂ آغاز قرار دیا۔ ماہرینِ لسانیات میں آٹو یسپرسن نے شد و مد کے ساتھ اس نظریے کی وکالت کی۔ یسپرسن کے بیان کے مطابق:

> The genesis of language is not to be sought in the prosaic, but in the poetic side of life; the source of speech is not gloomy seriousness, but merry play and youthful hilarity.......In primitive speech I hear the laughing cries of exultation when lads and lassies vied with one another to attract the attention of the other sex, when every body sang his merriest and danced his bravest to lure a pair of eyes to throw admiring glances in his direction. Language was born in the courting days of mankind; the first utterances of speech I fancy to myself like something between the nightly love lyrics of puss upon the tiles and the melodious love songs of the nightingale.[26]

یسپرسن کی تفصیلات کے پیشِ نظر اسی کو اس نظریے کا موجد مانا جاتا ہے۔ اس کے مطابق زبان کی ایجاد خیالات کی ترسیل کے لیے نہیں بلکہ یہ لہو و لعب کے جذبۂ نشاط کا اُبال ہے۔ اس نظریے کو ماہرین آغازِ زبان کے نغمانی نظریے (Sing Song Theory) کے عنوان سے جانتے ہیں[۲۷]۔ دیگر حکائی نظریات کی طرح اس نظریے کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ غنائی آوازیں اور گیت وفورِ جذبات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کا کرشمہ رہے ہیں جب کہ زبان کا مقصد بین الافرادی رابطہ اور باہمی افہام و تفہیم ہے۔ ان دونوں کے اظہار کی ہیئت اور مواد ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔ ان کے ارتقا کے اصول بھی مختلف ہیں۔ متعدد قدیم زبانیں غنائی خصوصیات سے محروم نظر آتی ہیں اور بعض ترقی یافتہ زبانوں میں خاصی غنائیت ملتی ہے[۲۸]۔ علاوہ ازیں حیوانی غوں غاں کے بعد اگلی منزل یک رکنی مجموعۂ اصوات کی تو مانی جا سکتی ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ نطق کی ابتدا طرح طرح کے مصمتوں پر مشتمل صوت رکنوں بلکہ کئی کئی صوت رکنوں پر مشتمل الفاظ اور کئی کئی لفظوں پر مبنی فقروں سے ہو۔[۲۹]

(۳) اصوات و اعضاء کے باہمی ربط پر مبنی نظریات:

متعدد ماہرینِ لسانیات کا ماننا ہے کہ انسان کے جسمانی اعضاء کی حرکات اور آوازوں میں کوئی نہ کوئی فطری تعلق ضرور ہے۔ اعضاء و اصوات کے اس فطری تعلق کی وضاحت میں تین نظریات سامنے آئے جو معمولی فرق کے باوجود ایک دوسرے سے قریباً مماثل ہیں۔

اجتماعی ہانک کا نظریہ (Yo-He-Yo Theory) نوائر (Noire) نے پیش کیا۔ اس نظریے کی رو سے انسان سخت محنت کرتے ہوئے تیز سانس کی مدد سے کچھ اعصابی سکون حاصل کرتا ہے۔ تیز سانس کی آمد و رفت سے صوتی تاروں میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ غیر متمدن انسان اجتماعی حیثیت سے کام کرتے

ہوئے تھکن کے احساس کو رفع کرنے، اپنی طاقت کو بڑھانے اور سہارے کی غرض سے ارادتاً ایسی آوازیں منہ سے نکالتے ہوں گے۔ انھی آوازوں سے مخصوص کاموں کے لیے اسم وجود میں آتے گئے۔ یوں یہ عمل ایک باقاعدہ زبان کی تشکیل پر منتج ہوا۔

اس کے برعکس ٹاٹا نظریہ (Ta Ta Theory) اس امر پر زور دیتا ہے کہ ابتدا میں انسان جب کوئی مشقت کرتا تھا تو غیر ارادی طور پر اُس کے اعضائے نطق محنت کرنے والے اعضائے جسم کی نقل کرتے تھے جس سے عموماً کوئی آواز یا آوازوں کے مجموعے پیدا ہو جاتے تھے۔ آوازوں کے انھیں غیر ارادی و بے معنی مجموعوں سے زبان کا ارتقا ہوا۔ ڈارون نے بھی کچھ غیر ارادی فجائی آوازوں کی عضویاتی توجیہات پیش کی ہیں۔ [۳۰]

اس حوالے سے تیسرا نظریہ 'Gestural Theory' ہے جس میں محنت کا ذکر نہیں بلکہ گفت گو کرتے وقت دیگر اعضائے جسمانی کی حرکات (Gestures) کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں سر رچرڈ پیجٹ (Sir Richard Pajet) نے اسی سے ملتا جلتا 'حرکاتِ دہن کا نظریہ' (Mouth Gesture Theory) پیش کیا [۳۱]۔ اصوات اور جسمانی اعضاء کے باہمی ربط پر مبنی یہ تمام نظریات اپنے اپنے دور میں ماہرینِ لسانیات میں قبولیت حاصل نہ کر سکے اور رد کر دیے گئے۔ دراصل غیر ارادی طور پر منہ سے نکلنے والی آوازوں کا محرک کچھ بھی ہو مگر انھیں لسانی حیثیت کسی طرح سے بھی نہیں دی جا سکتی۔ ان سے لسانی آوازیں اور الفاظ کیوں کر بنے ہوں گے؟ اس کی تاویل ممکن نہیں۔

(۴) زبان اور ذہن کے باہمی ربط کا نظریہ:

جرمن ماہرِ لسانیات، سٹائن ہال (Steinhal) نے اپنی کتاب 'گرامر، منطق، نفسیات' کے مقدمے کے پانچویں باب میں 'آغازِ زبان' سے بحث کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ زبان کی ابتدا اور قدیم انسان کے ہاں اس کے پہلے پہل استعمال کی چھان بین میں اُس ذہنی کلچر سے پوری واقفیت ناگزیر ہے جو صحیح معنوں میں تخلیقِ زبان کا پیش خیمہ ہے [۳۲]۔ اس کے ساتھ ساتھ شعور کی خصوصی کیفیت، اس کے مخصوص روابط اور اُن اصول وشرائط کو سمجھنا ضروری ہے جن کے تحت زبان وجود میں آتی ہے۔ ذہنی حالت اور شعور کے رابطے ہی دراصل وہ فعال قوتیں ہیں جو زبان تخلیق کرتی ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زبان ایک ایجاد نہیں بلکہ ذہن کے اندر ایک تخلیق ہے۔ شعور کے عناصرِ ترکیبی پر حکم ران لاشعور کے قوانین کی عمل داری ہی دراصل زبان کی تخلیق کا مؤجب ہوتی ہے۔

سٹائن ہال کا یہ خیال صحیح ہے کہ زبان کوئی مرئی چیز نہیں بلکہ ایک 'وقوعہ' ہے، مگر یہ بیان کہ ذہنی حالت اور شعور کے قوانین کی فعالیت ہی تخلیقِ زبان کا سبب ہے، درست نہیں۔ زبان دراصل اعضائے نطق سے پیدا شدہ صوتی ارتعاشات کے تسلسل کے سبب وجود پانے والے صوتی اشاروں کا وہ مجموعہ ہے جسے اعضائے سماعت کی مدد سے گرفت میں لیا جاتا ہے۔ نطق اور سماعت کے پسِ پشت نفسیاتی کارفرمائی سے انکار نہیں مگر پھیپھڑے، حلقوم اور ان سے خارج ہونے والی ہوائی لہریں، جیبھ، تالو، دانت اور ہونٹ تخلیقِ زبان کی ایسی اہم فعال قوتیں ہیں جن سے صوتی اشارے تشکیل پاتے ہیں۔ انھیں کسی صورت بھی ذہن کے اجزائے ترکیبی نہیں کہا جا سکتا۔

زبان کی تخلیق میں ذہن کی کارفرمائی کو وسیع تناظر میں جانچنے سے کسی نہ کسی منطقی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر پیدائش سے دو تین سال تک بچے کا ذہن ارتقا کی ابتدائی سطحیں بہت تیزی سے عبور کر رہا ہوتا ہے جس سے بچے کا دہن، اعضائے نطق اور دیگر جسمانی اعضاء ایک بالغ انسان کی نسبت جسامت، عمل اور حجم میں مختلف اور ناپختہ ہوتے ہیں۔ اس عمر میں بچہ بندروں کی طرح سانس لیتے وقت پینے کا عمل جاری رکھ سکتا ہے، دونوں ہاتھ اور گھٹنوں کے بل پر رینگتا ہے اور غوں غاں جیسی بے معنی آوازیں بھی نکالتا ہے، مگر وقت کے ساتھ بہ تدریج ذہنی بالیدگی سے بچہ ایک بالغ انسان کی طرح سیدھا کھڑا ہو کر چلنا اور بولنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ امر اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کو پیدائش ہی سے قوتِ تکوین ودیعت ہے جو دیگر اعضائے جسم کی طرح ذہن کی فعال قوتوں کے تابع ہوتی ہے اور جس کی بنا پر انسان دیگر تہذیبی اکتسابات کی طرح زبان تخلیق کرتا ہے۔ [۳۳]

انسان میں تخلیقِ زبان کی جبلّی صلاحیت کا نظریہ ماہرین کی توجہ آغازِ زبان کے قیاسی نظریات سے منحرف کر کے نیم سائنسی مطالعے کی طرف موڑ دیتا ہے، جس سے اصل قدیمی زبان کے نقطۂ آغاز کی کھوج میں ماہرین کے لیے انسانی خلیے میں زبان تخلیق کرنے والے اُس توارُثی نطفے کی دریافت ناگزیر ہو جاتی ہے جو

تمام مخلوقات میں صرف انسان ہی کو ودیعت ہے۔

یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ زبان تخلیق کرنے، بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت اگر صرف انسان ہی کو عطا ہے تو کیا کوئی اور مخلوق کسی بھی سطح پر زبان کا استعمال نہیں کر سکتی؟ اس سوال کے جواب میں سکھائے جانے پر کچھ جانوروں کا انسانی زبان بولنا اور سمجھنا ماہرین کو فی الحال لا جواب کر دیتا ہے۔

آغازِ زبان کا مسئلہ ماضی کے ایسے بے نشان جزیروں کے مانند ہے جہاں تک انسانی ذہن اور علم و تحقیق کی رسائی فی الحال ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں مندرجہ بالا قیاسی و نیم قیاسی نظریات پر تکیہ کیے بنا چارہ نہیں۔ حیوانوں کی آواز، اشیا کی جھنکار اور فجائیہ آوازوں کی نقل کے نظریے فقط اس حد تک درست ہیں کہ موجودہ یا قدیم زبانوں کے چند الفاظ کی تشکیل پر تو روشنی ڈالتے ہیں لیکن مجموعی طور پر زبان کے آغاز کی توجیہ نہیں کرتے۔ اس کے باوجود یہ موضوع ماہرینِ لسانیات کی دل چسپی سے کبھی خالی نہیں رہا۔ بعد ازاں متعدد ماہرین، مثلاً ہنری سویٹ (Henry Sweet)، رے ویز (Revez)، ایڈگر اسٹرتے وانٹ (Wundt) اور ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی (Suneti Kumar Chater Jee) نے بھی زبان کے نقطہ آغاز پر تحقیق سے اپنے اپنے نظریات پیش کیے۔ ان کے نظریات دراصل سابقہ نظریات میں سے چند اور بعض اوقات متعدد نظریات کی بنیاد پر قائم ہوئے جس کی وجہ سے وہ اس مسئلے پر سابقہ نظریات سے بڑھ کر راہ نما ثابت نہیں ہوئے، مگر اس کے باوجود اِن میں کہیں کہیں منطقی و سائنسی فکر کی آمیزش اس ضمن میں خاطر خواہ نتائج کے حصول کے لیے ماہرینِ لسانیات کو دعوتِ فکر و تحقیق دیتی ہے۔

انحرافِ زبان: نوعیت اور اسباب

Stability in Language is synonymous with rigor mortis.[34]

اس حوالے سے قطعی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ زبانیں کیوں اور کیسے بدلتی ہیں؟ بلا شبہ لسانی تغیرات اچانک نہیں بلکہ بہ تدریج رونما ہوتے ہیں۔ زبان اکتسابی روایت ہوتی ہے۔ اکتساب کے دوران اس میں تصرفات کے تھوڑے بہت امکانات بھی ہوتے ہیں[۳۵]۔ فرد میں نئے لفظ سیکھنے کا عمل یقیناً اچانک ہوتا ہے البتہ لفظ کے اطلاقی امکانات کو قبولیت دھیرے دھیرے ہی حاصل ہوتی ہے۔ ابتدا میں فرد متفرق سماجی صورتِ حال کے پیشِ نظر نئے لفظ اور اس سے زبان میں پیدا شدہ نئے قواعدی اصولوں کے استعمال میں مختار ہوتا ہے۔ یعنی کبھی وہ نئے لفظ کا استعمال کرتا ہے اور کبھی نہیں، مگر وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ زبان میں یہ تبدیلی پورے لسانی گروہ کو متاثر کرتی ہے۔

ماہرین کے مطابق بچوں میں اکتسابِ زبان کے عمل کو دراصل زبان میں تبدیلی کے بنیادی محرک کی حیثیت حاصل ہے[۳۶]۔ ایک مخصوص لسانی گروہ میں پروردہ بچے کو زبان اور اس کی قواعد سکھائی نہیں جاتی بلکہ بچہ اپنے ماحول میں مستعمل زبان کا اکتساب فطری انداز سے خود بہ خود کرتا ہے۔ اس عمل کے دوران میں ہر بچہ اپنی گرامر آپ خود تشکیل دیتا ہے۔ یہ قواعد بالغ افراد کے قواعدِ زبان سے مختلف ہوتے ہیں۔ زبان کے مروجہ قواعدی نظام کے ماتحت ہونے تک بچے کی زبان بہ تدریج ارتقائی مراحل طے کرتی ہے۔ علاوہ ازیں لسانی اعتبار سے مخلوط ماحول میں اکتسابِ زبان کرنے کی وجہ سے بچے کی زبان مروجہ مخصوص زبان کے مترادف نہیں ہوتی۔ صوتی، قواعدی اور لغوی سطح پر بچے کی زبان متعدد مگر لطیف انحرافات ظاہر کرتی ہے جو بعد ازاں نسل در نسل پروان چڑھتے ہیں اور انحرافِ زبان کا سبب بنتے ہیں۔

زبان میں تبدیلی کی نوعیت:

ہر زبان تغیر پذیر ہے۔ لسانی تغیرات زبان کی تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں۔ تبدیلی کا یہ طویل سلسلہ ارتقا کہلاتا ہے جو نہایت آہستہ روی اور غیر محسوس انداز سے انجام پاتا ہے۔

Language moves down time in a current of its own making. It has a drift .....

Nothing is perfectly static. Every word, every grammatical element, every

locution, every sound and accent is a slowly changing configuration, moulded by the invisible and impersonal .....[37]

مختلف اور متنوع تبدیلیوں زیرِ اثر زبان کی تشکیل دو طرح سے عمل میں آتی ہے:

(ا) زبان کی فطری تشکیل (۲) زبان کی ارادی تشکیل

(ا) زبان کی فطری تشکیل:

ایک ہی زبان میں فطری تغیرات کی ان گنت نوعیتیں ہوتی ہیں۔ ان سب کی جامع گروہ بندی اور سائنسی توجیہ ممکن نہیں تاہم ماہرینِ لسانیات نے زبان کی مختلف سطحوں میں وقوع پذیر جن فطری تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے اُن کا مختصر مطالعہ درج ذیل ہے:

(i) صوتی اور فونیمی تبدیلی (Phonetic And Phonemic Change):

زبان کے سائنسی مطالعے میں صوتی تغیرات کا جائزہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تغیرات عموماً زیادہ باقاعدگی اور صراحت سے ملتے ہیں۔ اسی سبب ماہرینِ لسانیات نے صرفی، نحوی اور معنوی تبدیلیوں کے مقابلے میں صوتی تغیرات کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی ہے۔ یہ عموماً کلموں میں ہوتے ہیں اِس لیے صرفی و معنوی ارتقا کو بھی کسی قدر انھی کا کرشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ بہ نسبت معنوی تبدیلیوں کے ان کی تعمیم سے قواعد وضوابط کا انضباط ممکن ہے۔ اس ضمن میں 'گرمزلاء' (Grimm's Law) اور 'حنکی قانون' (Palatal Law) کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، لیکن ان سب کاوشوں کے باوجود سچ تو یہ ہے کہ بہت سے صوتی تغیرات پر کسی ضابطے یا فارمولے کا اطلاق نہیں ہوتا۔

زبان میں صوتی تبدیلی دو طرح سے رونما ہوتی ہے۔ ہم صوت یا ایلوفون (Allophone) کی تبدیلی کی صورت میں اور فونیم (Phoneme) کی تبدیلی کی صورت میں۔ پہلی تبدیلی کا تعلق صوتیات سے ہے جب کہ دوسری کا فونیمیات سے۔ فونیمی تبدیلی عموماً باقاعدہ نہیں ہوتی۔ کچھ الفاظ میں ایک فونیم دوسرے فونیم سے بدلتا ہے اور کچھ میں نہیں، ''لیکن یہ تبدیلی تلفیظی صوتیات کی رعایت کو ملحوظ رکھتی ہے۔''[۳۸]

عموماً ایک آواز اُسی قریبی آواز سے بدلتی ہے جن میں باہم کچھ نہ کچھ خواص مشترک ہوں۔ بالکل غیر متعلق اور بعید آواز سے تبدیلی نہیں ہوتی۔ تاریخی تبدیلی کے طور پر صوتی اور فونیمی تبدیلیاں آپس میں اس طرح مدغم ہیں کہ انھیں الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور چوں کہ ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں لہٰذا دونوں کا مطالعہ عموماً ایک ساتھ کیا جاتا ہے۔

زبان میں صوتی تغیر سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ کسی کلمے میں کوئی بالکل نئی آواز پیدا ہو جاتی ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ کلمے کی کوئی ایک آواز یا متعدد آوازیں اُسی زبان کی مروجہ دوسری آوازوں سے بدل جاتی ہیں یا پھر کوئی آواز حذف ہو جاتی ہے۔ ''ہر صوتی کرشمہ زبان کے صوتی نظام کا پابند ہوتا ہے۔''[۳۹]

کسی زبان کے سرمایۂ کلمات یا اس کے معقول حصے میں باقاعدگی سے وقوع پذیر صوتی تبدیلی، 'نامیاتی یا تعمیری' کہلاتی ہے۔ اس کی مثال وہ کلمے ہیں جو پراکرتوں کی وساطت سے جدید ہند یورپی میں آئے اور جن کی اختتامیہ آواز 'ک' بدل کر 'ا' ہو جاتی ہے، جیسے 'املک' سے 'آملا'۔ یا پھر وہ کلمے جن کے آخر میں الف کی آواز حذف ہو جاتی ہے، جیسے 'بھکشا' سے 'بھیک' وغیرہ۔ تبدیلیوں کی یہ قسمیں اکثر کلموں میں باقاعدگی سے ملتی ہیں، البتہ کچھ تبدیلیاں باقاعدہ نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات ایک ہی ساخت کے کلموں میں مختلف قسم کی تبدیلیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس نوع کی تبدیلیاں 'اتفاقی' کہلاتی

ہیں۔ کلمے کی کسی آواز کی تبدیلی اگر آس پاس کی آوازوں کے زیرِ اثر ہو تو ایسی تبدیلی کو 'مشروط صوتی ادغام' کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آواز کی تبدیلی کا دیگر قریبی آوازوں سے تعلق نہ ہو تو وہ 'غیر مشروط صوتی ادغام' کے زمرے میں شمار کی جاتی ہے۔ بعض صوتی تبدیلیاں مرحلہ وار ہوتی ہیں اور کچھ براہِ راست۔ اس قسم کی تمام تبدیلیاں ایک لحاظ سے 'میکانکی' کہلائی جا سکتی ہیں۔ اس لیے کہ بہ ظاہر یہ طبیعیاتی عناصر سے متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ اگر چہ ان تبدیلیوں کی وقوع پذیری بولنے والوں کی وساطت ہی سے ہوتی ہے تاہم ان میں گویائی کی میکانیت کسی نہ کسی ضابطے کے تحت کارفرما ہوتی ہے۔ بعض تبدیلیاں گویائی کی میکانیت سے بے تعلق نہیں ہوتیں، البتہ قیاسِ تمثیلی کی بنیاد پر لسانی ہیئت اور معنی کے نفسیاتی تلازم کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

صوتی تغیرات کی اس طرح کی گروہ بندی نظری بنیادوں ہی پر ممکن ہے کیوں کہ ہر زبان میں یہ تغیرات اتنے ملے جلے ہوتے ہیں کہ اُن سب کے درمیان حدِ فاصل کھینچنا دشوار ہے۔ البتہ ماہرین کی رائے میں ایک صوتی رجحان ایسا بھی ہے جسے کم و بیش آفاقی قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ ہے کلموں کو سادہ اور مختصر کرنے کا رجحان۔ تاریخ السنہ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ قریباً سبھی زبانوں میں صوتی ہیئتیں وقت کے ساتھ ساتھ پیچیدگی سے سادگی کی طرف آئیں۔ سنسکرت، ژند، لاطینی اور یونانی کے قدیم، طویل اور ثقیل کلمے رفتہ رفتہ مختصر، سادہ اور سلیس ہوتے گئے۔ بعد ازاں ان سے ماخوذ زبانوں میں وہ کلمے مزید سادہ اور مختصر ہو گئے۔ صوتی تسہیل اور ایجاز و اختصار کا رجحان بلا شبہ لب و لہجے میں دور رس تبدیلی کا موجب بنتا ہے۔ اسی سبب آوازوں کے اجرا یا ادا کے طریقے میں معمولی سی تبدیلی ہو سکتی ہے یا مخارج، متصلہ مخارج سے بدل سکتے ہیں۔ لب و لہجے کی تبدیلی کی وجہ سے کلمے میں درج ذیل صوتی تغیرات دیکھنے میں آتے ہیں:

- ☆ دُہرے مصوتے اکہرے رہ جاتے ہیں یا اکہرے، دُہرے بن جاتے ہیں۔
- ☆ مصمتوں یا مصوتوں کا ادغام ہو جاتا ہے یا ان میں تقلیب ہو جاتی ہے۔
- ☆ چھوٹے مصوتے کھنچ کر طویل ہو جاتے ہیں۔
- ☆ ایک ہی کلمے میں ایک سے زیادہ آوازیں بدل جاتی ہیں۔
- ☆ آوازوں کے اضافے یا سقوط سے بھی کلمے متغیر ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل کلمے میں کسی بھی حصے میں رونما ہو سکتا ہے۔
- ☆ کلمے کی آوازیں باہم بدل جاتی ہیں، مثلاً مطلب سے مطبل وغیرہ۔

(ii) قواعدی تبدیلی (Grammatical Change):

قواعدی تبدیلی کی ذیل میں زبان میں رونما ہونے والی صرفی و نحوی تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

☆ صرفی تبدیلی (Morphemic Change):

قواعدی اعتبار سے زبان میں صرفی تبدیلی کے خاص عمل تصریف اور اشتقاق ہیں۔ اس تبدیلی سے مراد دراصل تصریف اور استخراج کے قاعدوں کی تبدیلی ہے۔ زبان میں نئے مارفیموں کا ظہور اور بعض مارفیموں کا معدوم ہو جانا اس کے تحت نہیں آتا بلکہ اسے ذخیرۂ الفاظ کی تبدیلی یا معنوی تبدیلی گردانا جائے گا۔ ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظوں کا داخل ہو جانا زبان میں
اَن گنت مارفیمی تبدیلیوں کا موجب ہوتا ہے کیوں کہ نہ صرف مادے بلکہ تصریفی و استخراجی سابقے اور لاحقے بھی مستعار لے لیے جاتے ہیں۔

صرفی تبدیلی کا صوتی تبدیلی سے گہرا تعلق ہے کیوں کہ ایلو مارف (Allomorph) اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ ان میں معمولی سا ردّ و بدل

صوتی تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔اسی طرح صوتی تبدیلیوں سے زبان میں طرح طرح کی صرفی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔اس حوالے سے کسی آواز یا آوازوں کا حذف خاص طور پر مارفیمیات پر اثر انداز ہوتا ہے،مثلاً 'خریددار' بدل کر 'خریدار' ہوگیا۔صوتی تبدیلی کئی ایلو مارف بنانے کی ذمے دار ہوتی ہے۔البتہ صرفی تبدیلی کا تعلق صوتی سے زیادہ معنوی تبدیلی سے ہے کیوں کہ مارفیم معنوی اکائی ہے۔صرفی تبدیلی براہِ راست معنوی تبدیلی کا باعث بن سکتی ہے۔

☆ **نحوی تبدیلی (Syntactic Change):**

نحو میں تبدیلی بہت شاذ ہے۔نحوی سطح پر زبان میں بڑی تبدیلی اسی صورت دیکھنے میں آتی ہے جب ایک مادرزبان بدلتے بدلتے دختر زبان کی ہیئت اختیار کر لے۔نحو کے دو حصے کیے جا سکتے ہیں،فقرہ اور جملہ۔فقروں کی ساخت میں عموماً تغیرات اور اضافے ہوتے رہتے ہیں البتہ جملے کی ساخت میں تبدیلی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے جو ایک طویل عرصے کو محیط ہوتی ہے۔صوتی تبدیلی سے زبان کی نحو متاثر ہوتی ہے۔اس سے بعض الفاظ ایک قواعدی گروہ سے نکل کر دوسرے قواعدی گروہ میں چلے جاتے ہیں۔اس لیے اس عمل کو بھی ایک لحاظ سے نحوی تبدیلی کے تحت شمار کیا جاتا ہے۔

زبان میں متعدد نحوی تبدیلیاں ایسی بھی رونما ہوتی ہیں جن کی توجیہ بہ آسانی ممکن نہیں۔

(iii) **معنوی تبدیلی (Semantic Change):**

لسانی تغیرات میں معنوی تبدیلیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اگر کوئی لفظ اپنے مروجہ مفہوم یا مفاہیم کے علاوہ کسی اور مفہوم کے لیے استعمال کیا جانے لگے یا پھر کوئی مفہوم اپنی مروجہ صوتی ہیئت (لفظی شکل) کے بہ جائے کسی اور صوتی ہیئت میں ادا ہونے لگے تو اسے معنوی تبدیلی کہا جاتا ہے۔یہ تبدیلی تاریخی اور جغرافیائی دونوں طرح سے زبان کو متاثر کر سکتی ہے۔تاریخی معنوی تبدیلی میں وقت کے ساتھ ساتھ لفظ اپنا مفہوم بدلتا ہے۔مثال کے طور پر بیسویں صدی کی ابتدا تک اردو میں لفظ 'رنڈی' عورت کے معنوں میں مستعمل تھا اور اب یہ 'طوائف' کے معنی دیتا ہے۔جب کہ جغرافیائی یا مکانی معنوی تبدیلی سے مراد ایک ہی لفظ کا مختلف علاقوں میں مختلف مفاہیم کے تحت رائج ہونا ہے،مثلاً اتر پردیش میں 'دائی' بچہ جنانے والی عورت کو کہتے ہیں اور بہار میں برتن صاف کرنے والی ملازمہ کو۔البتہ لفظ کے مفہوم میں مرحلہ در مرحلہ تغیر کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ معنوی تبدیلی،خواہ تاریخی ہو یا جغرافیائی،کبھی بھی اچانک رونما نہیں ہوتی اور تمام معانی کسی نہ کسی بنیادی وصف کی بنا پر ایک دوسرے سے بہ ہر حال مربوط ہوتے ہیں۔

جغرافیائی تبدیلی سے مماثل ایک چیز 'طبقاتی معنوی تبدیلی' ہے۔یعنی ایک ہی زمانے اور ایک ہی علاقے میں مستعمل زبان کے بعض الفاظ کا مختلف معاشرتی طبقات میں مختلف مفاہیم میں استعمال ہونا۔اسی طرح نہ صرف طبقات بلکہ کبھی کبھی افراد کی حد تک بھی معنوی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

زبان کے معنوی تغیرات کے سلسلے میں کلموں کے متروک ہوتے رہنے اور نئے کلموں کے جنم لیتے رہنے کے عمل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔زبان ہر دور میں متعدد الفاظ قبول و رد کرتی ہے۔اکثر الفاظ و اصطلاحات مستقل طور پر زبان کا حصہ بننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جب کہ کچھ نسبتاً مختصر مدت تک زبان کا ساتھ نبھا پاتے ہیں اور پھر متروک قرار دے دیے جاتے ہیں۔الفاظ و کلمات کے قبول و رد کا یہ سلسلہ اچانک نہیں ہوتا بلکہ قدیم و جدید مترادف الفاظ کچھ مدت تک ایک دوسرے کے متوازی عمل پیرا ہوتے ہیں۔رفتہ رفتہ ان میں سے اکثر ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتے ہیں اور اکثر غیر معین مدت کے لیے رواج پا جاتے ہیں۔البتہ اس امر کی تاویل ممکن نہیں کہ کون سا لفظ کب اور کیسے قبولیت حاصل کر لے اور کن عوامل کی کارفرمائی سے کوئی لفظ

کب اور کیسے متروک قرار دے دیا جائے۔ گویا زبان میں تغیر پذیری کے عمل کی پُراسراریت کی وضاحت ممکن نہیں۔

> Change, like the ripples from the stone, radiate outwards from whatever epicentre has started the change. How far the change spreads is dependent on many factors including what the source of the new expression is, what groups pick it up and whether the word is for a new concept or invention. Why certain words catch on and others do not, however, is often a mystery.[40]

الغرض زبان میں بہ تدریج اور غیر محسوس انداز سے صوتی، قواعدی، معنوی اور لغوی سطح پر تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور وہ بدلتے ہوئے سماجی، معاشرتی اور اقتصادی تقاضوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ یہی تغیرات دراصل زبان کی فطری تشکیل کا سبب بنتے ہیں۔ فطری طور پر زبان کی تشکیل کا دار و مدار اُن کلموں اور اسالیب پر ہوتا ہے جو لسانی گروہ کے افراد کی وساطت سے ظہور میں آتے رہتے ہیں اور قبولِ عام حاصل کر کے زبان کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔

(۲) زبان کی ارادی تشکیل:

زبان میں تغیرات کی وقوع پذیری نہ صرف اس کے فطری ارتقا بلکہ ارادی تشکیل کی بھی رہینِ منت ہوتی ہے۔ زبان کی ارادی تشکیل عموماً دو ذریعوں سے عمل میں آتی ہے۔ ایک ذریعہ عوام کا ہے اور دوسرا عالموں اور انشاپردازوں کا۔ عوام بالقصد زبان کی تشکیل میں حصہ نہیں لیتے بلکہ نئے حالات وواقعات سے مطابقت کی ضرورت انھیں لفظی سرمائے میں اضافے کی ترغیب دیتی ہے۔ گویا نئے لفظوں اور کلمات کا اختراع محض سرمایۂ کلمات بڑھانے کی نیت سے نہیں کیا جاتا۔ دراصل نت نئے مسائل، قدریں اور رجحانات نئی صوتی علامتوں کے متقاضی ہوتے ہیں۔ جہاں یہ علامتیں فطری طور پر خود بہ خود وضع ہوتی ہیں، وہیں کچھ کی ارادی تشکیل بھی ہوتی ہے جو سراسر عوام کے بدلتے ہوئے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کا نتیجہ ہوتی ہے۔

بعض اوقات عوام کی طرف سے مختلف وقتوں میں نت نئی بولیوں کے اختراع کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ یعنی بعض افراد نے اپنے امتیازی تشخص کے لیے لسانی چونچلوں سے کام لیتے ہوئے مخصوص محاوروں اور علامتی کلمات پر مبنی ایسی بولیاں اختراع کیں جو ان کے سوا کسی اور کے لیے ناقابلِ فہم ہوں۔ مثال کے طور پر اگلے وقتوں میں دہلی کے کچھ من چلوں نے لفظی الٹ پھیر سے کچھ بے تکی بولیاں اختراع کیں جنھیں زرگری، مقلوب، فرفری، کھپریل وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ معدودے چند افراد ہی انھیں بولتے اور سمجھتے۔ اگر چہ اب یہ اختراعی بولیاں ناپید ہو چکی ہیں مگر اس نوع کی کاوشیں آج بھی عوام کی طرف سے اکثر وبیش تر منظرِ عام پر آ جاتی ہیں۔ انگریزی زبان میں ایسی بولیوں کو 'Argot'،'Cant' اور 'Jargon' کہا جاتا ہے۔

زبان کی ارادی تشکیل میں علما وشعرا بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ خصوصاً شعرا کے لفظ وترکیب کے ردّ وقبول کرنے اور اختراعات سے وضع کردہ قوانین عام قبولیت حاصل کر لینے کے بعد زبان میں تغیر کا موجب بنتے ہیں جس سے نہ صرف زبان سنورتی ہے بلکہ عموماً اس کا دائرہ بھی پھیلتا ہے۔ مثال کے طور پر ابتداءً اردو زبان پر برج بھاشا کے اثرات سے شعرا کے ہاں بھاشا کے الفاظ کثرت سے مستعمل تھے مگر کچھ مدت بعد شاہ حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں اور بعد ازاں ناسخ نے بھاشا کے بہ جائے فارسی الفاظ کے استعمال کی روایت ڈالی۔ اس طرح متروکات کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن آج کئی متروکات کو واپس لایا جا رہا ہے۔ جہاں تک علما کا تعلق ہے تو اپنے لفظی سرمائے کی تنقیح کرنا، زبان میں در آنے والے الفاظ وتراکیب اور محاورات کی صحت پر گہری نظر رکھنا اور عوام میں اس کے قبول ورد کے ضمن میں اہم فیصلے کرنا ان کی اوّلین ذمے داریوں میں شامل ہوتا ہے۔ اکثر ممالک میں اس مقصد کے لیے علما کی انجمنیں تشکیل دی گئی ہیں۔ اس حوالے سے فرنچ اکیڈمی کا نام

مشہور ہے۔

علاوہ ازیں زبان کی ارادی تشکیل میں علما و فضلا کی اصطلاح سازی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ انسانی زندگی ہر لحظہ نت نئی ایجادات اور دریافتوں سے عبارت ہے جس سے جدید علوم اور تصورات جنم لیتے ہیں۔ زندگی کی ہمہ رنگی اور بدلتے رجحانات سے مطابقت جدید لفظیات اور مخصوص اصطلاحات وضع کرنے ہی سے ممکن ہو پاتی ہے۔ اصطلاح سازی سے زبان میں تغیر نا گزیر ہو جاتا ہے۔ مختلف علوم و فنون، صنعت اور سائنسی کرشموں کی اثر آفرینی نے تحریری لفظوں کی عمومی رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا اور متعدد سائنسی و تکنیکی کلمات کو جنم دیا جو اوّلاً مخصوص طبقوں ہی میں رائج رہے مگر بعد ازاں ان میں سے اکثر الفاظ عالم گیر سطح پر زبان زد ہوتے گئے۔

مختصر یہ کہ صوتی تغیرات، اخذ و اشتقاق اور دوسری زبانوں سے لسانی خوشہ چینی، لسانی سرمائے میں اضافے کا موجب ہوتے ہیں۔ قیاسِ تمثیلی سے حسبِ ضرورت نئے نئے کلمے بھی وضع کیے جاتے ہیں۔ فطری اور ارادی، عمومی اور خصوصی، کلماتی اور اسلوبی تشکیلوں کے ذریعے سے زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ ہر زبان کی موجودہ صورت متعدد تغیرات کا نتیجہ ہے۔ ان تغیرات ہی سے اس کے ارتقا کو تعبیر کیا جاتا ہے۔

زبان میں تغیر کے اسباب:

زبان متعدد بولیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ہر فرد کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے بہ ظاہر کسی بھی بولی کے انتخاب کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنے میلانِ طبع کے مطابق زبان کے استعمال میں آزاد ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود غیر محسوس انداز سے فرد کا یہ اختیار متعدد لسانی، علاقائی اور معاشرتی عوامل کے تابع ہوتا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) انفرادی تغیرات (Idiolectal Variations):

Language is a city to the building of which every human being brought a stone.[41]

ایک زبان بولنے والے تمام افراد نہ صرف ایک دوسرے سے گفت گو کر سکتے ہیں بلکہ بہ آسانی ایک دوسرے کو اپنی بات بھی سمجھا سکتے ہیں، مگر اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کی ایک زبان بولنے والے دو افراد زبان کو ایک ہی انداز سے برتتے ہوں گے کیوں کہ زبان میں اختلاف بولنے والے کی عمر، جنس، انتخابِ الفاظ، جذباتی کیفیات، ذہنی و جسمانی حالت اور قواعدِ زبان کی تفہیم کی بنا پر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر فرد کی زبان مختلف سماجی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی سرگرمیوں میں سے کسی ایک یا متعدد سے وابستہ ہونے کی بنا پر ہر فرد کی زبان دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔

فرد میں زبان برتنے کی امتیازی صلاحیت کو 'انفرادی بولی' (Idiolect) کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو گویا ایک زبان قریباً اپنے بولنے والوں کی تعداد کے مساوی افرادی بولیوں پر مشتمل ہوتی ہے[۴۲]۔ انفرادی بولی کے سبب فرد دیگر افراد کو محض بولی کی بنا پر پہچان لیتا ہے۔

(۲) علاقائی تغیرات (Regional Variations):

ایک بڑا لسانی علاقہ نا قابلِ تقسیم لسانی اکائی نہیں بلکہ متعدد بولیوں کا گہوارہ ہوتا ہے جہاں یہ بولیاں اپنی جداگانہ شناخت کے باوجود اُس مجموعی لسانی شناخت کا حصہ ہوتی ہیں جسے ایک مخصوص زبان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آبادی کی کثافت (Density) اور دیگر آبادیوں سے روابط ایسے عوامل ہیں جو زبان کو مقامی سطح پر متاثر کرنے اور متعدد مقامی بولیوں کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں۔

کسی بھی علاقے کی زبان بہ نسبت سرحدی علاقے کے وسطی علاقے میں زیادہ اتحاد و ثبت کے ساتھ مستعمل ہوتی ہے۔ سرحدی علاقے کی زبان دیگر

قریبی علاقائی تہذیب وزبان سے متاثر ہونے کے سبب یک ساں نہیں رہتی اور نسبتاً زیادہ متغیر اور مخلوط ہوتی ہے۔ گویا زبان اپنے مرکز سے دور کسی علاقے میں مستعمل ہو تو اپنے طور پر ارتقائی مراحل طے کرے گی۔ اس طرح مرکزی معیار سے رشتہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے زبان کا علاقائی روپ ابھر کر سامنے آتا ہے جسے 'علاقائی بولی' کہتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے تین اصطلاحات، Regio_Lect, Topo-Lect اور Dia-Lect مستعمل ہیں۔

کسی زبان کے علاقائی تغیرات کا جائزہ دراصل لسانیات کی اہم شاخ 'بولی شناسی' (Dialectology) کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ ایک بڑے لسانی علاقے میں ان تغیرات کو زبان کی جغرافیائی تقسیم سے جانچا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے بولی شناس (Dialectologists) ایک زبان کی متعدد بولیوں کے حامل علاقے کو لسانی نقشے پر مخصوص جغرافیائی حد بندی سے نمایاں کرتے ہیں۔ لسانیات کی اصطلاح میں ایسی جغرافیائی حد 'Isogloss' کہلاتی ہے۔ 'Isoglosses' کے تحت کی جانے والی تحقیق سے اگرچہ ہر بولی کے دائرہ کار کے تعین کے حوالے سے کافی معلومات مہیا ہو جاتی ہیں مگر ایک بولی اپنے مکمل ساختیاتی نظام کے تحت بنا کسی رد و بدل کے کتنے اور کیسے افراد کے ہاں مستعمل ہے؟ اس حوالے سے کوئی قطعی بات نہیں کی جا سکتی۔

بولی کا تفصیلی مطالعہ یہ حقیقت سامنے لاتا ہے کہ تمام لسانی گروہ قطعاً متجانس (Homogeneous) نہیں بلکہ متخالف (Heterogeneous) ہوتے ہیں [۴۳]۔ ایک مخصوص علاقے کی زبان میں وقوع پذیر تغیرات ہرگز خودکار اور غیر منظم نہیں ہوتے بلکہ وہ مختلف معاشرتی عوامل کے تابع ہوتے ہیں جن کی پیمائش کے لیے درج ذیل پیمانے وضع کیے گئے ہیں:

☆ **طبقاتی تغیرات** (Social Class Variations):

ایک انسانی معاشرہ درحقیقت متعدد گروہوں میں منقسم ہوتا ہے۔ مختلف سماجی طبقات کی بنا پر انسانی گروہ بندی زبان اور بالخصوص بولی کے مطالعے میں اہم ہے۔ ایک معاشرے میں مختلف سماجی طبقات سے وابستہ انسان مزدور، اساتذہ، معالج، سرکاری عہدے داران، مصنفین، ادبی شخصیات، صنعت کار، کاری گر، ماہرین، مجرم وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ یہ تمام سماجی طبقے زبان کا استعمال مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ بہ نسبت دوسرے طبقوں کے کسی ایک طبقے کے تمام افراد آپس میں زیادہ مربوط ہوتے ہیں جس سے ایک مخصوص لسانی دائرہ تشکیل پاتا ہے۔ ہر لسانی دائرے کی اپنی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں جس کی بنا پر اُس کی زبان دیگر لسانی دائروں کی زبان سے لطیف سطح پر منحرف ہوتی ہے۔ کوئی بھی زبان طبقاتی اختلافات سے خالی نہیں۔ معاشرہ مختلف طبقات سے وابستہ افراد کی پہچان ان کی سماجی ذمے داریوں اور حیثیتوں سے زیادہ ان کی مخصوص طبقاتی زبان یا بولی کی بنا پر کرتا ہے۔ بہ نسبت نچلے طبقوں کے سماجی اعتبار سے اہم طبقے کے افراد کے ہاں زبان زیادہ معیاری شکل میں مستعمل ہوتی ہے۔

ایک طبقے کی مخصوص بولی 'Socio-Lect' کہلاتی ہے۔ زبان میں انحراف کے طبقاتی عوامل پر تحقیق عموماً 'Socio-Dialectology' کا دائرہ کار ہے۔

☆ **قومی/نسلی تغیرات** (Racial Or Ethnic Variations):

عموماً ایک بڑے لسانی علاقے میں مختلف اقوام کے افراد جداگانہ ذیلی گروہوں کی صورت میں رہتے ہیں۔ ایسا کرنے پر وہ مجبور نہیں کیے

جاتے بلکہ ان کے پیشِ نظر نسلی تفاخر ہوتا ہے اور اپنی ہی قوم کے افراد کے ساتھ انھیں ایک طرح سے معاشرتی تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ افراد مخصوص نسلی خصوصیات کے حامل لہجے اور زبان کے استعمال سے اپنی جداگانہ نسلی حیثیت کا اظہار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستانی انگریزی۔ یہ پاکستان مین بھی بولی جاتی ہے اور بیرونی ممالک میں مقیم پاکستانی برادری میں بھی مستعمل ہے۔ نسلی سطح پر معاشرے کی یہ تقسیم بہ ہر حال زبان میں وقوع پذیر تبدیلیوں کو مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مختلف لسانی علاقوں میں سکونت پذیر ایک ہی نسل کے افراد کے ہاں زبان یک ساں طور پر مستعمل نہیں ہوتی اور نہ ہی ان پر اثر انداز ہونے والے عوامل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ نسلی اعتبار سے زبان میں پیدا انحراف کبھی بھی یک ساں نہیں رہتا۔

ایک قوم کی مخصوص بولی کو 'Ethno-Lect' کہتے ہیں۔

☆ عمر کی سطح پر تغیرات (Age Variations):

ایک مخصوص لسانی گروہ کی زبان پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں سے ایک 'عمر' ہے۔ بچہ بہ نسبت جوانوں اور بوڑھوں کے اپنے ہم عمروں کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتا ہے اور ایسے افراد کے ساتھ بھی جو عمر میں اُس سے معمولی فرق رکھتے ہوں۔ بچوں کے حلقے میں مستعمل زبان عمر کی دیگر سطحوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی زبان سے متفرق ہوتی ہے۔ بچوں کی زبان ان کے مشاغل سے وابستہ لفظیات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسی طرح جوانوں اور عمر رسیدہ افراد کی زبان اپنے مشاغل کی نوعیت کی بنا پر مخصوص اصطلاحات کی حامل ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے۔ گویا عمر کی نسبت سے متعدد مشاغل اور سرگرمیوں سے وابستہ الفاظ و اصطلاحات زبان میں تصریف و انحراف کے عمل کو مہمیز کرتے ہیں جس کی وجہ سے عمر کے ساتھ ساتھ زبان مسلسل تغیر سے دوچار رہتی ہے۔ زبان میں اس نوع کی تصریفات عموماً لغوی سطح پر تبدیلی کی بنا پر ہوتی ہیں۔

☆ جنس کی سطح پر تغیرات (Gender Variations):

زبان میں تغیر کے حوالے سے جنس ایک اہم عامل ہے۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ معاشرے میں افراد بہ نسبت مخالف جنس کے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ روابط کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں ۔ اس کا بنیادی سبب وہ سماجی و معاشرتی ذمے داریاں ہیں جو دونوں جنسوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو علاحدہ علاحدہ تفویض ہوتی ہیں اور جنھیں نبھانے میں افراد کا اپنے ہم جنسوں سے نسبتاً زیادہ رابطے میں رہنا ناگزیر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گھریلو معاملات میں عورتوں کا باہم ربط اور چار دیواری سے باہر معاملات نمٹانے میں مردوں کا باہمی تعاون۔ علاوہ ازیں جہاں عورتوں اور مردوں کی معاشرت نمایاں طور پر الگ الگ ہو وہاں زنانہ اور مردانہ لہجوں میں فرق اور بھی نمایاں ہوتا ہے۔ جیسا کہ لکھنؤ میں نوابانِ اودھ کے دور میں تھا۔ اس طرح سے معاشرہ جنس کی سطح پر دو بنیادی لسانی گروہوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دونوں جنسوں کے گروہ زبان کے استعمال میں بھی ایک دوسرے سے متفرق ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہر دو جنس کے کوئی بھی دو افراد ایک ہی طرح سے نہیں بولتے۔ لب و لہجہ، کلموں، محاوروں اور اسالیب میں فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مرد اور عورت کی زبان میں تفاوت کا سبب حیاتیاتی نہیں بلکہ سماجی ہوتا ہے۔ بہ نسبت مردوں کے عورتوں کی زبان کو زیادہ مہذب اور معیاری مانا جاتا ہے، مگر ایسا مستقل نہیں۔ دراصل مہذب اور غیر مہذب زبان کے استعمال کا انحصار عموماً سماجی حیثیت میں تضاد کی بنا پر ہوتا

ہے۔

☆ **مذہب کی بنا پر تغیرات** (Variations Due To Religion):

زبانیں مذہبی اثرات سے بھی تغیر کا شکار ہوتی ہیں۔اردو اور ہندی بالترتیب پاکستان اور بھارت کی قومی زبانیں ہیں۔بول چال اور سمجھنے کی حد تک دونوں زبانیں مماثل ہیں۔اردو اور ہندی بولنے والے افراد ایک دوسرے کو بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔دونوں کا تعلق چوں کہ ایسے دولسانی گروہوں سے ہے جو مذہبی اعتبار سے متضاد ہیں اسی وجہ سے دونوں کا رسم الخط اور ذخیرۂ الفاظ جدا جدا ہیں۔ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت ہونے کی وجہ سے ہندی میں سنسکرت الفاظ بہ کثرت ہیں اور یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔اس کے برعکس مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے لہذا اردو کا ایک بڑا حصہ عربی الفاظ پر مشتمل ہے اور یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

☆ **لہجے کی سطح پر تغیرات** (Accent Variations):

زبان میں ایک تبدیلی تلفظ کی سطح پر بھی ہوتی ہے۔ایک ہی زبان بولنے والے دولسانی گروہ مماثل قواعدی ولغوی خصوصیات کے تابع ہونے کے باوجود الفاظ کی ادائیگی میں متفرق طرز اپناتے ہیں۔تلفظ وادائیگی کی سطح پر زبان میں یہ انحراف لہجہ (Accent) کہلاتا ہے۔مخصوص علاقے کے افراد اپنے لہجے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں،مثلاً صوبہ پنجاب کے رہنے والے افراد اردو زبان مخصوص پنجابی لہجے میں بولتے ہیں۔گویا ایک فرد کا لہجہ مخصوص علاقائی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔

الغرض کوئی بھی زبان کسی بھی علاقے میں یک سانی سے مستعمل نہیں۔ہر زبان اپنی متعدد ذیلی بولیوں: علاقائی بولی،انفرادی بولی،طبقاتی بولی،نسلی بولی وغیرہ میں منقسم ہوتی ہے اور ان کے بولنے والوں کے ایک ہی معاشرے میں مل جل کر رہنے اور زندگی کرنے کی وجہ سے یہ بولیاں غیر محسوس انداز سے ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔متعدد عوامل کے زیرِ اثر زبان میں تغیر وتبدل اور ابداع واختراع کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔عموماً زبانوں میں تغیر پذیری اتنا ہی پُر اسرار عمل ہے جتنا کہ خود زبان کی پیدائش اور اس کا نقطۂ آغاز۔لیکن اگر زبان کو انسانی سرگرمیوں کے متوازی رکھ کر دیکھا جائے تو اس میں تغیر پذیری کے اسرار خود بہ خود منکشف ہونے لگتے ہیں۔دراصل زبان انسانی اعمال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔یہ اعمال چوں کہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں لہذا زبان بھی ہر لحظہ متغیر ہے۔یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ زبان اس لیے بدلتی ہے کہ ہر چیز تغیر پذیر ہے۔جیسا کہ ہریکلیٹس (Heraclitus) نے بہت عرصہ قبل کہا تھا:[44]

All is flux, nothing says still. Nothing endures but change.

زبان اور بولی

زبان ایک ایسا عالم گیر مظہر ہے جو ہر لحظہ ارتقا میں ہے۔یہی ارتقا اس کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔تاریخ بتاتی ہے کہ جن زبانوں میں کسی سبب ارتقائی عمل رک گیا وہ مر گئیں۔اسی سبب اگلے وقتوں کی کئی بڑی زبانوں کی حیثیت آج ماضی کے اوراقِ پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔ان میں آرامی اور اسوری زبانیں قابلِ ذکر ہیں۔گویا دنیا کی ہر زندہ زبان ارتقا پذیر ہے۔ہر ترقی یافتہ بڑی زبان اپنے ارتقائی مراحل میں مختلف لسانی ومعاشرتی عوامل کے تحت دیگر زبانوں سے نہ صرف متاثر ہوتی ہے بلکہ اُن پر اپنے اثرات بھی مرتب کرتی ہے:

دنیا کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان بھی اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ دوسری زبانوں کے اثرات یا الفاظ سے یک سر خالی ہے۔ [۴۵]

باہمی اختلاط سے زبانیں طبعی اور لسانی سطح پر تغیر کا شکار ہوتی ہیں۔ زبان میں تغیر پذیری ایک وسیع مظہر ہے۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے زبانیں نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں بلکہ ایک زبان خود میں بھی متعدد اختلافات رکھتی ہے [۴۶] ۔ یہ اختلافات اور تغیرات جغرافیائی، سیاسی، مادی اتفاقات، تعلیم، عادات، جنس، مذہب اور نسل کی بنا پر ہو سکتے ہیں۔ مختلف عوامل کے تحت زبان میں رونما ہونے والا ہر انحراف اس زبان کی ایک 'بولی' کہلاتا ہے۔ انگریزی زبان میں بولی کے لیے عموماً دو الفاظ 'Variety' اور 'Lect' مستعمل ہیں۔

'The Cambridge Encyclopedia Of Language' کے مطابق:

The term Variety itself often used for 'Any Variety' of a Language, but in recent years, many sociolinguists have begun to use 'Lect' as general term in this way.' [47]

گویا زبان میں کسی بھی نوع کی تبدیلی بولی کہلاتی ہے:

Lect is a term used by some sociolinguists to refer to a collection of Linguistic phenomena which has a functional identity within a Speech Community, but without specifying the basis on which the collection was made (e.g. whether the lect was regional (cf. Dialect), social (cf. Sociolect), etc.). [48]

بعد ازاں بولی پر مزید تحقیق کی غرض سے اسے متعدد پیمانوں مثلاً انفرادی، علاقائی، طبقاتی وغیرہ کی سطح پر جانچا جاتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ بلا شبہ ماہرینِ لسانیات کے ہاں بولی کے لیے انگریزی لفظ 'Lect' مستعمل ہے مگر عمومی حلقے میں اس مقصد کے لیے 'Lect' کے بہ جائے لفظ 'Dia-Lect' ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

A dialect is simply a distinct form of a language, differentiated from other forms of the language by specific linguistic feature (e.g., pronounciation, or vocabulary, or grammar, or any combination of these.). [49]

جدید لسانیاتی نقطۂ نظر سے بولی ایک نظریاتی تصور ہے اور اس اصطلاح کے وضع کیے جانے کا مقصد ماہرین کے لیے محض ایسا پیمانہ مہیا کرنا ہے جس کی مدد سے زبان میں رونما ہونے والے کسی بھی نوع کے انحراف کو جانچا جا سکے۔ جب کہ درحقیقت زبان فرد در فرد، گروہ در گروہ اور علاقہ در علاقہ مسلسل تغیر پذیر ایک ایسا عالم گیر مظہر ہے جسے مختلف بولیوں میں حتمی طور پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

بولی کی منطقی تعریف اور وضاحت اگرچہ ایک مشکل امر ہے، تاہم ایک لسانی گروہ کی زبان میں انحراف کے مطالعے کے لیے اصطلاح بولی کا استعمال ناگزیر ہے۔ [۵۰]

دنیا کی ہر زبان ایک مخلوط زبان ہے جو متعدد انفرادی، علاقائی اور معاشرتی بولیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کوئی بھی بڑی اور زندہ زبان ایسی نہیں کہ جس کی ایک سے زیادہ بولیاں نہ ہوں۔ زبان ایک ہی معیار اور ایک ہی شکل میں کسی پورے رقبے میں نہیں بولی جاتی۔ ایک بڑے علاقے کے لسانی گروہ میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ کچھ مثالی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھیں خصوصیات کے باعث زبان مختلف بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ درحقیقت زبان چاہے کتنے ہی مختصر علاقے میں

کیوں نہ بولی جاتی ہو، بولیوں کے اختلاف سے خالی نہیں۔

زبان اور بولی میں فرق:

عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ زبان اور بولی میں کیا فرق ہے؟ اس سوال کے درج ذیل جوابات ممکن ہیں:

(۱) سماجی اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نظامِ نطق جسے سیاسی سرپرستی میں بہ حیثیت قومی زبان تسلیم کرلیا جائے، زبان ہے اور جو یہ قبولیت حاصل نہ کرسکے وہ بولی ہے [۵۱]۔ مثال کے طور پر کئی ممالک کی قومیں زبانیں ابتداءً عام مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ کسی سبب ان کے دائرہ کار والے علاقے نے سیاسی اعتبار سے امتیازی حیثیت حاصل کرتے ہوئے پورے ملک کا نظام سنبھال لیا۔ اس سیاسی برتری کی بہ دولت اس مخصوص علاقے کی بولی کو 'قومی زبان' کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ گویا کسی بولی کو زبان کا درجہ دلانے میں اس علاقے کے سیاسی عناصر کی بالادستی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

A Language is a dialect with an army and a navy. [52]

(۲) اس کا ایک موزوں جواب یہ ہوسکتا ہے کہ ایسا نظامِ نطق جس میں ادب تخلیق کیا جاسکے وہ زبان ہے اور جس میں ادبی مواد تخلیق نہ کیا گیا ہو یا بہت کم تخلیق کیا گیا ہو وہ بولی ہے۔ [۵۳]

(۳) اس حوالے سے ایک خیال یہ ہے کہ ''بولی ایک جزو ہے اور زبان اس کا کل۔ جس طرح ایک وفاق کئی اکائیوں پر مشتمل ہوتا ہے، اسی طرح ایک زبان بولیوں کا وفاق ہوتی ہے۔ شاذ ایسی چھوٹی زبانیں ہوتی ہیں جو محض ایک بولی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ بہ ہر حال بولی کا تصور زبان کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہر بولی کسی نہ کسی زبان کے تابع ہوتی ہے۔'' [۵۴]

(۴) بولی کا اطلاق عام طور پر زبان کی ایسی عوامی یا عامیانہ طرز پر کیا جاتا ہے جو زبان کے معیار اور درستی کے متضاد ہو۔ لیکن لسانیاتی نقطہ نظر سے بولی، کسی بھی نوع کے امتیاز کے بغیر، محض زبان کی ایک متغیر شکل کو کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرینِ لسانیات زبان کی نام نہاد معیاری شکل کو فقط ایک بولی ہی سے تعبیر کرتے ہیں جو درحقیقت کسی بھی سطح پر اور کسی بھی طرح سے اُس زبان کی دیگر بولیوں سے ممتاز نہیں۔ [۵۵]

(۵) اس ضمن میں جدید نظریہ یہ ہے کہ درحقیقت زبان اور بولی میں کوئی بنیادی فرق نہیں [۵۶]۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہر فرد علاقائی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر کسی نہ کسی بولی یا زبان کا استعمال کرتا ہے۔ گویا امریکن انگلش (American English)، آسٹریلین انگلش (Australian English)، اور برٹش انگلش (British English) انگریزی زبان کی بولیاں ہیں جنھیں علاحدہ وخود مختار ممالک میں مستعمل ہونے کے سبب قومی بولیاں (National Dialects) کہا جاسکتا ہے [۵۷]۔ اسی طرح سے افراد مختلف علاقائی بولیاں یا زبانیں بھی بولتے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ زبان مختلف بولیوں کا مجموعہ ہے، لہٰذا انگریزی زبان کی کوئی ایک بولی بولنے والا فرد گویا انگریزی زبان ہی بولتا ہے اور انگریزی زبان کی کسی بھی ایک بولی کا استعمال کیے بنا فرد انگریزی زبان نہیں بول سکتا۔

اگر کسی زبان کے استعمال کا حلقہ نہایت محدود ہو تو اس کے بولنے والوں میں ایک دوسرے سے قرب کی بنا پر اس زبان کی بولیاں زیادہ نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس زبان کا علاقہ جس قدر بڑا اور دشوار گزار ہوگا، افراد میں کم آمیزی کے سبب اتنی ہی زیادہ اس میں بولیاں ہوں گی۔ دراصل زبان میں انحراف اور بولیوں کی آفرینش و ارتقا کا انحصار افراد کے جغرافیائی و معاشرتی قرب و بُعد پر ہوتا ہے۔ ایک ہی زبان بولنے والے دو گروہوں میں زیادہ سے زیادہ باہمی روابط کے سبب ان کی بولی تقریباً یک ساں ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک

گروہ کی بولی میں ظاہر ہونے والے تغیرات میل ملاقات سے دوسرے گروہ کی بولی کو بھی متاثر کرتے ہیں جس سے دونوں گروہوں میں باہمی تفہیم (Mutual Intelligibility) کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس متعدد طبعی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی حد بندیوں میں پنپنے والے لسانی گروہوں میں باقاعدہ رابطہ نہ ہونے کے باعث بولیوں کے مابین اختلافات مضبوط تر ہوجاتے ہیں۔ یہ اختلافات دو علاحدہ لسانی گروہوں سے متعلقہ افراد کے مابین باہمی تفہیم کا تناسب بہ تدریج کم کرنے، بولیوں کے باہم آمیز نہ ہونے کی وجہ سے مغائرت بڑھانے اور مزید نئی بولیوں کی آفرینش کا سبب بنتے ہیں۔ غیر متمدن قبائل میں چوں کہ نقل مکانی کم ہے اس لیے ان زبانوں میں بولیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

بولی نہ صرف دیگر بولیوں سے اختلاط کی بنا پر تغیر و تبدل کا شکار ہوتی ہے بلکہ مخصوص علاقائی اثرات بھی اس میں تبدیلی کا سبب بنتے ہیں۔ زبان میں کسی بھی نوع کی تبدیلی اگر قومی سطح پر پوری زبان کو متاثر کرنے میں کامیاب رہے تو نئی بولیوں کی آفرینش کا عمل رک جائے گا۔ اس کے برعکس اگر نئے تصورات کی درآمد کا سلسلہ پوری زبان کے بہ جائے کسی مخصوص علاقائی حدود میں مستعمل زبان کو متاثر کرے تو بولی جنم لے گی اور انحرافِ زبان سے متاثر علاقہ نئی بولی کا علاقہ تصور کیا جائے گا[58]۔ زبان اور بولی میں کسی بھی سبب طبعی اور لسانی سطح پر تبدیلیاں

اچانک نہیں بلکہ بہ تدریج رونما ہوتیں ہیں۔ انحراف کا یہ عمل عموماً ایک طویل عرصے کو محیط ہوتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دو لسانی گروہ آیا ایک ہی زبان کی دو مختلف بولیاں بولتے ہیں یا کہ علاحدہ علاحدہ لسانیاتی ساخت کی حامل دو مختلف زبانیں؟ مزید یہ کہ کسی مخصوص زبان کے مرکزی معیار سے کتنا ہٹنا بولیوں کا اختلاف قرار پاسکتا ہے اور کس نقطے سے آگے بڑھ جانے سے ایک نئی زبان کے حدود شروع ہو جاتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں عام طور پر یہ اصول وضع کیا گیا ہے کہ اگر دونوں لسانی گروہ ایک دوسرے کی بولی کو باہمی تفہیم کے تحت سمجھ سکیں تو وہ ایک ہی زبان کی دو بولیاں کہلائیں گی۔ اس کے برعکس اگر دونوں لسانی گروہ ایک دوسرے کی بولی کو نہ سمجھتے ہوئے مافی الضمیر تک رسائی میں مشکلات سے دوچار رہوں تو انھیں دو مختلف زبانوں کے حامل گروہ مانا جائے گا۔ باہمی تفہیم کا انحصار زبانوں میں موجود متعدد مماثلتوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ زبانوں میں متعدد مماثلتوں کے باوجود لسانی گروہوں میں باہمی تفہیم کی عمل داری درج ذیل وجوہ کی بنا پر ممکن نہیں ہوسکتی:

(۱) ایک صورت وہ ہے جب دو زبانوں میں الفاظ کی بڑی تعداد مشترک ہوتی ہے لیکن قواعد کی رو سے ان کی ساخت بالکل مختلف ہونے کی وجہ سے ہر شخص دونوں زبانوں کو ایک طرح سے نہیں سمجھ سکتا، مثلاً ہندی اور بنگالی میں سنسکرت الفاظ کی کثیر تعداد موجود ہے مگر قواعد اور صوتیات کا نظام ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہونے کی بنا پر انھیں ایک طرح سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسی طرح ہریانی اور پنجابی میں، اردو اور فارسی میں، انگریزی اور فرانسیسی میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں، مگر یہ الگ الگ زبانیں ہیں۔ ہر دو کو ایک ہی زبان کی دو بولیاں قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(۲) دوسری صورت وہ ہے جہاں قواعد میں قریباً یک سانی ہوتی ہے مگر الفاظ بالکل یا تقریباً مختلف ہوتے ہیں ۔ اس کی مثال ہندی اور پنجابی زبانیں ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو بھی باہمی تفہیم کے تحت نہیں سمجھا جاسکتا۔

(۳) عموماً ایک زبان کی دو بولیاں الفاظ و مشتقات کے حوالے سے یک ساں ہوتی ہیں لیکن ان کے تلفظ میں اس قدر فرق پایا جاتا ہے کہ سننے میں وہ دو علاحدہ زبانیں معلوم ہوتی ہیں۔ سریانی اور کلدانی، نشیبی علاقے کی اسکاچستانی (Scottish) اور انگریزی اس کی مثالیں ہیں۔

اس تناظر میں 'باہمی تفہیم' کی وضاحت بہ ذاتِ خود ایک پیچیدہ امر ہے۔ فہم کا انحصار ذہنی استداد پر ہے۔ انسانی ذہن ایک بہت ہی تغیر پذیر چیز ہے جس کی وجہ سے سمجھنا اور سمجھانا ایک اضافی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ وحشی اور دہقانی جسے دشوار سمجھیں گے، تعلیم یافتہ لوگ اسے معمولی بات جانیں گے۔[59]

باہمی تفہیم کے اصول کو بولی کی وضاحت میں اگرچہ بنیادی حیثیت دی جاتی ہے مگر بعض سیاسی، جغرافیائی اور تاریخی عوامل کی بنا پر زبان میں پیدا اختلافات کے ضمن میں یہ اصول زیادہ کارگر نہیں۔ مثال کے طور پر چین کے مختلف علاقوں میں مستعمل یک ساں تحریری نظام کی حامل زبانیں، مثلاً

'Mandarin' اور 'Cantonese'، محض ایک ملک کی حدود میں بولے جانے کے سبب ایک ہی زبان کی دو متفرق بولیاں کہلاتی ہیں۔ جب کہ ان کے بولنے والے ایک دوسرے کو ہرگز سمجھ نہیں پاتے۔ جب کہ دو علاحدہ جغرافیائی حدود کے حامل ممالک ، انڈونیشیااور ملائیشیا میں بولی جانے والی زبانیں ، بھا شا انڈو نیشیا (Bhasha Indonesia)اور بھاشا ملائیشیا (Bhasha Malaysia)، باہمی تفہیم کےاصول کے پیشِ نظر یقیناً دونوں ملکوں میں بہ آسانی سمجھی اور بولی جاسکتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک ہی زبان کی دو بولیاں نہیں۔

گویا زبان اور بولی کے فرق کو سمجھنے میں نہ تو باہمی تفہیم کا اصول کارآمد ہے اور نہ ہی علاقائی حد بندی اس حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ سناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کی اس ضمن میں کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں ماہرینِ لسانیات آج تک لیت ولعل کا شکار ہیں [۶۰] ۔البتہ لسانیاتی نقطہ نظر کی حامل ماہرین کی بڑی تعداد اس بات پر متفق ہے کہ زبان اور بولی میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔[۶۱]

گویا ایک ایسے نظامِ نطق کو بولی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو:

☆ زبان کی کوئی ابتدائی شکل ہو۔

☆ بولی عموماً بولی جاتی ہے یعنی بول چال تک محدود ہوتی ہے۔اس کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں ہوتا اور اگر کسی فرد کو اسے کبھی تحریر میں لانا پڑے تو اس علاقے کی بڑی زبان کے رسم الخط کا استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ بولی کسی زبان کی وہ ذیلی شاخ ہے جس کے بولنے والے کو کسی لسانی اختلاف کا احساس نہیں ہوتا۔[۶۲]

☆ بولی عام طور پر ایک بے ڈھب سی زبان ہوتی ہے جو نسبتاً ایک چھوٹے علاقے کے عوام میں رائج ہوتی ہے۔اس کی نہ تو کوئی تنظیم ہوتی ہے اور نہ ہی ضابطے اور اصول مقرر ہوتے ہیں۔اس لیے اس کی گرامر بھی مرتب نہیں ہو پاتی۔[۶۳]

انسان کی دیگر بنیادی ضرورتوں؛ لباس، کھانا اور دیگر رسومات میں معمولی اختلاف کی طرح بولیاں بھی زبان کے بے ضرر لطیف اختلافات کی پیداوار ہیں۔بولیاں دراصل زبان کے رنگا رنگ تنوع کا نمونہ ہیں اور یہ تنوع زندگی کی علامت ہے۔

بولی کی معیار بندی:

ایک بڑا لسانی علاقہ ایک ہی زبان کی متعدد و متفرق بولیوں کا حامل ہوتا ہے۔اس علاقے کی کوئی ایک نمایاں بولی 'معیاری بولی' (Standard Dialect) کہلاتی ہے۔معیاری بولی کسی بھی علاقے کی وہ بولی ہوتی ہے جسے عموماً سرکاری سر پرستی حاصل ہوتی ہے۔وہ اس علاقے کے اشرافیہ اور پڑھے لکھے طبقے کی بولی ہوتی ہے۔اس کا سیکھنا علاقے کے تمام مقامی وغیر مقامی افراد کے لیے ضروری ہوتا ہے۔معیاری تسلیم کیے جانے کی وجہ سے ادب اسی بولی میں تخلیق کیا جاتا ہے۔ماہرینِ لسانیات کے مطابق وہ بولی جسے مخصوص علاقے کے اشرافیہ، میڈیا کے اراکین اور تعلیم یافتہ طبقہ استعمال کرے، معیاری اور امتیازی ہے۔یہی زبان کا خمیر اور مرکزی نمائندہ ہوتی ہے۔

آٹو یسپرسن نے ماہرین کی اس رائے پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے:

> We set up as the best language that which is found in the best writers, and count as the best writers those that best write the language. We are therefore no furthur advanced than before. [64]

خاص وجوہ کی بنا پر جب ایک بولی سیاسی ومعاشرتی قبولیت حاصل کر لینے کے بعد زبان کے درجے پر فائز ہو جاتی ہے تو دیگر بولیاں معاشرے میں نظر

انداز کر دی جاتی ہیں، یہ رویہ قطعاً درست نہیں۔اسی طرح سے عموماً لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دیگر تمام بولیاں معیاری بولی سے ماخوذ ہوتی ہیں، یہ خیال بھی غلط ہے۔در اصل معیاری کہلائی جانے والی بولی اپنی ساخت اور ماہیت میں دیگر کسی بھی بولی سے کسی طرح بھی برتر نہیں۔

.....In linguistic terms no one dialect of a language is any more correct, any better, or any more logical than any other dialect of the language: all dialects are equally effective forms of language, in that any idea or desire that can be expressed in one dialect can be expressed just as easily in any other dialect. [65]

عموماً معاشرہ جس بولی کو قبولیت کا درجہ دے دے وہ معیاری زبان ہے اور باقی سب بولیاں۔البتہ اس بات کا تعین آسان نہیں کہ کون سی بولی کب، کیسے اور کیوں زبان کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے؟ معیاری اور غیر معیاری ہونے کے حوالے سے بولیوں میں اختلاف لسانیاتی نہیں بلکہ معاشرتی عوامل کے تحت ہوتا ہے، مثلاً وہ دارالسلطنت یا کسی مقدس مقام کی بولی ہو۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ایک زبان بولنے والے تمام افراد؛ خواہ وہ دیہاتی ہوں یا شہری، پڑھے لکھے ہوں یا اَن پڑھ اور خواہ اُن کا تعلق سماج کے کسی بھی طبقے سے ہو، معیاری و غیر معیاری کے جعلی و نام نہاد پیمانوں سے در کنار ایک ہی زبان کی مختلف بولیاں بولتے ہیں۔زبان کا مسئلہ بنیادی طور پر افادی مسئلہ ہے، جذبات بعد میں اِس سے وابستہ ہو جاتے ہیں لیکن جذبات کی وابستگی کے باوجود زبان کا ارتقا افادیت ہی کی بنیاد پر ہوتا رہتا ہے۔یہ ایک ایسا جاری و ساری عمل ہے جس میں شعور کی فطری قوتیں ہمہ وقت کارفرما رہتی ہیں۔جن کا احساس فوری طور پر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔زبان کے ارتقا کے حوالے سے تین امور پیشِ نظر رہنا چاہیں:

۱) زبان خود اختیار کردہ صوتی علامتوں کا ایک ایسا نظام ہے جس کی مدد سے سماجی گروہ کے افراد آپس میں تعاون کرنے اور مختلف اشیا کے بارے میں اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔

۲) زبان ضرورت کے ایک طویل عمل سے وجود میں آتی ہے اور تغیر پذیر حالات کے ماتحت بدلتی رہتی ہے۔تبدیلی کا یہ شعوری اور غیر شعوری عمل ہر لحظہ جاری رہتا ہے۔

۳) اسی سبب ایک زبان کی جو شکل کسی خاص زمانے میں ملتی ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتی کہ اُس خاص زمانے میں اُس زبان کا ارتقا کس طرح ہوا۔

اِن امور کی روشنی میں دیکھا جائے تو ''زبان سماجی حالات کے اندر ایک افادی ضرورت کے تحت اُبھرتی اور سماجی و طبیعی حالات کے ساتھ ساتھ تغیر و تبدل کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔اِس میں نسلی اور قومی اختلاط اور آب و ہوا کی تبدیلی کا غیر محسوس اثر بھی ہوتا ہے۔کیوں کہ زبان آوازوں کا مجموعہ ہے اور آوازوں میں تغیر و تبدل طبیعی ماحول اور انسان کے ذہنی ارتقا کے تحت ہوتا ہے۔اِس فطری عمل کے پیشِ نظر کسی بھی دور میں زبان کے کسی بھی رُوپ کو غلط، ناقص یا غیر معیاری قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' [۶۶]

زبان کو زیادہ سے زیادہ معیاری بنانے اور بولیوں کے استیصال کی ارادی کوشش کبھی بھی کام یابی سے ہم کنار نہیں ہوئی بلکہ منظّم اور معیاری زبان ہی سے متعدد نئی بولیاں جنم لیتی ہیں [۶۷]۔اِس حوالے سے شانتی رنجن بھٹاچاریہ لکھتے ہیں:

زبان کے تغیر کو غلطی نہیں سمجھنا چاہیے۔اس کی صحت کا اصل معیار رواج ہے جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔زبان بنی بنائی چیز نہیں بلکہ اس کے بننے کا عمل ہر لمحہ جاری رہتا ہے۔چاہے ہم اسے محسوس کریں یا نہ کریں۔ [۶۸]

ایک ملک میں اگر کئی معیاری زبانیں مستعمل ہوں تو ان میں سے ایک قومی زبان بن جاتی ہے اور اگر ایک سے زیادہ کئی قومی زبانیں ہوں تو ان میں سے

ایک زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے، مثلاً سوئٹزرلینڈ کی تین قومی زبانوں؛ جرمن، فرانسیسی اور اطالوی میں سے جرمن زبان زیادہ اہم ہے۔[69]

زبان پہلے یا بولی؟

ماہرینِ لسانیات میں ایک موضوع یہ بھی زیرِ بحث رہا ہے کہ زبانوں اور بولیوں کا تاریخی رشتہ کیا ہے؟ کیا ابتدا میں فقط ایک ہی زبان تھی جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ کئی مختلف بولیوں میں تقسیم ہوگئی؟ یا مختلف ابتدائی بولیاں مل جُل کر ایک زبان بنیں؟ یعنی بولیاں پہلے وجود پذیر ہوئیں یا زبان؟ اِس حوالے سے ارنسٹ رینان (Ernest Renan) اور میکس مُلر (Max Muller) کا خیال ہے کہ زبان کا فطری ارتقا انتشار سے اتحاد کی طرف ہے۔ میکس مُلر بولیوں کو زبان سے مقدم بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

یہ محض لغویوں کی اُپج ہے کہ وہ بولیوں کی کثرت کا تصور ہی نہیں کر سکتے کہ جب تک وہ اِن کا کوئی مشترک ماخذ قرار نہ دیں لیں۔[70]

اِن ماہرین کی دانست میں ابتداءً انسانی بولیاں متعدد ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ میل جول کے باعث اِن کے اختلافات کم ہوتے گئے اور بالآخر وہ ایک زبان کی شکل میں گُتھ گئیں۔ بالکل اس طرح جیسے کہ ابتدا میں قبیلے، ذات پات اور خاندان تھے جو بعد میں قوم کی شکل میں منظّم ہو گئے۔

امریکی ماہرِ لسانیات وھٹنے (Whitney) اِس نظریے سے اختلاف کرتے رقم طراز ہے:

One or two recent writers upon language have comitted the very serious error of inverting the mutual relations of dialectic variety and uniformity of speech, thus turning topsy-tury the whole history of linguistic development ..... these authors affirm that the natural tedency of language is from diversity to uniformity.[71]

وھٹنے کی رائے ہے کہ زبان پہلے آئی اور وہ پھر آہستہ آہستہ بولیوں میں تقسیم ہوگئی۔ جیسا کہ عہد نامہ عتیق سے بھی واضح ہے[72]۔ بعد ازاں ایک طویل عرصے تک کئی ارتقائی مراحل طے کرتے کرتے یہ بولیاں خود زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور اسی طرح اِن سے پھر بولیاں جنم لیتی ہیں۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ جس کے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ زبانوں کی تاریخ اِس کی سب سے بڑی شاہد ہے۔ اِس حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

لسانی تاریخ میں یہ واقع عام ہے کہ بولیاں ایک دوسرے سے جدا ہو کر مختلف زبانیں بن جاتی ہیں۔ اطالوی اور فرنچ نیز جرمن اور ڈچ کسی زمانے میں ایک ایک زبان کی دو دو بولیاں تھیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ کئی سو سال میں برطانیہ اور امریکہ کی انگریزی یا ہندوستان اور پاکستان کی اردو دو مختلف زبانیں بن جائیں۔ اِس کے برعکس شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان زوال پذیر ہو کر محض بولی رہ جاتی ہے۔[73]

اِس امر کے ثبوت میں ہند یورپی یا ہند آریائی زبانوں کی مثال سامنے ہے کہ کیسے زبانوں نے زبانوں کو جنم دیا۔ جدید لسانی محقق اب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جرمنی، لاطینی، یونانی، سنسکرت اور اوستا کی اصل ایک ہی ہے۔ زمانی بُعد کے باوجود آج بھی ان زبانوں میں لسانی اشتراک کی کچھ صورتیں نظر آ جاتی ہیں۔

ماہرین اِس لسانی اشتراک کی بنیاد اپنے اِس خیال پر رکھتے ہیں کہ ابتدا میں آریائی قوم ایک سماج کی صورت میں رہتی تھی۔ اور انھی کو موجودہ یورپ کا جد سمجھا جاتا ہے۔ ہزاروں سال قبل آرین جب دریائے ڈینوب (موجودہ جرمنی) کی وادی سے نکلے تو انھوں نے دو گروہ کی صورت میں مختلف ممالک کا رخ کیا۔ کچھ ہندوستان پہنچے اور کچھ یورپ۔ ایک طویل عرصے تک مختلف ممالک میں آباد ہونے کے باعث مخصوص جغرافیائی ماحول اور سماجی تغیرات کے نتیجے میں وہ خود اور اُن کی

زبان یک سر بدل گئی۔

نئی تحقیقات کی روشنی میں لسانی اشتراک کا درج بالا پس منظر باطل قرار دیا جا چکا ہے، کیوں کہ اب قطعی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد سے قبل دراوڑ قوم آباد تھی بلکہ دراوڑ سے بھی پہلے یہاں مُنڈا قبائل مقیم تھے اور اُس زمانے کے لحاظ سے اچھے خاصے متمدن تھے۔ آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں مُنڈا اور دراوڑی زبانوں کا چلن تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اب ماہرین کا ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے جن کی دانست میں اردو زبان نے دراوڑی سے جنم لیا ہے۔ اِن حالات میں لسانی اشتراک کا نظریہ زیادہ سے زیادہ جزوی طور پر صحیح ہو سکتا ہے۔

لسانی اشتراک کا یہ تصور دراصل اساطیر کے 'واحد اسطور' (Mono Myth) کے متوازی نظریہ ہے۔ یعنی دنیا میں ابتدا میں صرف ایک ہی اساطیر تھی اور باقی سب اسی سرچشمے سے پھُوٹی ہیں، لیکن بہ ہر حال علم الانسان سے اِس لسانی اشتراک کی کوئی توثیق نہیں ہوتی۔ [۷۴]

ڈاکٹر شوکت سبزواری زبان اور بولی کے باہمی تاریخی ربط کے حوالے سے درج بالا دونوں نظریوں کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دراصل یہ اصول ہی صحیح نہیں کہ زبان کی وحدت اس کی کثرت یا تنوع سے پہلے ہے۔ زبان سے پہلے بولیاں ہیں اور بولیوں سے پہلے زبانیں۔ روز و شب کی طرح یہ سلسلہ یونہی جاری ہے۔ قطعی اور آخری طور پر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ان میں سے کون مقدّم ہے اور کون مؤخر؟ [۷۵]

ابتدا میں زبان تھی یا بولی؟ مفروضات و قیاسیات پر مبنی یہ ایک ایسی بحث ہے جو کبھی بھی کسی منطقی نتیجے پر ختم نہیں کی جا سکتی۔ زبان اور بولی سے متعلق تمام تاریخی حقائق دراصل تاریخِ انسان سے جڑے ہیں۔ اِن حقائق کو اُسی صورت بے نقاب کیا جا سکتا ہے جب خطۂ زمین پر سب سے پہلے انسان سے متعلق معلومات حاصل کر لی جا سکیں، جب کہ کرۂ ارض پر نسلِ انسانی کی ابتدا سائنس دانوں اور دانش وروں کے لیے تا حال ایک معمہ ہے۔ درحقیقت ابتدائے آفرینش کے سارے مباحث لاعلمی کے ایسے مہیب اندھیروں میں دفن ہیں جہاں سے کسی بھی سچ کو کھوج لانا، ناممکنات میں سے ہے۔

باب اوّل۔ لسان اور لسانیات
فصل دُوُم

لسانیات

(مبادیات اور روایت)

قدیم زمانے میں 'لسانیات' کو گرامر (صرف ونحو) یا 'علم اللغۃ' (علم اللسان) کہا جاتا[۷۶]، اِس لیے اُسے کوئی علاحدہ نام نہیں دیا گیا تھا۔ اُس وقت یہ علم سادہ اور اپنی عمر کی ابتدائی منزلوں میں تھا۔ اِس کے مسائل قواعد اور لغت کے مسائل سے گڈ مڈ تھے۔ حدِّ فاصل نہ ہونے کی وجہ سے اِن کے درمیان امتیاز کرنا دشوار تھا۔ اِس کے تحت زیادہ تر الفاظ کی تحقیق، اس کے ماخذ اور اس کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ مزید برآں قدیم متون کی تشریح میں الفاظ کے اشتقاقی پہلوؤں سے بحث کی جاتی تھی۔ ۱۷۱۶ء میں ڈیویز نے علمِ زبان کے مطالعے کو (Glossology) کا نام دیا[۷۷]۔ بعدازاں لسانیات نے ایک قدم آگے بڑھایا اور قواعد کی حدود سے باہر آئی تو اس کا نام 'علم اللغۃ' کے بہ جائے 'فقہ اللغۃ' (زبان کا فلسفہ) قرار پایا[۷۸]۔ مگر جب ہند یورپی زبانوں کے تقابلی موازنے اور تجزیے کا آغاز ہوا تو اِس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا نام 'تقابلی قواعد' (Comparative Grammar) رکھا گیا۔ البتہ جیسے ہی یہ شعور بیدار ہوا کہ علمِ زبان محض قواعد (صرف ونحو) ہی نہیں بلکہ اس میں مختلف آوازوں (صوتیات) اور معنیات کا بھی احاطہ کیا جاتا ہے تو انیسویں صدی کی ابتدا میں اس کا نام (Comparative Philology) رکھا گیا۔ 'Philo' کے معنی ہیں محبت اور 'Logos' سے مراد 'لفظ'، 'علم' وغیرہ۔ اِس طرح 'Philology' کے معنی ہوئے 'زبان کی محبت'۔ یعنی اِس سے مراد وہ علم جس میں زبان کے حوالے سے کام کیا جائے۔ بعدازاں اِس نام پر اعتراض یہ اُٹھایا گیا کہ سائنس میں تقابل تو ہوتا ہی ہے، اِس لیے لفظ 'Comparative' کی کیا ضرورت ہے؟ لہٰذا علمِ زبان کو صرف 'Philology' کہا جانے لگا[۷۹]۔

'Philology' کی اصطلاح متنازعہ رہی۔ برطانیہ میں اِس سے تقابلی اور تاریخی لسانیات مراد لی جاتی رہی ہے۔ جرمنی اور فرانس میں اِس کا دائرہ کار مختلف رہا۔ جرمنی میں کتابی متن اور ادبی ورثے (خصوصاً یونانی اور رومن دنیا سے تعلق رکھنے والے) کے مطالعے کو اور ادبی دستاویزوں کے ذریعے سے تہذیب و تمدن کے جائزے کو بھی 'Philology' کہا گیا۔ گویا زبان کا مطالعہ مقصود بالذات نہ تھا۔ اِس مفہوم میں یہ اصطلاح زبان کی سائنس کو مطالعۂ ادب سے مربوط کرتی ہے۔ پرانے کتبوں اور قدیم دستاویزوں کی علامتوں کی خواندگی، اخذِ معنی اور کشفِ مفہوم کی کوشش اِسے لسانیات کے دائرے میں بھی لے آتی ہے[۸۰]۔ 'Philology' کی وضاحت میں خلیل صدیقی رقم طراز ہیں:

> لسانیات کا آغاز اُن تحریروں اور دستاویزوں کی مطالعے سے ہوا جو اپنی مذہبی اور جمالیاتی اقدار کی وجہ سے محفوظ رکھ لی گئی تھیں۔ ان دستاویزات کا متن لسانی اعتبار سے بہت قدیم تھا، اس لیے ان کی تفسیر ضروری سمجھی گئی۔ تفسیر کے ضمن میں زبانوں کی ساخت پر بھی تھوڑا بہت غور کیا گیا، اجزائے زبان کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ مفہوم کی تفہیم مقدم تھی، تاہم ضمنی طور پر اجزائے زبان (جہاں تک تکلمات کا تعلق ہے) اُبھرتے گئے اور آہستہ آہستہ کلمات کی حیثیتیں اور رشتے متعین کیے جانے لگے۔ اِس طرح گرامر وجود میں آنے لگی۔ اِن دستاویزات کے مطالعے سے قومی ثقافتوں کا جائزہ بھی ہوتا رہا، اور گرامر کے ساتھ ساتھ قومی ثقافتوں کے مطالعے کا رواج عام ہونے لگا۔

ثقافتی روایات کے مطالعے کو'فلولوجی' کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ جرمن فلولوجی، فرنچ فلولوجی جیسی ترکیبیں عام ہوگئیں۔ بنیادی طور پر فلولوجی کسی قوم کی ثقافتی روایات کے مطالعے کا نام تھا لیکن بہ تدریج اِس میں ادب اور زبان کا ضمنی مطالعہ بھی شامل ہو گیا۔[۸۱]

۱۸۴۱ء میں بریچرڈ نے علمِ زبان کو 'Glottology' کا نام دیا، لیکن یہ نام رائج نہ ہو سکا۔ 'Philology' اِس لیے قابلِ اعتراض تھا کہ اِس کے دائرہ کار میں ادبیات اور اسلوبیات وغیرہ آ جاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں فرانس میں اِس سے بہتر اصطلاح استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔ یوں علمِ زبان کا نام 'Linguistique' رائج ہو گیا۔ یہ لاطینی لفظ ہے جب کہ 'Philology' یونانی ہے۔

'Lingua' زبان کو کہتے ہیں اور 'Linguistique' زبان کے علم کو۔ انیسویں صدی کے دوران انگریزی میں علمِ زبان کے لیے 'Linguistic' کا لفظ استعمال ہونے لگا جو چند برس بعد 'Linguistics' کے نام سے مقبول ہوا، اور اب زبان کے کسی بھی نوع کے مطالعے کے لیے یہی لفظ رائج ہو چکا ہے۔ فارسی زبان میں اِس شعبۂ علم کو'زبان شناسی' کہتے ہیں۔ اردو زبان میں اس کے لیے'لسانیات' یا 'علمِ زبان' مستعمل ہے[۸۲]۔ علمِ زبان چوں کہ لمبا اور مرکب لفظ ہے اِس لیے'لسانیات' مختصر ہونے کی وجہ سے قابلِ ترجیح ہے۔ جب کہ ڈاکٹر سہیل بخاری اردو کے حوالے سے اِس علم کو'بولی گیان' کا نام دیتے ہیں۔[۸۳]

زبان کے مطالعے کی جدید روش اور نئے مناہج کو 'Philology' سے ممتاز کرنے کے لیے یہ اصطلاح وضع کی گئی تھی۔ گویا 'Linguistics' اور 'Philology' میں امتیاز روشِ مطالعہ، ترجیحی مدارج اور غرض و غایت ہی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

> Linguistics, the scientific study of language. The word was first used in the middle of the 19th century to emphasize the difference between a newer approach to the study of language that was then developing and the more traditional approach of 'Philology'. The differences were and are largely matters of attitude, emphasis, and purpose.[84]

جدید دور میں زبانوں کا مطالعہ سائنسی خطوط پر کیا جاتا ہے۔ اِس میں زبان کی ساخت کی توضیح شامل ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے زبان کے جدید سائنسی مطالعے کی ابتدا ہوئی، جسے 'ساختیاتی لسانیات' کا نام دیا گیا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ شروع شروع میں زبان کے مطالعے کے ضمن میں قیاسی رجحان غالب رہا اور تقابلی لسانیات کی بنیاد ناقص قسم کی تحقیقاتِ لفظی اور اشتقاقیات پر رہی، لیکن بہ تدریج اِس کی جگہ سائنسی رویّے نے لے لی۔

زبان کے مطالعے میں لسانیات نسبتاً نئی اصطلاح ہے جسے طبیعیات والٰہیات کی وضع پر'لسان' (زبان) سے اِس طرح ڈھالا گیا ہے کہ آخر میں نسبت کی 'ی' بڑھا کر عربی کی علامتِ جمع 'ت' اضافہ کر دی گئی ہے۔ 'لسانی' سے مراد ہے 'زبان سے منسوب'۔ لہٰذا 'لسانیات' کے معنی ہوئے زبان سے متعلق مسائل و مباحث۔[۸۵]

'لسانیات' اگرچہ نئی اصطلاح ہے، لیکن زبان سے متعلق مباحث نئے نہیں۔ یقیناً پیدائش کے بعد انسان شعور کی منزل پر قدم رکھتے ہی اپنے گرد و پیش میں موجود مظاہرِ قدرت کی نیرنگیوں پر حیران اور سراپا استفہام بنا ہوگا۔ اسی سلسلے میں اُس کے دل میں زبان سے متعلق بھی بے شمار سوالات پیدا ہوئے، جن کا جواب انسان اپنی بساط اور ذہنی سطح کے مطابق ہر دور میں دیتا رہا ہے۔ گویا تحقیق وجستجو کا یہ سلسلہ زمانۂ قدیم ہی سے کسی نہ کسی صورت چلتا چلا آ رہا ہے، لہٰذا زبان کا مطالعہ نئی بات نہیں[۸۶]۔ البتہ انیسویں صدی سے قبل اِسے باقاعدہ علم کی حیثیت حاصل نہیں تھی، لیکن پچھلی دو صدیوں میں اِس علم نے فی الواقع ایسی تنظیم اور اتنی ترقی حاصل کر لی ہے کہ ماہرینِ علمِ لسانیات کا یہ دعویٰ کہ 'اِس کی حیثیت طبیعیاتی علوم سے کم نہیں'، یک سر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا[۸۷]۔ دیگر علوم کی طرح 'لسانیات' بھی ایک علم ہے جو ابتدا سے اب تک ارتقا کی کئی منازل طے کر چکا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اِس امر کی وضاحت میں خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

جب لسانیات کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ وہ زبان کی سائنس ہے تو یہ تعریف دائرہ علوم و وقوف (Knowledge) اور دیگر سائنسی

> مطالعات کی طرح دوسرے علوم سے کچھ مخصوص رابطوں اور موضوع کی شعبہ جاتی تقسیم کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ لسانیات کو طبیعی، سمعیات، عضویات، نفسیات، بشریات سے بھی رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن دوسرے علوم کی طرح اِس کا ارتقائی سفر بھی جاری ہے۔ اِس کے نئے نئے اُفق اور نظریے اُبھرتے رہے ہیں۔ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ بنیادی اہمیت کے بعض نقطہ ہائے نظر تبدیل بھی ہو سکتے ہیں یا اِن کی ترجیحی حیثیت میں فرق پڑ سکتا ہے۔ اسی لیے اِس علم کا ایسا حتمی جائزہ، جو روّیے، کیفیت اور جامعیت کے لحاظ سے تمام مکاتیبِ فکر کے لیے قابلِ قبول ہو، ممکن نہیں۔[88]

لسانیات میں زبان کی تخلیق و تشکیل، اِس کے تدریجی ارتقا، اِس کی ساخت، الفاظ کی بناوٹ اور اِن کے ماخذ، اجزائے کلام اور اِن کی ابتدا، تغیرات اور اُن کے اسباب وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے۔ متعلقہ حقائق کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور انھیں دقیق مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ عمومی اصول و ضوابط اور کلّیے وضع کیے جاتے ہیں، باقاعدہ گروہ بندی اور ترتیب و تبویب کی جاتی ہے اور پھر نئے مشاہدوں کی روشنی میں اِن سب کی تصحیح بھی ہوتی رہتی ہے۔ بعض متعلقہ علوم، مثلاً نفسیات وغیرہ کے قواعد و کلّیات کی مدد سے زبان سے متعلق تمام حقائق کو سمجھنے اور سائنسی رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اِس لیے لسانیات کو زبان کا باقاعدہ علم قرار دیا جاتا ہے۔[89]

لسانیاتی تحلیل و تجزیے میں زبان کی ساخت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ساخت سے مراد وہ ڈھانچہ ہے جو اضداد کے ایسے منظم مجموعوں پر مشتمل ہو جنھیں زبان میں دریافت کیا جا سکے، خواہ اِن کا تعلق صوتی اکائیوں سے ہو یا گرامر کے تصرفات اور مشتقات سے، یا بعض حالتوں میں زبان کی مختلف صورتوں اور ہیئتوں کے معانی سے۔ معانی کی یہ شق لسانیات میں معنیات سے موسوم کی جاتی ہے۔[90]

ہر زبان کی موجودہ شکل بہ تدریج ارتقا اور مسلسل تغیرات کا نتیجہ ہے۔ اِس لیے زبان کے ساختیاتی ڈھانچے کو سمجھنے کے لیے اُس کی عہد بہ عہد متغیر صورتوں، حک و اصلاح اور تراش خراش کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں لسانیات کا بنیادی منصب زبان کے اِس عمیق لسانیاتی مطالعے اور جائزے سے ایسے عمومی و آفاقی کلّیات اور قواعد و ضوابط اخذ و مرتب کرنا ہے جن کا اطلاق کم و بیش تمام زبانوں پر ہو سکے اور جن سے زبانوں کے ماخذ اور اُن کے ارتقا کے مدارج و مناہج کی وضاحت ہو سکے۔[91]

لسانیات کا مواد اور موضوع، زبان کی کلّیت ہے جو انسانی گفت گو کی تمام امکانی صورتوں اور ناقابلِ احصا باہمی اختلافات کو محیط ہے، خواہ اِن صورتوں کا وجود کسی طرح اور کسی حیثیت سے بھی ہو یا رہ چکا ہو، خواہ تحریری، تکلّمی یا پھر علامتی دستاویز کی حیثیت سے۔ لسانیات کی جولاں گاہ کسی عہد یا کسی نسلِ انسانی تک محدود نہیں۔ غیر متمدن اور نیم وحشی اقوام کی بولیاں ہوں یا انسانی لبوں سے نکلی ہوئی ہر وہ آواز جو مافی الضمیر کی مظہر ہو، لسانیات کے دائرۂ کار میں یک ساں حیثیت سے زیرِ بحث لائی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر لسانیات ایک طرح کا منطقی علم الاحصا ہے۔ اِس کا تعلق لسانی علامات کی شناخت اور تمیز اور ان کے مناہج کی تحقیق سے ہے۔[92]

گویا 'لسانیات' سے مراد وہ علم ہے جو زبان کی اصلیت اور ماہیت کا مطالعہ کرتا ہے اور اِس کی پیدائش، فروغ، دائرہ کار اور تغیرات جیسے مسائل کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ لسانیات کے بنیادی منصب کی وضاحت میں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی لکھتے ہیں:

> زبان کے مختلف پہلوؤں کا فنی مطالعہ لسانیات کہلاتا ہے۔ زبان کا یہ فنی مطالعہ دوزمانی (Diachronic) بھی ہو سکتا ہے اور ایک زمانی (Synchronic) بھی۔ دوزمانی مطالعے کی حیثیت تاریخی ہوتی ہے جس میں کسی زبان کی عہد بہ عہد ترقی یا مختلف ادوار میں اِس کی نشو و نما کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور ایک زمانی مطالعے کی حیثیت توضیحی ہوتی ہے جس میں ایک خاص وقت یا خاص جگہ میں ایک زبان جس طرح بولی جاتی ہے، اِس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔[93]

لسانیات کا انسان، انسانی زندگی اور انسانی زبان و ادب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ نہ صرف قدیم کلاسیکی ادب بلکہ جدید ادب کی تفہیم و تشریح کو آسان بنانے، زبان کے قواعد کو سمجھنے، زبان میں موجود دوسری زبانوں کے الفاظ و تراکیب کی شناخت اور اس نوع کے متعدد معاملات سے نمٹنے کے لیے لسانیات کی مدد ناگزیر ہے۔ لسانیات زبان اور تاریخ کے اُن گوشوں کو بے نقاب کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے جو وقت کی دھند میں گم ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ مختلف زبانوں،

انسانوں اور انسانی معاشروں کے درمیان پائے جانے والے تعلق اور باہمی رشتوں کی بازیافت کا کارنامہ انجام دیتی ہے۔ لسانیات، سماجیات کو کئی پہلوؤں سے اجاگر کرتی ہے۔ لسانیات نے نہ صرف زبان کی ماہیت کے شعور کو عام کیا بلکہ فرضی قصے کہانیوں اور قیاسی نظریات سے نکال کر سائنس کی معروضی روشنی میں پیش کیا ہے اور اِس کی اصل تک رسائی کو ممکن بنایا ہے۔

'لسانیات' کو زبان کا سائنسی مطالعہ یا زبان کی سائنس کہا جاتا ہے۔ کسی علم کو باقاعدہ سائنس قرار دینے کے لیے اُس میں تین بنیادی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے، یعنی صراحت، معروضیت، تنظیم یا باقاعدگی۔ اِن کے بغیر سائنس کا تصور نہیں اُبھرتا۔ زبان کا سائنسی مطالعہ انھی تین اہم خصوصیات سے عبارت ہے۔ اِس لیے لسانیات کو بلاشبہ زبان کی سائنس قرار دیا جاسکتا ہے [۹۴]۔ ڈاکٹر نصیر احمد خان نے 'اردو لسانیات' میں زبان کے سائنسی مطالعے میں اِن تین کلیدی ضوابط کی جامع وضاحت کی ہے [۹۵]۔ ذیل میں اُن کا سرسری تعارف درج کیا جاتا ہے۔

صراحت (Explicitness):

زبان کے مطالعے میں صراحت کی ضرورت کو مختلف مسائل کے تعلق سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ لسانیات کا تعلق مواد کی اس نوعیت سے ہے جہاں وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اِس علم کا خاص مقصد اُن عمومی اور قیاسی اصولوں کی وضاحت ہے جو زبانوں کی ساختوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی ایک فرد کی زبان کو لے کر مطالعے کا آغاز کیا جاتا ہے، مگر اُس زبان کے بولنے والے دیگر افراد کے یہاں زبان کا کچھ فرق ملتا ہے تو پھر کام کو دوسرے بولنے والوں کی مدد سے آگے بڑھایا جائے گا۔ لسانیاتی تھیوری کا مفہوم اگر ایک زبان سے متعلق تمام باتوں کی وضاحت کرتا ہے تو اِس کے لیے ضروری ہے کہ خاص مزاجی تبدیلیوں اور عمومی سانچوں کے اصول وضع کیے جائیں۔ مطالعے کا طریقِ کار ایسا ہونا چاہیے جو مسائل کی وضاحت کر سکے، اور یہ اُسی صورت ممکن ہے جب تقابلی اندازِ فکر کو مطالعے کی بنیاد بنایا جائے گا۔ یہ واحد طریقِ کار ہے جو مسائل کو حل کر کے زبان کی ساخت کی مجموعی تصویر پیش کرتا ہے۔

معروضیت (Scientificness):

لسانی مطالعے میں معروضیت سے مراد ہے کہ لسانیاتی مفروضہ قائم کرنے کے لیے موجود شہادتوں کو اپنے کردار کے لحاظ سے بااعتبار، وضاحتی اور قطعی ہونا چاہیے۔ اِسی کو ایک معیاری و سائنسی اندازِ فکر کہا جاتا ہے۔ اگر مواد، طریقِ کار اور نتائج، تینوں عام سطح پر مشاہدے اور پرکھے جانے کے قابل نہ ہوں تو انھیں بہ جا طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ لسانیات کی رو سے جس مواد پر مفروضہ قائم کیا جاتا ہے اُسے زبان بولنے والوں کے صحیح استعمال پر مشتمل ہونا چاہیے۔ تجرباتی اندازِ فکر زبان کے لیے سانچے تجویز کرتی ہے جن کا صوتی، صرفی، نحوی، معنوی اور دوسری کسی بھی سطح سے تعلق ہوسکتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ کچھ سانچوں کی بنیاد پر مفروضہ قائم کر کے اور مزید مواد کی جمع آوری پر تجزیے کو پرکھتے رہنا چاہیے۔ تکلمی یا تحریری زبان سے اکٹھا کیا ہوا مواد، جو مفروضے کی بنیاد بھی ہوتا ہے، عام اصطلاح میں کارپس (Corpus) یعنی 'معیاری مواد' کہلاتا ہے۔

باقاعدگی (Systematicness):

زبان کے مطالعے کی ایک اہم خصوصیت باقاعدگی ہے جسے صراحت سے بالکل الگ نہیں کیا جاسکتا۔ زبان کی ساخت کے حوالے سے منتشر خیالات، زیرِ بحث موضوع پر ڈھیلی گرفت، قیاسی تفسیر، وقتی وضاحت، اصطلاحات اور طریقِ کار کا غیر موافق استعمال جیسی چیزیں سائنسی مطالعے کی ذیل میں نہیں

آتیں۔اصولی طور پر ایک ماہرِ لسانات اِن چیزوں سے خود کو بچاتے ہوئے ایک باقاعدہ اندازِ فکر کی مدد سے زبان کا مطالعہ کرتا ہے۔اِس مقصد کے لیے وہ مواد کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اپنے تجزیاتی مطالعے کے لیے ایک معیاری طریقِ کار کا انتخاب کرتا ہے۔مثال کے طور پر وہ پہلے زبان کے نظامِ تلفظ کا تجزیہ کرتا ہے۔پھر اپنے مطالعے کو آگے بڑھاتے ہوئے الفاظ کی ساخت کا جائزہ لیتا ہے۔اِس کے بعد الفاظ کی اُس ترتیب کا جائزہ لیتا ہے جو جملے بنانے میں معاون ہوتی ہے۔آخر میں مختلف معانی کا تجزیہ کیا جاتا ہے جو الفاظ اور الفاظ کے خوشوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

سائنسی مطالعے کے تین بنیادی کلّیوں کے سرسری تعارف کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سائنس میں قطعی اور صحیح اصولوں کی تلاش کی جاتی ہے، اِن اصولوں کو تجربات کے ذریعے سے دکھایا، سنایا اور محسوس کرایا جاتا ہے کہ یہ صحیح ہیں۔محض کسی عقیدے یا کسی جذبے کے تحت تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔سائنس کی اِسی قطعیت اور معروضیت کے پیشِ نظر سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کیا لسانیات میں سائنسی مطالعہ ممکن ہے؟ کیوں کہ لسانیاتی مطالعے کا سب سے اہم عنصر سماج میں رہتا ہوا انسان ہے۔انسانی ذہن سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ہر لحظہ متنوع جذبات اور متعدد نفسیاتی قدروں کے زیرِ اثر رہتا ہے۔'زبان' اِسی ذہن کی پیداوار ہے،تو بھلا زبان کا معروضی مطالعہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

جدید لسانیات میں حتی الامکان زبان کا شخصی اور معنوی عنصر نظر انداز کر کے اِس کی ہیئت ہی کا مطالعہ کیا جاتا ہے،یعنی اصوات،صرف اور نحو کو معنوی اور نفسیاتی قدروں سے الگ کر کے مطالعہ کیا جاتا ہے۔یہ طریقِ سائنسی ہے۔اِس کے برعکس روایتی طریقہ غیر معروضی اور انسانی تھا،سائنسی نہیں۔وہاں نفسیات اور قدروں کی اہمیت تھی۔اِس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ غلط تھا، بلکہ وہ انسانی علوم کا طریقہ تھا۔اِس سے یہ ثابت ہوا کہ لسانیات کی تمام شاخیں سائنسی طریق کے تحت نہیں آتیں،مثلاً معنیات وغیرہ۔قدیم قواعد میں غلط اور صحیح کا تصور تھا،جب کہ لسانیات میں کوئی بھی طریقِ اظہار غلط نہیں ہوتا۔اِس شعبۂ علم میں زبان کے غلط رُوپ کو زبان کی تبدیلی یا ارتقا مانا جاتا ہے۔[96]

لسانی مطالعے کی ابتدا (اجمالی جائزہ)

دینا کی قدیم ترین زبانیں بھی اظہار و ابلاغ کا پورا پورا حق ادا کرتی رہی تھیں اور کسی نہ کسی نظام کی حامل تھیں۔اگرچہ اُن کے لسانی نظام کے قواعد وضوابط منضبط ہو کر معرضِ تحریر میں نہیں آئے تھے لیکن بول چال کی سطح پر وہ زبانیں یقیناً کسی غیر شعوری اور ناپختہ قواعدی سانچے کی پابند رہی ہوں گی۔ظاہر ہے ابلاغ کی باقاعدہ ترسیل اور سماجی ہم آہنگی کے لیے لسانی مفاہمت،خواہ بول چال کی سطح پر ہی کیوں نہ ہو، ناگزیر تھی۔زبان کے اِس مقصد کے پیشِ نظر گویا زبان بولنے والے غیر شعوری طور پر زبان کی اندرونی ساخت سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتے ہوں گے۔ہر دور میں زبان سے متعلق کچھ اعتقادات، زبان کے قواعد اور ڈھیلی ڈھالی سی اصطلاحات کا رواج ضرور ہوگا۔اِن سب کو زبان کے علمی اور سائنسی شعور سے تو تعبیر نہیں کیا جا سکتا،البتہ انھیں 'لوک لسانیات' کہا جا سکتا ہے[97]۔جس نے 'علم الاقوام' اور 'تہذیبیات' جیسے علوم کے لیے تھوڑی بہت بنیادیں فراہم کیں۔فنِ تحریر کی ایجاد غیر شعوری صوتی تجزیہ و تقطیع کی غماز ہے۔لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ زبان کے مطالعے میں جدید لسانی و سائنسی روش سے کہیں پہلے زبانوں کی اندرونی ساخت،تالیف و ترتیب کے قاعدوں یا گرامر و صوتیات کے مبہم تصور کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

خلیل صدیقی کے مطابق ''ابتدائی لسانی دل چسپی یا لسانی مطالعے کی قدیم روایتوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک کی نوعیت مذہبی کہلا سکتی ہے اور دوسرے کی فلسفیانہ،پہلی کا تعلق قدیم ہند، مشرقِ وسطیٰ اور اٹھارھویں صدی تک کے یورپ سے ہے اور دوسرے کا یونان اور مصر سے۔''[98]

لسانی مطالعے کی مشرقی روایت:

ہندوستان میں علمِ لسانیات کی روایت قبلِ مسیح سے ملتی ہے۔قدیم ہند کی لسانیاتی سرگرمیوں کی یہ مسلسل روایت اگرچہ دریافت نہیں کی جا سکی تاہم

اِس میں بعض سنگِ میل ایسے آتے ہیں جن کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے۔ ویدک توضیح وتشریح کے سلسلے میں جو مواد منظرِ عام پر آ سکا اس کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لسانی مطالعے کے ابتدائی مرحلے میں تدوینِ لغت اور ترتیبِ فرہنگ کی طرف پہلے توجہ دی گئی۔ مشہور ترین اور مستند ویدک لغت 'نیرکتا' (Nirukta) ہے جسے 'یاسک' (Yasaka) کا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک قدیم لغت 'نگھنٹو' (Nighantu) کی شرح اور اِس پر اضافہ ہے۔ اس طرح کی لغات کی تدوین کا مقصد یہ تھا کہ وید کے مطالعے اور تفہیم میں سہولت ہو۔ یاسک نے اس لغت میں ویدک ادب سے قبل کی ایسے تحریری مواد سے اقتباسات اور حوالے بھی درج کیے ہیں جو قبل ویدک دور کی زبان کے نمائندہ ہیں۔

ویدک دور کے قواعد دانوں میں پانِنی ممتاز ترین قواعد نویس ہے۔ اِس کے بعد 'کاتیاین' (وارتک) کا رتبہ ہے اور پھر 'پتن جلی' (مہابھاشا) کا۔ پانِنی کی تالیف 'پانینم' کے بیش تر حصّوں کو براہِ راست شیو دیوتا کے فیضان اور القا کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ کتاب قریباً چار ہزار (۴۰۰۰) سوتروں پر مشتمل ہے جنھیں آٹھ (اشٹ) ابواب (ادھیایی) میں ترتیب دیا گیا ہے اسی لیے اسے 'اشٹ ادھیایی' بھی کہا جاتا ہے۔ پانِنی کے مستنبط قواعد بہت پیچیدہ ہیں۔ مخصوص مطالعے اور تربیت کے بغیر انھیں سمجھنا ممکن نہیں۔ پانِنی کو ہندو قواعد دانوں میں سب سے نمایاں حیثیت حاصل ہے اور 'پانینم' کو ویدک سنسکرت کی سب سے مستند قواعد کا درجہ دیا جاتا ہے۔[99]

رِگ وید کے منتروں کی تخلیق کے مختلف ادوار، تدوین، ضبطِ تحریر میں آنے، تحریر کی تبدیلیوں اور قواعد دانوں کے ادوار کا بھی صحیح تعین نہیں ہو سکا ہے۔ اِس لیے تیقن سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تمام قواعد وضوابط بھی عرصے تک مختلف مُنیوں کے ذریعے سینہ بہ سینہ ہی منتقل ہوتے رہے یا قواعد دانوں نے انھیں تحریری ورثے کی صورت میں چھوڑا تھا؟ علاوہ ازیں اِس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ پانِنی نے جس زبان کے قواعد مرتب کیے وہ بول چال کی زبان تھی یا محض کتابی اور محدود علمی حلقوں کی؟ بالخصوص دوسرے سوال کے جواب میں ماہرین آج بھی ایک دوسرے سے متفق نہیں۔

ویدک سنسکرت کے قواعد کی تدوین کے محرکات مذہبی تھے۔ برہمنوں کے لیے سنسکرت قواعد کی تعلیم لازم تھی۔ پتن جلی 'ویاکرن' (قواعد) کی تعلیم کو مذہبی فریضہ قرار دیتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اِس کے عہد سے پہلے برہمن بچوں کو قواعد کی تعلیم پہلے دی جاتی تھی اور پھر وید پڑھائے جاتے تھے۔ ویدوں کی زبان کو 'دیوبانی' قرار دیا جاتا تھا اِس لیے اِن کے متن کی غلط خواندگی گناہ تصور کی جاتی تھی۔ اسی سبب سمہتوں، منتروں اور اشلوکوں کے تقدس کے پیشِ نظر قواعد اور صوتیات کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی رہی۔ ''چناں چہ اِس سطح پر لسانی مطالعے کا سلسلہ بہت بعد کے دور تک بھی جاری رہا۔ یہاں تک کہ مختلف قسم کے مادّوں اور مشتقات یا سابقوں اور لاحقوں سے متعلق مباحث پر شہادت بعد کے ادوار سے ملتی ہے، جس سے یہ اندازہ لگا جا سکتا ہے کہ پانِنی سے براہِ راست یا بالواسطہ تحریک پانے والی ایک ہزار سے زیادہ قواعد کی کتابیں اور رسائل لکھے گئے ہیں۔[100] پانِنی کی 'اشٹ ادھیایی'، کاتیاین کی 'وارتک' اور پتن جلی کی 'مہابھاشیہ' بنیادی طور پر قواعد کی کتابیں ہیں لیکن ان میں صوتیاتی مباحث بھی کثرت سے ہیں۔''

مذکورہ تینوں قواعد نویسوں کو 'Three Stages of the Science of Grammar' کہا گیا ہے[101]۔ تلفظ کی صحت کے لیے بھی بہت

سے رسائل تالیف کیے گئے جنھیں موضوع کے اعتبار سے 'پراتشاکھیہ' اور 'شکشا' کے عنوانات سے دو زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 'پراتشاکھیہ' میں چاروں ویدوں کے تلفظ پر مباحث جمع ہیں اور 'شکشا' میں مذکورہ مباحث پر توضیحات، شرحیں اور مزید اضافے ہیں۔[102] اِن سب کے مجموعی وغائر مطالعے سے سنسکرت صوتیات کا ایسا نقشہ تیار ہو جاتا ہے جس سے سنسکرت 'فونیمیات' کو سمجھنے میں اچھی مدد مل سکتی ہے۔

پانِنی کی قواعد، اِس کی شرحیں اور بعد کی قواعدی کتب اپنی تمام تر ژولیدگی کے باوجود توضیحی وتشریحی قواعد کے لیے ایسی مثال قائم کرتی ہیں جس نے صدیوں بعد اہلِ مغرب کے لیے تقابلی قواعد اور تقابلی لسانیات کی عمدہ اور مستحکم اساس فراہم کی۔ 'پراتشاکھیوں' اور 'شکشاؤں' کے مؤلفین نے گویائی کے بنیادی طریق و مناہج، ادائے آواز کے مخارج اور کیفیتِ ادا کی وضاحت اور درجہ بندی کر کے اُس صوتیاتی تجزیے کی مثالیں قائم کر دیں جو جدید صوتیات کی ہم پلّہ نظر آتی ہیں۔ ''اِس سلسلے کے ایک طویل عرصے بعد قریباً بارھویں صدی عیسویں میں گجرات کے جین فاضل 'ہیم چندر' (Hema Chandra) کی تالیف 'شبدانوشاسن' (Sabdanusasana) قابلِ ذکر حیثیت رکھتی ہے۔ اِس کتاب کا وقیع حصّہ وہ ہے جو پراکرت قواعد سے تعلق رکھتا ہے۔''[103]

ہندوستان میں مسلمانوں کے طویل دورِ حکومت میں لسانیاتی اعتبار سے قواعد ولغات سے قطع نظر کوئی قابلِ ذکر کارنامہ نظر نہیں آتا۔ البتہ مسلم دورِ حکومت کے آخر میں سراج الدین علی خان آرزو نے اپنی تصانیف وتالیفات میں کچھ لسانی مباحث اُٹھائے ہیں۔ خانِ آرزو کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طور پر ہند آریائی اور ایرانی زبانوں کے باہمی رشتے کا سراغ لگایا۔ اِس حوالے سے انھیں اپنی تقدیم کا احساس بھی تھا۔ سنسکرت اور فارسی کی مشابہتوں کی کھوج میں ان کی علمیت پر عوام نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا گیا۔[۱۰۴]

عربی لسانیات کی جو روایت ملتی ہے اس کے محرکات بھی مذہبی تھے۔ عربی کے پہلے قواعد داں 'ابوالاسود ظالم بن عمر الدؤلی' (۶۰۳ء۔۶۸۹ء) کا تعلق کوفہ سے تھا لیکن اِن کی نشو ونما بصرہ میں ہوئی تھی۔ روایت ہے کی انھوں نے قواعد کے مبادیات حضرت علی ابنِ ابی طالب سے سیکھے تھے اور اِس علم کے حصول کا مقصد مذہبی نوعیت کا تھا۔ ابوالاسود کے بارے میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ بعد میں آنے والے تمام نحویوں نے ابوالاسود کی اوّلیت کو تسلیم کیا ہے اور اس کے شاگردوں میں کئی نام ور نحوی شامل ہیں[۱۰۵]۔ اِن روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی ادوار ہی میں قواعد ہیئت اور ساخت یا نحو اور صرف میں دل چسپی شروع ہو چکی تھی۔ ابن الندیم اور سیوطی کی کتابوں میں ابتدائی قواعد نویسوں کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے صَرف، نحو، لغات، معانی، اشتقاق اور لحن واصوات سے بحث کی ہے۔ اِس قسم کی دل چسپی کا آغاز عراق سے ہوا اور رفتہ رفتہ عربی قواعد کے دو دبستان بصرہ اور کوفہ میں اُبھرے۔ بعد میں ان کا ادغام دبستانِ بغداد میں ہو گیا۔ ابو الاسود کے شاگردوں میں 'ابوعبدالرحمٰن الخلیل بن احمد' (۷۱۸ء۔۷۸۶ء) عربی کا پہلا مستند قواعد داں اور عالمِ لسانیات ہے[۱۰۶]۔ اِس کی تالیف 'کتاب العین' عربی نحو، صرف اور تلفظِ حروف کی سند ہے۔ اِس کی کتاب 'العروض' عربی قواعد کی اہم کتاب ہے۔

ابوعبدالرحمٰن الخلیل بن احمد کے قابل شاگرد اور عربی نحو اور صوتیات کے اہم ترین عالم 'سیبویہ' (۷۶۰ء۔۷۹۶ء) نے پہلی بار عربی آوازوں کی درجہ بندی کی۔ سیبویہ کی لسانی خدمات علم النحو سے کہیں زیادہ صوتیات کے شعبے میں ہیں۔ اس کی تصنیف 'الکتاب' کے باب 'الادغام' میں عربی زبان کا جو صوتی تجزیہ ملتا ہے اس سے زیادہ مکمل و مستند تجزیہ کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔ سیبویہ نے عربی کی تکلمی آوازوں کا تجزیہ کر کے ان کے مخارج اور کیفیتِ ادا کی بنیادوں پر جو تقسیم اور درجہ بندی کی ہے، جدید مغربی ماہرینِ صوتیات اس سے کم وبیش متفق ہیں[۱۰۷]۔ ان باکمال اساتذہ کے گروہ کو دبستانِ بصرہ کے نحویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دوسرا مشہور دبستان کوفہ کے نحویوں کا تھا۔ اس دبستان کے بانی ابوجعفر محمد بن ابی سارہ رواسی کوفی تھے۔[۱۰۸]

فارسی لسانیات کے ابتدائی نقوش عربی اثرات سے خالی نہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ فارسی قواعد نویسی مکمل طور پر عربی قواعد نویسی کا چربہ ہے۔ ابتدا میں فارسی قواعد دانوں نے عربی قواعد مرتب کیں۔ ''اس کے بعد جب خود فارسی میں صرف ونحو کی تدوین شروع ہوئی تو قدرتی طور پر اصول قواعد میں اُن تصورات اور مباحث کا بڑا اثر پڑا جو عربی زبان کے سلسلے میں مرتب ومدون ہوئے تھے۔ عربی اور فارسی اصلاً اور نسلاً ایک دوسرے سے بڑی مختلف زبانیں تھیں، لیکن عہد اسلام سے فارسی کا تصور بغیر عربی کے اثر اور آمیزش کے ممکن نہیں۔ چناں چہ فارسی صرف ونحو بہت بڑی حد تک عربی صرف ونحو کی تقلید ہے۔ یہ تقلید صرف قواعد کی چند اصطلاحات کے استعمال تک محدود نہیں، بلکہ فارسی زبان کے تقریباً تمام تر اصول وضوابط انھیں سانچوں میں بیان کیے گئے ہیں، جو اصلاً صرف عربی کے لیے وضع کیے گئے تھے۔[۱۰۹]

لسانی مطالعے کی مغربی روایت:

تاریخی اعتبار سے سب سے پہلے یونان میں 'افلاطون' (Plato) کے یہاں لسانیات کے موضوع پر کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اِس کی معرکۃ الآرا تصنیف 'Cratylus' میں کافی تفصیل سے زبان کی ابتدا، معنی کی خصلت اور الفاظ کے مآخذ پر اِس کے خیالات قلم بند ہیں۔ اِس نے الفاظ کے بارے میں بنیادی خیال یہ پیش کیا کہ وہ جو معنی ظاہر کرتے ہیں کیا ان کا چیزوں کی خصلت سے بھی کوئی تعلق ہے یا محض لفظ اور معنی کے درمیان اختیاری تعلق قائم کیا گیا ہے۔ وہ یہ قیاس بھی کرتا

ہے کہ کیا زبان کی ساخت میں باضابطگی کے عمومی اصول وضع کیے جاسکتے ہیں یا وہ بے قاعدگی کی طرف ہی مائل رہتی ہے؟[110]

'ارسطو' (Aristotle) نے پہلی بار الفاظ کی صرفی تقسیم کی اور لفظ کی 'حالت' کا تصور پیش کیا۔ اُس نے کلموں کو زمروں میں تقسیم کیا۔ اِس کا خیال ہے کہ زبان لفظ بہ لفظ بولی جاتی ہے۔ کلمے کسی اصول کے تحت منتخب ہوتے اور ترتیب پاتے ہیں۔ اسی لیے اِس نے زبان کو اجزائے کلام میں تقسیم کیا، جس کی تقلید کم و بیش آج بھی کی جاتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ قبل مسیح) نے پہلی بار لسانی ساخت کے باقاعدہ تجزیے کی کوشش کی اور اس کے نزدیک قواعد منطق کا ایک حصّہ ہی ہے۔ اِس نے جملے کا جو نظریہ پیش کیا اِس کے اجزا کی شناخت اور قواعدی زمروں کی جو اساس قائم کی، ان سے قواعد کی ایک مخصوص روایت کا آغاز ہوا۔ لسانی تجزیے کا مخصوص طریقِ کار اور جو لسانی اصطلاحات ارسطو اور اِس کے مقلدین نے وضع کیں، انھیں آج بھی سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے[111]۔ یونان کے رواقیین (Stoics) نے ارسطو کی فقط تقلید ہی نہیں کی بلکہ کچھ اضافے بھی کیے۔

اسکندریہ کے علما نے قواعد کو زبان کی کسوٹی قرار دیا۔ اِن کے نزدیک قواعد نویس کا کام یہ توثیق کرنا نہیں کہ زبان کیا ہے؟ بلکہ یہ ہدایت دینا ہے کہ زبان کو کیا ہونا چاہیے۔ انھوں نے گرامر کی کسوٹی پر ہومر اور دیگر یونانی شعرا کے کلام کو پرکھا۔ یونانی لسانیات کا یہ اسکندریائی دور، جو تقریباً چوتھی صدی قبل مسیح سے شروع ہوا تھا، ہدایتی قواعد، معنیاتی تشریح اور یونانی حروف کے تلفظ کے دھندلے سے تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔ قواعد میں صَرف یا تشکیلیات کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ بلاشبہ قدیم یونانیوں ہی نے دنیائے مغرب میں قواعد اور لسانیات کی ابتدائی روایتوں کی داغ بیل ڈالی[112]۔ یونانیوں نے اپنی زبان کی ماہیت کی طرف تھوڑی بہت توجہ ضرور کی لیکن قدیم سنسکرت قواعد نویسوں کی طرح وہ قواعد اور صوتیات کے شعبوں میں تحقیق کا حق ادا نہ کرسکے۔

مذکورہ یونانی مفکرین کے خیالات کو رومیوں نے معمولی تبدیلی کا ساتھ قبول کیا۔ یونانی اور لاطینی کی لسانی ہم آہنگی اور مماثلت نے استفادے کی سہولتیں پیدا کردی تھیں۔ انھوں نے بیسویں صدی کی مؤلفہ قواعد کی کتابوں کے ذریعے سے پورے یورپ میں اپنی زبان 'لاطینی' کو متعارف کرایا۔ لسانیات کے اِس ابتدائی عہد کے بہت سے مباحث کو جدید لسانیات کی تھیوری میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سولھویں صدی کو لاطینی زبان کی ترقی کی معراج کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ چرچ کی مدد سے ایک طرف لاطینی کو فروغ ملا تو دوسری طرف قواعد سے متعلق مختلف مباحث اُبھرے[113]۔ رومن ایمپائر میں عیسائیت کے فروغ کی بہ دولت بائبل کا لاطینی ترجمہ عام ہوا۔ چوتھی صدی عیسوی میں گاتھک زبان میں پھر چھٹی اور نویں صدی عیسوی میں آرمینی اور سلاوی زبانوں میں بائبل کے ترجمے کیے گئے، لیکن اِن زبانوں کے روابط کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔[114]

نشاۃ الثانیہ کے دوران قدیم یونانی اور عبرانی کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ عہد نامہ عتیق کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لیے عبرانی سیکھنا ضروری تھا۔ اِس وجہ سے زبانوں کے کلماتی تقابل کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ بائبل کے مختلف زبانوں میں تراجم اور لاطینی کا کثیر اللسانی لغت، اِس قسم کے تقابل کی مثالیں ہیں۔ اُس دور میں قیاسی اشتقاقیات کی راہیں ہم وار ہوئیں۔ عبرانی اور یورپی زبانوں کے کلموں کو عبرانی الاصل ثابت کرنے کا سلسلہ چلا۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں 'گوٹ فریڈ ویلہم لائبنیز' (Gottfried Wilhelm Leibniz) نے پہلی بار عبرانی کے ام اللسنہ ہونے کے تصور کی تردید کی، لیکن اِس کی تردید کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا اور کسی کو زبانوں کے قدیم متون اور ان کی عصری صورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تاریخی و تقابلی مطالعے کا خیال نہ آیا۔ دراصل لائبنیز (۱۶۴۶ء۔۱۷۱۶ء) نے خود بھی اس طرح کے مطالعے کے بغیر یورپ، ایشیا بلکہ افریقہ اور امریکہ کی زبانوں کو ایک قدیم ترین ماخذ کی شاخیں بتا کر ہم نسب قرار دیا تھا[115]۔ جرمن مفکر لائبنیز کے اِس نظریے کی پیچیدگی اٹھارھویں صدی کی رومانوی تحریک کے زمانے میں واضح طور پر سامنے آئی، جس نے قدیم ترین تہذیبوں اور مقامی زبانوں کی طرف توجہ دینے پر مجبور کردیا اور کسی بھی صورت کی دیسی زبانوں کا تصور پیش کیا۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلا کہ فلسفیانہ نقطہ نظر تو پسِ پُشت چلا گیا اور ذیلی زبانوں کا ارتقا، ہجوں کے نظام میں تبدیلی، مختصر نویسی اور عالمی رسم الخط کے تصور کو فروغ ملا۔ سترھویں صدی کو اِن موضوعات کا عہد کہا جاسکتا ہے، جس میں ہم عصر لسانیات سے توجہ ہٹ کر موضوعات پر بحث و مباحث شروع ہوئے اور خاص توجہ اِس طرف دی جانے لگی کہ ایک عالمی قواعد تیار کرنا ممکن ہے یا نہیں؟[116]

اٹھارھویں صدی عیسوی کے جن مفکرین نے انسانی زبان کے آغاز سے متعلق غور خوص کیا، ان میں فرانسیسی مفکر 'ژاں ژاک روسو'

(Jean Jacques Rousseau) سرِفہرست ہے۔ اِس کے خیال میں زبان کی ابتدا کسی مافوق الفطرت طریقے سے نہیں بلکہ عین فطری طریقے سے ہوئی ہے۔ افلاطون کی طرح روسو (۱۷۱۲ء۔۱۷۷۸ء) کی تصنیف 'زبانوں کی ابتدا' میں بھی ایک تذبذب کی سی کیفیت پائی جاتی ہے[117]۔ کہیں وہ زبان کو 'معاہدہ عمرانی' کی طرح ارادی سمجھوتے کی پیداوار قرار دیتا ہے اور کہیں زبان کے مافوق الفطرت مآخذ کی تائید کی گئی ہے۔ بہ ہر حال روسو کے ارادی مفاہمت کا یہ نظریہ وقیع نہیں سمجھا گیا۔[118]

اٹھارہیں صدی کی ساتویں دہائی میں لسانیاتی مسائل پر بہت کچھ علمی نقطہ نظر اختیار کرنے والا پہلا جرمن مفکر 'جوہان گوٹ فریڈ ہرڈر' (Johann Gottfried Herder) ہے۔ ہرڈر (۱۷۴۴ء۔۱۸۰۳ء) نے لسانیات سے متعلق کوئی علمی تحقیق تو نہیں کی لیکن اس شعبۂ علم کے ارتقا کے لیے راہیں ضرور ہموار کر دیں۔ برلن اکیڈمی کی تحریک پر ۱۷۷۳ء کے مطبوعہ وانعام یافتہ اپنے مضمون، بہ عنوان 'زبان کس طرح ایجاد ہوئی' میں ہرڈر نے زبان کی الٰہیاتی تصور پر تنقید کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اگر زبان خدا کی تخلیق کی ہوتی تو ہر لحاظ سے کامل ہوتی اور اِس میں وہ خامیاں نہ ہوتیں جو منطقی اعتبار سے نظر آتی ہیں۔ ہرڈر زبان کو ارادی اور شعوری تشکیل کا حصہ بھی قرار نہیں دیتا، بلکہ وہ اِسے انسانی ضرورتوں اور تقاضوں کا تدریجی نتیجہ قرار دیتا ہے۔[119]

مغرب میں اٹھارھویں صدی کی آخری دہائی تک لسانیات کی جولاں گاہ مدرسانہ، معیاری اور ہدایتی قواعد، آغازِ زبان کے الٰہیاتی نقطہ ہائے نظر کی بحث وتمحیص، کلمے اور معنی کی فطری اور مفاہمانہ رشتوں کے متنازعہ تصورات، زبان اور لسانی گروہ کی ذہنی ونفسیاتی ہم آہنگی کے خیال، سطحی لغوی تقابل اور قیاسی اشتقاقیات پر مشتمل رہی۔ اگر چہ سولھویں اور سترھویں صدی میں سنسکرت اور اِس کی قواعد سے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ پیرس میں سنسکرت کی تدریس کی داغ بیل پڑ چکی تھی، تاہم زبانوں کے تقابلی مطالعے کا خیال پیدا نہیں ہوا تھا۔[120]

تقابلی لسانیات کی ابتدا:

دنیا میں، بالخصوص ہند یورپی خاندان السنہ میں تقابلی لسانیات کی ابتدا 'سراج الدین علی خان آرزوؔ (۱۶۸۹ء۔۱۷۵۶ء) سے ہوئی، جنھوں نے اپنی تالیف 'نوادر الالفاظ' میں پہلی بار سنسکرت اور فارسی کا تقابل کر کے اِن کی مشابہت کو 'توافق لسانین' کے نام سے ظاہر کیا، لیکن ہندوستان میں آرزو کی نشان دہی سے کسی نے بھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔[121]

صحیح معنوں میں تقابلی لسانیات کا آغاز اُس وقت ہوتا ہے جب سنسکرت زبان کا اہلِ یورپ سے تعارف ہوا:

> The discovery of the Sanskrit language by European scholars at the end of the eighteenth century was the starting point from which developed the study of the comparative philology of the Indo-European languages and eventually the whole science of modern linguistics.[122]

نہ صرف سنسکرت بلکہ قدیم ہندو قواعد دانوں کا کام بھی یورپ والوں کے لیے مشعلِ راہ بنا، جس سے علمائے یورپ پر یہ انکشاف ہوا کہ نہ صرف یورپ کی بیش تر زبانیں بلکہ ایران اور ہندوستان کی اکثر زبانیں بھی ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مشرق میں، بالخصوص ہندوستان میں یورپی اقوام کی تجارتی اور تبلیغی سر گرمیوں کے نتیجے میں لسانی تحقیقات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔[123]

یورپ کو سنسکرت سے روشناس کرانے کا سہرا در حقیقت برطانوی مستشرق، 'ولیم جونز' (William Jones) کے سر بندھتا ہے۔ جس نے ۱۷۸۶ء میں اپنے مشہور خطبے میں یہ تاریخی الفاظ کہے:

> The Sanskrit language, whatever be its antiquity, is of a wonderful stucture;

more perfect than the Greek, more copious than the Latin, and more exquisitely refined than either, yet bearing to both of them, a stronger affinity, both in the roots of verbs and in the forms of grammar, that could not possibly have been produced by accident; so strong indeed, that no philologer could examine all three without believing them to have sprung from some common source, which, perhaps, no longer exists.[124]

ہند یورپی زبانوں کی ہم نسبی کے حوالے سے اِس تیقن کے ساتھ رائے ولیم جونز (۱۷۴۶ء۔۱۷۹۴ء) سے قبل کسی نے نہیں دی تھی یہی وجہ ہے کہ ولیم جونز کے اِس مقالے کو جدید تقابلی اور تاریخی لسانیات کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے[۱۲۵]۔ ولیم جونز کی اِس دریافت کا اثر برطانیہ کے دانش وروں پر اتنا نہ ہوسکا جتنا جرمن عالموں پر ہوا۔ ولیم جونز نے اُن کے سامنے لسانی تحقیقات کی دو راہیں کھول دیں تھیں؛ ایک تقابلی مطالعے اور لسانی روابط کی اور دوسری مشترک قدیم ترین لسانی ماخذ کی۔ زبانوں کی ساخت کے تقابل کی ابتدا سے انیسویں صدی کے آغاز ہی میں زبانوں کے سائنسی مطالعے و تجزیے کی بنیاد پڑ گئی۔ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح لسانیاتِ عامہ میں اوّلیت کا سہرا جرمن مفکرین کے سر ہے اسی طرح تقابلی اور تاریخی لسانیات کا آغاز اور فروغ بھی جرمن علما ہی کی بہ دولت ہوا[۱۲۶]۔

'فریڈرک شلیگل' (Friedrich Schlegel) نے ۱۸۰۸ء میں ایک کتاب 'اہلِ ہند کی زبان اور حکمت' کے عنوان سے شائع کی، جس میں یورپی زبانوں اور سنسکرت کے الفاظ اور صرف و نحو کی مماثلت کے مطالعے کے بعد اِس خیال کی پُر زور حمایت کی کہ سنسکرت اور یورپی زبانوں، خاص طور پر یونانی، لاطینی اور جرمن کے مابین ایک گہرا رشتہ ہے اور یک گونہ مطابقت موجود ہے۔ فریڈرک شلیگل (۱۷۷۲ء۔۱۸۲۹ء) ہی نے پہلی بار 'تقابلی لسانیات' کی اصطلاح وضع کی[۱۲۷]۔

ہند یورپی زبانوں کے باقاعدہ عملی تقابل کی ابتدا جرمن ماہرِ لسانیات، 'فرانز بوپ' (Franz Bopp) نے کی۔ اِس نے اپنی تصنیف 'فارسی اور یورپی زبانوں کا سنسکرت سے موازنہ' میں دلائل و براہین کی مدد سے اِس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا کہ سنسکرت، فارسی اور مشہور یورپی زبانوں کا ماخذ کوئی ایک ہی زبان ہے، جسے قدیم آریائی زبان کہا جا سکتا ہے[۱۲۸]۔ بوپ کے بعد لسانیات کے اماموں میں 'جیکب گرِم' (Jacob Grimm) اور 'اگسٹ شلیخر' (August Schliecher) کا نام قابلِ ذکر ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں لسانی مطالعات کے حوالے سے دو ماہرین خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک اینگلو جرمن فلاسفر 'میکس مُلر' (Max Muller) اور دوسرا امریکی ماہرِ لسانیات 'ولیم وھٹنے' (William Dwight Whitney)۔ دونوں کو فرانز بوپ کے شاگرد ہونے کا فخر حاصل تھا[۱۲۹]۔ میکس مُلر (۱۸۲۲ء۔۱۹۰۰ء) کے نزدیک قواعدِ زبان میں 'کیا ہے' سے بحث کرتی ہے اور لسانیات 'کیوں ہے' سے۔ میکس مُلر زبان کی نسبت بولیوں کو زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ اُس کے خیال میں ابتدا میں پہلے بولیاں تھیں جو بعد ازاں زبانیں بنیں۔ اِس کے برعکس ولیم وھٹنے (۱۸۲۷ء۔۱۸۹۴ء) زبان کی اوّلیت کو تسلیم کرتا ہے، جو زمان و مکاں کی تبدیلیوں کے باعث بولیوں میں بٹ جاتی ہے۔ وہ زبان کو ایک تاریخی ادارہ قرار دیتا ہے اور لسانیات میں تاریخی نقطۂ نظر کا قائل ہے۔ امریکہ میں لسانیات کی روایت ولیم وھٹنے ہی سے شروع ہوتی ہے[۱۳۰]۔

انیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں جرمنی کے شہر لائپزگ (Leipzig) میں ایک جدید لسانیاتی دبستان کا آغاز ہوا، جو 'نوعمر قواعد دانوں' (Jung Grammatiker) کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ علما تاریخی دبستان کے نمائندے تھے جو عام قواعد کی روایت کے برخلاف لسانیات کو زبانوں کے ارتقا اور تقابل کا تجزیاتی مطالعہ سمجھتے تھے۔ اِن ماہرین کے نزدیک لسانی مواد کی توضیح یا لسانی بیان کی حیثیت محض عملی یا درسی تھی۔ ابتدا میں اِن کی طرف توجہ نہ دی گئی لیکن بالآخر وہ اپنے نظریات کو متعارف کرانے میں کام یاب ہوئے۔ اِس مکتبِ فکر کے اہم ماہرین میں 'ایچ سٹینتھل' (H. Stenthal)، 'کارل برگ مان' (Karl Brugman)، 'برتھولڈ ڈیل بروک' (Berthold

(Delbruck)، اور 'ہرمن پال' (Hermann Paul) نمایاں ہیں۔

'فردیناد دسوسیئر' (Ferdinand De Saussure) نے مذکورہ بالا نوعمر قواعد دانوں کے نقطہ نظر کی مخالفت کی اور زبان کے مطالعے میں (Synchronic) اور (Diachronic) طریقوں کی وضاحت کی۔ پہلے طریقے کو توضیحی اور دوسرے کو ارتقائی یا تاریخی لسانیات کہا جا سکتا ہے۔ سوسیئر (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۳ء) توضیحی لسانیات کو صحیح معنوں میں سائنس قرار دیتا ہے۔[۱۳۱]

جدید لسانیات کی ابتدا:

انیسویں صدی میں لسانیات کی کم وبیش تمام اصناف میں جرمن ماہرینِ لسانیات ہی پیش پیش رہے تھے لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں سوسیئر نے جو لسانیاتی اجتہادات کیے اور لسانیات کی دنیا کو جن نئے تصورات آشنا کیا وہ بحث وتمحیص، نقطہ نظر اور غور وفکر کے موَجب ہی نہیں ہوئے بلکہ لسانیاتی مطالعے کے نئے زاویوں کے سبب بھی بن گئے۔ گویا سوسیئر کے لسانی تصورات بیسویں صدی کی جدید لسانیات کی بنیاد بن گئے۔

سوسیئر کے نزدیک لسانیات کے میدان میں پہلا کام علامت کا تجزیہ ہونا چاہئے۔ وہ علامت کو خود اختیاری قرار دیتا ہے لیکن خود اختیاری سے مراد بولنے والے کی مرضی اور اس کا بلا روک ٹوک انتخاب نہیں۔ اِس نے پہلی بار 'Langue' (زبان) اور 'Parole' (بول چال) کے فرق و امتیاز کی نشان دہی کی اور واضح کیا کہ زبان، علامتوں کا مکمل نظام ہے جو لسانی گروہ میں ابلاغ کا ذریعہ بنتا ہے،
بول چال اِس کا استعمال ہے۔ اِس کے شاگرد 'Bally' نے فکر یا خیال اور اس کے لسانی اظہار کے رشتوں پر تحقیق کی اور اسلوبیات 'Stylistics' کو زبان کا ایک مؤثر عنصر قرار دیا۔[۱۳۲]

بیسویں صدی کو 'ساختیات' کی صدی کہا جاتا ہے۔ یورپی دانش وروں کے نزدیک ساختیات اِس نقطہ نظر کی ترجمان ہے کہ حقیقی بول چال یا کلام کی تہ میں مجرد ساخت ہوتی ہے، جسے حقیقی بول چال یا کلام سے ممتاز کیا جانا چاہیے۔ ساخت لسانی بیوہار یا کردار کے بین السطور ایک نظام کی حیثیت رکھتی ہے، اسی کا مطالعہ مقدم ہے۔ امریکہ میں ساختیات کے دو دھارے نظر آتے ہیں۔ ایک کا اصل منبع بشریات ہے، جس کے نمائندہ مفکرین میں 'ایڈورڈ ساپر' (Edward Sapir) سرِ فہرست ہے۔ دوسرے دھارے کا سرچشمہ 'بلوم فیلڈ' (Bloomfield) کے وہ اجتہادات ہیں جو یورپی لسانیات کی تربیت اور بعض امریکی انڈین زبانوں کے مطالعے کا نتیجہ کہلا سکتے ہیں۔[۱۳۳]

بیسویں صدی کے وسط میں 'نوم چومسکی' (Noam Chomsky) نے 'تولیدی متغیرہ' یا 'تبادلی قواعد' کا تصور پیش کیا، جو بے حد مقبول ہوا۔ چومسکی اِسے 'زبان کا ذہنیاتی نظریہ' کہتا ہے۔ اِس کے مطابق لسانیات کا تعلق بولنے والے کی تخلیقی لسانیاتی صلاحیتوں سے ہونا چاہیے، بول چال سے نہیں۔ چومسکی نے ماہرینِ ساختیات کے اِس نقطہ نظر کی تردید کی ہے کہ ہر زبان کی اپنی جداگانہ خصوصیت ہوتی ہے۔ اِس کے خیال میں تمام زبانیں بہت حد تک ایک ہی 'پیٹرن' (Pattern) رکھتی ہیں۔[۱۳۴]

یورپ اور امریکہ میں لسانیاتی سرگرمیوں میں تہذیبی اور سیاسی اغراض ومقاصد کی کارفرمائی کے باوجود خالص علمی اور تہذیبی نقطہ نظر بھی پیدا ہوا۔ بیسویں صدی میں برِصغیر پاک وہند میں اگرچہ قومی سطح پر لسانیات کے شعبے میں کچھ پیش رفت رہی مگر بین الاقوامی حیثیت کی کوئی لسانی تحقیق منظرِ عام پر نہ آسکی۔

لسانیات کی شاخیں اور دیگر علوم سے رشتہ

دنیا کا کوئی بھی شعبۂ علم اپنے دائرہ کار میں مکمل نہیں۔ ایک علم کو کسی نہ کسی حوالے سے کسی دوسرے علم سے واسطہ ضرور پڑتا ہے۔ تمام شعبہ ہائے علوم ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، جس کی بنا پر کئی بین الاقوامی مطالعے رائج ہوئے۔ ''مثال کے طور پر بشریات اور لسانیات کے امتزاج سے نسلی لسانیات وجود میں آئی۔ عمرانیات اور لسانیات سے مل کر سماجی لسانیات رونما ہوئی۔ نفسیات اور لسانیات کے اِدغام سے نفسیاتی لسانیات نے جنم لیا۔ لسانیات میں ریاضیات کا طریقہ

اختیار کیا گیا تو ریاضیاتی لسانیات کہلایا۔ ریاضی کی شاخ اعدادیات سے لسانیات میں بہت فائدہ اُٹھایا گیا، اِسے اعدادی لسانیات کہہ سکتے ہیں۔ اس کی ایک قسم لسانی زمانیات بھی ہے۔ لسانیات اور آثارِ قدیمہ یا قدیم تاریخ کے میل سے لسانی عتیقیات کا شعبہ تیار ہوا، جو لسانیات سے زیادہ تاریخ کے قریب ہے"[۱۳۵]۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر ماہرین نے لسانی مطالعے کی رعایت سے علمِ لسانیات کے درج ذیل شعبے قائم کیے ہیں:[۱۳۶]

عام لسانیات (General Linguistics):

عام لسانیات، لسانیت کے نظریات پیش کرتی ہے۔ اس میں زبان کی ماہیت، زبان کے تجزیے کے اصول، مروّجہ قواعد سے اِس کے اختلافات، لسانیاتی مطالعے کے مختلف شعبوں کے اصول اور اِن کا عام تعارف شامل ہوتا ہے۔ عام لسانیات کا ماہر انسانی زبانوں کے آفاقی خواص تلاش کرتا ہے تا کہ زبانوں کے بارے میں مجموعی طور سے کچھ بیان کر سکے۔ اِس مقصد کے لیے وہ ماہرین کے پیش کردہ تمام نظریات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ روایتی قواعد کے بیانات کا مطالعہ بھی کرتا ہے تا کہ اِس تحقیق و مطالعے کی بنا پر وہ اپنی تنقیدی رائے استوار کر سکے۔

تاریخی لسانیات (Historical Linguistics):

اِس شعبۂ علم میں زبان کی تاریخ اور عہد بہ عہد اس کی تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اِس سے کسی بھی زبان کی ابتدا، بہ تدریج ارتقا، اس کے قدیم تر اصوات و قواعد اور ارتقائی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ لسانیات کے اِس شعبے میں یورپ میں بہت زیادہ کام ہوا ہے اور بے شمار ماہرین نے اسے آگے بڑھانے میں حصّہ لیا۔ تاریخی لسانیات کو زبان کا 'عصریاتی مطالعہ' بھی کہتے ہیں۔ عموماً کسی بولی کا مطالعہ 'عصریاتی لسانیات' (Diachrinic Linguistics) کے تحت کیا جاتا ہے۔

اطلاقی لسانیات (Applied Linguistics):

یہ شعبۂ علم عام لسانیات اور تجزیاتی لسانیات کا عملی پہلو ہے۔ بیرونی زبانوں کا سیکھنا، ترجمے کی مشین بنانا، کسی زبان یا بولی کا علاقائی جائزہ لینا، کسی زبان کے کوڈ تیار کرنا، کسی زبان کے خفیہ کوڈ دریافت کرنا، رسم الخط میں اصلاح کی تجاویز، ٹائپ رائٹر میں حروف کی ترتیب وغیرہ جیسے معاملات اس شعبۂ علم کے زمرے میں آتے ہیں۔

عصری لسانیات (Synchronic Linguistics):

اِس شعبۂ علم کے تحت زبان کا مطالعہ کسی مخصوص نقطۂ زماں میں کیا جاتا ہے۔ ایک زبان کا عصری مطالعہ بالعموم حال کے نقطے میں کیا جاتا ہے۔ ایک زبان کا ایک مخصوص نقطۂ زماں میں مطالعہ کیا جائے تو اِس کی ساخت ہی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اِسے 'ساختیاتی لسانیات' (Structural Linguistics) بھی کہا جاسکتا ہے۔

تقابلی لسانیات (Comparative Linguistics):

تقابلی لسانیات میں محض ایک خاندان کی زبانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اِس میں ایک ہی خاندان کی مختلف زبانوں کے باہمی رشتے، شجرے اور نسل کا تعین کرنا ہوتا ہے۔

نوعیات:

تقابلی لسانیات کے برعکس 'نوعیات' کے تحت دنیا بھر کی زبانوں کا تقابل کیا جاتا ہے۔

تجزیاتی لسانیات (Descriptive Linguistics):

تجزیاتی لسانیات میں زبان کے صوتی نظام اور قواعد (صرف و نحو) کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اِسے اکثر 'توضیحی لسانیات' بھی کہا جاتا ہے۔ اِس کے احاطۂ کار میں درج ذیل شعبے آتے ہیں:

صوتیات (Phonetics):

اِس میں اصوات کی زیادہ سے زیادہ نزاکتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ شعبہ کسی ایک زبان تک محدود نہیں۔ اِس میں تمام زبانوں کا مجموعی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اکثر کسی ایک زبان یا بولی کی صوتیات پر بحث کی جاسکتی ہے۔

فونیمیات (Phonemics):

کسی ایک زبان کے صوتیے متعین کرنا فونیمیات کہلاتا ہے۔ صوتیات کے برعکس اِس شعبۂ علم میں غیر ضروری نزاکتوں کو نظر انداز کر کے صرف انھیں اختلاف کا جائزہ لیا جاتا ہے جو معنی کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ اِس طرح اصوات کی متعدد ذرّیات کی گروہ بندی کر کے انھیں کم سے صوتیوں میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔

مارفیمیات یا صرف (Morphology):

اِس میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے، مثلاً یہ معلوم کرنا کہ ایک مادّے میں سابقے اور لاحقے لگا کر نئے الفاظ کا اشتقاق کیوں کر ہوتا ہے؟

نحو (Syntex):

اِس کا موضوع کلام، یعنی جملہ اور فقرہ ہے۔ 'صرف' اور 'نحو' کو ملا کر زبان کی قواعد کہا جاتا ہے۔

معنیات (Semantics):

تجزیاتی لسانیات کا یہ شعبہ لفظوں اور جملوں کے مفہوم سے بحث کرتا ہے۔

تجزیاتی لسانیات کے درج بالا پانچ شعبوں میں فونیمیات، صَرف اور نحو کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جب کہ صوتیات اور معنیات ضمنی مقام رکھتے ہیں۔ صوتیات میں چوں کہ وہ مباحث زیرِ بحث آتے ہیں جو روزانہ استعمال نہیں ہوتے، اِس لیے اسے غیر اہم کہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح معنیات کو لغت کے ساتھ جوڑ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ تجزیاتی لسانیات کے علما کا ماننا ہے کہ لسانیات کو صرف زبان کی ہیئت سے سروکار ہے، معنی سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معنیات کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

درج بالا اہم شعبۂ ہائے علوم کے علاوہ ایسے اور بھی متعدد شعبے ہیں جو لسانیات کے کسی نہ کسی علم سے اِدغام کی صورت میں وجود پذیر ہوئے اور جنھیں بروئے کار لا کر سماج اور زبان کے باہمی ربط کو اور زیادہ واضح خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، مثلاً لسانی فردیات، لسانی عتیقیات، نسلی لسانیات یا بشریاتی لسانیات، علاقائی جائزے کے طریقے، نفسیاتی لسانیات، اعدادی لسانیات، لسانی زمانیات، ریاضیاتی لسانیات وغیرہ وغیرہ۔ یہاں لسانیات کی ایسی بہت سی دیگر شاخوں کے فقط نام ہی درج کر دینے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ جن کے تعارف اور دائرہ کار کی جامع وضاحت ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب 'عام لسانیات' میں کر دی ہے۔

خلاصۂ کلام کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ لسانیات سے دل چسپی کا سلسلہ دنیا میں بہت قدیم ہے، لیکن گزشتہ دو صدیوں سے مغرب میں اِس کی طرف خصوصی توجہ ہوگئی ہے۔ پہلے یہ علم تخمین و ظن پر مبنی تھا۔ پھر نیم سائنسی تحقیق کا آغاز ہوا۔ اِس کے بعد لسانی تحقیق سائنسی حدود میں داخل ہوئی۔ اِس کے لیے جامعات

میں خصوصی شعبے قائم کیے گئے اور جدید ریسرچ لیبارٹریز کی مدد سے بہتر تحقیقی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔لسانیات کی حدود سائنسز اور معاشرتی علوم تک وسیع ہوگئیں۔ اکیسویں صدی میں یہ سلسلہ بڑے انہماک سے جاری ہے۔ماہرین کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ لسانیات ایک پیچیدہ علم ہے اور اِس میں بڑی وسعت بھی ہے۔امید ہے کہ آیندہ لسانی تحقیقات بہت سے مبہم مسائل کو سلجھانے میں کام یاب ہو جائیں گی۔حال ہی میں لسانیات پر ایک مفید کتاب شائع ہوئی ہے۔اِس سے ایک اقتباس درج ذیل ہے جس میں لسانیات کی حدود واضح کی گئی ہیں:

> What is linguistics, then? Fundamentally, the field is concerned with the nature of language and (linguistics) communication. It is apparent that people have been fascinated with language and communication for thousands of years, yet in many ways we are only beginning to understand the complex nature of this aspect of human life. If we ask, What is the nature of language? Or how does communication work? We quickly realize that these questions have no simple answers and are much too broad to be answered in a direct way ..... The field as a whole represents an attempt to break down the broad questions about the nature of language and communication into smaller, more manageable questions that we can hope to answer, and in so doing establish reasonable results that we can build on in moving closer to answer to the larger questions. Unless we limit our sight in this way and restrict ourselves to particular frameworks for examining different aspects of language and communication, we cannot hope to make progress in answering the broad questions that have fascinated people for so long. As we will see, the field covers a surprisingly broad range of topics related to language and communication.

حواشی

۱۔ خلیل صدیقی: زبان کا مطالعہ، مستونگ: قلات پبلی شرز، (۱۹۶۴ء)، ص ۳۔

۲۔ خلیل صدیقی: لسانی مباحث، کوئٹہ: زمرّد پبلی کیشنز، (۱۹۹۱ء)، ص ۱۰۔

۳۔ سلیم فارانی، پروفیسر: اردو زبان اور اس کی تعلیم، لاہور: پاکستان بُک سٹور، (۱۹۵۳ء)، ص ۵۔

۴۔ اردو زبان اور اس کی تعلیم، ص ۵ تا ۶۔

۵۔ اشرف کمال، ڈاکٹر: لسانیات، زبان اور رسم الخط، فیصل آباد: مثال پبلی شرز، (۲۰۰۹ء)، ص ۵۔

۶۔ روح الامین، سیّد: اردو لسانیات کے زاویے، گجرات: عزت اکادمی، (۲۰۰۷ء)، ص ۸۰۔

7. Yule, George: *The Study Of Lamguage*, New York: Cambridge University Press. (2010), p.1.

8. Jesperson, Otto: *Language, Its Nature, Development And Origion,* New York: Norton, (1964), p.96.

9. Katzner, Kenneth: *The Languages Of The World*, London: Routledge, (1995), p.330.

Esperanto: Esperanto, the most important and influential of the so-called artificial languages, was devised in 1887 by Dr. Lazarus Ludwig Zamenhof of Warsaw, Poland. Based on the elements of the foremost Western languages, Esperanto is incomparably easier to master than any national tongue, for its grammer rules are completely consistent, and a relatively small number of basic roots can be expanded into an extensive vocabulary by means of numerous prefixes, suffixes, and infixes. The French Academy of Sciences has called Esperanto 'A masterpiece of logic and simplicity'. Its name derived from 'Doktoro Esperanto', meaning 'One who hopes'.

10. www.britannica.com

Ido: Artificial language constructed by the French logician and Esperantist 'Louis De Beaufront'. The language is a networking of Esperanto, intended by

its originator to improve upon what he considered weak points in Esperanto. The name of the language traces its origin to the Esperanto word 'Ido', meaning 'Offspring'. Louis Coutuart was one of its most influential proponents. Ido was specially designed to be grammatically, orthographically and lexographically regular, and above all easy to learn and use.

11. Fromkin, Victoria: *An Introduction To Language*, Australia: Nelson Thomson Learning, (2005), p.49.

12. An Introduction To Language, p.49.

۱۳۔ ہادی حسین، محمد: زبان اور شاعری، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۸۴ء)، ص۳ تا ۹۔

14. Genesis, 11:1-9

15. An Introduction To Language, p.49.

16. An Introduction To Language, p.50.

۱۷۔ لسانی جائزے، ص۲۸۔

18. Pei, Mario: *The Story Of Language*, New York: The New American Library, (1965), p.24.

۱۹۔ ڈاکٹر گیان چند جین اپنی تصنیف لسانی جائزے کے صفحہ ۲۷ پر لکھتے ہیں:

فریجین دراصل صوبہ 'فریجیا' کی زبان ہے جو موجودہ ترکی کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس زبان کا تعلق 'آرمینی خاندان' سے تھا جس پر یونانی اثرات تھے اور جو قریباً مردہ قرار دی جا چکی ہے۔ اس زبان میں آٹھویں صدی قبل مسیح کے کتبے ملتے ہیں۔

20. The Study Of Language, p.2.

21. An Introduction To Language, p.51.

۲۲۔ لسانی جائزے، ص۲۸۔

۲۳۔ خلیل صدیقی: زبان کا ارتقا، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، (۱۹۷۷ء)، ص۲۸۔

24. The Study Of Language, p.3.

۲۵۔ لسانی جائزے، ص۲۹۔

26. Lnguage, Its Nature, Development And Origion, p.96.

۲۷۔ لسانی جائزے، ص۴۰۔

۲۸۔ زبان کا ارتقا، ص۴۵۔

۲۹۔ لسانی جائزے، ص۴۰۔

30. The Story Of Language, pp.24-25.

۳۱۔ لسانی جائزے، ص۳۶۔

۳۲۔ زبان کا ارتقا، ص۳۰ تا ۳۳۔

33. The Study Of Language, p.6.

34. An Introduction To Language, p.473.

۳۵۔ خلیل صدیقی: زبان کیا ہے؟، ملتان: بیکن بُکس، (۱۹۸۹ء)، ص ۵۷۔

36. An Introduction To Language, p.473.

37. Sapir, Edward: *language: An Introduction To The Study Of Speech*, New York, (1942), p.150.

۳۸۔ لسانی جائزے، ص ۳۹۵۔

۳۹۔ زبان کیا ہے؟، ص ۵۸۔

40. Grace Wrinkler, Elizabeth: *Understanding Language(A Basic Course In Linguistics)*, London: Continuum, (2007), p.198.

41. An Introduction To Language, p.400.

42. An Introduction To Language, p.400.

43. Baker, Anne E. & Hengeveld, Kees: *Linguistics*, U.S.A: Blackwell Publishing, (2012), p.365.

44. An Introduction To Language, p.475.

۴۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۶ء)، ص ۵۔

46. Linguistics, p.361.

47. Crystal, David: *The Cambridge Encyclopedia Of Language (2nd Ed.)*, Islamabad: National Book Foundation, (1962), p.24.

48. A Dictionary Of Linguistics And Phonetics, p.217.

49. Adrin Akmajian & others: *Linguistics (An introduction to language and communication)*, New Delhi: PHI Learnunhg, (2012), p.278.

50. Linguistics, p.365.

51. The Story Of Language, p.51.

52. Linguistics, p.364.

53. The Story Of Language, p.51.

۵۴۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: 'اردو کے آغاز کے نظریے'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ): ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، (۲۰۰۷)، ص ۳۸۔

55. Linguistics (An introduction to language and communication), p.274.

56. The Story Of Language, p.51.

57. Finegan, Edward: *Language (Its Structure and Use)*, California: Wadsworth, (2004), p.15.

58. The Story Of Language, p.54.

۵۹۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ،ص۱۲۳تا۱۲۸۔

60. An Introduction To Language, p.401.

61. Language (Its Structure and Use), p.363.

62. Vant, Sturte: *Linguistic Change*, Chicago, (1961), p.146.

۶۳۔ اردو زبان کی تدریس،ص۱۳۔

64. An Introduction To Language, p.409.

65. Linguistics (An introduction to language and communication), p.281.

۶۶۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر:'قومی زبان۔چند حقائق،چند مسائل'مشمولہ:صحیفہ،لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب،مارچ۔اپریل(۱۹۷۶ء)،ص۴۰۔

67. The Story Of Language, p.62.

۶۸۔ شانتی رجن بھٹاچاریہ:بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ(ایک لسانی مطالعہ)،لکھنؤ:نصرت پبلشرز،(۱۹۸۸ء)،ص۲۶۔

۶۹۔ عام لسانیات،ص۲۹۔

۷۰۔ بہ حوالہ،شوکت سبزواری،ڈاکٹر:اردو زبان کا ارتقا،ڈھاکہ:پاک کتاب گھر،(۱۹۵۶ء)،ص۷۷۔

71. Whitney: Language and the Study of Language, London, (1884), p.177.

۷۲۔ سلیم اختر،ڈاکٹر:اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،(۲۰۰۸ء)۔کتاب کے صفحہ۱۳پر لسانی اشتراک کے حوالے سے لکھا ہے:

'عہد نامہ عتیق' کے بہ موجب بابل میں کو لوگ بلند مینار تعمیر کر رہے تھے اس سے خدشہ پیدا ہوا کہ یہ بلند مینار کے ذریعے آسمان تک رسائی حاصل کر لیں گے۔چناں چہ ان میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے ان کی زبانیں الگ الگ کر دی گئیں۔یوں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر علاحدہ بستیوں میں زندگی بسر کرنے لگے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان زبانوں میں اتنی مغائرت پیدا ہو گئی کہ ایک زبان کا دوسری زبان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

۷۳۔ جین،ڈاکٹر گیان چند:ایک بھاشا۔دو لکھاوٹ دو ادب،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،(۲۰۰۷ء)،ص۶۹۔

۷۴۔ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ،ص۱۷تا۱۸۔

۷۵۔ اردو زبان کا ارتقا،ص۷۷۔

۷۶۔ شوکت سبزواری،ڈاکٹر:لسانی مسائل،کراچی:مکتبۂ اسلوب،(۱۹۶۲ء)،ص۷۔

۷۷۔ اشرف کمال،ڈاکٹر:لسانیات،زبان اور رسم الخط،فیصل آباد:مثال پبلشرز،(۲۰۰۹ء)،ص۱۲۶۔

۷۸۔ لسانی مسائل،ص۸۔

۷۹۔ لسانیات،زبان اور رسم الخط،ص۱۲۶۔

۸۰۔ خلیل صدیقی:لسانی مباحث،کوئٹہ:زمرّد پبلی کیشنز،(۱۹۹۱ء)،ص۴۔

۸۱۔ خلیل صدیقی:زبان کا مطالعہ،مستونگ:قلات پبلشرز،(۱۹۶۴ء)،ص۲۳۔

۸۲۔ لسانیات،زبان اور رسم الخط،ص۱۲۶۔

۸۳۔ سہیل بخاری،ڈاکٹر:لسانی مقالات(حصّہ سوم)،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،(۱۹۹۱ء)،ص۱۱۔

۸۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: www.britannica.com

۸۵۔ اردو زبان کا ارتقا،ص۷۔

۸۶۔ اردو زبان کا ارتقا،ص۷۔

۸۷۔ زبان کا مطالعہ،ص ا۔
۸۸۔ لسانی مباحث،ص ۵۔
۸۹۔ زبان کا مطالعہ،ص ا تا ۲۔
۹۰۔ زبان کا مطالعہ،ص ۷۔
۹۱۔ لسانی مباحث،ص ۹۔
۹۲۔ لسانی مباحث،ص ۶ تا ۸۔
۹۳۔ حامداللہ ندوی، ڈاکٹر: اردو زبان کا تاریخی خاکہ،مشمولہ: اردو تاریخ و مسائل (مرتب): سیّد روح الامین، گجرات: عزت اکادمی، (۲۰۰۷ء)،ص ۳۵۔
۹۴۔ نصیر احمد خان: اردو لسانیات، نئی دہلی: اردو محل پبلی کیشن، (۱۹۹۰ء)،ص ۲۳ تا ۲۵۔
۹۵۔ اردو لسانیات،ص ۲۳ تا ۳۱۔
۹۶۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: عام لسانیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۱۹۸۵ء)، ۱۷ تا ۱۸۔
۹۷۔ لسانی مباحث،ص ۶۔
۹۸۔ لسانی مباحث،ص ۶۔
۹۹۔ لسانی مباحث،ص ۷ تا ۸۔
۱۰۰۔ لسانی مباحث،ص ۹۔
۱۰۱۔ مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر: حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۹۳ء)،ص ۱۷۵۔
۱۰۲۔ لسانی مباحث،ص ۱۰۔
۱۰۳۔ حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)،ص ۱۷۵۔
۱۰۴۔ حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)،ص ۱۷۵۔
۱۰۵۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: جامع القواعد (حصّہ صرف)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، (۲۰۰۴ء)،ص ۱۳۱۔
۱۰۶۔ لسانی مباحث،ص ۱۶۔
۱۰۷۔ لسانی مباحث،ص ۱۷ تا ۱۸۔
۱۰۸۔ جامع القواعد (حصّہ صرف)،ص ۱۳۴۔
۱۰۹۔ جامع القواعد (حصّہ صرف)،ص ۱۳۴۔
۱۱۰۔ اردو لسانیات،ص ۱۷۔
۱۱۱۔ لسانی مباحث،ص ۱۱ تا ۱۲۔
۱۱۲۔ لسانی مباحث، ۱۳۔
۱۱۳۔ اردو لسانیات،ص ۱۸۔
۱۱۴۔ لسانی مباحث،ص ۱۶۔
۱۱۵۔ لسانی مباحث،ص ۱۹ تا ۲۰۔
۱۱۶۔ اردو لسانیات، ۲۰ تا ۲۱۔
۱۱۷۔ عین الحق فرید کوٹی: اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، (۱۹۹۶ء)،ص ۲۰۔
۱۱۸۔ لسانی مباحث،ص ۲۱۔
۱۱۹۔ زبان کا مطالعہ،ص ۳۲ تا ۳۳۔

۱۲۰۔ زبان کا مطالعہ،ص۲۳۔
۱۲۱۔ لسانی مقالات (حصّہ سِوُم)،ص۲۷۔
122. Burrow, Thomas: The Sanskrit Language (Preface), London, (1965).
۱۲۳۔ حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی وادبی خدمات (جلد اوّل)،ص۱۷۶۔
۱۲۴۔ منقول از، حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی وادبی خدمات (جلد اوّل)،ص۱۷۶۔
۱۲۵۔ حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی وادبی خدمات (جلد اوّل)،ص۱۷۶۔
۱۲۶۔ لسانی مباحث،ص۲۵۔
۱۲۷۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ،ص۲۶۔
۱۲۸۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ،ص۲۶۔
۱۲۹۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ،ص۲۷۔
۱۳۰۔ لسانی مباحث،ص۳۰ تا۳۱۔
۱۳۱۔ لسانی مباحث،ص۳۴۔
۱۳۲۔ لسانی مباحث،ص۳۳ تا۳۸۔
۱۳۳۔ لسانی مباحث،ص۴۲ تا۴۳۔
۱۳۴۔ لسانی مباحث،ص۴۹۔
۱۳۵۔ عام لسانیات،ص۵۸۸۔
۱۳۶۔ لسانیات کی مختلف شاخوں اور دیگر علوم سے اِس کے روابط کے حوالے سے زیادہ تر معلومات 'عام لسانیات' از ڈاکٹر گیان چند جین سے اخذ کی گئی ہیں۔
137. Adrian Akmajian & others: *Linguistics (An Introduction to Language and Communication),* New Delhi: PHI Learning, (2012), p.5-6.

باب دُوُم۔ دنیا کی زبانیں
فصل اوّل

دنیا کی زبانیں
(طریقۂ تقسیم اور مختلف خاندان)

دنیا میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان کی تعداد کے ضمن میں آج تک ماہرینِ لسانیات کی طرف سے کوئی بھی قطعی بیان سامنے نہیں آیا۔ ''ایک عام اندازے کے مطابق دنیا میں کم از کم چار ہزار (۴۰۰۰) اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ہزار (۸۰۰۰) زبانیں مستعمل ہیں۔ میلبورن شہر (Melbourne City) ہی میں تقریباً اسّی (۸۰) سے زیادہ زبانیں بولی جاتیں ہیں''[۱]۔ زندہ اور مردہ کی تخصیص کے بغیر اگر زبانوں کا شمار کیا جائے تو یہ تعداد اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔ بہ نسبت زندہ کے مردہ زبانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بعض زبانیں بالکل حال ہی کی صدیوں میں ختم ہوئیں۔ امریکہ کے اصل باشندوں کی اکثر زبانیں بیسویں صدی میں ختم ہوئیں۔ آج سے قریباً چند ہزار سال قبل دنیا کا لسانی نقشہ کیا تھا؟ کسی کو علم نہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہند یورپی زبانوں سے قبل یورپ میں کون سی زبانیں بولی جاتی تھیں۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام پر پہلی بار زبانوں کے مطالعے اور تقسیم کے حوالے سے ماہرین کے ہاں سائنسی رویہ دیکھنے میں آیا۔ اس حوالے سے ماہرین نے زبانوں کے متعدد گروہوں کا بڑا منظم، تفصیلی اور تقابلی جائزہ لینا شروع کیا تا کہ مختلف زبانوں میں مشترک لسانی و نسلی مماثلتوں کی بنا پر ان کی درجہ بندی کی جاسکے۔[۲]

ماہرین نے دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں کو درج ذیل دو طریقوں کے تحت تقسیم کیا ہے:

(۱) زبانوں کی صوری یا نوعی تقسیم (Morphological Or Typological Division) ☆

(۲) زبانوں کی نسلی تقسیم (Geneological Division)

زبانوں کی صوری یا نوعی تقسیم

زبانیں لفظوں سے بنتی ہیں۔ یہ الفاظ بامعنی ہوتے ہیں۔ بامعنی لفظوں کو ترتیب دے کر جملہ بنایا جاتا ہے۔ مختلف زبانوں میں جملوں کی ساخت مختلف ہوتی ہے[۳]۔ لہٰذا اِس طرزِ تقسیم میں زبانوں کو لفظی اور صرفی خصوصیات کے لحاظ سے درج ذیل دو اہم گروہوں میں منقسم کیا گیا ہے:

(۱) غیر ترکیبی زبانیں (۲) ترکیبی زبانیں

(۱) غیر ترکیبی زبانیں (Inorganic Languages):

اس نوع کی زبانوں کو انفرادی(Isolating) اور یک رکنی(Mono_Syllabic) بھی کہا جاتا ہے۔ اس گروہ کی زبانیں یک لفظی ہوتی ہیں۔ لفظ اپنی جگہ مکمل اور جامد ہوتا ہے۔ اساسی الفاظ شکلوں کی تبدیلیوں کے ذریعے سے اپنے مفہوم میں تغیر و تبدل اور اضافہ نہیں کرتے ۔ ان زبانوں میں سابقوں(Prefixes)، لاحقوں(Suffixes)، وسطیوں(Infixes) اور حروفِ جار کا استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ جملے میں لفظ کی نحوی حیثیت محض اس کے مقام ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نوع کی زبانوں میں مصدر اور عملِ تصریف کا وجود نہیں ہوتا اور نہ ان میں قواعد ہوتی ہے[۴]۔ اس کی بہترین مثال چینی زبان ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے مشرق میں واقع ممالک اور ان کے گرد و نواح کی آبادیوں میں اسی نوع کی زبانیں رائج ہیں۔

(۲) ترکیبی زبانیں (Organic Languages):

اس گروہ میں دنیا کی باقی ماندہ زبانیں شامل ہیں۔ ان میں الفاظ اپنی شکلیں اور مفاہیم بدلتے رہتے ہیں اور جملے میں اپنی نحوی حیثیت سابقوں اور لاحقوں کے ذریعے سے ظاہر کرتے ہیں۔ ایک ہی لفظ اصل یا مصدر ہوتا ہے اور اسی سے متعدد الفاظ مشتق ہوتے ہیں۔ ترکیب کے مختلف مراحل کے اعتبار سے زبانوں کو درج ذیل مزید تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(i) انضمامی زبانیں (ii) امتزاجی زبانیں (iii) تصریفی زبانیں

(i) انضمامی زبانیں (Incorporating Languages):

انھیں کثیر مرکّبی (Poly-Synthetic) زبانیں بھی کہا جاتا ہے۔ انضمامی زبانوں میں لفظ کچھ صوتی ارکان کو حذف کر کے ایک لفظ کے جزو کو دوسرے لفظ کے جزو کے ساتھ اس طرح سے ملا دیا جاتا ہے کہ دونوں کا علاحدہ وجود قائم نہیں رہتا۔ اس کی مزید دو قسمیں یہ ہیں:

☆ مکمل انضمامی (Completely Incorporating):

یہ نوع زیادہ مستند اور معیاری ہے۔ اس میں مختلف الفاظ کے ایک ایک جزو کو لے کر آپس میں اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ ایک طویل لفظ ترتیب پاتا ہے۔ لہٰذا پورے جملے کے بہ جائے طویل لفظ بولا جاتا ہے۔ گرین لینڈ (Green Land) کے اسکیمو (Eskimo) اور شمالی و جنوبی امریکہ کے اصل باشندوں کی زبانیں اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔

☆ جزوی انضمامی (Partially Incorporating):

جزوی انضمامی زبانوں میں جملے میں چند الفاظ کے اجزا کو باہم ملا دیا جاتا ہے، جب کہ بیش تر الفاظ مکمل استعمال ہوتے ہیں، مثلاً فرانس (France) اور سپین (Spain) کی سرحد پر واقع باسک (Basque) زبان۔ اس میں ضمیر سے علاحدہ فعل کا کوئی آزاد وجود ہی نہیں۔ فارسی، فرانسیسی، انگریزی، اردو، بنگالی، گجراتی اور بانتو (Bantu) زبانوں میں بھی اس نوع کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

(ii) امتزاجی زبانیں (Agglutinating Languages):

اردو میں ان زبانوں کے لیے امتزاجی کے علاوہ ارتباطی، اتصالی، تالیفی اور ترکیبی کی اصطلاحیں بھی مستعمل ہیں۔ انضمامی زبانوں کی طرح ان زبانوں میں بھی ہر لفظ کا ایک جزو دوسرے لفظ کے جزو سے مدغم ہوتا ہے۔ دونوں میں البتہ فرق یہ ہے کہ امتزاجی زبانوں کے ہر لفظ کا ہر جزو اپنی جگہ مکمل اور با معنی مانا جاتا ہے، یعنی کسی بھی لفظ کے جزوی حالت میں مستعمل ہونے کے باوجود اِس کی آزاد معنوی حیثیت برقرار رہتی ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ امتزاج کا عمل ہر لفظ میں ہو۔ مادے کی سالمیت اور سابقوں اور لاحقوں کی ترتیب کے باعث امتزاجی زبانیں با قاعدہ ہوتی ہیں۔

امتزاجی زبانیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس قسم کی بہترین نمائندہ زبان ترکی ہے جو قاعدے کے اعتبار سے دنیا کی سب سے سلجھی ہوئی اور باضابطہ

زبان ہے۔علاوہ ازیں جنوبی افریقہ اور جزائر بحرالکاہل کی زبانیں اور یورالی (Uralic)، التائی (Altaic) اور دراوڑی (Dravidian) زبانیں اسی قسم کی ہیں[۵]۔ بین الاقوامی مصنوعی زبان سپرنٹو بھی امتزاجی ہے۔ سابقوں، لاحقوں اور وسطیوں کے مقام کے اعتبار سے امتزاجی زبانوں کی مزید چار قسمیں ہیں۔ واضح رہے کہ اگرچہ ان میں سے ہر قسم میں سابقے اور لاحقے زیادہ تر یکساں ترتیب ہی سے جملے میں آتے ہیں مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی دوسرے مقامات کے سابقے اور لاحقے بھی مل جاتے ہیں۔ یہ قسمیں درج ذیل ہیں:

☆ **سابقہ امتزاجی** (Prefix Agglutinating):

ان زبانوں میں تصریف کا عمل سابقہ لگا کر کیا جاتا ہے۔ افریقہ میں خطِ استوا کے جنوب میں پھیلی بانتو زبانیں اس کی بہترین مثال ہیں۔ اردو اور انگریزی زبان میں بھی سابقے موجود ہیں۔ انگریزی میں نسبتاً کم ہیں اور ہندی زبان میں اس سے بھی کم۔ ہندی میں سابقے عموماً نفی کے اظہار کے لیے آتے ہیں، مثلاً اَن جان، نکما، سگندھ وغیرہ۔

☆ **لاحقہ امتزاجی** (Suffix Agglutinating):

ان زبانوں میں لاحقہ جوڑ کر اشتقاق کا عمل انجام دیا جاتا ہے۔ یورالی، التائی اور دراوڑی زبانیں اسی قسم کی ہیں۔ ترکی اس نوع کی نمائندہ زبان ہے جس کا تعلق زبانوں کے التائی خاندان سے ہے۔

☆ **سابقہ لاحقہ امتزاجی** (Prefix-Suffix Agglitinating):

بحرالکاہل کے جزیروں کی زبانیں سابقہ لاحقہ امتزاجی ہیں۔ بحرِ ہند کے جزیرے مڈگاسکر (Madagascar) کی زبان بھی اسی گروہ سے ہے۔ سابقہ لاحقہ امتزاجی زبانوں میں مختلف خصوصیات کی بنا پر کئی قسم کے گروہ پائے جاتے ہیں۔ ان کی مرکزی قسم وہ ہے جس میں مادہ دو رکنی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ سابقے اور لاحقے، دونوں لگائے جاتے ہیں۔ اس نوع کی نمائندہ زبان جزیرہ نیوگنی (New Guinea Island) کی زبان 'مغوٗ' ہے۔ اس کے علاوہ ملانیشیائی گروہ (Melanesian Group) کی زبانیں بھی سابقہ لاحقہ امتزاجی ہیں۔

☆ **جزوی امتزاجی** (Partially Agglutinating):

سابقہ لاحقہ گروہ کی طرح اس میں بھی کئی اقسام کی زبانیں شامل ہیں جو جداگانہ خصوصیات کی حامل ہیں۔ چند اہم قسمیں یہ ہیں:

☆ پہلی قسم امتزاجی اور غیر ترکیبی کے درمیان میں آتی ہے جیسے سوڈانی خاندان (Sudanic Family) کی زبان ہوسا (Hausa)۔

☆ دوسری قسم امتزاجی اور انضمامی کے بین بین ہے، مثلاً باسک زبان۔ یہ ضمیر اور فعل کے معاملے میں انضمامی ہے اور باقی موقعوں پر امتزاجی۔

☆ تیسری قسم امتزاجی اور تصریفی کے بیچ عبوری ہے۔ اس کی مثال پولی نیشیائی گروہ (Polynesian Group) کی زبانیں ہیں۔

(iii) تصریفی زبانیں (Inflectional Languages):

انھیں اشتقاقی یا متجانسی زبانیں (Fusional Languages) بھی کہا جاتا ہے۔ اس گروہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نحوی رشتے کچھ ایسے

مختصر سابقوں اور لاحقوں کے اضافے سے ظاہر کیے جاتے ہیں کہ جو تاریخ میں بھی کہیں سالم لفظ کی شکل میں نہیں ملتے اور نہ ہی ان کے علاحدہ سے کوئی مستقل معنی ہوتے ہیں۔ وہ مادے کے ساتھ جزو لاینفک بن کر مدغم ہو جاتے ہیں۔ تصریفی زبانیں دنیا کی اہم ترین زبانیں ہیں۔ اس گروہ کی ذیل میں زبانوں کے ہند یورپی (Indo European)، سامی (Semitic) اور حامی (Hamitic) خاندان آتے ہیں۔ سابقوں اور لاحقوں کے مقام اور نوعیت کی بنا پر تصریفی زبانوں کو درج ذیل مزید دو اقسام میں بانٹا گیا ہے:

☆ **دروں تصریفی** (Inner Inflectional):

ان زبانوں میں مادہ تین مصمتوں (Consonants) پر مشتمل ہوتا ہے۔ مصمتے بنیادی لغوی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور قواعدی عنصر خاص طور پر مصوتوں کا ہوتا ہے۔ اس نوع میں مصوتوں (Vowels) کے وسطیوں کی مدد سے تصریف کی جاتی ہے۔ اس عمل میں وسطیوں کے ساتھ اگرچہ سابقے اور لاحقے بھی آسکتے ہیں مگر بنیادی حیثیت وسطیوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ سامی زبانیں اسی نوع سے تعلق رکھتی ہیں جن کی نمائندہ زبان عربی ہے۔

☆ **بروں تصریفی** (Outer Inflectional):

اس گروہ میں شامل زبانوں میں تصریف کا عمل لاحقوں کے ذمے ہے جو کہ خارجی ہوتا ہے۔ اگرچہ ان میں سابقے بھی ملتے ہیں لیکن وہ استخراج کا کام دیتے ہیں، نحوی رشتوں کا نہیں۔ ہند یورپی زبانیں اسی قسم کی ہیں۔

☆ **مرکّبی زبانیں** (Synthetic Languages):

مرکّبی زبانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں نحوی رشتے سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے ادا کیے جانے کی وجہ سے مرکب بنانے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ البتہ ان میں بات وضاحت سے نہیں کہی جاسکتی۔ قدیم کلاسیکی زبانیں مرکّبی ہیں۔ اسی سبب اصطلاح سازی میں ان سے مدد لی جاتی ہے۔ انھی کلاسیکی مرکّبی زبانوں نے بعد از اں تحلیلی زبانوں کو جنم دیا۔ جدید تصریفی زبانوں میں شمالی یورپ میں واقع ملک لتھوانیا (Lithuania) کی زبان،
'لتھوانیائی' (Lithuanian) مرکّبی ہے۔ گویا مدتِ مدید سے اس زبان میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

☆ **تحلیلی زبانیں** (Analytic Languages):

تحلیلی زبانوں میں مرکب بنانے کی صلاحیت اگرچہ کم ہوتی ہے مگر ان میں بات وضاحت سے کہی جاسکتی ہے۔ فرانسیسی، انگریزی، اردو، ہندی وغیرہ اس گروہ کی نمائندہ زبانیں ہیں۔ دروں تصریفی اور بروں تصریفی کی تقسیم کو مرکّبی اور تحلیلی سے ملا لیا جائے تو تصریفی زبانوں کی مزید چار اقسام بنتی ہیں:

☆ دروں مرکّبی تصریفی: اس کی مثال قدیم عربی اور عبرانی زبانیں ہیں۔
☆ دروں تحلیلی تصریفی: یہ جدید عربی اور جدید عبرانی ہیں۔ جدید عبرانی نسبتاً زیادہ تصریفی ہے۔
☆ بروں مرکّبی تصریفی: کلاسیکی ہند آریائی زبانیں یعنی سنسکرت اور اوستا اسی نوع سے تعلق رکھتی ہیں۔
☆ بروں تحلیلی تصریفی: جدید ہند یورپی زبانیں، مثلاً انگریزی، فارسی، ہندی، بنگالی وغیرہ۔

مندرجہ بالا تقسیم بالخصوص مارفیمیات (Morphology) اور کسی قدر نحو (Syntax) کو پیشِ نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ یہ تقسیم قطعیت کی حامل نہیں، کیوں کہ ایک گروہ کی لسانی خصوصیات دوسرے گروہ میں بہ کثرت مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر تحلیلی اور امتزاجی زبانوں میں جملے میں لفظ کا مقام بڑی حد تک اس کے معنی کا تعین کرتا ہے۔ التائی خاندان کی زبانیں امتزاجی ہیں لیکن اس خاندان کی بیش تر زبانوں میں عموماً تحلیلی عناصر بھی موجود ہیں۔ بعد میں آنے والے ماہرین نے

زبان کی تقسیم میں قواعدی خصوصیات کے علاوہ دیگر فونیمی (Phonemic) اور معنیاتی (Sementic) سطحوں کو بھی مدِّنظر رکھنے کی تجویز پیش کی۔ علاوہ ازیں صوتیات (Phonetics) کی بنیاد پر بھی زبانوں کی گروہ بندی کی کوشش کی گئی اور اس سلسلے میں خاص طور پر مصوتی فونیموں (Vowel Phonemes) کو مدِّ نظر رکھا گیا۔ بعض ماہرین نے زبانوں کی تقسیم میں خالص نحوی پیمانوں کو بنیاد بنایا۔

الغرض زبانوں کی تقسیم میں مذکورہ متعدد طریقوں کو آزمانے کا سلسلہ اس امر پر منتج ہوا کہ بلا شبہ مارفیمیات اور قواعد کی بنیاد پر زبانوں کی تقسیم جتنی واضح ہے اتنی کوئی اور نہیں، البتہ زبانوں کی صوری یا نوعیاتی گروہ بندی سے زیادہ مفید اور واضح اگر کوئی تقسیم ہے تو وہ نسلی تقسیم ہے۔ دراصل نسلی اعتبار سے زبانیں جس قدر نزدیک ہوں گی، نوعی اعتبار سے بھی وہ اُسی قدر مماثل ہوں گی۔

زبانوں کی نسلی تقسیم

زبانوں کی ارتقائی تاریخ میں یہ تقسیم بہت اہم ہے۔ اس سے نہ صرف زبانوں کے قریبی تعلق کا پتہ چلتا ہے بلکہ زبانوں کے مختلف طبقات میں کسی بھی زبان کے اصل مقام کے تعین میں آسانی رہتی ہے۔ کسی زبان کے ماضی کی تاریخ جس قدر معلوم ہو اس کا شجرہ اتنی ہی صحت سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔ تحریری ریکارڈ میّسر نہ ہوں تو تاریخی لسانیات کے طریقوں کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ ماہرینِ لسانیات نے تاریخی اور تقابلی مطالعے کے ضمن میں وضع کردہ قواعد کے بل پر زبانوں کی نسلی اعتبار سے درجہ بندی کی ہے۔ اس حوالے سے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ زبانوں کی کن مشترکہ خصوصیات کی بنا پر خاندان تشکیل پاتا ہے؟

نسلی رشتے قائم کرنے میں سب سے اہم صوتی اور صرفی مطابقتیں ہیں۔ ان کے بعد نحوی مطابقت، یعنی فقروں اور جملوں میں لفظوں کی ترتیب اور سب سے آخر میں ذخیرۂ الفاظ کی مشابہت یا مطابقت آتی ہے۔ تصریف کے قاعدوں کے ساتھ سابقوں اور لاحقوں کی ہم آہنگی سے مزید شہادت ملتی ہے۔ دورانِ مطالعہ فونیموں کی مماثلت کو بھی مدِّنظر رکھا جا سکتا ہے مگر یہ بنیادی نکتہ نہیں [۶]۔ جرمن ماہرِ لسانیات، میکس ملر (Max Muller) کے نزدیک نسلی تقسیم کی بنیادیں زبان کے تعمیری عنصر پر قائم ہیں، لیکن جن زبانوں نے اپنی اصل سے الگ ہو جانے کے بعد کچھ ترقی کر لی ہے ان کا دوسری زبانوں سے رشتہ صرف اصل الفاظ کی بنیاد پر ہی دریافت کیا جا سکتا ہے [۷]۔ ان اصلی اور بنیادی الفاظ میں قریبی رشتوں، ابتدائی اعداد، خاص خاص اعضائے جسم، ضمائر، بنیادی افعال اور گھریلو پالتو جانوروں کے نام شامل ہیں۔ دوسرے الفاظ کا جائزہ ان میں وسیع مماثلت کی بنا پر لیا جانا چاہیے۔ [۸]

اٹھارھویں صدی میں زبانوں کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کے آغاز و فروغ سے اس مفروضے کا قیام عمل میں آیا کہ دنیا کی تمام زبانیں کسی نہ کسی طرح سے باہم مربوط ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر ایک گروہ کی تمام زبانیں کسی نہ کسی صورت ایک قدیمی زبان سے ماخوذ ہیں۔ یہ قدیمی زبان بعض صورتوں میں معلوم ہے اور بعض میں نہیں۔ اس امر کی تصدیق یورپی زبانوں کے تقابلی جائزے سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی اور دیگر کئی رومانس زبانیں (Romance Languages) بنیادی طور پر لاطینی زبان سے ماخوذ ہیں۔ اس صورت میں متعدد رومانس زبانوں کی اصل قدیمی معلوم 'لاطینی زبان' ہے۔ اس حوالے سے لاطینی کو 'مادر زبان' (Parent Language) کی حیثیت دی جاتی ہے جب کہ فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی اور دیگر رومانس زبانوں کو 'دختر زبانیں' (Daughter Languages) کہا جائے گا۔ گویا لاطینی سے ماخوذ یہ دختر زبانیں تمام تر موجودہ باہمی مغائرت اور مستقبل میں متوقع مزید اختلافات کے باوجود 'متحد الاصل' اور ایک دوسرے کی بہنیں کہلائیں گی۔ اسی طرح اگر مزید بڑے پیمانے پر دیکھا جائے تو زبانوں کے سب سے اہم اور بڑے خاندان 'ہند یورپی' میں اصل قدیمی ہند یورپی زبان سے لاطینی، یونانی، سنسکرت اور دیگر کئی دختر زبانیں ماخوذ ہیں جن سے بعد ازاں مزید متعدد زبانیں پھوٹیں۔

اس تناظر میں یہ امکان خارج البحث قرار نہیں دیا جا سکتا کہ دنیا کی تمام زبانیں بنیادی طور پر ایک ایسی ہی قدیم زبان (Ur Language) [۹] سے پھوٹی ہیں جو ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں دفن ہو چکی ہے۔ اکثر ماہرین کے ہاں اس کے لیے انگریزی لفظ 'Nostratic' [۱۰]

مستعمل ہے۔انیسویں صدی کی ابتدا میں زبانوں کے دیگر خاندانوں اور گروہوں کے حوالے سے کیے جانے والے تقابلی مطالعے سے حاصل کردہ نتائج 'اصل قدیم زبان' کے نظریے کی مزید تائید کرتے ہیں۔

> All the Oriental nations jam tongue and words together in the throat, like the Hebrews and Syrians. All the Mediterranean peoples push their enunciation forward to the palate, like the Greeks and the Asians. All the Occidentals break their words on the teeth, like the Italians and Spaniards ...[11]

زبانوں کے باہمی ربط کی نوعیت و کیفیت کی وضاحت میں ماہرینِ لسانیات کے ہاں مختلف خاندانوں اور گروہوں کے لیے متفرق اصطلاحات مستعمل ہیں۔مثال کے طور پر زبانوں میں موجود واضح نسلی مماثلت کی بنا پر انھیں ایک ہی 'خاندان' (Family) کے تحت رکھا جاتا ہے۔اس کے برعکس سرسری یا غیر واضح نسلی تعلق پر ان کا شمار 'فائلم' (Phylum) کی ذیل میں کیا جائے گا۔کم مربوط زبانوں کے گروہ کے لیے اکثر لفظ 'میکرو فائلم' (Macro Phylum) بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

> ... As comparative studies grew to include larger numbers of potentially related languages, the term 'Family came to be used with increasing generality, often applied to cases where a genetic relationship was impossible to demonstrate. Usage varies greatly, but there is now a trend to avoid this term for language groups with only a remote degree of relationship, or where a clear ancestor language is unknown. 'Phylum' (plural 'Phyla') has come to be widely used in such cases with 'Macro-Phylum' available for still less definite groupings.[12]

مثال کے طور پر آسٹریلیا کی تمام اصل قبائلی زبانیں (Aboriginal Languages) اگرچہ آپس میں مربوط ہیں مگر تاریخی و نسلی اعتبار سے ان کا باہمی ربط کچھ خاص واضح نہیں اسی سبب ان تمام زبانوں کے مجموعے کو 'آسٹریلیائی خاندان' کے بہ جائے 'آسٹریلیائی فائلم' یا 'آسٹریلیائی میکرو فائلم' کا نام دیا جائے گا۔

تقسیم کے مشترکہ معیار کے باوجود زبانوں کے خاندان کی تعداد کے ضمن میں ماہرین کے ہاں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔عام طور پر زبانوں کے خاندانوں، ذیلی گروہوں اور نمائندہ زبانوں کی جو تقسیم قابلِ قبول ہے اس کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

(ا) ہندامریکی زبانیں (American Indian Languages):

ان زبانوں کا تعلق شمالی، وسطی اور جنوبی امریکہ میں مقیم قدیم باشندوں سے ہے جنھوں نے قریباً پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) سال قبل ایشیا سے امریکہ کی طرف ہجرت کی[13]۔امریکی خطے میں قریباً ایک ہزار سے زائد ہندامریکی زبانیں مستعمل ہیں۔ایک سو (۱۰۰) سے زیادہ امریکی ریاستوں اور کینیڈا (Canada) میں، تین سو (۳۰۰) کے قریب وسطی امریکہ (Central America) اور میکسیکو (Maxico) میں اور ایک ہزار (۱۰۰۰) کے لگ بھگ جنوبی امریکہ (South America) میں بولی جاتیں ہیں۔ان ہندامریکی زبانوں کی گروہ بندی کا آغاز قریباً ایک صدی قبل ہوا اور آج بھی اسی طرح سے جاری ہے۔متعدد ماہرین نے مختلف ادوار میں ان زبانوں کے خاندانوں اور گروہوں کی تعداد کا تعین کیا ہے جو کہ ایک دوسرے سے قطعی متضاد ہے اور تا حال نظرِ ثانی کے عمل سے گزر رہا ہے۔

شمالی امریکہ کی زبانوں میں الگونکیائی خاندان (Algonkian Family) کا سب سے زیادہ مطالعہ کیا گیا اس لیے کہ یورپ والوں کو سب سے

پہلے اسی زبان کے بولنے والوں سے واسطہ پڑا تھا[۱۴]۔ اوجیبوا (Ojibwa)، بلیک فوٹ (Black Foot)، کری(Cree)، فاکس(Fox)اور ڈیلاویئر (Delaware)اس خاندان کی نمائندہ زبانیں ہیں۔

میکسیکواور وسطی امریکہ میں زبانوں کے ازٹیک (Aztec)اور مایا (Maya) خاندان اہم ہیں۔میکسیکو میں اب بھی ازٹیک اور مایازبانوں کی متعدد بولیاں مستعمل ہیں۔

جنوبی امریکہ میں زبانوں کے دوخاندان قابلِ ذکر ہیں، اراوک (Arawak)اور کارب (Carib)۔ان میں کارب زبانیں بہت پچھڑی ہوئی ہیں جب کہ اراوک زبانیں نسبتاً اہم ہیں اور وسیع علاقے میں بولی جاتی ہیں۔ اس خطے کی ایک اور اہم زبان کویچوا (Quechua) ہے جو اب بھی پیرو (Peru) میں ہسپانوی کے متوازی بہ کثرت بولی جاتی ہے۔جنوبی امریکہ میں یہ واحد زبان ہے جو کولمبس(Columbus) کی آمد سے قبل ایک تہذیب کا ذریعہ اظہار تھی۔

ان گنت لاطینی ہندامریکی زبانوں کو تین اہم خاندانوں:میکروچبچان(Macro-Chibchan)، جی پانو کاریب (Ge-Pano_Carib)اوراینڈین استوائی (Andean Equatorial) میں منقسم کر دیا گیا ہے[۱۵]۔ یہ زبانیں مائل بہ زوال ہیں۔ پانچ سو(۵۰۰) سال قبل ان زبانوں کے بولنے والے قبائل کی تعداد قریباً پانچ کروڑ تھی جواب بہ مشکل ڈیڑھ کروڑ رہ گئی ہے۔[۱۶]

(۲) کھواسان زبانیں (Khoisan Languages):

جنوبی افریقہ میں مستعمل وہ پینتیس (۳۵) زبانیں جو دیگر بانتو زبانوں سے واضح لسانی اور نسلی رشتے نہ ہونے کے سبب بانتو گروہ کی ذیل میں نہیں آتیں ،کھواسان خاندان کے تحت شمار کی گئی ہیں۔

The name Khoisan is composed of word 'Khoi', the Hottentot word for Hottentot,and'San',theHottentotwordforBushman.[17]

ان زبانوں کے بولنے والے سب سے پچھڑے ہوئے قبیلوں میں سے ہیں۔اس خاندان کی نمائندہ زبانیں بُش مین (Bushman)، ہاٹن ٹاٹ (Hottentot)، ساندو(Sandawe)اور آستا(Hasta) ہیں۔بُش مین زبان جنوبی افریقہ،نمیبیا(Namibia)اور بوٹسوانا(Botswana) میں رائج ہے جب کہ ہاٹن ٹاٹ فقط نمیبیا میں بولی جاتی ہے۔

(۳) چاری نیل زبانیں (Chari-Nile Languages):

چاری نیل خاندان ابتداءً 'میکروسوڈانی خاندان'(Macro-Sudanic Family) کے نام سے موسوم تھا[۱۸]۔ زبانوں کا یہ خاندان خطِ استوا کے اوپر مغرب سے مشرق تک پھیلا ہوا ہے۔ زبانوں کی تقسیم کے حوالے سے اس خاندان کے بارے میں بھی اختلافات ہیں۔بعض ماہرین کے مطابق یہ اور بانتو خاندان مل کر ایک بڑا حبشی افریقی خاندان تشکیل دیتے ہیں اور حامی خاندان ان سے الگ ہے اور حبشی بھی نہیں۔بعض کے نزدیک یہ خاندان، بانتو اور حامی خاندانوں سے الگ ہے یا پھر ان کا ہم نسب ہے[۱۹]۔علاوہ ازیں اکثر ماہرین کا خیال ہے کہ چاری نیل زبانیں اور صحارا زبانیں(Saharan Languages) نسلی اعتبار سے مماثل ہیں اور یہ زبانوں کے بڑے خاندان 'Nilo-Saharan' کے تحت شمار کی جاتی ہیں۔[۲۰]

قریباً دوسو (۲۰۰) سے زائد چاری نیل زبانیں مزید دو گروہوں، مشرقی سوڈانی (Eastern Sudanic)اور وسطی سوڈانی (Central Sudanic) میں منقسم ہیں۔مشرقی سوڈانی گروہ نسبتاً بڑا ہے۔ اِس گروہ میں نیو بین (Nubian)، لانگو (Lango)، ترکانا(Turkana)اور ماسائی

(Masai) زبانیں شامل ہیں جو بالترتیب سوڈان(Sudan)، یوگینڈا(Uganda)، کینیا (Kenya) اورتنزانیہ(Tanzania) میں مستعمل ہیں۔

وسطی سوڈانی گروہ کی زبانوں میں سارا (Sara) اور ماڈی (Madi) اہم ہیں جو بالترتیب چاڈ (Chad) اور یوگینڈا میں رائج ہیں۔ان علاقوں میں دیگر چاری نیل زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔

(۴) افریقی ایشیائی زبانیں (Afro-Asiatic Languages):

یہ زبانیں تین ہزار(۳۰۰۰) سال قبل مسیح ارتقا پذیر ہوئیں۔ یہ شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے علاقوں میں مستعمل رہی ہیں۔اگلے وقتوں میں ان زبانوں کے مجموعے کو حامی سامی خاندان(Hamito-Semitic Family)[21] بھی کہا جاتا رہا ہے[22]۔

> The term 'Afro-Asiatic' is a recent coinage, having replaced the older term 'Hamito-Semitic'. The family embraces five groups of languages spoken by people of vastly different racial, religious, and cultural origins, but today there is little doubt among linguists that their languages are interrelated.[23]

تقریباً ڈھائی سو(۲۵۰) زبانوں کا حامل افریقی ایشیائی خاندان درج ذیل پانچ گروہوں میں منقسم ہے:

(i) سامی گروہ (Semitic Group):

سامی گروہ مزید دو ذیلی گروہوں، مشرقی سامی گروہ(Easter Semitic Group) اور مغربی سامی گروہ (Western Semitic Group) میں منقسم ہے۔مشرقی سامی گروہ کی قدیم ترین زبان اکادی (Akkadian) ہے جو قدیم میسو پوٹیمیا (Mesopotamia) میں تین ہزار سال قبل رائج تھی۔ اکادی کی دو اہم بولیاں اسوری (Assyrian) اور بابلی (Babylonian) ہیں جو میسو پوٹیمیا اور وادیِ نیل(Nile Valley) میں دو ہزار سال قبل مسیح تک مستعمل رہیں۔آٹھویں صدی قبل مسیح میں آرامی (Aramaic) نے اسوری اور بابلی کی جگہ لے لی۔مغربی سامی گروہ کی زبانیں مشرقی ساحلی علاقوں میں بولی جاتی رہی ہیں۔عبرانی، آرامی اور عربی اس گروہ کی تین بنیادی زبانیں ہیں۔[24]

سامی زبانوں کا ایک اہم ذیلی گروہ کنعانی(Canaanitic) ہے۔کنعانی زبانوں میں عبرانی سب سے اہم ہے۔توریت عبرانی زبان ہی میں ہے اور اس کی ترتیب کا زمانہ آٹھ سو(۸۰۰) قبل مسیح کا ہے۔قدیم عبرانی پہلی صدی عیسوی کے آخر تک کتابوں میں رائج رہی۔ جدید عبرانی ساتویں صدی عیسوی تک زندہ رہی۔اس صدی میں عربی کے فروغ سے عبرانی کا خاتمہ ہو گیا مگر بعد ازاں انیسویں صدی میں حکومتِ اسرائیل کے قیام سے عبرانی کے احیا کی بھرپور کوشش کی گئی۔اب یہ اسرائیل کی سرکاری زبان ہے مگر کسی کی مادری زبان نہیں۔

آرامی اور عبرانی زبانیں بہت حد تک مماثل ہیں۔قدیم آرامی زبان کے کتبے آٹھویں صدی قبل مسیح کے اوائل کے ہیں۔انجیل کے بعض حصے آرامی میں لکھے گئے۔فلسطین میں عبرانی کے زوال کے بعد آرامی ہی کا بول بالا تھا مگر ساتویں صدی میں عربوں کے ہاتھوں فلسطینیوں کی شکست سے آرامی کا خاتمہ ہوا اور عربی رائج کر دی گئی۔

عربی زبان سامی گروہ کی سب سے اہم اور نمائندہ زبان ہے جسے پندرہ(۱۵) سے زائد ممالک کی سرکاری زبان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔عربی کی قدیم بولیوں میں صرف مکہ کی بولی 'حجازی' باقی ہے ۔ البتہ نجد کی عربی زیادہ خالص اور بیرونی اثرات سے پاک ہے۔ علاوہ ازیں ایتھوپیا

(Ethiopia) کی سرکاری زبان امہری(Amharic)اور دیگر ایتھوپیائی زبانیں بھی سامی گروہ میں شمار ہوتی ہیں۔

(ii) بر بر گروہ (Berber Group):

چوتھی صدی قبل مسیح کے قدیم لیبیائی زبان کے نمونے چٹانوں پر کندہ ملے ہیں۔قدیم لیبیائی کے الفاظ جدید بر بر زبانوں میں ملتے ہیں جو الجیریا(Algeria)، تیونس، مراکش(Morocco) موریطانیہ، سینی گال(Senegal)اور ریگستانِ صحارا (Sahara Desert) میں بولی جاتی ہیں۔ان میں ہوسا (Hausa)، شاویہ (Shawia)، کبیلا (Kabyle)اور طوارگ (Tuareg)نمائندہ زبانیں ہیں۔ بر بر گروہ کی تمام زبانیں باہم قریبی مماثلت رکھتی ہیں۔ اسی سبب اسے زبانوں کا متجانس گروہ (Homogeneous Group) کہاجاتا ہے۔[۲۵]

(iii) کُشٹک گروہ (Cushitic Group):

کُشٹک زبانوں میں افریقہ کے نشیبی اور فرازی علاقوں کے گروہ شامل ہیں۔نشیبی زبانیں اگرچہ بنیادی طور پر ایتھوپیا اور سومالیہ (Somalia) میں مستعمل ہیں البتہ ان کا پھیلاؤ کینیا اور سوڈان تک ہے۔ ایتھوپیا کے نسبتاً وسیع رقبے میں رائج کُشٹک زبانوں میں گالا (Gala)، اورومو (Oromo)،افار (Afar)،ساہو (Saho)اور سومالی (Somali)اہم ہیں۔

کُشٹک زبانوں کے فرازی گروہ کی اہم زبانیں سیدمو(Sidamo)اور بر.جی(Burji) ہیں۔

(iv) چاڈی گروہ (Chadic Group):

اس گروہ کی نمائندہ زبان ہوسا (Hausa) ہے۔

(v) مصری گروہ (Egyption Group):

حامی زبانوں میں قدیم مصری سب سے اہم تھی۔ اس زبان میں چار سو (۴۰۰) سال قبل مسیح کے کتبے ملتے ہیں۔ بعد ازاں یہ زبان قبطی (Coptic) کہلائی۔تیسری صدی عیسوی میں قبطی زبان میں انجیل کا ترجمہ ہوا۔دسویں صدی کے قریب یہ ناپید ہوگئی اور اس کی جگہ عربی نے لے لی۔

(۵) نائجر کانگو زبانیں (Niger-Congo Languages):

نائجر کانگو خاندان، نائجر کورڈوفینی (Niger-Kordofanian) بھی کہلاتا ہے۔یہ افریقی زبانوں کا سب سے بڑا خاندان ہے۔اس گروہ کی تقریباً ایک ہزار(۱۰۰۰)زبانیں ہیں جو مزید درج ذیل چھ ذیلی گروہوں میں منقسم ہیں جن میں بانتو گروہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے :

(i) مانڈے گروہ (Mande Group):

اس گروہ کی اہم زبانیں ملینکا (Malinke) ،بمبارا (Bambara)اور کیپل (Kapelle) ہیں جو بالترتیب سینی گال (Senegal)،مالی (Mali)اور لائبیریا (Liberia) میں بولی جاتی ہیں۔

(ii) مغربی اٹلانٹک گروہ (West Atlantic Group):

فلانی (Fulani) اس گروہ کی اہم زبان ہے جو مغربی ایشیا کے وسیع علاقے میں مستعمل ہے۔

(iii) وولٹائی گروہ (Voltaic Group):

اس گروہ کی زبانوں میں گھانا(Ghana) میں مستعمل گرما (Gurma) زبان، مالی میں بولی جانے والی سینیفو (Senufo) زبان اور برکینا فاسو (Burkina Faso) میں رائج موسی(Mossi) زبان شامل ہے۔

(iv) کوا گروہ (Kwa Group):

اس گروہ کی زبانیں نائجیریا (Nigeria)، گھانا، ٹوگو (Togo)، بینن (Benin) اور لائبیریا میں رائج ہیں۔ اہم زبانیں یوروبا (Yoruba)، فانٹی (Fanti)، فان (Fon) اور کرو (Kru) ہیں۔

(v) اداموا گروہ (Adamawa Group):

اس گروہ میں زنڈہ (Zande) اور سانگو (Sango) زبانیں شامل ہیں جو بالترتیب سوڈان اور وسطی افریقہ میں مستعمل ہیں۔

(vi) بانتو گروہ (Bantu Group):

بانتو گروہ کی سب سے اہم زبان سواہیلی (Swahili) ہے جو وسیع پیمانے پر وسطی اور مشرقی افریقہ میں، بالخصوص مشرقی ساحل پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ابتداءً یہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی مگر اب رومن میں لکھی جانے لگی ہے۔ مغربی افریقی بانتو گروہ
بحرِ اوقیانوس کی خلیج گنی سے لے کر مشرق میں سوڈان تک پھیلا ہوا ہے۔ بانتو گروہ کی دیگر زبانوں میں کانگو(Kongo)، گاندا(Ganda)، بمبا (Bemba)، شونا (Shona)، سوانا(Tswana)، سوتھو (Sotho) اور زولو (Zulu) وغیرہ شامل ہیں۔
نائجر کانگو خاندان کے تمام گروہوں میں بانتو گروہ سب سے اہم اور وسیع ہے۔ یہاں تک کہ اکثر ماہرین اسے الگ خاندان شمار کرتے ہیں۔

(۶) اسکیمو۔الیٹ زبانیں (Eskimo-Aleut Languages):

یہ خاندان فقط دو بنیادی زبانوں، انیوٹ (Inuit) اور یوپائک (Yupik) پر مشتمل ہے۔ انیوٹ زبانیں گرین لینڈ، کینیڈا، الاسکا (Alaska) اور سائبیریا(Siberia) میں بولی جاتی ہے جب کہ یوپائک زبان روس(Russia) کے بیش تر جزیروں اور 'Aleutian' جزائر میں رائج ہے۔ یہ جزیرے الاسکا کی جنوب مشرقی نوک سے سائبیریا کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ باہم مربوط یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔ ماہرین ان دونوں زبانوں اور الاسکا کی دیگر ہند بولیوں، سائبیریا کی چکچی(Chukchi) زبان اور جاپان کی اینو(Ainu) زبان کے درمیان میں نسلی مماثلتوں کی دریافت میں تا حال سرگرداں ہیں۔

(۷) پالیوایشیائی زبانیں (Paleo-Asiatic Languages):

یہ خاندان سائبیریا کے شمالی اور مشرقی علاقوں میں بولی جانے والی ان گنت زبانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک چھوٹا گروہ باہم مربوط زبانوں کا ہے۔ جن میں چکچی(Chukchi) کوریاک (Koryak) اور ایٹلمن (Itelmen) زبانیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اس خاندان میں تین ایسی زبانیں بھی شامل ہیں

جو نہ تو باہم نسلی اشتراک کی حامل ہیں اور نہ ہی کسی اور خاندان کی زبانوں سے لسانی مماثلت رکھتی ہیں۔ان تینوں میں سے ایک زبان گلیک (Gilyak) ہے جسے نیوکھ (Nivkh) بھی کہتے ہیں۔یہ زبان دریائے امر
(Amur River)اور جزیرہ سھالن (Sakhalin Island)میں بولی جاتی ہے۔ دوسری زبان کٹ (Ket)یا ینیسئی او سٹیک (Yenisei-Ostyak) ہے جو وسطی ایشیا میں دریائے ینیسئی (Yenisei River) کے کناروں پر آباد افراد کی زبان ہے اور تیسری زبان یا کا گر (Yakagar) یا اڈیول(Odul) کہلاتی ہے جو جمہوریہ یاقوتیہ(Republic Of Yakutiya) میں رائج ہے۔

(۸) آسٹریلیائی زبانیں (Australian Languages):

ان زبانوں کے بولنے والے بہت پچھڑے ہوئے قبائلی ہیں جن کی تعداد روز بہ روز کم ہونے سے زبانیں بھی ختم ہوتی جارہی ہیں۔اس خاندان میں شامل قریباً سو (۱۰۰) سے زائد زبانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان میں سے ایک جنوبی آسٹریلیا کی قدیم قبائلی زبانوں پر مشتمل پاما نیوگن گروہ (Pama-Nyugan Group) ہے اور دوسرا شمالی آسٹریلیا کی قریباً پچاس (۵۰) کے لگ بھگ زبانوں کا حامل غیر پاما نیوگن گروہ(Non Pama-Nyugan Group ہے۔ان زبانوں میں تا حال کوئی نسلی رشتہ قائم نہیں کیا
جاسکا۔ارانڈا (Aranda) اور مرنجین (Murngin) اس خاندان کی نمائندہ زبانیں ہیں۔

(۹) پاپوائی زبانیں (Papuan Languages):

یہ زبانیں بنیادی طور پر نیوگنی(New Guinea)،آس پاس کے کئی جزائر اور نیو برطانیہ(New Britian) میں بولی جاتی ہیں۔اس خاندان کے تحت زبانوں کو دراصل لسانی مماثلت سے زیادہ جغرافیائی بنیادوں پر شمار کیا گیا ہے۔اسی سبب یہ ایک دوسرے سے اس قدر منحرف ہیں کہ بہ مشکل ایک ہی خاندان کی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ زبانیں قریباً پانچ سو (۵۰۰) سے زائد ہیں لیکن ان کے بولنے والے کم تعداد میں رہ گئے ہیں۔ مرنڈ (Marind) ،نمبورن (Nimboran)،اینگا (Enga)، کیٹ (Kate) اور ٹولائی(Tolai) اس خاندان کی نمائندہ زبانیں ہیں۔

(۱۰) ملایا پولی نیشیائی زبانیں (Malayo-Polynesian Languages):

یہ خاندان آسٹرونیشیائی(Austronesian) بھی کہلاتا ہے۔تقریباً ہزار(۱۰۰۰) سے زیادہ زبانوں پر مشتمل یہ خاندان ہند یورپی کے بعد سب سے بڑا خاندان ہے۔یہ زبانیں ہوائی جزیرے(Hawaii Island)،تائیوان(Taiwan)[۲۶]،فلپائن(Philippine)،انڈونیشیا(Indonesia) کے آس

پاس تمام جزیروں، ملائیشیا(Malaysia)، نیوگنی، آسٹریلیا،تسمانیہ(Tasmania) اور یہاں تک کہ بحرالکاہل کے ایسٹر جزیرے (Easter Island) اور افریقہ کے جنوب مشرق میں مڈگاسکر جزیرے تک میں بولی جاتی ہیں۔ملایا(Malaya) اور بھاشا انڈونیشیا کے سوا باقی زبانوں میں سے بیش تر پچھڑی ہوئی زبانیں ہیں۔یہ خاندان مزید چار گروہوں میں منقسم ہے۔

(i) انڈونیشیائی گروہ (Indonesian Group):

یہ گروہ مزید تین ذیلی گروہوں؛ شمالی گروہ، جنوبی گروہ اور مغربی گروہ میں بٹا ہوا ہے۔

- ☆ شمالی گروہ تائیوان اور فلپائن جزیروں پر مشتمل ہے۔تائیوان کے مغربی حصے میں چینی زبان اور مشرقی حصے میں فارموسائی زبان رائج ہے۔ فارموسائی پر چینی زبان کے گہرے اثرات ہیں۔ٹگالوگ(Tagalog) فلپائن کی سب سے اہم زبان ہے۔
- ☆ جنوبی گروہ ملائیشیا اور انڈونیشیا پر مشتمل ہے۔ یہاں ملایا زبان مستعمل ہے۔ یہ زبان نہ صرف جنوبی گروہ کی بلکہ پورے ملایا پولی نیشیائی خاندان کی سب سے اہم اور بنیادی زبان ہے۔اس میں چودھویں صدی کی ابتدا سے ادب ملتا ہے۔ یہ انڈونیشیا کی سرکاری زبان ہے۔ملائیشیا میں یہ عربی رسم الخط اور انڈونیشیا میں رومن میں لکھی جاتی ہے۔اسے عربی، ڈچ اور سنسکرت، تینوں زبانوں نے متاثر کیا۔

☆ مغربی گروہ میں جاوا (Java) اور جزیرہ مڈگاسکر کی زبانیں شامل ہیں۔ جاوا میں جاوی (Javanese) زبان اور مڈگاسکر میں مالا گاسی (Malagasy) زبان مستعمل ہے۔

(ii) مائیکرونیشیائی گروہ (Micronesian Group):

مائیکرونیشیا دراصل ملائیشیا اور پولی نیشیا کے بیچ کا عبوری خاندان ہے جو پاپوا (Papua) کے مشرق میں بہت چھوٹے جزیروں کو کہتے ہیں۔ یہ گروہ قریباً آٹھ (۸) زبانوں پر مشتمل ہے۔ یہ زبانیں چامورو (chamorro)، ترکیس (Trukese)، پلاؤ (Palau)، نوروان (Nauruan)، گلبرٹیس (Gilbertese)، مارشلیس (Marshallese)، یاپیس (Yapese) اور پوناپی (Ponapean) ہیں۔

(iii) ملانیشیائی گروہ (Melanesian Group):

اس گروہ کی زبانیں خطِ استوا کے جنوبی علاقوں میں رائج ہیں۔ فجی (Fijian) اس گروہ کی سب سے اہم اور نمائندہ زبان ہے۔ علاوہ ازیں سو (۱۰۰) سے زائد ملانیشیائی زبانیں، نیوگنی، نیوبرطانیہ، نیوآئرلینڈ اور دیگر کئی جزیروں میں مستعمل ہیں۔

(iv) پولی نیشیائی گروہ (Polynesian Group):

یہ گروہ ہوائی جزیرے اور اس کے بالکل جنوب میں ساموا (Samoa) اور ٹونگا (Tonga) تک پھیلا ہوا ہے۔ ساموآن (Samoan)، ٹونگا (Tongan)، ماوری (Maori) اور مارقیسان (Marquesan) پولی نیشیائی زبانیں ہیں۔ ایک دوسرے سے جغرافیائی فصل کے باوجود ان زبانوں میں یک سانی ہے اور ان کے بولنے والے بہ آسانی ایک دوسرے کو سمجھ لیتے ہیں۔

(۱۱) مون کھمیر زبانیں (Mon Khmer Languages):

مون کھمیر زبانیں ایشیا کے جنوب مشرقی علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ اس خاندان کی وجہِ تسمیہ یہ ہے:

> Their name is derived from the two most important members of the family - Khmer, the national language of Cambodia, and Mon, a relatively minor language today, but at one time one of the most influential in the region.[27]

قریباً سو (۱۰۰) مون کھمیر زبانیں تھائی لینڈ (Thailand)، میانمر (Myanmar)، ویتنام (Vietnam) اور ہندوستان میں کچھ پچھڑے ہوئے قبیلوں میں رائج ہیں۔ چین اور برما کی سرحد کے دونوں جانب قریبی سرحدی علاقوں میں کاوا (Kawa) زبان بولی جاتی ہے جب کہ پالانگ (Palaung) زبان برما میں اور کھازی (Khasi) زبان آسام (Assam) میں مستعمل ہے۔ اس کا ذخیرہ الفاظ برما کی مون زبان سے مماثل ہے۔ اکثر ماہرین مون کھمیر زبانوں اور ہندوستان کی منڈا زبانوں کو ملا کر ایک بڑا خاندان، آسٹروایشیائی (Austro-Asiatic) خاندان قرار دیتے ہیں جب کہ بعض انھیں تبت چینی خاندان سے ملاتے ہیں۔

(۱۲) چینی تبّتی زبانیں (Sino-Tibetan Languages):

تقریباً تین سو (۳۰۰) سے زائد مشرقی ایشیائی زبانوں پر مشتمل یہ خاندان، 'ہند چینی' (Indo-Chinese) کے نام سے بھی موسوم ہے۔ ان زبانوں کے بولنے والے ہند یورپی کے بعد سب سے زیادہ ہیں۔ یہ زبانیں میانمر، تھائی لینڈ، تائیوان (Taiwan)، چین (China) اور ناگالینڈ (Nagaland) میں رائج ہیں۔ انھیں مزید درج ذیل چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(i) چینی گروہ (Chinese Group):

اس گروہ کی زیادہ تر زبانیں چین اور تائیوان میں بولی جاتی ہیں۔ البتہ کچھ زبانیں انڈونیشیا، ملائیشیا، تھائی لینڈ، سنگاپور (Singapore) اور ہانگ کانگ (Hong Kong) میں بھی مستعمل ہیں۔ چینی زبان اس گروہ کی نمائندہ زبان ہے۔ یہ زبانیں اور ان کی بولیاں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے بولنے والوں کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنا مشکل ہے۔

(ii) تھائی گروہ (Tai Group):

تھائی گروہ کی سب سے اہم اور نمائندہ زبان 'تھائی' ہے۔ علاوہ ازیں اس گروہ میں لاؤ (Lao)، پئی (Puyi)، تنگ (Tung)، شان (Shan) اور سیامی (Siamese) زبانیں بھی شامل ہیں جو چین کے متعدد علاقوں کے علاوہ میانمر اور ویتنام میں بولی جاتی ہیں۔ شمالی تھائی کی بولیاں شمالی مشرقی آسام اور شمالی میانمر میں بولی جاتی ہیں جب کہ تھائی کی مشرقی شاخ چین کے جزیرے ہینان (Henan Island) میں بھی رائج ہے۔

(iii) تبت برمی گروہ (Tibto-Burman Group):

تبّتی (Tibetan) اور برمی (Burmese) اس گروہ کی خاص زبانیں ہیں۔ تبّتی پر سنسکرت کا کافی اثر ہے اور اس کا رسم الخط بھی براہمی کی شاخ ہے۔ برمی زبان میانمر کی سرکاری زبان ہے۔ اس کے ادب پر پالی کا گہرا اثر ہے۔ اس گروہ کی دیگر خاص زبانوں میں لاہُو (Lahu)، چن (Chin)، گارو (Garo)، مرمی (Murmi) اور جونکھا (Jonkha) شامل ہیں جو بالترتیب چین، میانمر، آسام اور انڈیا، نیپال اور بھوٹان (Bhutan) میں بولی جاتی ہیں۔

(iv) میاؤ یاؤ زبانیں (Miao-Yao Languages):

> The two chief languages, which give the group its name are Miao (also called Hmong), spoken in several varieties by 4.5 million people, and Yao (also called Mien), spoken by nearly a million people.[28]

یہ پندرہ (۱۵) زبانوں پر مشتمل ایک چھوٹا گروہ ہے جو 'ہمونگ مین' (Hmong-Mien) گروہ بھی کہلاتا ہے۔ یہ زبانیں جنوبی چین اور اس سے ملحقہ جنوب مشرقی ایشیا کے کچھ علاقوں میں رائج ہیں۔

تبت چینی خاندان کے مذکورہ بالا چاروں گروہ نہ صرف متخالف ہیں بلکہ ان کی زبانیں بھی باہم مختلف ہیں۔

(۱۳) منڈا زبانیں (Munda Languages):

'منڈا' دراصل اسی خاندان کی ایک زبان 'منڈاری' کا لفظ ہے جس کے معنی ' سردار' ہیں[۲۹]۔ یہ زبانیں اُڑیسہ، بہار، بنگال، مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش میں مستعمل ہیں۔ اس کے علاوہ ہماچل پردیش کے بعض حصوں میں بھی بولی جاتی ہیں۔ اس خاندان کی سب سے خاص اور بنیادی زبان سنتھالی (Santali) ہے جو بہار، مشرقی بنگال اور اُڑیسہ میں رائج ہے۔ اسی طرح منڈاری (Mundari) اور ہو (Ho) زبانیں جنوبی بہار اور جنوبی اُڑیسہ میں بولی جاتی ہیں۔

سنتھالی، منڈاری اور ہو زبانیں نوعی اور نسلی اعتبار سے باہم اس قدر مماثل ہیں کہ بعض ماہرین انھیں ایک ہی نام 'کھرویڈی' (Kherwadi) سے ظاہر

کرتے ہیں [۳۰]۔ان کے علاوہ سوارا (Savara) اور کورکو (Korku) بھی اس خاندان کی اہم زبانیں ہیں جو بالترتیب جنوبی اُڑیسہ، مغربی مدھیہ پردیش اور شمال مشرقی مہاراشٹر میں بولی جاتی ہیں۔

(۱۴) دراوڑی زبانیں (Dravidian Languages):

تقریباً پچیس (۲۵) زبانوں پر مشتمل یہ خاندان بہار، اُڑیسہ، مدھیہ پردیش، سری لنکا اور دورافتادہ بلوچستان تک پھیلا ہوا ہے۔جنوبی بھارت میں یہ زبانیں بہ کثرت بولی جاتی ہیں۔اس خاندان کی چار اہم اور نمائندہ زبانیں تیلگو (Telugu)، تامل (Tamil)، کنڑا (Kannada) اور ملیالم (Malayalam) ہیں۔

تامل ان چاروں میں جغرافیائی اعتبار سے خاصے بڑے پیمانے پر بولی جانے والی زبان ہے۔اس کے بولنے والے تامل ناڈو، سری لنکا، ملائیشیا، انڈونیشیا، ویتنام، مشرقی اور جنوبی افریقہ کے متعدد علاقوں اور بحرِ ہند کے بعض جزیروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔یہ قدیم ترین دراوڑی زبان ہے [۳۱]۔تیلگو زبان آندھراپردیش میں رائج ہے۔اس میں سنسکرت الفاظ بہ کثرت ہیں۔اسے مشرقی اطالوی کہا جاتا ہے [۳۲]۔کنڑا زبان کرناٹک میں مستعمل ہے۔یہ تامل سے مماثل ہے البتہ اس کا رسم الخط تیلگو کا ہے۔دراوڑی کا سب سے پرانا کتبہ (۴۵۰ قبل مسیح) اسی زبان میں ہے۔ملیالم نویں صدی میں تامل سے الگ ہوئی۔یہ کیرلا کی زبان ہے۔اس میں سنسکرت الاصل الفاظ قریباً اسّی (۸۰) فی صد ہیں۔

مذکورہ بالا چاروں بنیادی دراوڑی زبانوں کے علاوہ اس خاندان میں گونڈی (Gondi)، کوئی (Kui)، کورکھ (Kurukh) اور تلو (Tulu) بھی اہم زبانین ہیں جو بالترتیب مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر، جنوبی اُڑیسہ، بہار اور مینگلور کے مغربی ساحل کے جنوب میں بولی جاتی ہیں۔علاوہ ازیں بلوچستان میں مستعمل براہوی (Brahui) بھی دراوڑی زبان ہے۔اس پر بلوچی، پشتو، سندھی اور فارسی کے بھی اثرات ہیں۔

(۱۵) کاکیشائی زبانیں (Caucasian Languages):

یہ زبانیں روس کے جنوبی سرے پر واقع بحیرہ کیسپین (Caspian Seas) اور بحرِ اسود (Black Seas) کے درمیانی پہاڑی علاقے کوہِ قاف (Caucasus Mountains) میں بولی جاتی ہیں۔ماضی میں مختلف حملہ آوروں سے بچ کر بھاگے ہوئے لوگ ان پہاڑوں میں پناہ لیتے رہے ہیں۔اسی سبب یہاں زبانیں بہ کثرت ہیں۔قریباً چالیس (۴۰) کے لگ بھگ تمام کاکیشائی زبانیں مشکل صوتیاتی اور مارفیمیاتی نظام کی حامل ہیں اور ان کا باہمی نسبی تعلق بھی قیاسی ہے کیوں کہ ابھی تک دلائل سے ان زبانوں کی مشترک مورثِ اعلیٰ زبان ثابت نہیں کی جا سکی۔جغرافیائی لحاظ سے انھیں چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(i) جنوبی کاکیشائی گروہ (Southern Caucasian Group):

نہ صرف جنوبی کاکیشائی گروہ بلکہ پورے کاکیشائی خاندان کی سب سے اہم زبان جارجیائی (Georgian) ہے۔یہ جارجیا (Georgia) کے دارلسلطنت تبلیسی (Tbilisi)، جو پہلے تفلس (Tiflis) کہلاتا تھا، کی زبان ہے۔اس کا ادب پانچویں صدی سے ملتا ہے۔

(ii) مغربی کاکیشائی گروہ (Western Caucasian Group):

یہ گروہ ابخازواڈ یگیان (Abkhazo-Adyghian) بھی کہلاتا ہے۔اس کی اہم زبانیں کبیرڈیان (Kabardian)، اڈیگا (Adyghe)، کراچائی (Karachai) اور ابخازی (Abkhazian) ہیں جو ابخازیہ (Abkhazia)، اڈیگیا (Adygea) اور چرکس (Cherkess) کے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

(iii) مشرقی کاکیشیائی گروہ (Eastern Caucasian Group):

اس گروہ کی اہم زبانیں چیچن (Chechen) اور انگش (Ingush) ہیں جو جمہوریہ چیچن (Republic of Chechen) اور جمہوریہ انگش (Republic of Ingush) میں مستعمل ہیں۔

(iv) داغستان گروہ (Dagestan Group):

اس گروہ کی نمائندہ زبانوں میں اوار (Avar)، لیزجن (Lezgin)، ڈارگن (Dargin)، لاک (Lak) اور تابسارن (Tabasaran) شامل ہیں۔

(۱۶) التائی زبانیں (Altaic Languages):

The name Altaic is derived from the Altai Mountains of western Mongolia where the languages are believed to have originated.[33]

زبانوں کا یہ خاندان ترکی، وسطی ایشیا، منگولیا اور چین کو محیط ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ قریباً ساٹھ (۶۰) سے زائد زبانوں کا حامل یہ خاندان درج ذیل مزید تین اہم گروہوں میں منقسم ہے:

(i) ترکی گروہ (Turkic Group):

التائی خاندان کی قریباً نصف سے زیادہ زبانوں کا تعلق اس گروہ سے ہے۔ یہ زبانیں باہم متجانس ہیں اور انھیں بولنے والے ایک دوسرے کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس گروہ میں آذربائیجانی (Azerbaijani)، ترکمان (Turkmen)، ازبک (Uzbek)، تاتار (Tatar)، قازق (Kazakh)، کرگیز (Kirgiz) اور یاکٹ (Yakut) زبانیں بھی شامل ہیں جو روس، افغانستان، چین اور اس کے گردونواح میں مستعمل ہیں۔

(ii) منگوئلی گروہ (Mongolian Group):

اس گروہ کی نمائندہ زبان منگول (Mongol) ہے جو ریاست منگول کی سرکاری زبان ہے۔ اس کے علاوہ اس گروہ میں کالمک (Kalmyk)، بریئٹ (Buryat)، سانتا (Santa)، ڈاگر (Dagur) اور مونگر (Monguor) زبانیں شامل ہیں۔ منگول گروہ کا قدیم ترین کتبہ تیرھویں صدی کا ہے۔ ان زبانوں کو بولنے والے افراد بہت کم تعداد میں باقی ہیں۔ اس گروہ کی تمام زبانیں اور ان کی بولیاں باہم سمجھی جا سکتی ہیں۔

(iii) تنگیوزک گروہ (Tungusic Group):

یہ گروہ مانچو تنگس (Manchu-Tungus) بھی کہلاتا ہے۔ اس کی زبانیں سائبیریا کے وسیع علاقے اور چین کے مخصوص حصوں میں مستعمل ہیں۔ اوینکی (Evenki)، لامٹ (Lamut)، نانائی (Nanai) اور مانچو (Manchu) اس گرہ کی اہم زبانیں ہیں۔ چینی اور روسی زبانوں کے دباؤ میں آنے کی وجہ سے ان کا ارتقا رک گیا ہے۔

(۱۷) یورالی زبانیں (Uralic Languages):

تقریباً تیس(۳۰) سے زائد یورالی زبانوں کی اصل قدیم یورالی زبان (Proto Uralic Language) سات ہزار(۷۰۰۰) سال قبل تک روس میں واقع یورال پہاڑوں (Ural Mountains) کے شمالی علاقوں میں مستعمل رہی ہے۔ان زبانوں میں تحریری مواد تیرھویں صدی سے دست یاب ہے۔اس خاندان کے درج ذیل دواہم گروہ ہیں:

(i) فنو یوگرک گروہ (Finno-Ugric Group):

The term Ugric is derived from Ugra, an old Russian name for western Siberia. It was to thi area the Ugric peoples migrated in the first centuries of the Christian era.[34]

یہ زبانیں وسطی یورپ کے ایک حصے میں اور شمال کی طرف یورپ اور ایشیا کے سنگم پر واقع علاقوں میں بھی بولی جاتی ہیں۔ فنو یوگرک گروہ مزید دو گروہوں میں منقسم ہے جن میں ایک فنک گروہ (Finnic Group) ہے جس کی نمائندہ زبان فنش (Finnish) ہے۔یہ زبان فن لینڈ(Finland)،سویڈن(Sweden)اورروس میں رائج ہے۔ان زبانوں کادوسرا گروہ، یوگرک گروہ (Ugric Group) کہلاتا ہے جس کی سب سے اہم زبان ہنگیرین (Hungarian) ہے جسے مگیارزبان (Magyar Language) بھی کہا جاتا ہے۔یہ ہنگری کی سرکاری زبان ہے۔علاوہ ازیں اس گروہ کی دواہم زبانیں کھانتی (Khanty)اور مانسی (Mansi) ہیں جنھیں بالترتیب اوسٹیک (Ostyak)اوروگل (Vogel) بھی کہا جاتا ہے۔یہ یورال پہاڑوں کے مشرق میں واقع دریا، 'Ob River' کے گردونواح اور مشرقی سائبیریا میں مستعمل ہیں۔

(ii) سیموئیڈ گروہ (Samoyed Group):

سیموئیڈ زبانیں سائبیریا کے شمالی حصے میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تعداد میں یہ زبانیں صرف چار ہیں۔ ان میں نینیٹس (Nenets)سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے جو ابتداءً یورک (Yurak) کہلاتی تھی۔ دیگر زبانوں میں سیلکپ (Selkup)اور انیٹس (Enets)شامل ہیں جنھیں پہلے پہل بالترتیب اوسٹیک سیموئیڈ (Ostyak Samoyed) اور ینیسی (Yenisey) کہا جاتا تھا۔

(۱۸) ہندیورپی زبانیں (Indo-European Languages):

یہ خاندان السنہ سب سے اہم اور بڑا ہے۔ بہ نسبت دیگر خاندانوں کے یہ سب سے وسیع ہے جو ہندوستان ، افغانستان ، ایران ، کوہ قاف کے پاس آرمینیا، پورے یورپ، دونوں امریکہ، جنوبی افریقہ کے بالکل جنوبی حصے، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کومحیط ہے۔زیادہ تر ہندیورپی زبانیں اپنے علمی و ادبی ذخائر کی بہ دولت دنیا کی سب سے اعلیٰ زبانیں مانی جاتی ہیں اوران کے ساتھ ساتھ ان کے بولنے والے بھی سیاسی، معاشی، اور تہذیبی اعتبار سے اہم ہیں۔ان زبانوں میں سے بعض نے اپنی جغرافیائی حدود سے نکل کر دیگر کئی علاقوں کی زبانوں پر گہرے اثرات مرتب کیے اور کچھ تو کم و بیش عالمی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔
زیادہ تر ہندیورپی زبانوں کے قدیم ترین اور مسلسل تاریخی شواہد دست یاب ہونے سے ان کا تاریخی تجزیہ اور تقابل بہت حد تک سائنسی طرز پر ممکن ہوسکا۔
ماہرینِ لسانیات کے ہاں اصل قدیم ہندیورپی زبان (Proto Indo-European Language) مع اپنے متفرق گروہوں کے تین

بنیادی ناموں سے یاد کی جاتی ہے۔

☆ ہند یورپی(Indo-European)

☆ ہند جرمینک(Indo-Germanic)

☆ ہند آریائی(Ind0-Aryan)

ہند جرمینک نام دراصل جرمن ماہرین کا تجویز کردہ ہے اور عام طور پر جرمنی ہی میں مستعمل ہے مگر یہ پورے خاندان کے لیے غیر تسلی بخش ہے۔اسی سبب زیادہ تر ماہرین اس کا استعمال نہیں کرتے۔ ہند آریائی نام بھی صحیح نہیں کیوں کہ اس کا اطلاق اس خاندان کے صرف ایشیائی گروہ پر ہوتا ہے۔علاوہ ازیں 'آریا' کی اصطلاح ایک نسل کے لیے مخصوص اور رائج ہے۔لہٰذا بہتر ہے کہ نسل اور لسانی خاندان کے نام کو خلط ملط نہ کیا جائے۔ان کے برعکس ہند یورپی نام ان دونوں بڑے علاقوں کی نشان دہی کرتا ہے جہاں یہ زبانیں بہ کثرت بولی جاتی ہیں۔اسی لیے اس خاندان السنہ کے لیے زیادہ تر ماہرین ہند یورپی نام ہی پر متفق ہیں۔

ہند یورپی زبانیں قریباً نو(۹) ذیلی خاندانوں میں تقسیم کی گئی ہیں جن میں سے آٹھ کا تعلق یورپ سے ہے اور ایک کا ایشیا سے۔یورپی سلسلے کے ذیلی خاندان درج ذیل ہیں:

(i) جرمینک زبانیں (Germanic Languages):

ہند یورپی خاندان کا یہ ذیلی خاندان سب سے زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ اسے ٹیو ٹا نک (Teutonic) خاندان السنہ بھی کہا جاتا ہے۔ افراد و مقامات کے چند ناموں کے سوا چوتھی صدی سے قبل اس خاندان کی زبانوں کا کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں۔ عموماً قیاس کیا جاتا ہے کہ پہلی صدی قبل مسیح تک جرمن لوگوں میں ایک ہی اصل قدیم جرمینک زبان (Proto Germanic Language) یک ساں مستعمل تھی جو بعد ازاں تین اہم زبانوں اور ان کی بولیوں میں تقسیم ہوئی۔ان زبانوں کے تین اہم گروہ درج ذیل ہیں:

☆ مشرقی جرمینک گروہ (Eastern Germanic Group):

مشرقی جرمن قبائل دریائے اوڈر (Oder River) کے مشرقی علاقے میں سکونت پذیر ہوئے۔اس گروہ کی اکلوتی اہم زبان گوتھک (Gothic) ہے جو آٹھویں صدی تک وسطی یورپ میں مستعمل رہی۔ جرمینک خاندان کے قدیم تحریری نمونے گوتھک زبان ہی میں ملتے ہیں۔بشپ الفلاس (Bishop Ulfilas) نے عہد نامہ جدید کا ترجمہ گوتھک زبان میں کیا تھا جس کا مخطوطہ چوتھی صدی کا دست یاب ہے۔۱۵۶۰ء میں ایک یورپی سفیر نے ترکی کے مقام کریمیا (Crimea) پر ایک گوتھک بولی دریافت کی اور اس کے قریباً ساٹھ(۶۰) الفاظ بھی قلم بند کیے مگر جلد ہی یہ بولی ختم ہو گئی۔

☆ شمالی جرمینک گروہ (Northern Germanic Group):

سکینڈے نیویا (Scandinavia) میں مقیم شمالی جرمن قبائل میں ابتداءً اصل قدیم شمالی جرمینک زبان یک ساں رائج تھی جسے اب قدیم نورس (Old Norse) کہا جاتا ہے۔بعد ازاں قریباً دسویں صدی میں یہ دو ذیلی گروہوں، مغربی سکینڈے نیوین (Western Scandinavian) اور مشرقی سکینڈے نیوین(Eastern Scandinavian) میں بٹ گئی۔مغربی گروہ میں ناروے (Norwey) کی

زبان نارویجین (Norwegian) اور آئس لینڈ(Ice Land) کی زبان آئس لینڈک (Ice Landic) شامل ہیں جب کہ مشرقی گروہ ڈنمارک (Denmark) اور سویڈن میں مستعمل زبانوں بالترتیب ڈینش (Danish) اور سویڈش (Swedish) کا حامل ہے۔ آئس لینڈ کی زبان میں بارھویں صدی سے اچھا ادب دست یاب ہے۔ اس کی کچھ قدیم قواعدیں بھی موجود ہیں جن سے وسطی آئس لینڈ سے متعلق اہم تفصیلات فراہم ہوتی ہیں۔ دیگر تین 'نیوین' زبانیں باہم مماثل ہیں اور انھیں بولنے والے ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں۔

☆ **مغربی جرمینک گروہ (Western Germanic Group):**

یہ زبانیں لسانیاتی، ادبی اور علمی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ مغربی جرمن قبائل دریائے ایلب (Elbe River) اور دریائے اوڈر (Oder River) کے درمیانی میدانی علاقوں میں آباد ہوئے جہاں جرمینک خاندان کے مغربی گروہ کی زبانوں کا ارتقا ہوا۔ یہ گروہ مزید دو ذیلی گروہوں، بالائی جرمن (High German) اور نشیبی جرمن (Low German)، میں منقسم ہے۔ نشیبی اور بالائی تقسیم جغرافیائی بنا پر ہے، لسانی اعتبار سے نہیں۔ بالائی جرمن کی ممتاز اور اہم زبان جدید جرمن ہے جو جرمنی کے علاوہ آس پاس کی سرحدوں، پولینڈ، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، فرانس بیلجیم اور ہالینڈ میں بولی جاتی ہے۔ نشیبی جرمن گروہ اینگلو فریسیئن (Anglo-Frisian)، ڈچ (Dutch) اور فلیمش (Flemish) زبانوں پر مشتمل ہے۔

پانچویں صدی میں مغربی جرمن کے اینگلوسیکسن (Anglo-Saxon) قبائل شمالی سمندر پار کر کے برطانیہ میں آباد ہو گئے۔ ان کے ساتھ آئی ہوئی زبان بعدازاں انگریزی کہلائی۔ انگریزی نہ صرف اس گروہ کی بلکہ تمام جرمنی زبانوں میں سب سے اہم اور نمائندہ زبان ہے۔ اسے بولنے والے غالباً چینی زبان کے بعد سب سے زیادہ ہوں گے۔ انگریزی زبان جزائر برطانیہ کے علاوہ کینیڈا، امریکہ، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں مستعمل ہے۔

(ii) **اطالوی زبانیں (Italic Languages):**

اطالوی زبانیں جزیرہ نما اٹلی میں قریباً ایک ہزار سال قبل مسیح پہنچیں۔ انھیں مزید درج ذیل چار گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

☆ **آسکن امبرین گروہ (Oscan Umbrain Group):**

یہ معدوم زبانیں ہیں۔ آسکن زبان جنوبی اٹلی میں بولی جاتی تھی۔ اس زبان میں تحریری مواد قریباً دوسو (۲۰۰) صدی قبل مسیح سے ملتا ہے۔ امبرین زبان پورے شمالی اٹلی میں رائج تھی۔ اس زبان میں تحریر سات (۷) کتبے دست یاب ہیں جو دوسو سے ڈیڑھ سو سال قبل مسیح کے درمیانی عرصے کے ہیں۔ اس گروہ کی زبانوں میں ہندیورپی کا 'P' اپنی اصل صوت ہی میں برقرار رہتا ہے۔

☆ **سابیلین گروہ (Sabellian Group):**

یہ گروہ آسکن اور امبرین کے بیچ کا ہے۔ اور ایک ہی معدوم زبان 'سابیلین' کا حامل ہے۔ اس زبان کے تحریری نمونے بہت کم ہیں۔ آسکن اور امبرین کی طرح اس زبان میں بھی ہندیورپی کی آواز 'P' اپنی اصل میں قائم رہتی ہے۔

☆ **لاطینی گروہ (Latin Group):**

اطالوی خاندان کی بنیادی زبان لاطینی ہے۔ابتدا میں لاطینی زبان وسطی اٹلی یعنی روم اور اس کے نواحی علاقوں میں مستعمل تھی۔لاطینی میں تحریری مواد قریباً چھٹی صدی قبل مسیح سے ملتا ہے جب کہ باقاعدہ لاطینی ادب تیسری صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر چار سو (۴۰۰) سال تک رہا۔ یورپ میں وسیع رومن سلطنت کے قیام سے لاطینی بہ طور سرکاری زبان متعارف ہوئی۔ عام بول چال کی سطح پر لاطینی، ادبی لاطینی سے قدرے مختلف تھی جسے عموماً نئی لاطینی یا سوقیانہ لاطینی کہا گیا۔ یہ ابتداءً یک سانی سے مستعمل رہی مگر رومن فتوحات میں اضافے کے ساتھ سوقیانہ لاطینی فاتحین کے ہم راہ دوسرے ممالک میں پہنچی جہاں یہ 'رومی زبان'

(Lingua Romana) کہلائی۔

مختلف علاقوں اور ممالک میں اسے وہاں پہلے سے موجود زبان سے خلط ملط ہونے اور جداگانہ علاقائی، معاشرتی اور نسلی عوامل کے تحت ارتقا پذیر ہونے کا موقع ملا جس سے متعدد رومانس زبانیں (Romance Languages) وجود میں آئیں۔البتہ سوقیانہ لاطینی زبان کب ختم ہوئی اور رومانس زبانیں کب اور کس طرح وجود میں آئیں؟ اس حوالے سے کچھ بھی قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا۔

رومانس زبانوں میں اطالوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور پرتگالی بڑی مملکتوں کی سرکاری زبانیں ہیں جب کہ کیتالان (Catalan)، پرووِنسال (Provencal)، رھتین (Rheatian)، سارڈینی (Sardinian)، اور مولڈاوین (Moldavian) نسبتاً چھوٹے علاقوں میں رائج ہیں۔ اس گروہ کی زبانوں میں ہند یورپی کی آواز 'P' تبدیل ہو کر 'Q' بن جاتی ہے۔

☆ فالسکان گروہ (Faliscan Group):

یہ گروہ ایک ہی زبان، فالسکان پر مشتمل ہے۔ یہ معدوم زبان ہے۔اس کے کچھ لغات اور کتبے دست یاب ہیں۔

(iii) کیلٹک زبانیں (Celtic Languages):

ابتدا میں یہ زبانین پورے مغربی یورپ اور جزائر برطانیہ میں پھیلی ہوئیں تھیں ۔ ولادتِ مسیح سے قبل کی پانچ صدیوں میں سپین اور شمالی اٹلی مین رائج تھیں۔ چوتھی صدی میں ترکی کے شہر انقرہ تک ان کا تسلط تھا۔اب یہ معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔اطالوی اور جرمینک خاندانوں کی زبانوں نے انھیں جزائر برطانیہ کے بالکل میں دھکیل دیا ہے۔اطالوی خاندان کی طرح کیلٹک خاندان کی زبانیں بھی 'P' اور 'Q' اصوات کے تحت دو گروہوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔

'Q' صوت کی حامل کیلٹک زبان، گوئڈلک (Goidelic) یا گیلک (Gaelic) چوتھی صدی قبل مسیح میں آئر لینڈ (Ireland) میں مستعمل تھی جہاں یہ آئرش (Irish) کے نام سے جانی جاتی تھی۔قدیم آئرش میں پانچویں صدی کے مبلغین کی تحریریں دست یاب ہیں۔انیسویں صدی کے بعد انگریزی زبان رفتہ رفتہ آئرش کی جگہ لیتی گئی۔بعد ازاں یہ سکاٹ لینڈ (Scotland) میں سکاٹ گیلک (Scots Gaelic) اور آئل آف مین (Isle Of Man) میں مینکس (Manx) کے نام سے بولی جاتی رہی۔ یہ دونوں زبانیں اب ختم ہو چکی ہیں۔

'P' صوت کی حامل زبان بریتھونک (Brythonic)، جسے عام طور پر برطانوی کیلٹس (British Celts) کہا جاتا ہے، ابتدا میں جنوبی برطانیہ اور ویلز (Wales) میں رائج تھی مگر پانچویں صدی کے قریب اینگلو سیکسنز کی آمد سے انگریزی زبان نے برطانوی کیلٹس کو شمالی اور مغربی علاقوں اور خصوصاً شمال مغربی فرانس میں واقع صوبہ بریٹنی (Brittany) کی طرف دھکیل دیا جہاں یہ اب بھی بریٹن (Breton) کے نام سے مستعمل ہے۔

(iv) یونانی یاہیلینک زبانیں (Greek or Hellenic Languages):

ہند یورپی زبانوں کا یہ ذیلی خاندان فقط یونانی زبان اور اس کی متعدد بولیوں کا حامل ہے۔ یونانی قریباً چودھویں صدی قبل مسیح سے معلوم زبان ہے۔ اس میں ابتدائی تحریری نقوش جزیرہ کریٹ (Crete) سے دست یاب ہونے والی خط 'Linear B' میں لکھی مٹی کی تختیوں کی صورت محفوظ ہیں۔ یونانی زبان کے چار ادوار ہیں:

☆قدیم دور ☆ کلاسیکی دور ☆عبوری دور ☆جدید دور

☆ چودھویں صدی قبل مسیح سے آٹھویں صدی قبل مسیح تک یونانی زبان کا قدیم دور مانا جاتا ہے۔ اس دور کی یونانی 'Mycenaean Greek' کہلاتی تھی۔

☆ کلاسیکی یونانی کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی قبل مسیح تک کا مانا جاتا ہے۔

☆ عبوری دور کی یونانی کوئن (Koine) یعنی 'عام' کہلاتی تھی۔ یہ چوتھی صدی قبل مسیح سے قریباً ایک ہزار (۱۰۰۰) سال قبل تک مشرقی بحیرۂ روم میں رائج رہی۔ عہد نامہ جدید کی زبان اس کا تحریری نمونہ ہے۔

☆ 'Koine' ہی کی متعدد بولیاں بہ طور جدید یونانی زبان نہ صرف یونان میں بلکہ کریٹ، قبرص (Cyprus)، ترکی اور امریکہ کی متعدد ریاستوں میں بولی جاتی ہیں۔

(v) البانی زبانیں (Albanian Languages):

یہ خاندان صرف البانی زبان اور اس کی متعدد بولیوں پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر یہ زبان البانیہ (Albania) میں رائج ہے۔ اس کے علاوہ یہ بلقان (Balkan)، یونان، ترکی اور اٹلی کے قریبی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ البانی کی دو بنیادی بولیاں گھیگ (Gheg) اور ٹوسک (Tosk) ہیں جو مزید کئی بولیوں میں منقسم ہیں۔ یہ تمام بولیاں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ انھیں بولنے والے ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے۔ البانی زبان سے متعلق ناکافی تاریخی معلومات کی بنا پر دیگر ہند یورپی زبانوں سے اس کے تعلق کی وضاحت قریباً ناممکن ہے۔ البتہ ہند یورپی خاندان کے تحت اس کا شمار اُن بیش تر الفاظ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جو دیگر ہند یورپی زبانوں سے اس نے مستعار لیے ہیں۔ خاص طور پر اطالوی الاصل الفاظ بہ کثرت ہیں۔ البانی زبان کے اوّلین کتبے بائبل کے باب 'میتھیو' (Methew) کے ترجمے ہیں جو چودھویں صدی سے دست یاب ہیں۔

(vi) بالٹوسلاوی زبانیں (Balto-Slavic Languages):

ماہرینِ لسانیات بالٹک اور سلاوی زبانوں کو کافی مماثلت کی بنا پر عموماً ہند یورپی زبانوں کے ایک ہی ذیلی خاندان، بالٹوسلاوی کے تحت شمار کرتے ہیں۔ البتہ یہ نکتہ تا حال زیرِ بحث ہے کہ آیا بالٹک اور سلاوی زبانوں میں مماثلت کی وجہ مشترک نقطۂ آغاز ہے یا کہ متعدد عوامل کے تحت موجودہ باہمی اثر و نفوذ؟ [۳۵] بہ ہر حال اجتماعی طور پر ان زبانوں کو بولنے والے افراد قریباً تین سو (۳۰۰) ملین کے لگ بھگ ہیں جن میں سے نصف سے بھی زیادہ روسی زبان بولتے ہیں۔

بالٹک زبانوں میں لتھوانیائی (Lithuanian) اور لاٹوین (Latvian) یعنی لیٹش (Lettish) بنیادی اہمیت رکھتی ہیں جو بالترتیب لتھوانیا اور لاٹویا میں مستعمل ہیں۔ دونوں زبانیں معیاری ہیں اور متعدد بولیوں کی حامل ہیں۔ ان میں تحریری مواد چودھویں صدی سے ملتا ہے۔ یہ زبانیں بحیرہ بالٹک کے ساحلی علاقوں میں اور امریکہ کے کچھ حصوں میں بھی بولی جاتی ہیں۔ متعدد بالٹک زبانیں معدوم ہو چکی ہیں۔ قدیم پرشین (Old

(Prussian) سترھویں صدی میں ختم ہوگئی تھی۔

سلاوی زبانیں زیادہ تر روس اور مشرقی یورپ کے متعدد علاقوں مستعمل ہیں۔ یہ تعداد میں نسبتاً زیادہ ہیں جنھیں درج ذیل تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

☆ **جنوبی سلاوی گروہ (Southern Slavic Group):**

سلاوی زبانوں کی سب سے قدیم زبان کلیسائی سلاوی (Church Slavic) یعنی قدیم بلغاری (Old Bulgarian) اسی گروہ میں شامل ہے۔ جنوبی سلاوی زبانوں میں بلغاری، مقدونیائی (Macedonian)، سربین (Serbian)، کروشین(Croatian)، اور سلوو ینیائی (Slovene) شامل ہیں جو یوگوسلاویہ اور یونان کے متعدد علاقوں میں مستعمل ہیں۔

☆ **مغربی سلاوی گروہ (Western Slavic Group):**

یہ گروہ چیک (Czech)، سلاوی (Slovakian)، سوربین (Sorbian) اور پولش (Polish) زبانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ادب بارھویں صدی سے ملتا ہے۔ یہ زبانیں جمہوریہ سلوواک(Slovak Republic)، چیک، پولینڈ(Poland) اور مشرقی جرمنی میں رائج ہیں۔

☆ **مشرقی سلاوی گروہ (Eastern Slavic Group):**

اس گروہ کی بنیادی زبان روسی ہے۔ اس میں ادب گیارھویں صدی سے ملتا ہے۔ روس کی سرکاری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایشیائی روس میں بھی ثانوی حیثیت سے رائج ہے۔ علاوہ ازیں بیلا روسی(Belarusian) اور یوکرائنین (Ukrainain) بھی اس گروہ کی اہم زبانیں ہیں جو بالترتیب مغربی روس اور یوکرائن (Ukraine) میں بولی جاتی ہیں۔ یوکرائنین کے کچھ بولنے والے آسٹریا میں بھی ہیں۔

(vii) آرمینی زبانیں (Armenian Languages):

اس ذیلی خاندان میں صرف آرمینی زبان اور اس کی متعدد بولیاں شامل ہیں۔ یہ زبان آرمینیا (Armenia)، ترکی، مشرقِ وسطی کے کچھ علاقوں، یورپ اور امریکہ میں رائج ہے۔ آرمینی کے قدیم کتبے میخی رسم الخط میں ملتے ہیں۔ کلاسیکی آرمینی کی ایک بولی گربیر (Grabar) کے نام سے معلوم ہے جو آج بھی آرمینیا کے کلیساؤں میں مذہبی تحاریر کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ بارھویں صدی سے اس کی جدید بولیاں وجود میں آئیں۔ انیسویں صدی میں موجودہ آرمینی زبان کی تشکیل ہوئی۔ اس کی دو بولیاں ارارات(Ararat) اور سٹامبول (Stambul) ہیں۔ ارارات خاص آرمینیا میں بولی جاتی ہے جب کہ سٹامبول قسطنطنیہ کے آس پاس اور بحرِ اسود کے ساحلی علاقوں میں رائج ہے۔ سٹامبول نسبتاً اہم ہے۔ اس میں ادب بھی ہے۔

(viii) اناطولی زبانیں (Anatolian Languages):

اناطولی زبانیں ایشیائے کوچک سے متعلق ہیں۔ یہ تمام زبانیں معدوم ہو چکی ہیں۔ یہ دو ہزار (۲۰۰۰) سال قبل مسیح اُن علاقوں میں رائج تھیں جو اب ترکی اور شام (Syria) کہلاتے ہیں۔ حتّی (Hittite) اس خاندان کی بنیادی زبان ہے۔ ہند یورپی زبانوں سے چند مماثلتوں کی بنا پر ۱۹۱۵ء سے

ماہرین اسے ہند یورپی خاندان کے تحت شمار کرتے ہیں۔قریباً پندرھویں صدی قبل مسیح کے خطِ میخی میں لکھے ختّی زبان کے کتبے دست یاب ہیں۔قدیم ختّی میں موجود تحریریں اب تک کسی بھی ہند یورپی زبان کا سب سے قدیم تحریری مواد مانا جاتا ہے۔اناطولی خاندان کی دیگر زبانوں میں پالیک (Palaic)،لیڈیان (Lydian)،لیسیان (Lycian)،اورلوین (Luwian) شامل ہیں۔

(ix) ہندایرانی زبانیں (Indo-Iranian Languages):

یہ ہند یورپی زبانوں کا قدیم ترین ذیلی خاندان ہے جو درج ذیل تین اہم گروہوں میں منقسم ہے:

☆ ایرانی گروہ (Iranian Group):

ایرانی گروہ ستّر (۷۰) سے زیادہ زبانوں پر مشتمل ہے۔بنیادی طور پر یہ زبانیں افغانستان اور ایران میں بولی جاتی ہیں۔ان میں سے اکثر زبانوں اور بولیوں کا ہند یورپی زبانوں سے تعلق تا حال واضح نہیں[۳۶]۔ بہ ہر حال اس گروہ کی اہم زبانوں میں فارسی (Persian)، تاجک (Tajik)، پشتو (Pashto)، اوسیٹک (Ossetic) اور بلوچی (Baluchi) قابلِ ذکر ہیں جو بالترتیب ایران اور افغانستان، تاجکستان، افغانستان اور پاکستان، روس اور جارجیا، پاکستان اور ایران میں بولی جاتی ہیں۔کردش (Kurdish) کردستان کی زبان ہے جو ایران کے مغرب میں واقع ہے۔کچھ کرد (Kurd) افراد عراق اور ترکی میں بھی موجود ہیں۔ان زبانوں کا قدیم تحریری مواد دست یاب نہیں۔پارسیوں کے پیغمبر زرتشت (Zoroaster) کا صحیفہ 'ژند اوستا' (Zend Avesta) قدیم ایرانی زبان اوستائی (Avestan) میں ہے جو کہ ساتویں صدی قبل مسیح کا ہے۔

☆ دردی گروہ (Dardic Group):

اس لسانی کنبے کے کئی لہجے اور بولیاں ہیں جو کشمیر، گلگت، چترال، کافرستان، شمال مغرب میں پامیر اور جنوب میں ہندوکش تک کے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔اکثر ماہرین دردی بولیوں کو پیشاچی بولیاں بھی قرار دیتے ہیں۔ان بولیوں میں سے اکثر ضبطِ تحریر میں نہیں آسکیں اور بعض تا حال منظرِ عام پر نہیں لائی جاسکیں۔دردی بولیوں میں قابلِ ذکر کھوار (Khowar)، کافر، شنا (Shina)، کوہستانی (Kohistani) اور کشمیری (Kashmiri) ہیں جو بالترتیب چترال اور اس کے نواحی علاقوں میں، کافرستان، جل کوٹ سے چلاس تک کو محیط علاقے 'شناکی' میں، انڈس کوہستان اور وادیِ کشمیر میں بولی جاتی ہیں۔دردی بولیوں میں سے صرف کشمیری میں ادب ملتا ہے۔اس پر سنسکرت کا اثر ہے۔

☆ ہندآریائی گروہ (Indo-Aryan Group):

انھیں ہندی زبانیں (Indic Languages) بھی کہتے ہیں۔قریباً دوسو (۲۰۰) سے زائد یہ زبانیں بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور نیپال میں بولی جاتی ہیں۔ بھارت میں رائج نمایاں زبانیں ہندی، اردو، بنگالی، پنجابی، مراٹھی، گجراتی، اُڑیا اور آسامی ہیں جب کہ پاکستان میں اردو، پنجابی اور سندھی اہم آریائی زبانیں ہیں۔اسی طرح بنگالی زبان کو بنگلہ دیش کی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔سنہالی (Sinhalese) سری لنکا میں اور نیپالی (Nepali) نیپال کی قومی زبان ہے۔ماہرین خانہ بدوش جپسیوں (Gypsies) کی زبان، 'Romany' کو بھی اسی گروہ کے تحت شمار کرتے ہیں۔

ہندایرانی زبانوں کے دو گروہوں، ایرانی اور ہندآریائی کی زبانیں باہم اتنی مماثل ہیں کہ ویدک سنسکرت کے بعض جملے برائے نام ترمیم سے اوستائی ہو

جاتے ہیں۔

زبانوں کے سائنسی مطالعے میں اگر چہ ان کی نسلی تقسیم افادیت سے خالی نہیں اور اس ضمن میں ماہرین نے تقابلی مطالعے کو بروئے کار لاتے ہوئے زبانوں کو مختلف خاندانوں اور ذیلی گروہوں میں منقسم کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی مگر اس کے باوجود یہ معلوم کرنا کہ کون سی زبانیں نسلی اعتبار سے مماثل ہیں اور کون سی نہیں، بہت مشکل ہے۔ مثال کے طور پر نیپال (Nepal) کے دور دراز علاقے میں مستعمل نیپالی زبان کا تعلق زبانوں کے ہند یورپی خاندان سے ہے جب کہ ہنگری (Hungary) کی سرکاری زبان ہنگیرین (Hungarian) چاروں طرف سے ہند یورپی زبانوں میں گھری ہونے کے باوجود نسلی لحاظ سے ہند یورپی نہیں۔ لہٰذا زبانوں کو متعدد خاندانوں، ذیلی گروہوں اور انفرادی حیثیت میں منقسم کرنے کی فقط کوشش کی جا سکتی ہے مگر تقسیم کا یہ عمل ہرگز قطعی اور جامع قرار نہیں دیا جا سکتا، کیوں کہ فی الحال زبانوں میں نسلی مماثلتیں واضح سائنسی خطوط پر استوار نہیں کی جا سکیں، مثلاً اکثر ماہرین جاپانی زبان اور ترکی زبان کو نسلی لحاظ سے باہم مربوط بتاتے ہیں جو کہ درست نہیں۔ ایسا یقیناً زبانوں کی مشترک لسانی و نسلی خصوصیات کو ماضی بعید کے اوراقِ پارینہ سے کھوج کر نہ لا سکنے کی بنا پر ہے کہ جن کے بارے میں وقت اور تاریخ مکمل خاموش ہیں۔ علاوہ ازیں زبانیں ایک مخصوص گروہ میں شمار کیے جانے کے بعد انفرادی طور پر ہرگز نہیں پنپتیں بلکہ یہ مختلف عوامل کے تحت دیگر زبانوں اور بولیوں سے مسلسل خلط ملط ہوتی رہتی ہیں اور زبانوں میں وقوع پذیر ہونے والے تغیرات کبھی بھی یک ساں نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس طریقِ تقسیم سے دنیا کی تمام زبانوں کی گروہ بندی ممکن نہیں۔

اردو کا تعلق چوں کہ ہند ایرانی زبانوں کے ہند آریائی گروہ سے ہے لہٰذا اردو زبان کی ابتدا، تحولات اور موجودہ صورتِ حال سے کماحقہٗ واقفیت کے لیے ہند آریائی گروہ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ چناں چہ اس کا نسبتاً تفصیلی جائزہ آئندہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔

باب دُوُم۔ دنیا کی زبانیں
فصل دُوُم

ہندآریائی زبانوں کا خصوصی جائزہ

خِطّوں کی تقسیم سے قطع نظر لسانیات میں متحدہ برِصغیر کی زبانوں کا ایک ساتھ مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ زبانیں بالعموم اِن چار خاندانوں میں تقسیم کی جاتی ہیں:

(۱) ہندیورپی (۲) دراوڑی (۳) چینی تبتی (۴) آسٹروایشیائی

برِصغیر کے تین بڑے ملکوں میں زبانوں کی صورتِ حال یہ ہے:

پاکستان: ہندیورپی (ہندآریائی، دردی اور ایرانی)، چینی تبتی، دراوڑی (فقط براہوی)۔

بھارت: ہندیورپی (ہندآریائی اور دردی)، چینی تبتی، آسٹروایشیائی، دراوڑی۔

بنگلہ دیش: ہندیورپی، چینی تبتی۔[۳۷]

یہاں صرف ہندآریائی زبانوں کا ذکر مقصود ہے، لہٰذا پہلے آریاقوم[۳۸] کے داخلۂ ہند اور پھر قدیم ہندآریائی زبان کے ارتقا کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

آریاؤں کا داخلۂ ہند

قدیم اور اصل ہندیورپی زبان کیا تھی؟ اس کے بولنے والوں کا اصل وطن کہاں تھا؟ وہ کس طرح یورپ اور ایشیا کے وسیع براعظموں میں پھیلے؟ آریاؤں سے متعلق ایسے سوالات آج تک تحقیق کے متقاضی ہیں۔ اگر ان سوالات پر روشنی ڈالی جا سکتی تو اصل اور قدیم آریائی زبان کی جائے پیدائش کا سُراغ مل جاتا، لیکن یہ مسئلہ ہنوز اختلافی ہے۔

ویدی، اوستائی، یونانی اور لاطینی بولنے والے ابتدائی آریاؤں کی نسل اور اصل وطن سے متعلق اگرچہ فی الحال کوئی مستند تحقیق سامنے نہیں آئی تاہم جدید محققینِ لسانیات اِس نظریے پر متفق ہیں کہ یوریشیا (Eurasia) کے وہ وسیع میدان جن کا سلسلہ ایک طرف پولینڈ (Poland) اور جرمنی (Germany) سے ملتا ہے اور دوسری جانب یورال پہاڑوں (Ural Mountains) کے جنوب میں واقع وسط ایشیا کے الطائی (Altai) اور تیان شان (Tian Shan) کے سلسلہ ہائے کوہ سے ملتا ہے، کو آریاؤں کا وطن قرار دیا جا سکتا ہے[۳۹]۔ اِس نظریے کی تائید اُن ریکارڈوں سے بھی ملتی ہے جو ۱۹۰۶ء میں ایشیائے کوچک (Asia Minor) میں دریافت ہوئے ہیں اور جن کا تعلق ۱۵۰۰ قبل مسیح سے ہے۔ اِن ریکارڈوں میں بعض دیوی، دیوتاؤں کے نام (مثلاً 'اندرا'، 'ارونا'، 'مترا' وغیرہ) ملتے ہیں جو سنسکرت کی مقدس کتابوں میں جوں کے توں موجود ہیں[۴۰]۔ تاریخی شہادتیں بھی اِس نظریے کی حمایت کرتی ہیں کہ آریاؤں کا اصل وطن ایشیا ہی میں کسی جگہ تھا، جہاں سے نامعلوم اسباب کی بنا پر ان کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور اِن کے بعض قبیلے پہلے ایران اور بعد ازاں برِصغیر میں داخل ہوئے اور بعض قبائل مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے یورپ تک جا پہنچے۔ قدیم ویدک سنسکرت اور ایرانی اوستائی زبان کے مشترک عناصر کا مطالعہ بھی لسانی اعتبار سے اسی نظریے پر دلالت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں سنسکرت، اوستائی، یونانی اور لاطینی کا تقابلی مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ یہ زبانیں اصلاً اور نسلاً ایک ہیں جو بہ تدریج اختلافات کا شکار ہوئیں[۴۱]۔ اِس ضمن میں قدیم ترلسانی شہادت ویدوں (رِگ وید، سام وید، یجروید، اُتھروید) سے فراہم نہیں ہوتی کیوں کہ ویدوں کی تصنیف کے دور سے غالباً تین ہزار سال

(۳۰۰۰) پہلے آریا قوم کے مختلف قبائل ایک دوسرے سے بچھڑ چکے تھے۔
آریاؤں کے مختلف قبائل کی ایشیا اور یورپ کے متعدد علاقوں کی طرف ہجرت سے قطع نظر یہاں دل چسپی کا مرکز فقط وہ آریائی گروہ ہے جو ۳۰۰۰ قبل مسیح اور ۲۵۰۰ قبل مسیح کے درمیانی عرصے میں ایران میں موجود تھا۔ قدیم ہند یورپی زبان بولنے والے آریا اپنے داخلۂ ہند سے قبل اِک عرصے تک مشرقی ایران اور افغانستان میں مقیم رہے۔''ایک اندازے کے مطابق آریاؤں نے ایران میں قریباً ایک ہزار سال (۱۰۰۰) تک قیام کیا''[۴۲] ۔ یہاں ان کی زبان ایران میں پہلے سے موجود زبان سے مخلوط ہوکر ارتقائی منزل طے کرتی ہوئی ۲۰۰۰ قبل مسیح میں 'ہندایرانی' منزل تک پہنچ چکی تھی۔ 'ہند یورپی' زبان کی یہ 'ہندایرانی' شکل ہی ان تمام زبانوں کی ماں کہی جاسکتی ہے جو بعدازاں ایران میں پھیلیں اور جنھیں آریا بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔

آریاؤں کی آمد سے قبل ہندوستان میں درج ذیل مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے:

(۱) نگریٹو (Negrito):

افریقہ سے ہندوستان آنے والی یہ پہلی قوم تھی جو غالباً افریقہ سے سمندر کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ہندوستان پہنچی۔ نسلاً یہ لوگ حبشی تھے۔ ان کے نشانات اب تک جزائر انڈمان میں پائے جاتے ہیں۔[۴۴]

(۲) آسٹرک (Austric):

ہندوستان پہنچنے والی دوسری قوم 'آسٹرک' فلسطین سے آئی تھی، جنھیں 'پروٹو آسٹرالائڈ' (Proto Australiod) بھی کہا جاتا ہے۔ آسٹرک قبائل شمالی اور وسطی ہندوستان میں آباد ہوئے۔ آریاؤں کی آمد سے قبل آسٹرک اور دراوڑ قبائل باہم ترقی کرتے ہوئے ایک باقاعدہ تہذیب کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ بعدازاں آسٹرک قبیلے سیلون، برما، ملایا اور آسٹریلیا میں پھیل گئے۔ آسٹرک لوگوں کی زبانیں بعض غیر متمدن قبائل میں آج بھی رائج ہیں۔[۴۵]

(۳) دراوڑ (Dravidian):

دراوڑ نسل کے لوگ قریباً ساڑھے تین ہزار سال (۳۵۰۰) قبل مسیح ہندوستان میں وارد ہوئے۔ ابتداءً یہ وادیِ سندھ میں بسے۔ بعدازاں ملک کے دیگر حصوں بالخصوص شمالی حصوں میں پھیل گئے۔[۴۶]

یہ سب اقوام بحیرۂ روم اور ایشیائے کوچک سے آئیں اور ہندوستان پہنچ کر ہڑپا اور موہن جوداڑو (پنجاب اور سندھ) میں ایک زبردست تمدن کی بنیاد رکھی،[۴۷] جو ایک ترقی یافتہ زبان کے بغیر ناممکن تھا۔

ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کی متعین تاریخ بتانا ممکن نہیں۔ ہجرت کے اِس سلسلے کا نقطۂ آغاز ۱۵۰۰ قبل مسیح سے پہلے کا ہے کیوں کہ یہ وہ دور ہے جب رگ وید کی تخلیق عمل میں آئی۔ داخلۂ ہند سے قبل آریا قبیلے کچھ عرصے تک افغانستان میں مقیم رہنے کے بعد دریائے کابل اور قرم کے کنارے کنارے پنجاب میں داخل ہوئے۔[۴۸]

آمدِ ہند کے بعد آریاؤں کا سابقہ یہاں پہلے سے آباد اقوام میں سے خاص طور پر دو قوموں (آسٹرک اور دراوڑ) سے پڑا۔ دراوڑ اور آریا اقوام مغربی اور شمال مغربی ہندوستان میں آمنے سامنے ہوئیں جب کہ آسٹرک قوم سے آریاؤں کا سابقہ زیادہ تر مشرقی اور وسطی ہند کے علاقوں میں پڑا۔[۴۹]

سر جارج گریرسن، برطانوی جرمن مستشرق ہارنلے کے اس نظریے سے متفق ہیں کہ مختلف عرصوں میں آریاؤں کے دو گروہ ہندوستان آئے۔ ان میں سے کون سا گروہ 'اندرونی' کہلایا اور کون سا 'بیرونی'؟ اس حوالے سے گریرسن کی رائے ہارنلے کے برعکس ہے۔ گریرسن کی تحقیقات کے مطابق:

..........at the earliest period at which we have any cognizance of India, the Punjab was in the possession of a number of Indo-Aryan tribes, not necessarily on good terms with each other, and sometimes speaking different dialects......................... Hoernle looked upon the second invaders as entering the Punjab like a wedge, into the heart of a country already occupied by the first immigrants, and forcing the latter outwards in three directions, to the east, to the south, and backwards to the west. Here again, while not denying it, I am not prepared, in our present state of knowledge , to accept this 'Wedge-Theory' as necessarily correct. It is equally possible that the lastest commers may have found their way opposed and have gone round their predecessors, down the Indus Valley, and thence, in later times, across India to their south and ultimately behind them on the east.[50]

گویا بہ قول ہارنلے پہلا گروہ دوآبہ گنگ وجمن میں قیام پذیر تھا کہ دوسرا گروہ پہلے گروہ کو مشرق، جنوب اور پیچھے مغرب کی طرف دھکیلتا ہوا داخل ہوا۔ اس طرح بعد میں آنے والا دوسرا گروہ 'اندرونی آریا' بن گیا اور شکست خوردہ پہلا گروہ 'بیرونی آریا' کہلایا۔ جب کہ گریرسن کی رائے یہ ہے کہ پہلے وارد ہونے والے آریا درمیان ہی میں بسے رہے اور بعد میں آنے والے آریا پہلے سے موجود آریاؤں کے چاروں طرف نیم دائرے کی شکل میں پھیل گئے۔ ہارنلے کے نظریے کے برعکس اس طرح آریاؤں کا پہلا گروہ 'اندرونی' اور دوسرا گروہ 'بیرونی' کہلایا۔ اسی نسبت سے گریرسن نے آریائی زبانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے؛ اندرونی گروہ کی زبانیں، بیرونی گروہ کی زبانیں۔

پہلے اور بعد میں آنے والے آریاؤں کی باہمی لڑائیوں اور پھر اِن کی ہندوستان میں پہلے سے موجود آسٹرک اور دراوڑ اقوام سے جنگ و پیکار کی صدائے بازگشت ویدوں کے منتروں میں ملتی ہے [۵۱]۔ لیکن بہ ہر حال جدید علما اور ماہرینِ لسانیات کے نزدیک گریرسن کا یہ نظریہ زیادہ پذیرائی حاصل نہ کر سکا۔

یہ امر مسلّم ہے کہ جب دو مختلف قومیں، خواہ جنگ کی شکل میں یا باہمی تعاون کی صورت، آپس میں ارتباط اور اختلاط کرتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کی تہذیب، رسم و رواج، رہن سہن، مذہبی عقائد اور زبانوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ایسا ہی معاملہ نو وارد آریاؤں کے ساتھ پیش آیا اور ہندوستان میں انھیں ایک ایسے تمدن سے واسطہ پڑا جو ہر لحاظ سے اِن کے تمدن پر فوقیت رکھتا تھا۔ ''ویدک شہادتوں کے مطابق آریاؤں نے نہ صرف بالخصوص دراوڑی تہذیب اور زبانوں کے اثرات قبول کیے بلکہ دراوڑی مذہب کے بعض عناصر اور اعتقادات کو بھی اپنا لیا تھا۔ اس طرح دراوڑی اور آریائی اختلاط سے وجود پذیر تہذیب و مذہب 'ہندی' کہلائے اور زبانوں نے 'ہند آریائی' نام پایا'' [۵۲]۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ ہندی تمدن خالص آریائی تمدن نہیں بلکہ اِس کی بنیادیں فراہم کرنے میں ہندوستان کی غیر آریا اقوام کا بھی بڑا اور اہم حصہ ہے۔

بِرصغیر میں داخل ہونے والے آریائی قبیلوں کی اصل زبان کا تعین دشوار ہے۔ چوں کہ آریاؤں کی آمد مختلف پہروں میں ہوئی اِس لیے قدیم آریائی زبان بِرصغیر میں واحد معیاری زبان کی شکل میں ہرگز داخل نہیں ہوئی بلکہ مختلف آریا قبیلے اپنے ساتھ متعدد و متفرق بولیاں لیے وارد ہوئے۔ قدیم ہند کی اِن آریائی بولیوں کے حوالے سے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے جستہ جستہ لسانی شواہد رِگ وید میں ضرور ملتے ہیں۔ ان بولیوں میں سے ایک ابتدائی بولی ویدوں کی زبان ہونے کی وجہ سے محفوظ و معتبر رہی جب کہ دیگر بولیاں پہلے سے موجود بولیوں سے خلط ملط ہو کر اور باہمی اثرات قبول کرنے سے بہ تدریج تغیر و تبدل سے دوچار ہوئیں۔ اس طرح آریائی زبانوں نے 'ہند ایرانی' منزل سے گزر کر 'ہند آریائی' شکل اختیار کی۔

ہندآریائی زبان کا ارتقا

عام طور پر ہندآریائی زبانوں سے وہ زبانیں مراد لی جاتی ہیں جو جنوبی ایشیا یا قدیم ہند میں آریاؤں کے ورود کے بعد ارتقا پذیر ہوئیں، لیکن چوں کہ ماہرین کے نزدیک اِن زبانوں کی آریائی حیثیت متنازع رہی ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آریائی زبانوں سے مراد وہ زبانیں لی جائیں جو آریاؤں کی آمدِ ہند کے بعد اپنی امتیازی حیثیت سے اُبھریں اور ارتقائی مراحل طے کیے۔ ماہرینِ لسانیات نے لسانی اور صوتی خصوصیات کی بنا پر ہندآریائی زبانوں اور بولیوں کے درج ذیل تین اہم اور بڑے عہد بتائے ہیں:

(۱) ہندآریائی زبان کا عہدِ قدیم : ۱۵۰۰ قبل مسیح تا ۵۰۰ قبل مسیح

(۲) ہندآریائی زبان کا عہدِ وسطیٰ : ۵۰۰ قبل مسیح تا ۱۰۰۰ صدی عیسوی

(۳) ہندآریائی زبان کا عہدِ جدید : ۱۰۰۰ صدی عیسوی تا حال [۵۳]

ہندآریائی زبان کا عہدِ قدیم:

بہ حیثیتِ مجموعی یہ عہد ۱۵۰۰ قبل مسیح تا ۵۰۰ قبل مسیح، قریباً ایک ہزار سال (۱۰۰۰) کو محیط ہے۔ ''اُس وقت 'ہند یورپی' زبان 'ہند ایرانی' منزل سے گزر کر خالص 'ہندآریائی' شکل اختیار کر چکی تھی'' [۵۴]۔ یہ عہد آریاؤں کی قدیم و مقدس زبان 'سنسکرت' کی نمائندگی کرتا ہے۔ 'وسیع معنوں میں اِسے ویدوں سے لے کر کالی داس کے ڈراموں تک میں مستعمل زبان سے مراد لیا جا سکتا ہے' [۵۵]۔ سنسکرت کے لغوی معنی شائستہ، مہذب اور فصیح کے ہیں۔ اس عہد کے دست یاب ادبی سرمائے کے مطالعے سے سنسکرت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے پیشِ نظر اِس کے ارتقا کے درج ذیل دو اہم ادوار قرار دیے جا سکتے ہیں:

(۱) ویدک سنسکرت:

قدیم ہندآریائی عہد میں ہندوستان میں شمال مغرب تا مشرق سنسکرت کا ارتقا اور فروغ عمل میں آیا۔ سنسکرت کے قدیم ترین تحریری نمونے ویدوں (رِگ وید، سام وید، یجر وید، اُتھر وید) کی رچناؤں کی صورت میں ملتے ہیں۔ اِسی سبب ویدک زبان کو 'ویدک سنسکرت' [۵۶] کہتے ہیں۔ ویدک سنسکرت کو بعد کی سنسکرت سے الگ بتانے کے لیے کبھی کبھی 'ویدک بھاشا' بھی کہا جاتا ہے۔ اِس زبان کا پہلا مستند تحریری نمونہ رِگ وید کی شکل میں دست یاب ہے۔ ''لسانی شہادتوں کے مطابق رِگ وید کی تدوین ۲۰۰۰ قبل مسیح اور ۱۵۰۰ قبل مسیح کے درمیانی عرصے سے شروع ہو کر قریباً ۵۰۰ قبل مسیح تک جاری رہی'' [۵۷]۔ بقیہ وید بھی ۱۰۰۰ قبل مسیح یا اس کے کچھ بعد تک تصنیف کیے جا چکے تھے [۵۸]۔ چاروں ویدوں کی زبان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف ویدک سنسکرت میں مقامی و غیرآریائی عناصر کی آمیزش کی بنا پر ہے۔ یہ اختلاف فقط تلفظ تک محدود نہیں تھا بلکہ دیسی الفاظ کی آمیزش بہ کثرت ہوئی۔ یہاں تک کہ سب سے قدیم وید 'رِگ وید' کے مختلف حصوں کی زبان یک ساں نہیں۔ رِگ وید میں مختلف راجاؤں اور علاقوں کے ذکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مختلف حصوں کی تصنیف مختلف مقامات پر مختلف علاقائی زبانوں کے زیرِ اثر ہوئی۔

رِگ وید کی زبان کی نوعیت کے حوالے سے ماہرین میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ ویدک قواعد نویس اے۔اے میکڈانل (A.A Macdonnell) کی تائید میں بعض دیگر یورپی اور ہندوستانی ماہرین 'ویدک سنسکرت' کو ایک طرح کی علمی و ادبی زبان قرار دیتے ہیں جو ایک خاص جماعت یعنی 'پروہتوں' کی زبان تھی۔ مزید یہ کہ ویدک سنسکرت بہت کم ایسے الفاظ کی حامل ہے جن سے اُس دور کے عام لوگوں کی زبان کا اندازہ لگایا جا سکے [۵۹]۔ اِس کے برعکس بہ قول ڈاکٹر مسعود حسین خان:

رِگ وید کے بیش تر منتر اسی غیر مصنوعی اور سادہ زبان میں ہیں جو اُس وقت آریاؤں کے گھرانوں میں بولی جاتی تھی۔ اگر بہ قول میکڈانل

رِگ وید کی زبان کو ادبی مان بھی لیا جائے تو اِس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ وہ اس زمانے کی بولیوں کی نشان دہی نہیں کرتی۔ ادبی زبان چالو زبان سے مختلف ضرور ہوتی ہے لیکن بالکل مختلف نہیں۔[۶۰]

اسی طرح ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق:

میرے خیال میں آریاؤں کی قدیم زبان ادب اور فلسفہ کی زبان نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ اتنے قدیم زمانے میں اِس کا امکان کم ہے کہ تمدنی ضروریات نے انھیں ایک ادبی اور معیاری زبان کی تشکیل پر مجبور کیا ہو۔ اس کے علاوہ وید آریاؤں کے سچے اور سادہ جذبات وخیالات کا آئینہ ہیں جن میں سادہ اور فطری انداز میں مقدس دیوتاؤں کے گُن گائے گئے ہیں۔ اس قسم کی تصنیف میں وہی زبان استعمال ہوسکتی ہے جسے ہر کس وناکس سمجھ سکے اور جو روزانہ بول چال میں برتی جائے۔[۶۱]

مزید براں ڈاکٹر شوکت سبزواری متعدد لسانی مماثلتوں کی بنیاد پر ویدک سنسکرت کو آریائی زبانوں کے وسطی عہد میں رائج اُن پراکرتوں کے مشابہ قرار دیتے ہیں جو سنسکرت کی علمی وادبی اہمیت کے برعکس عام بول چال کی زبانوں کی حیثیت سے جانی جاتی تھیں[۶۲]۔ بنیادی ویدک بھاشا غالباً مغربی ہندوستان (جو آج کل پاکستان کا علاقہ ہے) کی آریا بولی پر مبنی تھی، کیوں کہ یہ بولی آریاؤں کے ماخذ سے زیادہ قریب تھی۔ اسے بعد ازاں 'اُدیچیہ' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ادبی حیثیت اختیار کرنے سے یہ عام بول چال سے ہٹ کر ارتقائی منازل طے کرتی رہی اور اس کے برعکس رِگ وید کی زبان 'کتابی' بن کر رہ گئی۔ آریاؤں کے مختلف قبائل کی بولیوں میں خفیف اختلافات تھے لیکن رِگ وید کی زبان کا معیار سب تسلیم کرتے تھے[۶۳]۔ ویدوں کے علاوہ ویدک سنسکرت میں بعد ازاں براہمنیں اور اُپ نِشَد یں بھی تخلیق کی گئیں جو ہندوؤں کی مذہبی تصانیف ہیں۔

(۲) کلاسیکی سنسکرت:

ویدک سنسکرت کے بعد سنسکرت کے دوسرے روپ 'کلاسیکی سنسکرت' کا ظہور ہوا۔ سنسکرت زبان میں ادب تخلیق کیے جانے کے سبب یہ کلاسیکی سنسکرت کہلائی۔ اسے 'ادبی سنسکرت' بھی کہتے ہیں۔ رزمیہ نظمیں مہابھارت اور رامائن، منظوم سمرتیاں اور کالی داس کے ڈرامے اسی زبان میں لکھے گئے جنھیں بلا تامل عالمی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ سنسکرت اِس دور میں ہندوستان کے عالموں کی مشترکہ زبان بن گئی تھی۔ عالموں اور برہمنوں نے اپنی دانست میں آریائی زبان کی پاکیزگی، نفاست اور تقدس کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ چناں چہ زبان کو غیر ہند آریائی عناصر سے پاک کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مقامی اور علاقائی تعصّبات سے قطع نظر سنسکرت کو منظّم کرنے کی غرض سے صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی بنایا گیا جو ہر جگہ رائج ہوں۔ اس طرح زبان علاقائی ہونے کے بہ جائے 'راشٹر بھاشا' (ملکی زبان) بن گئی۔ خاص قسم کی ٹکسالی زبان میں تخلیق کیے جانے والے ادب کے سبب یہ زبان بن سنور کر 'سنسکرت' (شُدھ) ہوگئی۔

آریا اقوام کی سکونت پذیری کے سبب ملک کے بیش تر حصوں، بالخصوص علمی، ادبی اور مذہبی حلقوں اور بالعموم عام بول چال کی سطح پر سنسکرت کو بولا اور سمجھا جانے لگا۔ گویا اُس دور میں سنسکرت 'لنگوا فرینکا' کی حیثیت سے ہندوستانی بولیوں کی کثرت میں وحدت کا کام دینے لگی تھی[۶۴]۔ کبھی کبھی ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت کو ملا کر محض 'سنسکرت'[۶۵] بھی کہا جاتا ہے، لیکن بلا شبہ صوتی اور قواعدی اعتبار سے ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت مختلف ہیں۔

۱۰۰۰ قبل مسیح سے ۶۰۰ قبل مسیح تک آریا پنجاب سے لے کر بنگال تک پھیل چکے تھے[۶۶]۔ مختلف آریا اقوام کے سنگ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں جا بسنے کے سبب جہاں سنسکرت کی ادبی اہمیت و معیاری حیثیت کے پیشِ نظر دیگر دیسی و بدیسی بولیوں پر اِس کے راج ورواج کو تسلیم کیا گیا وہیں یہ صوتی اور قواعدی اعتبار سے اُن بولیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، جس کا براہِ راست اثر اس کی ٹکسالی کیفیت اور مرکزی حیثیت پر پڑا اور اس کا خزانۂ الفاظ عام بول چال کی متعدد بولیوں کے الفاظ سے بہت بڑھ گیا۔ ''نتیجے کے طور پر متعدد صوتی اور صرفی ونحوی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں رواج پانے لگیں۔ بعض اوقات الفاظ کو اجنبی ماحول کی صوتیات کے تحت توڑ مروڑ دیا جاتا، یہاں تک کہ حروف بھی مخصوص علاقائی حد کے بعد اپنا

مروج تلفظ کھو دینے اور نئے تلفظ میں ادا کیے جانے لگے۔ ہندوستان کے دیگر حصوں کی نسبت مشرقی صوبوں میں لسانی تبدیلیاں سرعت سے رونما ہوئیں''[67]۔لسانی تبدیلیوں کا یہ سلسلہ سنسکرت زبان کی مرکزی حیثیت کے خاتمے پر منتج ہوا،جس کی بنا پر اس دور میں سنسکرت کے درج ذیل تین علاقائی روپ سامنے آئے:

☆ اُدیچیہ:

یہ شمال مغربی ہندوستان کی بولی تھی۔''اُدیچیہ دراصل اُس علاقے کی بولی تھی جہاں آج کل سندھی اور لہندا(مغربی پنجابی) زبانیں بولی جاتی ہیں''[68]۔آریاؤں کی قدیم معیاری زبان سے قریب ہونے کی بنا پر اِسے دیگر بولیوں پر فوقیت حاصل تھی۔ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں اِسے زیادہ صحیح اور معیاری زبان کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔

☆ پراچیہ:

پراچیہ مشرقی ہندوستان میں رائج تھی۔یہ جن علاقوں میں بولی جاتی تھی اِن میں موجودہ اودھ(بالخصوص مشرقی یوپی)،بہار،بنگال اور اُڑیسہ کے علاقے شامل تھے۔یہ بولی دیسی بولیوں سے بہت زیادہ اثر قبول کر لینے کے سبب اپنا مخصوص آریائی لہجہ کھو چکی تھی اور معیار سے بہت دور جا نکلی تھی۔پراچیہ زبان بولنے والے آریائی قبائل شمال مغربی ہندوستان کے آریاؤں کے نزدیک 'آسوروں' (بھوت پریت) کی نسل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ براہمنہ میں پراچیہ بولی کو 'اشدھ' کہا گیا ہے۔[69]

☆ مدھیہ دیشہ:

اُدیچیہ اور پراچیہ کے درمیان انبالہ سے الٰہ آباد تک کا علاقہ 'مدھیہ دیش' کہلاتا تھا اور یہاں رائج بولی 'مدھیہ دیشہ' تھی جو نہ تو بہت زیادہ معیاری بولی تھی اور نہ بالکل غیر معیاری،مگر جب آریا تہذیب کا مرکز دوآبہ گنگ وجمن ہوا تو یہی زبان ترقی کر گئی۔مدھیہ دیشہ کا رواج خاص اُس علاقے میں تھا جہاں آج کل مغربی ہندی کی بولیاں (کھڑی بولی،ہریانوی،برج بھاشا،بندیلی اور قنوجی) بولی جاتی ہیں اور جہاں اردو اور ہندی کا چلن عام ہے[70]۔مدھیہ دیشہ کی تفصیل معلوم نہیں البتہ جیسے جیسے آریائی تہذیب کا مرکز پنجاب سے ہٹ کر دوآبہ گنگ وجمن ہوتا گیا،مدھیہ دیشہ کو ممتاز حیثیت دی جانے لگی۔[71]

اِن بولیوں کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند جین 'دکشنی' (جنوبی) کے نام سے سنسکرت کی چوتھی بولی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔[72]

۵۰۰ قبل مسیح تک پہنچتے پہنچتے سنسکرت کا رواج کم ہونے سے وہ روبہ زوال ہونے لگی۔اس کے کئی مذہبی،ادبی اور لسانی اسباب تھے،البتہ اس زوال کا سب سے اہم سبب وہ مذہبی انقلاب تھا جو 'مہاویر سوامی' اور 'مہاتما گوتم بدھ' کی تبلیغی کوششوں سے ہندوستان میں نمودار ہوا۔دونوں مذہبی رہنماؤں نے اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ کی غرض سے عام بول چال کی مقامی بولیوں کا انتخاب کیا۔اس طرح مذہب کا سہارا لے کر مقامی بولیاں سنسکرت کے مقابل سر اُٹھانے لگیں۔ردِعمل کے طور پر ویدک مذہب کے علم بردار سنسکرت کی حفاظت اور زیادہ سختی سے کرنے لگے،جس سے یہ خواص اور طبقۂ اشراف کی زبان بن گئی[73]۔علاوہ ازیں مذہبی تقدس حاصل ہونے کی وجہ سے یہ عام لوگوں سے زیادہ پنڈتوں اور پروہتوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔یہاں تک کہ اسے سماج کے نچلے درجے کے لوگوں کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا۔اس امر کی شہادت اُس دور کے اُن سنسکرت ڈراموں سے ملتی ہے جن میں اعلیٰ طبقے اور اونچی ذات سے متعلق افراد سنسکرت میں مکالمے ادا کرتے،جب کہ ادنیٰ طبقے اور نیچی ذات کے کردار پراکرت بولتے۔[74]

'سنسکرت' یعنی پاک وصاف،مرصع اور تراشیدہ زبان کے برعکس 'پراکرت' یعنی فطری اور خودرو زبان چوں کہ نسبتاً سہل اور سادہ زبان تھی اسی لیے عوام

میں بے حد مقبول ہوئی اور بہت جلد عام بول چال کی زبان بن گئی۔

واضح رہے کہ پراکرت کوئی علاحدہ زبان نہیں تھی بلکہ سنسکرت ہی کی بدلی ہوئی شکل تھی [۷۵]۔ جب سنسکرت زبان کے تلفظ، قواعد اور نحوی ڈھانچے میں کافی حد تک تبدیلیاں رونما ہوئیں تو یہ زبان بالکل بدل گئی۔ سنسکرت کی بدلی ہوئی شکل 'پراکرت' کہلائی [۷۶]۔ سر جارج گریرسن کے مطابق:

> The change from Sanskrit to Prakrit is so clear example of regular linguistic development, and is paralleled so exactly by the change of Latin to the Romance Languages, that I can not concieve the necessity of any other explanation.[77]

پراکرت کے پنپنے اور پھلنے پھولنے کے برعکس سنسکرت کی کم مائیگی و زوال پذیری کو محسوس کرتے ہوئے مشہور قواعد نویس پانِنی نے چوتھی صدی قبل مسیح میں سنسکرت کی پہلی قواعد 'اشٹ ادھیایی' (Astadhayayi) مرتب کی۔[۷۸]

پانِنی اور اس کی اشٹ ادھیایی:

'اشٹ ادھیایی' سنسکرت کی نہایت جامع، مستند اور مکمل قواعد ہے۔ یہ سنسکرت زبان کی نہایت حیرت انگیز لسانی توضیح ہے جس سے قدیم ہندوستان میں توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ اہلِ مغرب بھی پانِنی کے اِس لسانی شاہ کار کا لوہا مانتے ہیں۔[۷۹]

اشٹ ادھیایی سے مراد ہے 'آٹھ ابواب کا مجموعہ'۔ یہ سنسکرت کی منظم قواعد ہے جو چار ہزار (۴۰۰۰) سوتروں (شعری سطور) پر مشتمل ہے۔ تمام سوتر آٹھ ابواب میں منقسم ہیں۔ ہر باب یعنی 'ادھیایا' (Adhyaya) کے چار پد (Pada) یعنی چار حصے ہیں۔ ان چار ہزار سوتروں کے توسط سے پانِنی نے سنسکرت کی نہ صرف نہایت جامع اور مکمل توضیح کی بلکہ اس زبان کے لسانیاتی ڈھانچے کا بہت باریک بینی سے تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اشٹ ا دھیایی میں پانِنی نے اپنے چونسٹھ (۶۴) پیش رووں کا ذکر بھی کیا ہے جس میں 'نیرکتا' (Nirukta)[۸۰] کا مصنف 'یاسک' (Yaska) بھی شامل ہے[۸۱]۔ پانِنی کے بعد کے قواعد نویسوں میں اہم 'کاتیاین' (Katyayana) ہے جس نے 'وارتک' تالیف کی۔ کاتیاین کا جانشین مشہور قواعد نویس 'پتن جلی' (Patanjali) تھا جس نے 'مہا بھاشیہ' کے نام سے قدیم سنسکرت زبان اور اس کے ادبی سرمائے پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے۔[۸۲]

پانِنی نے اپنی شہرہ آفاق قواعد اشٹ ادھیایی کی تخلیق سے سنسکرت زبان کی ساخت اور ہیئت کا تعین تو کر دیا مگر اس کے باوجود وہ زبان میں تبدیلی کے عمل کو روک نہ سکا۔ یہیں سے ہند آریائی زبان کے ارتقا کے وسطی عہد کا آغاز ہوتا ہے جہاں پراکرتیں پھلی پھولیں اور اَپ بھرنشوں کو فروغ حاصل ہوا۔

ہند آریائی زبان کا عہدِ وسطیٰ:

ہند آریائی زبان کا وسطی عہد ۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۰۰۰ اصدی عیسوی تک قریباً ڈیڑھ ہزار سال (۱۵۰۰) کے عرصے کو محیط ہے [۸۳]۔ یہ عہد پراکرتوں کے ظہور اور ارتقا کا ہے۔ ''مغربی ماہرینِ لسانیات کی تقلید میں یہ خیال عام ہے کہ پراکرت کسی ایک مخصوص زبان کو کہتے ہیں، جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پراکرت دراصل بہ ذاتِ خود کسی زبان کا نام نہیں بلکہ زبانوں کے ایک گروہ کا نام ہے جس میں بنگال سے لے کر سندھ تک کی مختلف زبانیں شامل ہیں۔''[۸۴]

پراکرتوں کے صوتی اور لسانی تغیرات کے پیشِ نظر ماہرینِ لسانیات نے عہدِ وسطیٰ کے درج ذیل تین اہم ارتقائی ادوار مقرر کیے ہیں۔

(۱) دورِ اوّل : ۵۰۰ قبل مسیح سے مولودِ مسیح تک

(۲) دورِ دُوم : مولودِ مسیح سے ۵۰۰ صدی عیسوی تک

(۳) دورِ سِوُم : ۵۰۰ صدی عیسوی سے ۱۰۰۰ صدی عیسوی تک

(۱) دورِ اوّل:

پراکرت کے ارتقا کے دورِ اوّل کا تعین ۵۰۰ قبل مسیح سے مولودِ مسیح تک کیا گیا ہے۔ اس دور میں پراکرت اپنی اِن دو ادبی صورتوں میں ملتی ہے:

☆ پالی:

ارتقا کے اوّلین دور میں پراکرت کا پہلا ادبی روپ 'پالی' ہے۔ یہ وسط ہند آریائی عہد کی اوّلین نمائندہ زبان ہے۔ کلاسیکی سنسکرت کی طرح پالی بھی ایک شائستہ ، مہذب اور ادبی زبان تھی جس کا ڈھانچہ اُس عہد کی بہت سی بولیوں میں سے کسی ایک بولی کی بہ تدریج تہذیب و ترقی کے بعد تیار ہوا۔ مہاتما گوتم بدھ اور مہاویر سوامی نے اپنے اپنے مذاہب، بالترتیب بدھ مت اور جین مت کی تبلیغ و تلقین کے لیے سنسکرت کے برعکس پالی زبان کا انتخاب کیا۔ پالی زبان کے قدیم نمونے بدھ اور جینیوں کی مذہبی کتب اور 'گاتھا' کے گیتوں کے تراجم کی صورت میں محفوظ ہیں۔

مہاتما گوتم بدھ پالی بولتے تھے۔ وہ نہ صرف اس زبان میں بدھ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیتے تھے بلکہ اپنے پیروؤں کو بھی تبلیغ اور عام بول چال کے لیے پالی زبان کے استعمال کی تلقین کرتے تھے۔ بدھ مذہب کی تمام مستند تصانیف پالی زبان میں ہیں۔ ان میں جاتک، دھم پد، تری پٹک، بدھ گھوش کی اٹھ کتھا، مہاونش وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بدھ مذہب سے متعلق شاعری، کہانیاں، لغت اور قواعد بھی پالی میں ہیں۔ ''بدھ مذہب کے پیروؤں کے توسط سے پالی نہ صرف تکشلا (ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں واقع ایک قدیم علمی مرکز، موجودہ ٹیکسلا) اور ہندوستان کے دیگر مقامات تک پہنچی بلکہ سری لنکا، برما اور تھائی لینڈ کا سفر بھی کیا۔

پالی بنیادی طور پر مگدھ (بہار) کی زبان تھی، جہاں بعد ازاں ماگدھی پراکرت کا ارتقا عمل میں آیا۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ ماگدھی کا ارتقا گوتم بدھ کے زمانے میں ہو چکا تھا اور وہ ماگدھی ہی بولتے تھے۔ بلاشبہ پالی اور ماگدھی میں گہرا لسانیاتی رشتہ موجود ہے''[۸۵]۔ پالی پانچویں صدی قبل مسیح ہی میں مذہبی اور ادبی حیثیت اختیار کر چکی تھی جو گیارھویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اس کے بعد اس کی حیثیت بدھ عالموں اور مذہبی پیشواؤں تک محدود ہو کر رہ گئی[۸۶]۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے قریب مگدھ میں سنسکرت کا اثر ختم ہو چکا تھا۔[۸۷]

☆ اشوک کے کتبوں کی زبان:

اشوک[۸۸] کے کتبوں کی زبان دورِ اوّل کی پراکرت کا دوسرا ادبی روپ ہے۔ اِسے 'شیلالیکھی' پراکرت بھی کہتے ہیں[۸۹]۔ اشوک کا زمانہ گوتم بدھ کی وفات کے تقریباً ۲۳۰ قبل مسیح یعنی ڈھائی سو سال (۲۵۰) بعد کا ہے۔

اشوک نے مہاتما بدھ کی تعلیمات، اپنے حکومتی فرامین اور اپنی زندگی کے اہم واقعات کو پتھروں اور ستونوں پر کندہ کروا کر اپنی وسیع سلطنت کے طول و عرض میں نصب کروایا تھا جنھیں 'اشوک کی لاٹ' (Ashokan Edicts) کہا جاتا ہے۔ مؤرخین کے مطابق یہ کتبے تعداد میں کئی ہزار تھے مگر اِن میں سے فقط بیالیس (۴۲) ہی دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہے۔[۹۰]

کتبوں کی زبان پالی سے بہت مماثل ہے اور اِس کی آوازیں سنسکرت کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ تمام مقامات کے کتبوں کی زبان ایک جیسی نہیں تھی بلکہ ان میں علاقائی فرق نمایاں ہے۔ خاصی موشگافی کے بعد محققین اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اشوک کے زمانے میں کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار علاقائی بولیاں رائج تھیں۔ قیاس غالب ہے کہ مرکز سے حکومتی فرامین اور دیگر معلومات کو اردھ ماگدھی زبان میں مختلف مقامات تک بھیجا جاتا اور پھر انھیں مقامی بولی سے مخلوط کر کے کندہ کیا جاتا۔[۹۱]

کتبوں کی زبان دو طرح کے رسوم الخط (کھروشٹی اور براہمی)[۹۲] کی نمائندگی کرتی ہے۔ شہباز گڑھی اور مان سیرا کے کتبے 'کھروشٹی' میں ہیں جب کہ باقی سب 'براہمی' میں۔[۹۳]

(۲) دورِ دُوُم:

یہ دور مولودِ مسیح سے ۵۰۰ صدی عیسوی تک متعین کیا جاتا ہے۔ پراکرتوں کے ارتقا کے حوالے سے یہ دور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اشوک کے زمانے ہی سے بولیوں کا علاقائی فرق نمایاں تھا۔ بہ تدریج اِس فرق کے بڑھنے سے الگ الگ پراکرتیں ارتقا پذیر ہوئیں۔ بہ حیثیت زبان جب ان کا ارتقا پورے طور پر ہو چکا تو انھیں باقاعدہ ادبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ چناں چہ وسطی ہند آریائی کا یہ دوسرا دور 'ادبی پراکرتوں کا دور' بھی کہلاتا ہے۔ اس دور کی جن پراکرتوں نے ادبی حیثیت اختیار کی اور ان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ چلا، وہ درج ذیل ہیں:

☆ مہاراشٹری پراکرت:

مہاراشٹری پراکرت[۹۴] مہاراشٹر کی زبان تھی اور تمام ادبی پراکرتوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تصور کی جاتی تھی۔ عہدِ پراکرت کے قواعد نویسوں نے اسے 'مثالی پراکرت' کہا ہے۔ اُن کی توجہ کا مرکز یہی پراکرت تھی۔ انھوں نے اِس کا مطالعہ کافی تفصیل سے کیا ہے اور دوسری پراکرتوں کی نسبت اس کے قواعد زیادہ مرتب کیے۔ اس دور کا بیش تر شعری ادب اسی پراکرت میں ملتا ہے۔ اس کا استعمال موسیقی میں بھی کیا جاتا تھا۔[۹۵]

☆ شورسینی پراکرت:

یہ مدھیہ دیش کی پراکرت ہے اور اس کا مرکز متھرا (اتر پردیش) تھا۔ متھرا اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ قدیم زمانے میں 'شورسین' کے نام سے موسوم تھا۔ اسی نسبت سے یہ بولی 'شورسینی پراکرت' کہلائی[۹۶]۔ مدھیہ دیش کی بولی ہونے کی وجہ سے یہ سنسکرت کے زیادہ قریب تھی اور لسانی اعتبار سے اس نے سنسکرت سے گہرے اثرات قبول کیے۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقے میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا تو وہ یہی زبان تھی۔ ''اِس کی دو بولیاں؛ آبھیری (آہیری)' اور 'اونتی' کا ذکر ملتا ہے۔''[۹۷]

☆ ماگدھی پراکرت:

ماگدھی پراکرت[۹۸] پورے مشرقی ہندوستان کی بولی تھی البتہ اس کا مرکز مگدھ دیش (جنوبی بہار) تھا۔ قدیم ہند آریائی عہد میں یہ علاقہ 'پراچیہ' بولی کا تھا۔ آریائی تہذیبی مرکز سے فصل کی بنا پر ماگدھی پراکرت غیر آریائی بولیوں سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ اسی سبب اسے غیر مہذب تصور کیا جاتا تھا۔ سنسکرت ڈراموں مین نچلے درجے کے کردار اسی پراکرت میں اپنے مکالمے ادا کرتے تھے۔ 'باُلو کی، شاکاری، ڈھکّی، شابری اور چانڈالی اِس کی ذیلی بولیاں ہیں'۔[۹۹]

☆ اردھ ماگدھی پراکرت:

شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیانی علاقے (بہار سے الہ آباد تک) میں 'اردھ ماگدھی' بولی جاتی تھی۔ اردھ ماگدھی سے مراد 'آدھی ماگدھی' ہے۔ 'مہاتما گوتم بدھ اور مہاویر سوامی نے اپنے اپنے مذاہب کی تبلیغ جس بولی میں کی وہ دراصل اردھ ماگدھی کی قدیم شکل تھی'' [۱۰۰]۔ بالخصوص جین مت کی ابتدائی مذہبی و ادبی تصانیف اسی پراکرت میں پائی جاتی ہیں۔ ''جین اپنی اردھ ماگدھی کو 'آرش' کہتے ہیں'' [۱۰۱]۔ یہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب زبان تھی۔ اس کا رواج اُس زمانے کے شاہی خاندانوں تک میں رہا۔

☆ پیشاچی پراکرت:

یہ پنجاب اور کشمیر میں مستعمل تھی۔ ''کشنوں کے عہد (مولودِ مسیح سے ۴صدی عیسوی تک) میں شمال مغربی ہندوستان کی اِس پراکرت کو فروغ حاصل ہوا'' [۱۰۲]۔ اس میں ادبی تصانیف کا فقدان ہے۔ پیشاچی پراکرت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آریائی زبان نہیں، کیوں کہ اِس میں ایرانی زبانوں کے بعض اثرات نفوذ کر گئے ہیں۔ شہباز گڑھی (مردان) میں دریافت شدہ کتبے سے اس زبان کی بعض خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ [۱۰۳]

اِن پراکرتوں کے علاوہ وسطی ہند آریائی عہد کے اس دور میں ایک اور بولی 'گاتھا' کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس میں بُدھوں اور جینیوں کی کئی کتابیں ہیں۔ مغربی مفکرین اسے سنسکرت اور پالی کے بیچ کی زبان مانتے ہیں لیکن اسے سنسکرت اور پراکرت سے مخلوط زبان کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کا ارتقا نہیں ہوا۔ [۱۰۴]

مولودِ مسیح سے قریباً ۵۰۰ء تک ادبی پراکرتیں اُدیچیہ، پراچیہ اور مدھیہ دیش کے علاقوں میں مغرب تا مشرق ارتقائی مراحل طے کرتی رہیں۔ ادبی مقاصد کے لیے استعمال کیے جانے کے سبب اِن پراکرتوں کا ارتقا مختلف نہج پر ہونے لگا۔ چناں چہ رفتہ رفتہ عوام سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا اور عوامی زبان متفرق اَپ بھرنشوں کے روپ میں دوسری ڈگر پر ارتقا پانے لگی۔ ۵۰۰ء تک پہنچتے پہنچتے ادبی پراکرتوں کا ارتقا رُک گیا۔ یہیں سے ہند آریائی زبان کے عہدِ وسطی کے دورِ سوُم کا آغاز ہوتا ہے جس میں اَپ بھرنشیں ارتقا پذیر ہوئیں۔

(۳) دورِ سوُم:

۵۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک قریباً پانچ سو سال کے عرصے کو محیط یہ دور ادبی پراکرتوں کے زوال اور عام بول چال کی سطح پر مستعمل زبانوں کے ارتقا کا ہے۔ عام بول چال کی یہ زبانیں 'اَپ بھرنش' [۱۰۵] کے نام سے موسوم ہیں۔

اَپ بھرنش پراکرت کی عوامی شکل ہے۔ جس طرح لسانی تغیر کے نتیجے میں سنسکرت نے پراکرت کا رُوپ دھارا، اسی طرح پراکرت اپنا لسانی چولا بدلنے سے اَپ بھرنش کہلائی۔ ''یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اَپ بھرنش زبانیں کچھ تو ادبی پراکرتوں کے عام بول چال کے رُوپ تھے اور کچھ ادبی پراکرتوں کے برعکس ان کی ہم سر بولیاں تھیں'' [۱۰۶]۔ گویا ادبی پراکرتوں کے تاریخی ارتقا اور صوتی و لسانی تبدیلیوں کی وجہ سے متعدد اَپ بھرنشیں وجود میں آئیں۔ اس نوع کی لسانی تبدیلیاں

اچانک اور محسوس انداز سے رونما نہیں ہوتیں بلکہ صدیوں کو محیط یہ لسانی تغیرات فطری طور پر نہایت غیر محسوس طریقے سے وقوع پذیر ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں ایک زبان اپنا لسانی روپ بدل کر دوسری زبان کی شکل میں اُبھرتی ہے۔ اس لسانی تغیر و تبدل سے دنیا کی کوئی بھی زبان محفوظ نہیں۔

ابتداءً لفظ 'اَپ بھرنش' کسی خاص زبان کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ گنوار، ٹوٹے پھُوٹے اور بگڑے ہوئے لفظوں کو 'اَپ بھرنش' یا 'اَپ شبد' کہا جاتا تھا۔ بعدازاں وہ زبان جس میں اَپ شبد استعمال ہوئے، 'اَپ بھرنش' یا 'اَپ بھاشا' کہلائی [۱۰۷]۔ اَپ بھرنش کے تحریری نمونے اگرچہ تیسری صدی عیسوی میں لکھے گئے سنسکرت ڈراموں میں ملتے ہیں لیکن اسے باقاعدہ زبان کی حیثیت چھٹی صدی عیسوی میں حاصل ہوئی [۱۰۸]۔ اَپ بھرنشوں میں تصانیف کا سلسلہ تقریباً چودھویں صدی تک ملتا ہے [۱۰۹]۔ ساتویں صدی عیسوی سے اس کا استعمال شاعری میں ہونے لگا تھا جو قریباً پندرھویں صدی عیسوی تک رہا۔ [۱۱۰]

مشہور قواعد نویس مارکنڈے نے اپنی تصنیف 'پراکرت سروَسو' میں تین قسمیں بیان کی ہیں:

۱۔ وراچڑ اَپ بھرنش ۲۔ ناگر اَپ بھرنش ۳۔ اُپ ناگر اَپ بھرنش

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق:

مارکنڈے نے جن اَپ بھرنشوں کا ذکر کیا ہے وہ ادب اور فن کی زبانیں ہیں۔ بول چال کی زبانیں ان سے مختلف تھیں اور بہت تھیں۔ [111]

اَپ بھرنش چوں کہ پراکرت کا عوامی رُوپ تھی اسی سبب جن علاقوں میں پراکرتیں مستعمل تھیں وہیں اَپ بھرنشوں کا آغاز وارتقا عمل میں آیا۔ لہٰذا اس امر کے پیشِ نظر زیادہ تر ماہرین نے اتفاقِ رائے سے اَپ بھرنش کی درج ذیل اقسام بیان کی ہیں:

☆ مہاراشٹری اَپ بھرنش:

یہ مہاراشٹر کے علاقے کی بولی تھی۔ اس کا ارتقا مہاراشٹری پراکرت سے ہوا۔ موجودہ مراٹھی زبان کا سلسلہ مہاراشٹری اَپ بھرنش سے قائم کیا جاتا ہے۔ [112]

☆ شورسینی اَپ بھرنش:

شورسینی اَپ بھرنش شورسینی پراکرت سے نکلی۔ یہ اسی علاقے کی بولی تھی جہاں شورسینی پراکرت کا ارتقا ہوا اور جس کا مرکز شورسین دیش (متھرا) تھا۔ یہ قدرے شائستہ اور مہذب زبان تھی۔ ''۸۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک دوآبہ کی شورسینی اَپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی تھی۔ اس کا بنیادی سبب راجپوتوں کا سیاسی اقتدار تھا۔ علاوہ ازیں گجرات کے جینیوں نے بھی اِسے ترقی دی'' [113] ۔ ۱۰۰۰ء کے بعد یہ مغربی ہندی (کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی)، راجستھانی، پنجابی (مشرقی) اور گجراتی زبانوں کی پیدائش کا موجب بنی۔ گجراتی اور راجستھانی کا تعلق شورسینی اَپ بھرنش کی اُس شکل سے ہے جسے ناگر اَپ بھرنش بھی کہا جاتا ہے۔ ناگر اَپ بھرنش دراصل شورسینی ہی کا مغربی روپ تھی۔

☆ ماگدھی اَپ بھرنش:

اس کا تعلق ماگدھی پراکرت سے ہے۔ یہ مشرقی ہندوستان کے وسیع خطے میں مستعمل رہی۔ مختلف مقامات پر اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا۔ '' بنگال میں پراچیہ، گوڑ اور ڈھکی کہلائی جس سے موجودہ بنگالی اور آسامی نکلیں۔ اُڑیسہ میں اس کا نام اَت کلی پڑا جس سے موجودہ زبان اُڑیا نے جنم لیا۔ بہار کی تمام بولیاں اس کے تحت آ جاتی ہیں۔ بہار کی ایک بولی کا نام 'مگہی' ہے جو لفظ 'ماگدھی' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔'' [114]

☆ اردھ ماگدھی اَپ بھرنش:

یہ شورسینی اَپ بھرنش اور ماگدھی اَپ بھرنش کے درمیانی علاقے کی زبان تھی۔ اس سے مشرقی ہندی کی بولیوں کا ارتقا ہوا جن میں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی شامل ہیں۔

☆ شمال مشرقی اَپ بھرنش:

اس کی دو قسمیں ہیں:

(i) وراچڑ اَپ بھرنش:

یہ سندھ میں بولی جاتی تھی۔ بعد ازاں اس سے سندھی زبان کا ارتقا ہوا۔

(ii) کیکیی اَپ بھرنش:

لہندا دیش کا قدیم نام کیکیی تھا۔ کیکیی اَ پ بھرنش سے مغربی پنجابی (لہندا) کا ارتقا ہوا ۔ ابتدا میں مشرقی پنجابی بھی کیکیی اَپ بھرنش سے متعلق تھی لیکن بعد کے دور میں یہ شورسینی اَپ بھرنش کے زیرِ اثر آ گئی، اسی لیے سندھی اور لہندا میں لسانیاتی مماثلتیں ظاہر کرتی ہیں کہ کیکیی اَپ بھرنش اور وراچڈ اَپ بھرنش یقیناً باہم ملتی جُلتی ہوں گی۔ البتہ شمال مغربی ہندوستان کی پراکرتوں اور اَپ بھرنشوں کا احوال ابھی تک تاریخی دھند لکے میں ہے۔ اس سبب ان سے متعلق کوئی بھی وضاحت فی الحال مشکل ہے۔ راجستھانی اور گجراتی کی طرح مشرقی پنجابی کا رشتہ بھی شورسینی اَپ بھرنش سے جوڑا جاتا ہے۔[۱۱۵]

☆ پیشاچی اَپ بھرنش:

دھیریندر ورما نے پیشاچی اَ پ بھرنش کا ذکر بھی کیا ہے ، جس کا منبع پیشاچی پراکرت تھی۔ بعد ازاں اس سے درد زبانوں (Dardic Languages)، مثلاً کشمیری وغیرہ کا ارتقاعمل میں آیا۔[۱۱۶]

اَپ بھرنش کو 'اوہٹھ'[۱۱۷] کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یہ لفظ اَپ بھرنش ہی کی مزید ترمیم شدہ شکل ہے[۱۱۸]۔ اَپ بھرنشیں دور دراز علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں تھیں۔ اِن کا ادب مختلف مقامات پر تخلیق کیا گیا جو آج بھی دست یاب ہے اور جس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے اختتام تک اَپ بھرنشیں پورے شمالی ہندوستان میں مغرب تا مشرق پھیل چکی تھیں۔ اَپ بھرنش زبانوں میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ اگرچہ ۱۰۰۰ء کے بعد بھی جاری رہا البتہ بول چال کی زبان کی حیثیت سے ان کا ارتقا رک گیا اور ان کی جگہ متعدد جدید بولیاں اور زبانیں سر اُٹھانے لگیں۔ یہیں سے ہند آریائی زبان کے عہدِ جدید کا آغاز ہوتا ہے جو بہت سی جدید ہند آریائی بولیوں اور زبانوں کی ارتقائی تاریخ کا شاہد ہے۔

ہند آریائی زبان کا عہدِ جدید:

جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز وارتقا کی تاریخ ۱۰۰۰ء متعین کی گئی ہے۔ اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان آنے والے مسلمانوں کا تعلق فقط ایک قوم سے نہیں تھا بلکہ یہ ترک، ایرانی اور افغانی تھے۔ ان تمام اقوام کی اپنی اپنی جداگانہ تہذیب اور زبان تھی۔ البتہ عربی ، بہ حیثیت مذہبی زبان، ان اقوام کی مشترک ثانوی زبان تھی۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں نہ صرف سکونت اختیار کی بلکہ مختلف ادوار میں ان میں سے کچھ لوگوں نے حکومتی بھاگ دوڑ بھی سنبھالی۔ ۱۱۹۳ء میں فتح دہلی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے تسلط و حکمرانی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس سیاسی تبدیلی کے دور رس نتائج مرتب ہوئے اور شمالی ہندوستان میں سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی سطح پر سرعت سے تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔

ہند آریائی زبانوں میں ادبی تخلیقات کی ابتدا لگ بھگ تیرھویں صدی میں ہوئی۔ ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹرجی کا خیال ہے کہ اگر مسلمان ہندوستان میں نہ آئے ہوتے تو جدید ہند آریائی زبانوں کے ادبی آغاز وارتقا میں قریباً ایک یا دو صدیوں کی تاخیر ضرور ہو جاتی۔[۱۱۹]

ماہرینِ لسانیات نے موجودہ جدید ہند آریائی زبانوں کو ان کی لسانی اور ترکیبی خصوصیات کی بنا پر درج ذیل گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) شمال مغربی گروہ کی زبانیں:

اس گروہ کی زبانوں میں لہندا (مغربی پنجابی) اور سندھی کے علاوہ اُن جپسیوں کی بولیاں بھی شامل ہیں جو غالباً پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان سے نکلے اور ایران، آرمینیا، ایشیائے کوچک، شام اور یورپ کے مختلف مقامات پر جا بسے۔[۱۲۰]

☆ لہندا:

مغربی پنجاب کی زبان لہندا ہے۔لہنداز بان کئی اور ناموں سے بھی موسوم ہے، مثلاً ہندکو، جانگی، ملتانی، پوٹھوہاری، اُچی وغیرہ۔ان میں سب سے بہتر نام لہندا ہی ہے۔اس کے معنی 'سمت مغرب' کے ہیں۔یعنی جس طرف سورج غروب ہوتا ہے۔

لہندا پر درد اور پیشاچ زبانوں کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔مغربی پنجاب میں کیکیی دیش بھی شامل ہے جہاں قدیم زمانے میں پیشاچی پراکرت اور وراچڈاَپ بھرنش بولی جاتی تھیں۔[۱۲۱]

لہندا میں بہت کم ادب موجود ہے۔صرف سکھوں کی 'جنم ساکھی'، چند مقبول نظمیں اور گیت ہیں جن کی زبان مشرقی پنجابی سے متاثر معلوم ہوتی ہے[۱۲۲]۔ اسے بولنے والے افراد ادبی و علمی مقاصد کے لیے عموماً اردو، مشرقی پنجابی اور بہت کم ہندی کا استعمال کرتے ہیں۔ پہلے پہل لہندا کا رسم الخط 'لنڈا' تھا جو 'شاردا' کی ایک قسم ہے مگر اب یہ رائج نہیں۔اب لہندا اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

☆ سندھی:

یہ صوبہ سندھ کی بولی ہے۔ بھارت میں سندھی بولنے والے مہاجر کثیر تعداد میں ہیں تاہم اس کے بولنے والوں میں پاکستانی مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔اگلے وقتوں میں سندھ 'وراچڈ دیش' کہلاتا تھا، اس لیے موجودہ سندھی کا تعلق وراچڈاَپ بھرنش سے ہے۔آریائی زبانوں میں یہ واحد زبان ہے جو براہِ راست عربی سے متاثر ہوئی[۱۲۳]۔اسی سبب اس میں عربی اور فارسی الفاظ بہ کثرت موجود ہیں۔سندھی زبان کی پانچ بولیاں ہیں؛ وچولی، سریکی، لاڑی، تھریلی اور کچھی۔ان میں 'وچولی' معیاری بولی ہے۔

سندھی زبان میں ادب موجود ہے جو خاص طور پر صوفیانہ ہے۔اس کی مثال شاہ عبدالطیف بھٹائی کی مشہور کتاب 'شاہ جی رسالو' ہے[۱۲۴]۔سندھی زبان اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ بھارت میں اسے دیوناگری میں لکھنے کی کوشش ملتی ہے مگر اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔سندھی کا اپنا اصل رسم الخط 'لنڈا' بھی تاجروں میں مقبول ہے۔

☆ جپسی بولیاں:

یورپ اور مغربی ایشیا میں سکونت پذیری کی بنا پر جپسی بولیوں کی دو شاخیں متعین کی جاتی ہیں، آرمینی بولیاں اور یورپی بولیاں۔ یہ بولیاں ان پراکرتوں سے مشتق ہیں جو شمال مغربی ہندوستان میں مستعمل تھیں۔ان کا کچھ تعلق پیشاچہ زبانوں سے بھی ہے۔[۱۲۵]

(۲) جنوبی گروہ کی زبانیں:

یہ گروہ ایک ہی زبان 'مراٹھی' اور اس کی تین بولیوں پر مشتمل ہے:

☆ مراٹھی:

مراٹھی مہاراشٹر کی زبان ہے اور یہ مہاراشٹر اَپ بھرنش سے نکلی ہے۔ اس میں 'تت سم'[۱۲۶] الفاظ بہت کم ہیں جب کہ دیسی یا 'تدبھو'[۱۲۷] الفاظ بہ کثرت ہیں۔مراٹھی کی تین خاص بولیاں یہ ہیں:

☆ **دیشی:** یہ معیاری اور وسطی زبان ہے جو پُونے (Pune) میں بولی جاتی ہے۔اس پر فارسی کے اثرات ہیں۔

☆ **کونکنی:** یہ بولی گوااوراس کے نواح میں رائج ہے۔ یہ کنڑا سے متاثر ہے۔

☆ **بڑاڑی:** بڑاڑی ناگ پور میں مستعمل ہے۔اس پر بھیلی اور تلنگی زبانوں کا اثر ہے۔

مراٹھی کی یہ تینوں قسمیں آپس میں زیادہ فرق نہیں رکھتیں کہ انھیں جدا جدا زبانوں کا درجہ دیا جا سکے۔ان میں زیادہ تر فرق لفظ کی سطح پر ہے۔

مراٹھی ادبی اور علمی حیثیت سے ہندوستان کی ممتاز ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔اس کے قدیم ترین مصنفین میں 'مکندراجہ' 'گیا نیشور' اور 'نام دیو' قابلِ ذکر ہیں۔گیا نیشور نے بھگوت گیتا کی تفسیر 'گیا نیشوری' کے عنوان سے لکھی۔نام دیو کی چند نظمیں سکھوں کے 'آدی گرنتھ' میں محفوظ ہیں [۱۲۸]۔اس کا رسم الخط دیوناگری ہے۔

(۳) مشرقی گروہ کی زبانیں:

یہ گروہ مزید دو شاخوں میں منقسم ہے؛ ماگدھی زبانیں اور مشرقی ہندی۔ ماگدھی زبانوں کے زمرے میں چار زبانیں؛ بنگالی، اُڑیا، آسامی اور بہاری شامل ہیں۔ بنگالی، اُڑیا اور آسامی مشرقی ماگدھی زبانیں ہیں جب کہ بہاری، ماگدھی کی مغربی شاخ ہے۔ان زبانوں کا اجمالی مطالعہ درج ذیل ہے:

☆ بنگالی:

بنیادی طور پر یہ ریاست بنگال اور بنگلہ دیش کی زبان ہے، البتہ چھوٹا ناگ پور اور وادیِ آسام میں بھی رائج ہے۔ بنگالی زبان ماگدھی اَپ بھرنش کی خاص جانشین ہے۔عہدِ حاضر میں بنگالی کی دو جدا جدا اور باضابطہ شاخیں بن گئی ہیں۔ایک ادبی بنگالی ہے جو سنسکرت سے زیادہ متاثر ہے اور دوسری عوام کی زبان ہے۔دونوں میں خاصا فرق ہے۔ بنگالی کی اصل لسانی شاخیں یہ ہیں:

☆ کلکتہ اوراس کے اطراف کی مرکزی زبان۔

☆ رنگ پور، میمن سنگھ اور ڈھاکہ کی مشرقی زبان۔

☆ ندیا اور چوبیس پرگنہ کی مغربی زبان۔

ادبی سرمائے کے اعتبار سے بنگالی ہندوستان کی اہم ترین زبان شمار کی جاتی ہے۔غالباً ہندی کے بعد ادب اور علوم وفنون کے اعتبار سے بنگالی ہندوستان کی سب سے زیادہ قابلِ وقعت زبان ہے۔انگریزی تسلط کے بعد اس نے خاص ترقی حاصل کی۔قدیم بنگالی شعرا میں چنڈی داس اور جدید مین ٹیگور قابلِ ذکر ہیں۔ بنگالی رسم الخط 'براہمی' ہی کی ایک شکل ہے۔

☆ اُڑیا:

یہ اُڑیسہ (قدیم اَت کل دیش) کی زبان ہے۔ اسی سبب اسے 'اَت کلی' یا 'اوڈری' بھی کہتے ہیں۔ بنگالی کی طرح اُڑیا بھی ماگدھی اَپ بھرنش کی پیداوار ہے جو بارھویں صدی عیسوی میں نمودار ہوئی۔اس کی قواعد بنگالی سے بہت ملتی جلتی ہے۔اُڑیسہ پر مرہٹوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے اُڑیا میں مراٹھی زبان کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔علاوہ ازیں آندھراپردیش سے جغرافیائی قرب کی بنا پر اس مین تیلگو الفاظ بھی داخل ہو گئے ہیں۔

اُڑیا کا ادب قریباً چار سو سال (۴۰۰) پرانا ہے لیکن اس کا پہلا تحریری نمونہ ۱۲۶۶ء کا ہے۔ [۱۲۹]

☆ آسامی:

یہ زبان وادیِ آسام میں رائج ہے۔اس زبان کا اصلی نام 'اَسَمِیہ' ہے۔اُڑیا اور بنگالی کی طرح یہ زبان بھی ماگدھی اَپ بھرنش سے نکلی ہے۔آسامی کی دو شاخیں ہیں۔ایک مشرقی اور دوسری مغربی۔مشرقی آسامی سبوساگر میں مستعمل ہے۔آسامی زبان بنگالی سے بہت مماثل ہے۔دونوں کی قواعد اگرچہ زیادہ مختلف نہیں لیکن دونوں کے ادبی رجحانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔دونوں کا رسم الخط ایک ہی ہے۔آسامی زبان کا ادب زیادہ تر تاریخی ہے جو قریباً چھ سو سال (۶۰۰) پرانا ہے۔[۱۳۰]

☆ **بہاری:**

ماگدھی اَپ بھرنش سے ارتقا پانے والی یہ چوتھی زبان ہے جو صوبہ بہار میں مستعمل ہے۔تمدنی اعتبار سے صوبہ بہار کا تعلق یو۔پی سے رہا ہے لیکن لسانی اعتبار سے اس کی بولیاں بنگالی زبان سے زیادہ قریب ہیں۔بہاری دراصل بہ ذاتِ خود اسم اللسان نہیں بلکہ یہ اِن تین بولیوں کا مجموعہ ہے:

☆ **میتھلی:**

یہ شمال مشرقی بہار کی بولی ہے۔اس کا مرکز دربھنگہ ہے اور یہ خاص دربھنگہ کے برہمنوں کی زبان ہے۔اس میں اچھا ادب ملتا ہے۔'ودیاپتی' میتھلی زبان کا بڑا شاعر تھا۔

☆ **مگہی:**

یہ جنوبی بہار میں مستعمل ہے جو پٹنہ، گیا، مونگر اور ہزاری باغ میں بولی جاتی ہے۔یہ خاص ماگدھی کا علاقہ ہے۔

☆ **بھوج پوری:**

بھوج پوری[۱۳۱] بولی مشرقی یو۔پی میں گورکھ پور اور بنارس کی کمشنریوں، بہار میں شاہ آباد اور چمپارن وغیرہ کے اضلاع میں رائج ہے۔

مذکورہ بہاری بولیوں میں میتھلی اور مگہی ایک دوسرے سے مماثل ہیں جب کہ بھوج پوری ان سے قدرے مختلف ہے۔صوبہ بہار میں تین رسم الخط رائج ہیں۔ادبی تحاریر کے لیے دیوناگری استعمال ہوتا ہے۔عام لکھائی کی غرض سے کیتھی رسم الخط برتا جاتا ہے۔میتھلی برہمنوں میں بنگالی رسم الخط سے ملتا جلتا رسم الخط رائج ہے جسے میتھلی رسم الخط کہا جاتا ہے۔صوبہ بہار کی ادبی زبانیں اردو اور ہندی ہیں۔[۱۳۲]

☆ **مشرقی ہندی:**

'مشرقی ہندی' درحقیقت اسم اللسان نہیں۔یہ اصطلاح گریرسن کی وضع کردہ ہے جس سے وہ مغربی ہندی کے مشرق میں مستعمل تین بولیاں؛ اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی مراد لیتا ہے۔اسے 'پوربی ہندی' بھی کہا جاتا ہے۔یہ اردھ ماگدھی اَپ بھرنش کی ارتقائی شکل ہے۔اپنی بعض خصوصیات میں یہ مغربی ہندی سے مماثل ہے اور بعض خوبیوں میں بہاری سے، البتہ نسبتاً یہ مشرقی ہندوستان کی زبانوں (بہاری اور بنگالی) کے زیادہ قریب ہے۔اس کی تین بولیاں یہ ہیں:

☆ **اودھی:**

اودھی متعدد ناموں سے جانی جاتی ہے جن میں سے ایک نام کوسلی بھی ہے۔یہ مشرقی ہندی کی اہم بولی ہے جو لکھنؤ اور فیض آباد کی کمشنریوں اور الٰہ آباد کی کمشنری میں شمالی حصے کو چھوڑ کر بولی جاتی ہے۔اودھی میں کافی ادب موجود ہے۔اس کے دو مشہور شاعر ملک محمد جائسی

(مصنف: پدماوت) اور تلسی داس (مصنف: رامائن) ہیں جن کا شمار ہندی ادب کی مایہ ناز ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ اودھی کے جنوب مغربی روپ کو 'بیسواڑی' بھی کہتے ہیں۔

☆ بگھیلی:

موجودہ مدھیہ پردیش بننے سے قبل ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۲ء کے درمیانی عرصے میں جو ریاست وندھیا پردیش تھی اس کا مغربی حصہ بندیل کھنڈ اور مشرقی حصہ باگھیل کھنڈ تھا۔ بگھیلی اسی حصے کی بولی ہے[۱۳۳]۔ بگھیلی میں بہت کم ادب ملتا ہے۔

☆ چھتیس گڑھی:

یہ مشرقی مدھیہ پردیش میں رائے پور کمشنری کے علاقے 'چھتیس گڑھ' کی بولی ہے۔ یہ بولی مراٹھی اور اُڑیا سے متاثر ہے۔ اس میں بھی بہت کم ادب تخلیق کیا گیا۔

مشرقی ہندی کے لیے دیوناگری رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے۔

(۴) وسطی زبانیں:

اس گروہ کی زبانوں میں مغربی ہندی، مشرقی پنجابی، گجراتی اور راجستھانی بولیوں کے علاوہ پہاڑی گروہ کی بولیاں بھی شامل ہیں جو اُن کھاشا قبیلوں (Khas Tribes) میں رائج ہیں جو ہمالیہ کے پہاڑوں میں مغرب سے مشرق تک پھیلے ہوئے ہیں۔[۱۳۴]

☆ مشرقی پنجابی:

اسے عام طور پر 'پنجابی' کہا جاتا ہے۔ یہ مشرقی پنجاب، بیکانیر (راجستھان) کے شمالی اضلاع اور ریاست جموں کے جنوبی اضلاع کی زبان ہے۔ مغرب میں یہ لہندا، مشرق میں کھڑی بولی اور ہریانوی، شمال اور شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں باگڑو اور بیکانیری بولیوں سے گھری ہوئی ہے[۱۳۵]۔ ماہرین پنجابی کی متعدد بولیوں کا ذکر کرتے ہیں، مثلاً ماجھی، دوآبی، پوادھی، مالوی، بھٹیالی، ڈوگری وغیرہ۔ ان میں ماجھی[۱۳۶] اور ڈوگری مشہور ہیں۔ ماجھی معیاری زبان ہے جو پاکستان میں ضلع لاہور اور بھارت میں ضلع امرت سر اور ضلع گرداس پور میں رائج ہے۔ ڈوگری ریاست جموں اور ضلع کانگڑہ میں مستعمل ہے۔

مشرقی پنجابی میں خاصا ادب موجود ہے۔ موجودہ زمانے میں سکھ قوم اس زبان میں متواتر ادب تخلیق کر رہی ہے۔ سکھ پنجابی کو گُرمکھی رسم الخط میں تحریر کرتے ہیں جو لنڈا رسم الخط کی ایک اصلاح یافتہ شکل ہے۔ پاکستان میں اِسے ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے اردو رسم الخط رائج ہے۔

☆ گجراتی:

یہ زبان گجرات، کاٹھیاوار، ریاست بڑودہ اور اُس کے نواحی اضلاع میں رائج ہے۔ گجراتی شورسینی اَپ بھرنش کے مغربی روپ ناگر اَپ بھرنش کا ترقی یافتہ روپ ہے۔ دیگر زبانوں کے برعکس اس کی متعدد بولیاں آپس میں زیادہ متفرق نہیں۔ قدیم راجستھانی اور قدیم گجراتی باہم اِس قدر مماثل ہیں کہ اِن میں فرق نہ ہونے کے برابر ہے۔

راجپوتوں کے عہد میں متھراوالوں کے سیاسی اقتدار کی بہ دولت جدید گجراتی اپنی قواعد کے اعتبار سے مغربی ہندی بالخصوص برج بھاشا سے بہت متاثر ہوئی[۱۳۷] ۔اِس کا رسم الخط ہندی سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔

☆ راجستھانی:

یہ مدھیہ دیش کی زبان کا جنوب مغربی پھیلاؤ ہے۔اس پھیلاؤ کی آخری کڑی گجراتی زبان ہے۔یہ شورسینی اَپ بھرنش یا اُس کے روپ اُپ ناگر اَپ بھرنش کی ارتقائی شکل ہے۔اِس میں قدیم ادب کافی مقدار میں پایا جاتا ہے،البتہ موجودہ زمانے میں راجستھان کی واحد تہذیبی وادبی زبان ہندی ہے۔راجستھانی کی چار اہم بولیاں یہ ہیں:

☆ مارواڑی:

یہ راجستھانی بولی جودھ پور، بیکانیر،جیسل میر اوراودے پور میں مستعمل ہے۔مارواڑی کا قدیم ادب 'ڈنگل' کہلاتا ہے۔مارواڑی ادب زیادہ تر دوہوں اور قصوں پر مشتمل ہے۔

☆ مالوی:

یہ ریاست اندور اور اجین کی بولی ہے۔

☆ جے پوری:

یہ بولی جے پور،کوٹا اور بوندی کے اضلاع میں رائج ہے۔جے پوری میں کچھ نہ کچھ ادب موجود ہے۔

☆ میواتی:

یہ الور اور دہلی کے جنوب میں گوڑ گاؤں کی بولی ہے۔میواتی علاقہ ہریانہ اور راجستھان میں بٹا ہوا ہے۔میواتی آبادی زیادہ تر مسلمان ہے۔میواتی اور مالوی بولیوں میں ادب بہت کم ہے۔

اِن چاروں بولیوں کی ساخت کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مارواڑی اور جے پوری دونوں گجراتی سے مماثل ہیں۔ میواتی برج بھاشا سے اور مالوی مغربی ہندی سے مشابہت رکھتی ہے۔راجستھان اور گجرات کی سرحد پر بھیلی بولیاں رائج ہیں جو گجراتی سے مشابہت کے باوجود راجستھانی زبان کی ذیل میں آتی ہیں۔اسی طرح خاندیشی بھی راجستھانی گجراتی بولی ہے۔

☆ پہاڑی بولیاں:

پہاڑیاں بولیاں درج ذیل ہیں:

☆ پوربی پہاڑی:

یہ نیپال میں رائج ہے۔اسے نیپالی، پربتیا،گرکھالی اور سکھ کُرا بھی کہتے ہیں۔یہ بولی نسبتاً واضح اور سنورے روپ میں کاٹھ منڈو کی گھاٹی میں مستعمل ہے۔یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

☆ وسطی پہاڑی:

یہ زبان جے پوری سے متاثر ہے۔اس میں کچھ ادب ملتا ہے۔اس کی مزید دو بولیاں ہیں۔ایک بولی 'کمایونی' ہے جو المونڑہ اور نینی تال کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔دوسری بولی 'گڑھوالی' ہے جو ریاست گڑھوال اور مسوری کے پہاڑی علاقے کی بولی ہے۔

☆ **مغربی پہاڑی:**

یہ زبان متعدد بولیوں کی حامل ہے جو شملہ اور اس کے نواحی پہاڑی علاقے میں رائج ہیں۔ان میں تحریری ادب نہیں ملتا۔

قریباً سب پہاڑی بولیاں راجستھانی سے خاصی مماثلت رکھتی ہیں۔ بالخصوص وسطی پہاڑی بولیاں جے پوری سے مماثل ہیں اور مغربی پہاڑی بولیاں مارواڑی سے خاصی قریب ہیں۔اس مماثلت کا سبب اِن علاقوں میں اُن چند راجپوت قبائل کی سکونت پذیری ہے جو مسلمانوں کے عہد میں راجپوتانہ سے ہجرت کر کے یہاں آئے۔اسی وجہ سے یہاں کی بولیوں نے راجستھانی سے گہرا اثر قبول کیا۔

☆ **مغربی ہندی:**

'مشرقی ہندی' کی طرح 'مغربی ہندی' بھی دراصل کسی زبان کا نام نہیں بلکہ یہ اُن پانچ بولیوں کے مجموعے کا فرضی نام ہے جو دہلی اور اس کے نواح میں مستعمل رہیں۔ یہ بولیاں ہیں؛ کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا،قنوجی اور بندیلی۔ایک دوسرے سے لسانی مماثلت رکھنے والی یہ پانچوں بولیاں چوں کہ 'مشرقی ہندی' کے مغرب میں واقع ہیں اسی سبب پہلی بار سر جارج گریرسن نے انھیں 'مغربی ہندی' کے اجتماعی نام سے پکارا۔اسی طرح بہ قول ڈاکٹر مسعود حسین خان:

> اسی شورسینی اَپ بھرنش نے مغربی ہندی کو جنم دیا جو ۱۰۰۰ سنہ عیسوی کے قریب ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔جب کوئی زبان کسی وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے تو اِس کی یکسانیت باقی نہیں رہتی اور وہ جزوی اختلافات کے ساتھ کئی بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔مغربی ہندی بھی کم از کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ایسی ہی بولیوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔[۱۳۸]

مذکورہ بالا بیان کے برعکس ڈاکٹر شوکت سبزواری کہتے ہیں:

> برج، کھڑی، بندیلی اور قنوجی کے علاقے میں کبھی کوئی ایک زبان نہ تھی جو اِن بولیوں کے درمیان کی چیز ہو اور جو بعد میں اِن بولیوں میں بٹ گئی ہو۔شروع ہی سے اِن علاقوں میں مذکورہ بالا بولیاں رائج تھیں۔چند ملتی جلتی زبانوں کو دیکھ کر اِن کا ایک مشترک ماخذ فرض کرنا ایک ایسا فعل ہے جسے فکرِ انسانی کی اختراع سمجھنا چاہیے۔[۱۳۹]

مغربی ہندی مدھیہ دیش کی زبان ہونے کی حیثیت سے ہند آریائی زبان کی بہترین نمائندہ ہے کیوں کہ مدھیہ دیش کا علاقہ قدیم ہند آریائی عہد کا وہ علاقہ ہے جہاں سنسکرت زبان کی نمائندہ شکل پروان چڑھی تھی، جہاں وسطی ہند آریائی عہد میں شورسینی پراکرت اور شورسینی اَپ بھرنش کو بالخصوص ادبی حیثیت سے فروغ حاصل ہوا تھا اور جس کا ڈنکا پنجاب سے بنگال تک بجتا تھا۔

بعد ازاں اسی علاقے میں ۱۰۰۰ صدی عیسوی کے بعد چار جدید ہند آریائی زبانوں؛ مشرقی پنجابی، گجراتی، راجستھانی اور مغربی ہندی (کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی ،قنوجی) نے ارتقائی سفر طے کیا۔اس طرح مشرقی پنجابی، گجراتی اور راجستھانی کی طرح مغربی ہندی بھی وسطی گروہ کی زبان ہے۔البتہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کی رائے کے مطابق:

> اندرونی زبان کی شاخ میں صرف مغربی ہندی ایک ایسی زبان ہے جسے ہم خالص اندرونی زبان کہہ سکتے ہیں، بلکہ اگر

پنجابی، راجستھانی اور گجراتی کی ملواں حیثیت پر نظر رکھیں تو اندرونی گروہ کی نمائندہ زبان محض 'مغربی ہندی' ہے۔[۱۴۰]

مغربی ہندی ہندوستان کی پانچ ریاستوں؛ ہریانہ، دہلی، اُتر پردیش، اترا کھنڈ اور مدھیہ پردیش میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے شمال مغرب میں مشرقی پنجابی رائج ہے اور جنوب میں مراٹھی زبان کا چلن ہے۔ جنوب مشرق میں یہ مشرقی ہندی سے اور شمال میں پہاڑی بولیوں؛ کمایونی، گڑھوالی وغیرہ سے گھری ہوئی ہے۔

اکثر ماہرینِ لسانیات مغربی ہندی کا قدیم ترین تحریری نمونہ چند بردائی کی نظم 'پرتھی راج راسا' کو قرار دیتے ہیں[۱۴۱]۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق انہتر (۶۹) بندوں پر مشتمل اس نظم کا کچھ حصہ چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم مغربی ہندی کے نمونے چند بھگت یا وشنو پرست غیر برہمن مصنفین کے مذہبی کلام سے حاصل ہوتے ہیں۔[۱۴۲]

شور سینی اَپ بھرنش اپنے ارتقا کے آخری دور میں دو نمایاں شکلوں میں اُبھر کر سامنے آئی۔ پہلی شکل میں اسما و افعال کا اختتام عام طور پر 'الف' (ا) پر ہوتا ہے اور دوسری شکل میں 'واؤ' (و) پر۔ اس اعتبار سے مغربی ہندی کے نام سے موسوم پانچ بولیوں کو اِن دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) طویل مصوتے 'الف' پر ختم ہونے والی بولیاں:

یہ بولیاں کھڑی بولی اور ہریانوی ہیں۔ ان میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال عموماً 'الف' پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً 'میرا بیٹا لاہور گیا'، 'ساون آیا' وغیرہ۔ یہ لہجہ اردو کی نمایاں پہچان ہے۔

(۲) مصوتے 'واؤ' پر ختم ہونے والی بولیاں:

یہ بولیاں برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی ہیں۔ ان میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ عام طور پر 'واؤ' پر ہوتا ہے، مثلاً 'میرو بیٹو لاہور گیو'، 'ساون آیؤ' وغیرہ۔ اردو نے اپنے ارتقا کے کسی بھی مرحلے پر اِن شکلوں کو اختیار نہیں کیا۔

مغربی ہندی کے نام سے موسوم پانچ بولیوں کا اجمالی ذکر پیش ہے:

☆ برج بھاشا:

برج بھاشا کو نسبتاً شور سینی اَپ بھرنش کی نمائندہ بولی اور سچی جانشین تسلیم کیا گیا ہے۔ 'واؤ' کا لہجہ رکھنے والی اس بولی کا ارتقا دہلی کے جنوب مشرقی علاقے میں ہوا جس کا مرکز برج[۱۴۳] (متھرا) رہا ہے۔ متھرا ہندو تہذیب و تمدن کا مرکز ہونے کے علاوہ سنسکرت زبان کا گہوارہ بھی رہا ہے۔

برج بھاشا کافی وسیع علاقے میں رائج ہے۔ جنوب میں یہ آگرہ، بھرت پور، فیروز آباد، دھول پور، کرولی، ریاست گوالیار اور جے پور کے مشرقی اضلاع تک بولی جاتی ہے۔ شمال میں یہ گوڑ گاؤں کے مشرقی حصوں تک مستعمل ہے۔ شمال مشرق کی جانب اس کا پھیلاؤ علی گڑھ، ایٹہ، بلند شہر، مین پوری، بدایوں اور بریلی کے اضلاع سے ہوتے ہوئے نینی تال کے ترائی پرگنوں تک ہے۔

متھرا کی برج بھاشا معیاری مانی جاتی ہے۔ دوسرے اضلاع کی بھاشاؤں میں مقامی اختلافات پائے جاتے ہیں، مثلاً بلند شہر میں یہ کھڑی بولی سے گھل مل جاتی ہے۔ جے پور میں راجستھانی اس پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ گوڑ گاؤں کے ضلع میں یہ میواتی سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ 'فارسی میں اِس زبان کو 'زبانِ گوالیاری' کہا گیا ہے۔'[۱۴۴]

شعری ادب کے لحاظ سے برج بھاشا خاصی متمول بولی رہی ہے۔ کرشن بھگتی کا تمام تر ادبی سرمایہ جو شاعری پر مشتمل ہے، برج بھاشا ہی میں ملتا ہے۔ اس

بولی میں ہندی کے سب سے بڑے شاعر سور داس نے شاعری کی۔ خاص کر سورداس کے بھجن (سور ساگر) تو برج بھاشا شاعری کا نہایت اعلیٰ نمونہ تصور کیے جاتے ہیں۔

☆ بندیلی:

'واؤ' کے لہجے کی حامل یہ بولی بنیادی طور پر بندیل کھنڈ میں رائج ہے۔ بندیل کھنڈ کا علاقہ اُتر پردیش کے باندا، ہمیر پور، جالون اور جھانسی کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ مدھیہ پردیش کے بعض شمالی اضلاع بھی بندیل کھنڈ میں آتے ہیں، لیکن بندیلی کا چلن اس سے زیادہ وسیع علاقے میں ہے۔ شمال میں یہ آگرہ، مین پوری اور ایٹہ تک جب کہ جنوب میں بھوپال تک پھیلی ہوئی ہے۔

بندیلی کے مشرق میں بگھیلی رائج ہے۔ شمال اور شمال مغرب میں قنوجی اور برج بھاشا کا چلن ہے۔ جنوب مغرب کی جانب سے یہ راجستھانی بولیوں سے گھری ہوئی ہے اور جنوب میں اس کے حدود مراٹھی سے ملتے ہیں۔

ادبی لحاظ سے بندیلی ایک اہم بولی ہے۔ اس میں عوامی ادب کا وقیع سرمایہ ملتا ہے۔ قدیم رزمیہ شاہ کار 'آلھا اودل' اسی بولی میں ہے۔ علاوہ ازیں ہندی ادب کے اہم شاعر اور نقاد کیشو داس اور پدماکر کا تعلق بھی اسی بولی سے ہے۔

☆ قنوجی:

اس بولی کا نام ضلع فرخ آباد (یو۔ پی) میں واقع قدیم تاریخی شہر قنوج پر ہے۔ سنسکرت کے پرانے ادب یہاں تک کہ رامائن میں اس شہر کا ذکر ملتا ہے۔ موجودہ دور میں قنوجی بولی اپنی خالص شکل میں ایٹہ، فرخ آباد اور شاہ جہاں پور میں مستعمل ہے۔ کان پور اور ہردوئی تک اس کا چلن ملتا ہے۔ کان پور میں یہ بندیلی بولی سے اور ہردوئی میں اودھی سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ شاہ جہاں پور کے شمال میں یہ پیلی بھیت تک بولی جاتی ہے جہاں یہ برج بھاشا سے گھُل مل جاتی ہے۔ مشرق اور شمال مشرق میں یہ اودھی سے گھری ہوئی ہے۔ اس کے مغرب اور شمال مغرب میں برج بھاشا رائج ہے اور جنوب میں بندیلی مستعمل ہے۔

قنوجی اور برج بھاشا میں گہرا لسانیاتی رشتہ موجود ہے یہاں تک کہ ان دونوں کے قواعد میں فرق بہت کم ہے۔ قنوجی میں ادب کا فقدان ہے۔ اسی وجہ سے اس بولی کی قدیم شکل وصورت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

☆ ہریانوی:

ہریانوی کو 'بانگڑو' اور 'جاٹو' بھی کہتے ہیں، لیکن اس کو ہریانوی کہنا زیادہ موزوں ہے۔ یہ دہلی کے شمال مغرب میں واقع صوبہ ہریانہ کی بولی ہے۔ دہلی کے نواحی علاقوں میں ہریانوی بولنے والے جاٹوں کی کثیر آبادی ہے اِس لیے اِن علاقوں میں یہ بولی جاٹو کے نام سے مشہور ہے۔

دہلی کے شمال مغرب میں واقع ہریانہ کے اضلاع رہتک، حصار، کرنال وغیرہ میں خالص ہریانوی بولی جاتی ہے۔ ہریانوی پر راجستھانی اور پنجابی زبان کی گہری چھاپ ہے۔ اس کے شمال میں پنجابی زبان مستعمل ہےجب کہ شمال مشرق میں کھڑی بولی اور جنوب مغرب میں راجستھانی رائج ہے۔[۱۴۵]

قدیم اردو، بالخصوص دکنی اردو پر ہریانوی نے گہرے اثرات مرتب کیے البتہ معیاری اردو میں یہ اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔[۱۴۶]

☆ کھڑی بولی:

یہ دہلی کے شمال مشرق کی بولی ہے۔اس میں مغربی اتر پردیش کا وسیع علاقہ شامل ہے جسے بالائی دوآبہ کہتے ہیں۔کھڑی بولی کا علاقہ دراصل اتر پردیش کا
وہ علاقہ ہے جہاں آج بھی مسلمان مجموعی آبادی کا کثیر حصہ ہیں اور جہاں اسلامی تمدن وثقافت کا گہرا اثر رہا ہے۔

دریائے گنگا کے شمال مشرق میں یہ بولی مرادآباد، بجنور اور رام پور کے اضلاع، نیز مغربی روہیل کھنڈ میں رائج ہے۔دوسری طرف گنگا کے شمال مغرب
میں یہ میرٹھ، مظفرنگر اور سہارن پور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔شمال میں

اتراکھنڈ کے مرکزی شہر دوہرادون اور اس کے میدانی علاقوں میں بھی کھڑی بولی ہی کا چلن ہے۔کھڑی بولی کے شمال میں پہاڑی بولیاں رائج ہیں اور
شمال مغرب میں ہریانوی بولی جاتی ہے۔جنوب میں یہ برج بھاشا سے گھری ہوئی ہے اور اس کے جنوب مشرق میں قنوجی مستعمل ہے۔

اس بولی کا نام 'کھڑی' ہندو ادیبوں کا تجویز کردہ ہے۔گریرسن اور دیگر مغربی مفکرین اسے 'ہندوستانی' کے نام سے پکارتے ہیں۔بالخصوص گریرسن کھڑی
بولی کو 'ہندوستانی' اور اردو کو 'ادبی ہندوستانی' کہتا ہے۔[۱۴۷]

الغرض قدیم ہندآریائی زبان کا ڈھانچہ اور اس کا کینڈا اگرچہ ایک تھا لیکن اِس کے رُوپ ایک سے زیادہ تھے۔زبان کے یہ متنوع رُوپ مختلف بولیوں
کی صورت ویدک زمانے میں بول چال کی سطح پر رائج تھے۔اِن مقامی بولیوں کی ایک تاریخ ہے۔قانونِ فطرت کے مطابق اِنھوں نے ارتقا کے بے شمار مراحل طے
کیے ہیں۔اِنھی بولیوں کی ترکیب وتالیف سے ادب اور فلسفے کی شائستہ اور مہذب زبان 'سنسکرت' وجود میں آئی۔کسی زمانے میں سنسکرت سے ممتاز بنانے کے لیے
اولاً یہ بولیاں 'پراکرت' کہلائیں مگر بعدازاں جب اِن میں سے چند بولیاں ترقی کر کے ادبی پراکرتیں بنیں اور سنسکرت کے پہلو میں جا بیٹھیں تو بول چال کی سطح پر 'اَپ بھرنشوں' کا ظہور ہوا۔پراکرت کے مقابلے میں اَپ بھرنشوں کے الفاظ پست اور گرے ہوئے تصور کیے جاتے تھے۔بعد میں انھیں اَپ بھرنشوں سے موجودہ دیسی
بولیوں اور جدید زبانوں کا ارتقا عمل میں آیا۔

حواشی

1. Fromkin, Victoria & others: *An Introduction To Language*, Australia:
   Nelson Thomson Learning, (2005), p.47o.
2. Crystal, David: The Cambridge Encyclopedia Of Language (2nd Ed.),
   Islamabad: National Book Foundation, (1962), p.294.

☆ اِس عنوان کے تحت مواد کی جمع آوری کے ضمن میں زیادہ استفادہ ’عام لسانیات‘ از ڈاکٹر گیان چند جین سے کیا گیا ہے۔

۳۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر: اردو زبان کا ارتقا، ڈھاکہ: پاک کتاب گھر، (۱۹۵۶ء)، ص۳۔

۴۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: عام لسانیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، (۱۹۸۵ء)، ص۷۲۶۔

۵۔ عام لسانیات، ص۷۲۹۔

۶۔ عام لسانیات، ص۷۴۲۔

۷۔ اردو زبان کا ارتقا، ص۱۴۔

۸۔ عام لسانیات، ص۷۴۳۔

9. Mathews, P.H.: *Oxford Concise Dictionary Of Linguistics*, New York:
   Oxford University Press, (2007), p.423.

   Ur Language: Ur is a German prefix meaning 'original' or 'primitive'. E.g. an 'Ursprache' is a protolanguage; the 'Urheimat' of the peoples speaking Indo-European is the home territory from which, hypothetically, they migrated across Europe and Asia.

10. Oxford Concise Dictionary Of Linguistics, p.268.

    Nostratic: Conjectural family of languages whose branches are usually said to include at least Indo-European, Afro-Asiatic, Altaic, Dravidian, Kartvelian, and Uralic.

11. An Introduction To Language, p.471.
12. Crystal, David: *A Dictionary Of Linguistics And Phonetics*, U.S.A:
    Blackwell Publishing, (1997), p.148.
13. Katzner, Kenneth: *The Languages Of The World*, London: Routledge,

(1995), p.35.

۱۴۔ عام لسانیات،ص۷۴۵۔

15. The Languages Of The World. p.35.

۱۶۔ عام لسانیات،ص۷۴۸۔

17. The Languages Of The World. p.33.

18. The Languages Of The World. p.32.

۱۹۔ عام لسانیات،ص۷۵۶تا۷۵۷۔

20. The Languages Of The World. p.33.

۲۱۔ ڈاکٹر گیان چند جین عام لسانیات کے صفحہ۷۶۲ پر لکھتے ہیں:

روایتاً حضرت نوح کے دو بیٹے سام اور حام تھے جن کے نام پر زبانوں کے یہ خاندان، سامی اور حامی رائج ہوئے۔ اس روایت کے مطابق یہ دونوں زبانیں ہم ماخذ ہو جاتی ہیں لیکن اس کی تردید خود اس روایت میں موجود ہے۔ دو بھائیوں کی زبانیں مختلف نہیں ہوا کرتیں۔

22. Prasad, Tarni: *A Course In Linguistics,* New Delhi: PHI Learning, (2012), p.193.

23. The Languages Of The World. p.30.

24. A Course In Linguistics, p.193.

25. The Languages Of The World. p.30.

۲۶۔ تفصیل کی لیے دیکھیے: en.wikipedia.org

Formosa: The Former name of Taiwan is 'Formosa', which dates from 1544, when Portuguese sailors sighted the main Island of Taiwan and named it 'Ilha Formosa', which means 'Beautiful Island'.

27. The Languages Of The World. p.24.

28. The Cambridge Encyclopedia Of Language (2nd Ed.), p.313.

۲۹۔ عام لسانیات،ص۷۸۵۔

30. The Languages Of The World. p.24.

31. The Cambridge Encyclopedia Of Language (2nd Ed.), p.310.

۳۲۔ عام لسانیات،ص۷۹۱۔

33. The Languages Of The World. p.19.

34. The Languages Of The World. p.17.

35. The Cambridge Encyclopedia Of Language (2nd Ed.), p.302.

36. The Cambridge Encyclopedia Of Language (2nd Ed.), p.303.

۳۷۔ عام لسانیات، ص۸۳۹۔

۳۸۔ 'آرین' کو بالعموم ایک مخصوص نسل سمجھا جاتا ہے مگر محمد مجیب اپنی تصنیف 'تاریخ تمدنِ ہند' (لاہور: پروگریسو بک، ۱۹۸۶ء) کے صفحہ نمبر ۴۶ پر درج کرتے ہیں:

آریا نسل کی کوئی ایسی علامت نہیں جس سے وہ پہچانی جا سکے۔ آریا کے لغوی معنی ہیں نیک، شریف برادری والے۔ یہ دراصل نئی نسل کا نام نہیں۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ ہم اِس لفظ کو بالکل چھوڑ دیتے اور اُن لوگوں کے لیے، جو اپنے آپ کو ہندوستان میں آ کر آریا کہنے لگے تھے، کوئی اور نام تجویز کر لیتے لیکن یہ اصطلاح اِس قدر رائج ہوگئی کہ اِس کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیے اِس سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ غلط فہمی سے بچنے کی یہ صورت ہے کہ ہم یاد رکھیں کہ آریا سب گورے اور قد آور نہیں تھے، سب کی ناک اُونچی، بال سُنہرے اور آنکھیں نیلی نہیں تھیں۔ انھیں آریا صرف اِس بنا پر کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو آریا کہتے تھے۔

۳۹۔ زور، ڈاکٹر محی الدین قادری: ہندوستانی لسانیات، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۰۹ء)، ص۶۳ تا ۶۴۔

۴۰۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۱۱ء)، ص۱۰۔

41. Lion's H. Gray: *Foundations Of Language*, New York: Macmillan, (1958), pp.303-356.

۴۲۔ خلیل احمد بیگ، مرزا: اردو کی لسانی تشکیل، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۰۸ء)، ص۱۵۔

۴۳۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص۶۔

۴۴۔ شرف الدین اصلاحی: اردو سندھی کے لسانی روابط، لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، (۱۹۷۶ء)، ص۴۔

۴۵۔ احتشام حسین، سیّد: ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، لکھنؤ: دانش محل، (۱۹۶۳ء)، ص۲۹ تا ۳۰۔

۴۶۔ اردو سندھی کے لسانی روابط، ص۵۔

۴۷۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، ص۲۹ تا ۳۰۔

۴۸۔ ہندوستانی لسانیات، ص۶۳ تا ۶۴۔

۴۹۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص۱۱۔

50. Grierson, George Abraham: Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), Calcutta,(1916), pp.3_4.

۵۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: جامع القواعد (حصہ صرف)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، (۲۰۰۴ء)، ص۶ تا ۷۔

۵۲۔ خلیل صدیقی: زبان کیا ہے؟، ملتان: بیکن بُکس، (۱۹۸۹ء)، ص۲۱۵۔

۵۳۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص۱۶ تا ۳۰۔

۵۴۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص۸۔

۵۵۔ عین الحق فرید کوٹی: اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، (۱۹۹۶ء)، ص۷۷۔

۵۶۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ کے صفحہ ۴۷ پر عین الحق فرید کوٹی لکھتے ہیں:

واضح رہے کہ ویدک آریائی زبان ہونے کے باوجود ایک ہزار سال قبل وارد ہونے والے آریائی قبائل کی زبان سے کافی حد تک مختلف ہو گی لیکن چوں کہ اُس اوّلین عہد کی زبان کے کوئی نمونے فراہم نہیں ہیں اس لیے ان اختلافات کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل

ہے۔ہاں! البتہ باقی آریائی زبانوں سے تقابلی جائزے کے بعد اس کا کچھ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔

۵۷۔ جامع القواعد (حصہ صرف)، ص ۷۔

۵۸۔ عام لسانیات، ص ۸۴۱۔

۵۹۔ سدھیشور ورما، پروفیسر ڈاکٹر: آریائی زبانیں، حیدرآباد دکن: اعظم اسٹیم پریس، (۱۹۴۲ء)، ص ۵۴۔

۶۰۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۹۔

۶۱۔ اردو زبان کا ارتقا، ص ۲۵۔

۶۲۔ ڈاکٹر سبزواری کے اِس خیال کی تائید زبان کیا ہے؟ کے صفحہ ۲۱۹ پر درج خلیل صدیقی کے اِس بیان سے ہوتی ہے:

۔۔۔رِگ وید کے بعض لسانی شواہد سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آریاؤں کی ہندآریائی بولیاں، جنھیں قواعد نویسوں نے پراکرتیں کہا ہے، رِگ وید کی تخلیق کے ادوار سے تعلق رکھتی ہیں اور ادبی اور کلاسیکی سنسکرت سے زیادہ قدیم ہیں۔انھیں سنسکرت کی بہنیں کہا جا سکتا ہے، بیٹیاں نہیں۔

۶۳۔ خلیل صدیقی: زبان کیا ہے؟، ملتان: بیکن بکس، (۱۹۸۹ء)، ص ۲۱۶ تا ۲۱۷۔

۶۴۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۱۲۔

۶۵۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو کے صفحہ ۱۳ پر ڈاکٹر مسعود حسین خان رقم طراز ہیں:

اُس زمانے میں دراصل لفظ سنسکرت صفت کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ 'سنسکرت واکیم' ٹھیک اُس زبان کو کہتے تھے جسے اردو میں شستہ زبان کہا جاتا ہے۔رفتہ رفتہ لفظ سنسکرت ایک خاص زبان کے سلسلے میں بولا جانے لگا۔

۶۶۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۱۰۔

۶۷۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۱۰۔

۶۸۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۱۸۔

۶۹۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۱۱۔

۷۰۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۱۸۔

۷۱۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۱۱۔

۷۲۔ عام لسانیات، ص ۸۴۲۔

۷۳۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۱۴۔

۷۴۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۲۰۔

۷۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: اردو کی کہانی، لاہور: مکتبۂ عالیہ، (۱۹۷۵ء)، ص ۱۵ تا ۱۶۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کے مطابق:

۔۔۔جب پنڈتوں نے پراکرت کے بول کے معنی بتانا چاہے تو وہ دو ٹولیوں میں بٹ گئے۔ان میں سے ایک ٹولی کا کہنا ہے کہ سنسکرت ایک منجھی ہوئی بولی تھی جو پراکرت سے نکلی ہے۔اور پراکرت جنتا کی بولی تھی۔سنسکرت پڑھے لکھوں کی بولی بن گئی اور جنتا سے اس کا ناتا ٹوٹ گیا۔۔۔۔۔دوسری ٹولی کہتی ہے کہ پراکرت سنسکرت سے نکلی ہے یا اِس سے ملتی جلتی ہے یا اس کا بگڑا ہوا رُوپ ہے

۔۔۔۔۔پراکرت کی گرامر لکھنے والے پہلی ٹولی میں ہوں چاہے دوسری میں ان سب کی کتابیں دیکھ کر یہی سمجھنا پڑتا ہے کہ پراکرت نے

سنسکرت سے جنم لیا ہے، کیوں کہ اِن میں سے ہر ایک نے سنسکرت کے بولوں سے پراکرت کے بول گھڑنے کے قاعدے لکھے ہیں۔

۷۶۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۲۱۔

77. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.121.

۷۸۔ جامع القواعد (حصہ صرف)، ص ۷۔

۷۹۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۱۹۔

۸۰۔ خلیل صدیقی: لسانی مباحث، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، (۱۹۹۱ء)، صفحہ ۳۱۵ پر درج ہے:

نیرکتا (Nirukta): قدیم ہند کی پہلی دست یاب لغت نگھنٹو (Nighantu) ہے جو کئی نسلوں کے مُنیوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اِن مُنیوں نے دراصل وید کی تفہیم میں سہولت پیدا کرنے کے لیے اس کے مشکل الفاظ کی تشریح کی تھی اور قواعدی ہیئتوں اور محاوروں کی تفسیر کے ساتھ ساتھ ایک ہی لفظ کے محلِ استعمال کے اعتبار سے مختلف معانی وضع کیے تھے۔ یاسک مُنی نے اِس لغت کی شرح مرتب کی اور اس پر اضافے بھی کیے۔ یہ شرح 'نرکتا' (Nirukta) کے نام سے موسوم ہے اور ویدک سنسکرت کا مشہور ترین اور مستند لغت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اِسے 'ویدک اَنگ' یعنی وید کے اعضا بھی کہا جاتا ہے۔ اِس میں ویدک بجنوں، اشلوکوں اور منتروں کی صحیح خواندگی اور تفہیم کے لیے بعض لفظی تشکیلیات (صرف) اور صوتیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تصریفی صورتوں کے الگ الگ معنی بیان کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں اشتقاقی پیرایہ بھی ہے۔

81. Lespschy, Giulio: *History of Linguistics (The Eastern Traditions Of Linguistics),* New York: Longman Group, (1994), pp.31-33.

۸۲۔ جامع القواعد (حصہ صرف)، ص ۸۔

۸۳۔ اپنی تصنیف، زبان کیا ہے؟ کے صفحہ ۲۲۵ پر خلیل صدیقی رقم طراز ہیں:

مغربی ماہرینِ لسانیات ۵۰۰ قبل مسیح سے پراکرتوں کے اُبھرنے کا دور متعین کرتے ہیں۔ پراکرتیں تو اِس سے ایک ہزار سال پہلے ہی مروّجہ زبانیں تھیں۔ پانچویں صدی قبل مسیح سے کچھ پراکرتیں مذہبی زبان بن کر علمی حلقوں میں بھی سنسکرت کی جگہ لینے لگیں تھیں۔ پراکرتوں کے مذہبی اور ادبی حیثیت سے فروغ پانے کا دور پانچویں صدی قبل مسیح سے کم و بیش ۱۰۰۰ء تک محیط ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آخر آخر میں اِن کے جو نئے رُوپ اُبھرے انھیں 'اَپ بھرنش' کہا جاتا ہے۔

۸۴۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۷۶۔

۸۵۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۲۲۔

۸۶۔ زبان کیا ہے؟ ص ۲۳۰۔

۸۷۔ عام لسانیات، ص ۸۴۴۔

۸۸۔ اردو انسائیکلو پیڈیا، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، (۱۹۸۴ء)، ص ۸۸۔

اشوک (۲۷۳۔۲۳۲ قبل مسیح): سلطنت مگدھ (جنوبی بہار، بھارت) کا راجا۔ موریا خاندان کے بانی چندر گُپت مورے (۳۲۲۔۲۹۷ قبل مسیح) کا پوتا اور راجا بندوسار (۲۹۷۔۲۷۲ قبل مسیح) کا بیٹا۔ بندوسار نے اِسے ٹیکسلا اور اُجین کے صوبوں کا گورنر مقرر کیا اور اِس نے اپنے حسنِ انتظام کا ایسا سکّہ بٹھایا کہ باپ نے اپنے بڑے بیٹے پر ترجیح دے کر اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ اس کی تخت نشینی کے وقت کلنگ (اُڑیسہ) کے سوا قریباً تمام ہندوستان موریا سلطنت میں شامل تھا۔ اس نے ۲۶۱ قبل مسیح میں کلنگ پر

چڑھائی کی جس میں ایک لاکھ آدمی مارے گئے اور لاکھوں قحط اور بیماری کا شکار ہوئے۔ اِس ہولناک خون ریزی نے اشوک کے دل پر گہرا اثر کیا۔ اس نے جنگ سے توبہ کر لی اور بدھ مت کا پیرو بن کر اِسے عالم گیر مذہب بنا دیا۔

۸۹۔ عام لسانیات، ص ۸۴۷۔

۹۰۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۲۳۔

۹۱۔ عام لسانیات، ص ۸۴۷۔

۹۲۔ کھروشٹی رسم الخط دائیں جانب سے بائیں جانب کو لکھا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان کے شمال مغرب میں رائج تھا جب کہ براہمی رسم الخط بائیں جانب سے دائیں جانب کو لکھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے خطّے میں یہی رسم الخط رائج تھا۔

۹۳۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۱۸۔

۹۴۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان اپنی کتاب، مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو کے صفحہ ۲۱ پر بیان کرتے ہیں:

ڈاکٹر چیٹر جی نے ڈاکٹر من موہن گھوش کی ایک تصنیف کے حوالے سے مہاراشٹری پراکرت کی علاحدہ حیثیت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اِن کے خیال میں مہاراشٹری کی نسبت ملک مہاراشٹر سے نہیں، بلکہ یہ شورسینی پراکرت کی ایک شستہ اور ترقی یافتہ شکل تھی۔

۹۵۔ اردو میں لسانی تشکیل، ص ۲۶۔

۹۶۔ اردو سندھی کے لسانی روابط، ص ۲۸۔

۹۷۔ عام لسانیات، ص ۸۴۹۔

۹۸۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو کے صفحہ ۲۲ پر درج ڈاکٹر مسعود حسین خان کے بیان کے مطابق:

بعض مصنفوں نے اِس پراکرت کو پالی سے خلط ملط کر دیا ہے۔ حال آں کہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ پالی کا یہ نام (ماگدھی) سب سے پہلے سیلون کے بدھوں میں پڑا جو ہندوستانی زبانوں کے باریک اختلافات سے ناواقف تھے۔

۹۹۔ عام لسانیات، ص ۸۵۱۔

۱۰۰۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۲۶۔

۱۰۱۔ عام لسانیات، ص ۸۵۱۔

۱۰۲۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۲۴۔

۱۰۳۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۲۶۔

۱۰۴۔ عام لسانیات، ص ۸۵۲۔

۱۰۵۔ 'اَپ بھرنش' کے معنی و وضاحت کے بیان میں ڈاکٹر خلیل احمد بیگ اپنی تصنیف، اردو کی لسانی تشکیل کے صفحہ ۲۷ پر لکھتے ہیں:

اَپ بھرنش کے لغوی معنی ہیں بگڑی ہوئی یا بھرشٹ (Corrupt) زبان۔ اَپ بھرنش کی اصطلاح دوسری صدی قبل مسیح کے ممتاز قواعد داں اور 'مہابھاشیہ' کے مصنف پتنجلی کے عہد سے ملتی ہے، لیکن اس نے یہ اصطلاح زبان کے معنی میں استعمال نہیں کی تھی، بلکہ اَپ بھرنش سے اس کی مراد وہ الفاظ تھے جو تلفظ کے اعتبار سے بگڑ گئے تھے یا جن کی صوتی ہیئت مسخ ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ زبان کے معنی میں اَپ بھرنش کا استعمال سب سے پہلے چنڈ نے اپنی کتاب 'پراکرت لکشنم' میں کیا تھا جو چھٹی صدی عیسوی کا ایک معروف قواعد نویس گزرا ہے۔ نویں صدی عیسوی کے ایک معروف قواعد نویس رودرٹ نے سنسکرت اور پراکرت کے ساتھ اَپ بھرنش زبان کی بھی توضیح کی ہے لیکن اَپ

بھرنش کی باقاعدہ قواعد گیارھویں صدی عیسوی کے قواعد نویس ہیم چندر نے لکھی جو 'ہیم چندر شبدانو شاسن' کے نام سے مشہور ہے۔

۱۰۶۔ اردو زبان کا ارتقا، ص۲۷۔

۱۰۷۔ اردو زبان کا ارتقا، ص۳۴۔

۱۰۸۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص۲۸۔

۱۰۹۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، ص۳۹۔

۱۱۰۔ عام لسانیات، ص۸۵۳۔

۱۱۱۔ اردو زبان کا ارتقا، ص۳۸ تا۳۹۔

۱۱۲۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص۲۹۔

۱۱۳۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص۲۸۔

۱۱۴۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص۳۲۔

۱۱۵۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص۲۹۔

۱۱۶۔ دھیریندرورما: بھاشا وگیان، الہ آباد: کتاب محل، (۱۹۵۷) ص۱۴۰۔

۱۱۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: اردو کا روپ، لاہور: آزاد بک ڈپو، (۱۹۷۱ء) ص۳۹۔

'اوہٹھ' کی وضاحت میں ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

پراکرت کی گرامر لکھنے والوں نے اچھّروں کی بدلائی کے جو قاعدے دیے ہیں ان سے اَپ بھرنش کا بول ہی اوہٹھ بھی بن جاتا ہے۔ اب یہ بدلے ہوئے ناموں ہی نے دھوکہ دیا ہے جو ڈاکٹر مسعود حسین خان (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو (۲۰۱۱ء) ص۳۰) اور ڈاکٹر شوکت سبز واری (اردو زبان کا ارتقا (۱۹۵٦ء) ص۳۸) نے اپنی اپنی کتابوں میں ایک ہی بول کے اِن دونوں رُوپوں (اَپ بھرنش اور اوہٹھ) کو دو الگ الگ بولیاں سمجھ رہے ہیں۔

۱۱۸۔ عام لسانیات، ص۸۵٦۔

۱۱۹۔ سنیتی کمار چیٹرجی، ڈاکٹر: ہند آریائی اور ہندی، کلکتہ: فرما کے۔ ایل مکھو پادھیائے، (۱۹٦۰) ص۱۰۳ تا۱۰۴۔

۱۲۰۔ ہندوستانی لسانیات، ص٦۹۔

۱۲۱۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص۴۵۔

۱۲۲۔ ہندوستانی لسانیات، ص٦۷۔

۱۲۳۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص۴۵۔

۱۲۴۔ عام لسانیات، ص۸٦۲۔

۱۲۵۔ ہندوستانی لسانیات، ص٦۹۔

۱۲٦۔ تت سم کے لفظی معنی ہیں 'اُس جیسا'۔ 'اُس' سے یہاں مراد سنسکرت زبان ہے۔ اصطلاحاً ان سے مراد وہ سنسکرت الاصل الفاظ ہیں جو بغیر کسی تبدیلی یا ردّو بدل کے استعمال ہوں۔ قدیم اردو میں تت سم الفاظ بہ کثرت ملتے ہیں، مثلاً سندر، گیان، سنسار، جیو وغیرہ۔

۱۲۷۔ سنسکرت الفاظ جب اپنی بدلی ہوئی حالت میں استعمال ہوتے ہیں تو 'تدبھو' کہلاتے ہیں۔ تدبھو الفاظ کی بنیاد اگرچہ سنسکرت ہے لیکن وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ ان کی شکل وصورت اور ہیئت میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اردو میں تدبھو الفاظ کی تعداد بہت زیادہ ہے، مثلاً کام (س: کرم)، دودھ (س: دگدھ)، گھوڑا (س: گھوٹک) وغیرہ۔

۱۲۸۔ ہندوستانی لسانیات، ص۸۱۔

۱۲۹۔ عام لسانیات، ص ۸۶۶۔

۱۳۰۔ عام لسانیات، ص ۸۶۶۔

۱۳۱۔ 'بھوج پوری' کی وجہ تسمیہ کی وضاحت میں عام لسانیات کے صفحہ ۸۶۶ پر ڈاکٹر گیان چند جین لکھے ہیں:

اس بولی کا نام بہار کے ضلع شاہ آباد کے پرگنہ بھوج پور سے ماخوذ ہے۔ مالوے (اجین) کے راجہ بھوج کے خاندان کے کچھ راجپوت اس علاقے میں آ کر بس گئے تھے۔ وہ بھوج دیشی کہلاتے تھے۔ ان کی ریاست کو 'بھوج پور' کہا گیا۔ ایک زمانے میں یہ علاقہ صوبے کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔

۱۳۲۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۴۸۔

۱۳۳۔ عام لسانیات، ص ۸۶۸۔

۱۳۴۔ ہندوستانی لسانیات، ص ۷۰۔

۱۳۵۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۵۴۔

۱۳۶۔ لفظ 'ماجھا' مدھیہ سے بنا ہے جس کے معنی وسط کے ہیں۔ اس طرح ماجھی بہ معنی وسطی ہوا۔

۱۳۷۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۵۱۔

۱۳۸۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۶۵ تا ۶۶۔

۱۳۹۔ اردو زبان کا ارتقا، ص ۸۳۔ البتہ بعدازاں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے 'مغربی ہندی' کے وجود کو 'قدیم مغربی ہندی' اور کبھی 'مغربی ہندی' کے نام سے تسلیم کیا ہے۔ اِس حوالے سے اُن کی تصنیف 'داستانِ زبانِ اردو' کے صفحہ ۹۴ تا ۹۵ پر درج ہے:

اردو، برج، ہریانی، قنوجی، بندیلی آج جہاں بولی جاتی ہیں دسویں صدی عیسوی میں یہ پورا علاقہ کسی ایک زبان کے تصرف میں تھا۔ یہ زبان اِن بولیوں کے حدود میں رائج تھی۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس زبان میں کسی قسم کا اختلاف نہ تھا۔ ہر لحاظ سے وہ واحد اور یکساں تھی۔ لیکن اس میں اتنا اور اس درجے کا اختلاف نہ تھا جتنا کہ آج ان بولیوں میں ہے جو اُس زبان سے متفرع ہوئیں۔ یہ زبان بدلتی رہی۔ اس کے اختلافات جو کسی زمانے میں معمولی اور غیر اہم تھے، شدید سے شدید تر ہوتے رہے اور گیارھویں صدی عیسوی کے آتے آتے اتنے نمایاں ہو گئے کہ وہ پانچ بولیوں میں بٹ گئی۔ اس قدیم زبان کو جو دسویں صدی عیسوی میں اردو اور اس کی ہم سر بولیوں میں منقسم ہوئی، قدیم ہندی کہتے ہیں۔

اِس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو اور کھڑی بولی کو ایک ہی زبان مانتے تھے۔

۱۴۰۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۵۶۔

۱۴۱۔ اردو کے محققِ اوّل، حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق 'پرتھی راج راسا' چند حقیقی و تاریخی کرداروں کے گرد بُنے گئے فرضی واقعات کی ایسی جعلی تصنیف ہے جسے کسی طرح بھی کتابِ تاریخ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ 'راسا' کے مصنف چند بردائی نے پرتھی راج کے زمانے کا صحیح علم نہ ہونے کی بنا پر فقط اپنے قیاس کے مطابق پرتھی راج کو اصل زمانے سے قریباً نوّے سال قبل فرض کر لیا تھا۔ لہٰذا اِس تصنیف کی زبان کو اُس وقت کی نمائندہ قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

مظہر محمود شیرانی: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد ہفتم (تنقید پرتھی راج راسا)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۷۶ء)۔

۱۴۲۔ ہندوستانی لسانیات، ص ۷۵۔

۱۴۳۔ برج کے معنی 'جانوروں کا باڑا' کے ہیں۔ چوں کہ اس علاقے (متھرا) میں گائے کی اہمیت تھی شاید اسی سبب برج کا لفظ متشکل ہوا۔

۱۴۴۔ عام لسانیات، ص ۸۱۲۔

۱۴۵۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۱۵۹۔

۱۴۶۔ ہریانوی کی خصوصیات کے لیے دیکھیں جگ دیو سنگھ کی تصنیف: 'A Descriptive Grammar Of Bangru'، کروکشیتر: کروکشیتر یونی ورسٹی، (۱۹۷۰ء)، بہ حوالہ اردو کی لسانی تشکیل از ڈاکٹر خلیل احمد بیگ، ص ۱۶۲۔

147. Linguistic Survey Of India,vol.ix(Part 1), p.42.

باب سِوُم۔ اردو میں مستشرقین کی لسانی تحقیقات (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)
فصل اوّل

اردو زبان اور اہلِ یورپ

ہندوستان میں یورپی اقوام کے ورود کا سلسلہ واسکوڈے گاما (Vaso Da Gama) کی آمد سے جُڑا ہے۔ تین جہازوں پر مشتمل ایک بحری بیڑے کے ہم راہ واسکوڈے گاما ۱۴۹۸ء میں ساحلِ مالا بار پر بہ مقام کالی کٹ لنگر انداز ہوا۔ جنوبی ہندوستان میں داخلے کے بعد یہاں اپنے متعدد مقاصد کے حصول کی غرض سے اِن یورپی مستشرقین کے لیے ایک ایسی زبان کا سیکھنا ضروری تھا جو وسیع پیمانے پر بولی اور سمجھی جاتی ہو، جو 'رابطے کی زبان' (Lingua Franca) ہو۔ اس لسانی ضرورت کے پیشِ نظر مستشرقین نے اردو لغات و قواعد کی طرف رجوع کیا۔ اُس وقت جنوبی ہند میں مستعمل زبان کا دامن اس نوع کے تالیفی و تحقیقی سرمائے سے خالی تھا۔ ایسا دو وجوہ کی بنا پر تھا:

- ☆ یہی دور در اصل دکن میں اردو ادب کے آغاز کا تھا۔ بول چال کے اعتبار سے زبان رفتہ رفتہ کسی قدر معیاری شکل اختیار کرنے لگی تھی، البتہ تحریری مواد فقط صوفیانہ و مذہبی دستاویزات کی صورت میں موجود تھا جن کو باقاعدہ اردو زبان کا درجہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔
- ☆ اردو کے اہلِ زبان کو لغات و قواعد کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ اہلِ زبان، زبان سیکھنے یا بولنے کے لیے قواعد کے رہینِ منت نہیں ہوتے بلکہ قواعدِ زبان اپنی تشکیل کے لیے اہلِ زبان کے لسانی شعور کے پابند ہوتے ہیں۔

گویا اردو کے لغات و قواعد کی طرف اگر کوئی توجہ کرتا تو غیر زبان ہی کرتا۔ اسی سبب اردو کے ابتدائی لغات و قواعد کی تالیف و تدوین کا سہرا یورپی مستشرقین کے سر بندھتا ہے۔ اُن کی یہ کاوش ابتداءً انفرادی اور بعد ازاں گروہی تحقیق کی صورت میں سامنے آئی۔ پس اردو پر ان کی عنایات کا در اسی سبب وا ہوا۔ علاوہ ازیں مستشرقین ہی کے توسط سے اردو زبان ہندوستان کی حدود سے باہر دیگر یورپی ممالک میں متعارف ہوئی۔

یورپی اقوام کی آمد سے قبل دکن میں بہ حیثیت 'لنگوا فرینکا' مستعمل زبان کی اصل کیا تھی؟ ادبی اعتبار سے اسے کیا مقام حاصل تھا؟ یہ کس نام سے پُکاری اور پہچانی جاتی تھی؟ یہ اور اسی نوع کے متعدد سوالات دکن میں اردو زبان کے آغاز، ارتقا اور ابتدائی صورتِ حال کے سرسری جائزے کا تقاضا کرتے ہیں۔

مستشرقین سے قبل دکن میں اردو زبان (اجمالی جائزہ)

دکن مین پہلے پہل اردو زبان کا عمل دخل مسلمانوں کے حملے سے شروع ہوا جب دہلی کے سلطان، علاء الدین خلجی اور اُس کے سپہ سالار، ملک کافور نے ۱۲۹۴ء میں مہا راشٹر میں واقع ' دیو گری ' پر اپنا تسلط قائم کر کے دکن پر حکومت کا آغاز کیا۔ انتظامی امور کی مؤثر کارگزاری کے پیشِ نظر گجرات سے لے کر دکن تک کے سارے علاقے کو سو سو موضعات میں منقسم کر کے انتظامی حلقے بنا دیے گئے۔ ہر حلقے پر ایک ترک امیر مقرر کر دیا گیا جو 'امیرِ صدہ' کہلایا۔ یہ ترک نژاد 'امیرانِ صدہ' اپنے خاندان کے دیگر افراد اور متوسلین کے ہم راہ جب شمالی ہند سے دکن آئے تو اپنے ساتھ وہ زبان لائے جو

بازار ہاٹ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہ زبان اُن کے حلقۂ تسلط میں آنے والے افراد کے لیے نئی اور اَن جانی تھی۔ اسی طرح حلقوں کی روزمرّہ بولی 'امیرانِ صدہ'

کے لیے پرائی تھی۔ تہذیبی ولسانی سطح پر درپیش اس مسئلے کے حل کے طور پر'امیرانِ صدہ' نے وہاں کی مقامی بولیوں میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ شامل کر کے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی اور امورِ زندگی طے کرنے کا عمل شروع کیا۔ اِس تہذیبی ولسانی عمل اور ردِّعمل کی صورت میں ایک طرف تو اِن علاقوں کی معاشرت وتہذیب میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور دوسری طرف اس ابھرتی ہوئی 'اردو' کو معاشرے کی عام ضرورت کی زبان بنا دیا گیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا سیاسی سیلاب سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں اُٹھا اور دکن میں جا رُکا۔ ۱۳۲۷ء میں سلطان محمد بن تغلق نے دولت آباد (دیو گری) کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور فرمان جاری کیا کہ عمالِ حکومت، افسران اور متعلقین دہلی (شمالی ہند) سے دولت آباد (جنوبی ہند) ہجرت کر جائیں۔ تاریخ کی اس اہم ہجرت کے عمل نے شمالی ہند کی تہذیب وزبان کے اثرات کو مہمیز کیا جس سے جنوبی ہند کی تہذیب وزبان خاطر خواہ تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔

دکن میں اردو کی ابتدا اگر چہ علائی حملوں سے ہوئی، البتہ اس کی ترقی وترویج کے امکانات سلطان محمد بن تغلق کے دور میں روشن ہوئے۔ نصیرالدین ہاشمی کے مطابق شمالی ہند سے آنے والے یہ فاتحین اپنے ساتھ دکن میں جو زبان لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشو ونما پانے لگی، کیوں کہ یہاں اس کے مقابلے میں کوئی دوسری ایسی زبان نہ تھی جو اس کی نشو ونما اور ارتقا کے راستے میں حائل ہوتی۔ گویا مسلم فاتحین کے ہم راہ دکن میں داخل ہونے والی اس ہند آریائی زبان کا خیر مقدم ہوا اور یوں وہ پردیسی ودیسی دونوں طرح کے افراد کے استعمال میں آنے لگی۔ [۲]

یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو زبان کا خمیر دکن سے بہت پہلے شمالی ہند میں، جہاں فارسی کا دور دورہ تھا اور سرکاری ودرباری سرپرستی فقط فارسی ہی کو حاصل تھی، تیار ہوا جو بعد ازاں نہالِ نوخیز کی صورت مسلم فاتحین کے ہم راہ سرزمینِ جنوبی ہند میں جا پیوست ہوا۔ گجرات ودکن کی زرخیز زمین میں اسے پنپنے کے پورے پورے مواقع میسر آئے جس سے اس کے نمایاں خط وخال کی نمود وظہور کا تاریخی سلسلہ شروع ہوا۔ اردو زبان کی آفرینش کے ضمن میں شمالی ہند کے مذکورہ بالا تقدّم کے باوجود زبان کی ادبی صورت گری کے حوالے سے گجرات ودکن کو اوّلیت حاصل ہے۔ یہ اوّلیت درج ذیل چند اہم وجوہ کی بنا پر ہے:

- ☆ سلطان محمد تغلق کے آخری زمانۂ حکومت میں دکن کے 'امیرانِ صدہ' نے بغاوت کر دی۔ ۱۳۴۷ء ایک امیر کو سلطان بنا دیا گیا اور اس طرح بہمنی سلطنت وجود میں آ گئی۔ بہمنی سلطنت چوں کہ شمال سے کٹ کر وجود میں آئی تھی اسی سبب ترک نژاد حکم رانوں نے شمال کے نئے حملوں سے اپنی مدافعت کے لیے اُن تمام دیسی عناصر کی حوصلہ افزائی کی جو خالصتاً دکنی زمین کی پیداوار تھے۔ بہمنی سلطنت میں 'ہندوی' مستعمل تھی جسے 'دکنی زبان' کی حیثیت حاصل تھی۔
- ☆ دکن کا ترک نژاد حکم ران طبقہ شمال سے آیا تھا اور ان کی اپنی علاحدہ بولی تھی۔ دکن کی مقامی بولیوں اور حکم ران طبقے کی اپنی بولی کے مقابلے میں اردو زبان میں بات کرنا آسان تھا۔ اسی سبب قدرتی طور پر اردو زبان کو دکن میں سرکاری سر پرستی حاصل ہوئی۔ 'رابطے کی زبان' کی حیثیت سے اردو علاء الدین خلجی کی فتحِ دکن کے بعد بہمنی سلطنت کے وجود میں آنے تک بین العلاقائی زبان کا کام دیتی رہی اور جسے معاشرتی ضرورت نے سماج کے ہر طبقے تک پہنچا دیا۔
- ☆ جنوبی ہند (دکن) میں صوفیائے کرام کے اثرات نے بھی اردو زبان کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ اپنے مخصوص صوفیانہ و مذہبی خیالات کے ذریعۂ اظہار کے طور پر اسی زبان میں نثر ونظم لکھنے لگے۔ اسی سبب بہ مقابلۂ شمال، دکن میں سرکار اور مشائخ کی دل چسپی وسر پرستی کی بہ دولت اردو زبان کو ادبی حیثیت حاصل ہوئی۔

دکن کی پروردہ یہ جدید بولی ہندوی، ہندی اور دکنی کہلائی۔ یہ بھی جدید ہند آریائی کی ایک شاخ ہے۔ آفرینش میں یہ دیگر جدید ہند آریائی زبانوں، پنجابی، سندھی، مغربی ہندی، راجستھانی، گجراتی، مرہٹی، اُڑیا، بنگالی اور آسامی کے متوازی ہے، البتہ ادبی نشو ونما کے اعتبار سے یہ اودھی کی معاصر ہے۔ 'دکنی زبان' کا سارا سرمایۂ الفاظ ہند آریائی ماخذات پر مبنی ہے اور قواعدی ڈھانچا بھی ہند آریائی بولیوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ [۳]

بہمنی سلطنت (۱۳۴۷ء۔۱۵۲۷ء) کے قیام ہی سے اردو زبان میں تصنیف وتالیف کا باقاعدہ آغاز ہوا جو زیادہ تر صوفیائے کرام کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ بعد ازاں ۱۶۸۶ء تک عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں نے اردو زبان وادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس دور کے دست یاب دکنی ادب کے تخلیقی

نمونے قواعد اور ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے' یک سانی معیار' کے حامل نہیں اور مماثلتوں کے باوجود لسانی اختلافات ظاہر کرتے ہیں۔ گویا ہندوستان میں یورپی اقوام کی آمد کے وقت اردو رہندوستانی ایک باقاعدہ زبان کے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ دکنی اردو کے اس ادبی سرمائے کی تاریخی، تہذیبی اور لسانی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ ادبی سرمایہ ایسا مستند وٹھوس لسانی مواد فراہم کرتا ہے جس سے زبانِ اردو کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس میں ظہور پذیر ہونے والے لسانی تغیرات کا بہ خوبی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

جنوبی ہند میں ساحلِ مالابار پر بہ مقام کالی کٹ پہلی بار لنگر انداز ہونے والے یورپی مستشرقین کو مقامی سطح پر میل جول، گفت وشنید اور روزمرّہ کے معاملات وامور نمٹانے کی غرض سے مستعمل' دکنی اردو' کو بہ حیثیت' رابطے کی زبان' سیکھنا پڑا۔ اسی سبب وہ لغات وقواعد کی صورت اردو کے تالیفی سرمائے کی طرف متوجہ ہوئے۔

اردو رہندوستانی لغات وقواعد کے ضمن میں مستشرقین کی تحقیقی وتالیفی مساعی کے جائزے سے قبل جان لینا اہم ہے کہ مستشرقین سے مراد کون لوگ ہیں؟ ' شرق شناسی' کے حوالے سے ان کے مطالعاتی مقاصد کی نوعیت کیا ہے؟

شرق شناسی یا شرقیات (Orientalism)

لفظ 'Orient' لاطینی لفظ 'Oriens' سے ماخوذ ہے جس سے مراد' مشرق' ہے، جہاں مغرب (یورپ) سے پہلے سورج طلوع ہوتا ہے۔ عام طور پر 'Orient' سے مراد ایشیا وشمالی افریقہ ہے۔ 'Orient' کا متضاد لفظ 'Occident' ہے۔ یہ بھی لاطینی زبان کے لفظ 'Occidens' سے ماخوذ ہے جس سے مراد' مغرب' ہے۔ عام طور پر یورپ اور امریکہ کو 'Occident' کہا جاتا ہے۔[۴]

'The Oxford English Dictionary' کے مطابق' اورینٹل' (Oriental) کے معنی ہیں:

> Belonging to, found in, or characteristic of, the countries or regions lying to the east of the Mediterranean or of the ancient Roman Empire; belonging to south_western Asia, or Asiatic countries generally; also, belonging to the East of Europe, or of Christendom(as the Oriental Empire, or Church); Eastern.[5]

' اورینٹل' یعنی ہر وہ شے جس کا تعلق مشرقی دنیا سے ہو۔ انگریزی زبان میں 'Orient' اور 'Oriental' کی اصطلاحیں مشرقی ممالک اور ان سے وابستہ کسی بھی پہلو کی وضاحت کے لیے مستعمل ہیں۔

'The New Lexicon Webster's Of The English language' میں درج معلومات کے مطابق 'Orientalist' کا مفہوم اس طرح سے ہے:

> A specialist in Oriental civilization, Languages, etc.[6]

یعنی مغرب میں وہ یورپی اور امریکی افراد جنھوں نے مشرقی ممالک کی زبانوں، ثقافتوں اور دیگر متعلقہ علوم میں مہارت حاصل کی ہو اور جنھوں نے تحقیق ومطالعے کے ذریعے سے ان علوم میں نئی راہیں دریافت کی ہوں، انھیں 'Orientalist' یعنی' ماہرِ شرقیات' یا' مستشرق' کہا جاتا ہے[۷]۔ اسی ڈکشنری میں اصطلاح 'Orientalism' کے درج ذیل معنی درج ہیں:

> A characteristically Oriental trait, practice etc. The study of Oriental

civilization, Languages etc. [8]

یعنی مشرقی مما لک کی تاریخ، ادب، تہذیب وثقافت اور زبانوں کے مطالعے کو 'Orientalism' (شرق شناسی) کہا جاتا ہے۔

درج بالا علمی نوعیت کی تعریفات اپنی زود فہمی کی بنا پر اب بھی متعدد تعلیمی اداروں میں رائج ہیں۔ اس علمی تفہیم و وضاحت کے بعد یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اہلِ یورپ 'Orientalism' کو کیا معنی پہناتے ہیں؟

یورپین نے دراصل نظریہ 'ہم اور وہ' کی بنیاد پر پوری دنیا کو ایک عارضی حد بندی کے تحت دو متضاد حصوں میں منقسم کیا جن میں سے، اُن کے مطابق، ایک 'مغرب' ہے اور دوسرا 'مشرق'، ایک مہذب ہے تو دوسرا بد تہذیب۔ اس حد بندی سے یورپین کا مقصد اپنا ایک ایسا بالعکس تصور قائم کرنا ہے جس سے وہ اپنی من چاہی شناخت کے قیام کو ممکن بنا سکیں۔ مشرق سے کچھ خصوصیات وابستہ کر کے ان کے تضادات کی وضاحت کے لیے مغرب کی طرف سریع اشارہ کر سکیں۔ [۹]

اس امر کی مزید وضاحت ایک ماہر امریکی نقاد، ایڈورڈ ڈبلیو سعید (Edward W.Said) کے اس بیان سے ہو جاتی ہے:

Unlike the Americans, the French and the British-less so the Germans, Russians, Spanish, Portuguese, Italian and Swiss_have had a long tradition of what I shall be calling 'Orientalism', a way of coming to terms with the Orient that is based on the Orient's special place in European Western experience. The Orient is not only adjacent to Europe: it is also the place of Europe's greatest and richest and oldest colonies, the source of its civilizations and languages, its cultural contestant, and one of its deepest and most recurring ikages of the 'Other'. In addition, the Orient has helped to define Europe (or the west) as contrasting image, idea, personality, experience. [10]

شرق شناسی سے مراد کئی نکات ہیں جو سب ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف مربوط ہیں بلکہ ایک دوسرے پر منحصر بھی۔ شرق شناسی کی اصطلاح کی سریع وضاحت کے لیے درج ذیل تین تعریفات کا سمجھنا ضروری ہے:

(۱) علمی تعریف کی رو سے وہ علما اور اکابرین جو مشرق کے حوالے سے اپنی دائرۂ تحقیق میں خاص موضوع یا اپنے کسی عمومی مضمون پر کام کر رہے ہوں، 'شرق شناس' کہلاتے ہیں اور کیا جانے والا کام 'شرق شناسی' کہلائے گا۔

(۲) عمومی طور پر 'شرق شناسی' سے مراد وہ اندازِ فکر ہے جس کی بنیاد موجودات اور نظریۂ علم کے مطابق اس امتیاز پر ہے جو 'خاص مشرق' اور (اکثر اوقات) 'خاص مغرب' کے درمیان میں ہے۔

(۳) 'شرق شناسی' کے درج بالا دونوں مفاہیم سے نسبتاً واضح مفہوم یہ ہے کہ 'شرق شناسی' دراصل مشرق پر مغرب کی حکم رانی اور بالا دستی قائم رکھنے کے لیے اختیار کردہ ایک تشکیل ہے۔ [۱۱]

درج بالا تعریفات کی رو سے 'شرق شناسی' کی آڑ میں یورپی اور امریکی حکام کی مشرق پر مغربی تسلط کی سازش کو بہ خوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کی 'شرق شناسی' کا یہ سارا عمل قطعاً سادہ اور آسان نہیں۔ مغرب کو مشرق پر نظریاتی، تصوراتی، ثقافتی، علمی اور سیاسی تسلط قائم کرنے کی غرض سے طویل مدتی منصوبے کی تشکیل اور اس پر 'استدلالی' عمل درآمد درکار رہا۔ استدلالی اس حوالے سے کہ مغرب کو مشرق پر اپنی کسی بھی نوع کی 'توجیہ' کے ضمن میں مشرقی استفسار پر خاطر خواہ مدلل جواب دہی میں آسانی رہے۔ مثلاً وہ اپنی نو آبادیاتی پالیسیوں کی توجیح میں مشرق کو مہذب بنانے کی کاوش بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایڈورڈ ڈبلیو سعید کا بیان

ہے:

> The European defined themselves as the Superior race compared to the Orientals; and they justified their colonization by this concept that they said it was their duty towards the world to civilize the uncivilized world.[12]

مشرقی زبانوں، تہذیبوں، علوم وفنوں، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات اور طرزِ زندگی سے آگاہی کے بغیر مشرق کا حصار مغرب کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اسی سبب مشرق پر اپنی مکمل اجارہ داری اور وہاں اپنی نوآبادیات[13] کے قیام کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کیخاطر مغرب کو 'شرق شناسی' کا جال بُننا پڑا۔ اس حوالے سے ایڈورڈ ڈبلیو سعید رقم طراز ہیں:

> Orientalism, therefore, is not an airy European fantasy about the Orient, but a created body of theory and practice in which, for many generations, there has been a considerable material investment. Continued investment made Orientalism, as a system of knowledge about the Orient, an accepted grid for filtering through the Orient into Western consciousness, just as that same investment multiplied---indeed, made truly productive---the statements proliferating out from Orientalism into the general culture.[14]

موجودہ دور کے علما و اکابرین 'مطالعاتِ شرق' یا 'علاقائی مطالعات' کے مقابلے میں 'شرق شناسی' کی اصطلاح کو ترجیح نہیں دیتے۔ ایسا دو وجوہ کی بنا پر ہے۔ اوّل: 'شرق شناسی' نسبتاً مبہم اور عمومی نوعیت کی اصطلاح ہے۔ دوّم: یہ اصطلاح انیسویں اور بیسویں صدی کے شروع میں یورپی نوآبادیاتی اور استبدادی نظام کی تصویر پیش کرتی ہے[15]۔ برِصغیر پاک و ہند کے حوالے سے مطالعات کو تخصیصی نقطہ نظر سے 'ہند شناسی' یا 'ہندیات' (Indology) کہا جاتا ہے۔ گویا 'ہند شناسی' سے مراد ہے:

> Indology is the academic study of the history and cultures, languages, and literature of the Indian subcontinent(Most specially the modern_day states of India, Pakistan, Bangladesh, Sirilanka and Nepal). Indology may also known as 'Indic Studies'. 'Indian Studies' or 'South Asian Studies'.[16]

'مشرق' سے مغرب کی مراد بائبل (B i b l e) میں متذکرہ ممالک اور خصوصاً 'ہندوستان' تھی[17]۔ اسی سبب اپنے تمام تر معنوی اور منطقی ربط کے باوجود ہندوستان پر تحقیق و مطالعے کے ضمن میں 'ہند شناسی' کے بہ جائے اصطلاح 'شرق شناسی' ہی مستعمل ہے۔

سرزمینِ ہند پر قدم رکھنے والے مستشرقین کا تعلق مختلف یورپی اقوام سے تھا۔ یہ اقوام ابتدا میں تجارتی امور و مقاصد کے تحت ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ ہندوستان کی معیشت، دولت کی فراوانی، بین الاقوامی منڈی میں ہندی مصنوعات کی مانگ، حکم رانوں کی غفلت، سیاسی تنزل، اندرونی خلفشار، بیرونی حملوں اور صوبائی سطح پر متعدد بغاوتوں نے نو وارد یورپی اقوام کو تجارتی امور کے علاوہ کسی اور سمت بھی توجہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ درج بالا تمام حقائق بیرونی تسلط کے بیج کے لیے سازگار حالات کی فراہمی کا سبب بنے۔ یورپی اقوام نے اپنے اپنے ادوار میں بہ مطابق استطاعت حکم رانی اور تسلط کے بہتے دھارے میں ہاتھ دھوئے۔ تقسیمِ ہند، ۱۹۴۷ء تک اردو باقاعدہ ایک مکمل زبان کی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ آفرینش (جو آج تک ماہرینِ لسانیات کی متعدد و متضاد آرا کے دام میں ہے) سے ۱۹۴۷ء تک اردو اپنی شناخت کے لیے کن مقامی و بیرونی افراد کے باہمی روابط، مختلف زبانوں اور بولیوں کے اختلاط، مقامی حکم رانوں کی توجہ، یورپی فرماں رواؤں کی لسانی

پالیسیوں اور تعلیمی اقدامات کی رہینِ منت رہی؟ اِن سوالوں کے جوابات سے آ گاہی کی یہ دولت ہی اردو زبان وادب کے حق میں مستشرقین کی علمی وتحقیقی مساعی کا مطالعہ ممکن ہے جو بہ ہر حال ہند میں یورپی اقوام کی آمد اور سیاسی وتہذیبی اُتار چڑھاؤ کے جائزے کے بنا ادھورا ہے۔

ہند میں یورپی اقوام کی آمد

(اردو/ ہندوستانی کا ارتقا: عہد بہ عہد اجمالی جائزہ)

تجارت کی غرض سے چار اہم یورپی قومیں (پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی، انگریز) ہندوستان کے ساحلوں پر مختلف ادوار میں لنگر انداز ہوئیں۔ ظاہر ہے نو وارد اقوام اپنے ساتھ جداگانہ طرزِ معاشرت، علوم، زبان، ثقافت اور معاملاتِ روزمرّہ لائیں۔ متنوع بیرونی اور اندرونی ثقافتوں کے حامل افراد کے طویل عرصے تک میل ملاپ سے کئی مخلوط ثقافتوں اور بولیوں نے جنم لیا۔ ان مقامی و بیرونی بولیوں کے اشتراک واختلاط سے کس طرح اردو زبان متاثر ہوئی؟ اس امر سے آگاہی کے لیے ذیل میں متذکرہ چار اہم یورپی اقوام کی ہند میں آمد کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

پرتگالی بادشاہ، جان دوّم (John_II) کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا مینوئل اوّل (Manuel_I)[18] تخت نشین ہوا۔

مینوئل اوّل (حکومت: ۱۴۶۹ء۔۱۵۲۱ء) نے تین جہازوں پر مشتمل بیڑا واسکوڈے گاما (Vasco Da Gama) کی سپرداری میں پرتگال (Portugal) کے دارالسلطنت لزبن (Lisbon) سے ۸ جولائی ۱۴۹۷ء میں سوئے ہند روانہ کیا۔ یہ بیڑا چھبیس (۲۶) اپریل ۱۴۹۸ء کو بہ خیر 'راس اُمید' (Cape of Good Hope)[19] تک پہنچا۔ ایک عرب ملاح کی مدد سے یہ بیڑا راس اُمید کا چکر کاٹتے ہوئے ۱۷ مئی ۱۴۹۸ء کو ساحلِ مالابار Malabar) (Coast پر کالیکٹ (Calicut) کے شمال میں آٹھ (۸) میل کے فاصلے پر واقع ایک قصبے میں لنگر انداز ہوا۔ پرتگالیوں نے گویا پندرھویں صدی کی آخری دہائی میں ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا۔ بعد ازاں مختلف اوقات میں بہت سے پرتگالی یہاں آئے۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی عمل داری تھی۔ دہلی کی مرکزی سلطنت لودھی خاندان کے قبضے میں تھی اور سکندر لودھی (حکومت: ۱۴۸۸ء۔۱۵۱۷ء) تخت نشین تھا، مگر اس سے قبل ہی سلطان محمد تغلق کی عجیب وغریب اصلاحات کے سبب بنگال، دکن اور گجرات مرکز سے کٹ گئے تھے۔ دکن میں بہمنی، وجے نگر، کوچین اور کالی کٹ کی سلطنتیں قائم تھیں، جہاں مسلمانوں کا عمل دخل نہ تھا۔ یہاں راج دھانی ہندو راجاؤں کے سپرد تھی۔ ان راجاؤں میں ساحلِ مالابار پر کالی کٹ کا راجہ سب میں ممتاز تھا۔ 'زیمورن' (Zamorin)[20] اس کا موروثی لقب تھا۔ ہندوستان کی روایتی مہمان نوازی کے پیشِ نظر راجہ زیمورن نے اس پرتگالی نو وارد کا استقبال کیا۔ اس وقت ساحلِ مالابار پر لگ بھگ پچاس (۵۰) بندرگاہیں تھیں۔ اس مہربان راجہ نے حکم دے رکھا تھا کہ مذہب وملّت کی تخصیص کے بغیر جس کا دل چاہے تجارت کرے۔ اس فراخ دلی کے باوجود راجہ اپنے حریف کو پچھاڑنے اور مات دینے پر قادر تھا۔ اسی سبب واسکوڈے گاما نے زرخیز ساحلِ مالابار کی دولت سمیٹنے کی غرض سے محتاط رویہ اپناتے ہوئے راجہ سے راہ ورسم بڑھانے کا منصوبہ تیار کیا جس میں وہ کسی قدر کامیاب بھی ہوا۔

شاہِ پرتگال نے دوسری مہم کے طور پر تیرہ (۱۳) جہازوں کا بیڑا تیار کیا۔ بارہ سو (۱۲۰۰) جہازرانوں پر واسکوڈے گاما (۱۴۶۰ء۔۱۵۲۴ء) کو افسر مقرر کیا۔ پیڈرو آلوریز کابرال (Pedro Alvarez Cabral) کو امیر البحر مقرر کر کے ۸ مارچ ۱۵۰۰ء میں ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ سمندری طوفان کے سبب یہ بیڑا جنوبی امریکہ کے ساحل پر ملک برازیل (Brazil) میں لنگر انداز ہوا۔ برازیل پر اپنے تسلط کے بعد پرتگالی وہاں سے چلے تو ۱۳ ستمبر ۱۵۰۰ء کو بہ مقام کالی کٹ لنگر انداز ہوئے[21]۔ راجہ زیمورن نے اس بار پرتگالیوں کو کالی کٹ میں ایک کوٹھی بنانے کی اجازت دے دی۔ یہ کوٹھی ہندوستان کے ساحلی علاقے میں پرتگالیوں کے اثر ورسوخ کو بڑھانے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ پرتگالیوں نے عربوں کو، جن کے قبضے میں ایشیا اور افریقہ کے سواحل کی تجارت تھی، شکستیں دے کر

ہندوستان کی تجارت سے بے دخل کر دیا اور ساحلی علاقوں پر اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ البتہ انھوں نے اندرونِ ملک قبضہ کرنے کی کوشش نہ کی کیوں کہ پرتگال ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک پر قبضہ کرنا اور اسے برقرار رکھنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ اسی سبب انھوں نے خود کو ساحلی علاقوں اور تجارت تک محدود رکھا۔

سولھویں صدی میں پرتگالیوں کے وہ اوجِ موج سمندر میں تھے کہ سارے راجہ، مہاراجہ ان کے آگے تعظیماً جھکتے تھے۔ چار سو (۴۰۰) جہازوں پر مشتمل ایک بیڑا پرتگالیوں نے تیار کیا تھا جس میں بائیس ہزار (۲۲۰۰۰) سپاہ اور چھتیس سو (۳۶۰۰) توپیں تھیں۔ ان کے جنگی جہاز جہاں جاتے فتح پاتے اور دشمنوں کی کشتیاں ڈبوتے۔ بحرِ ہند میں کسی کو مجال نہ تھی کہ ان کے مقابلے کو آتا [۲۲]۔ گویا سولھویں صدی میں پرتگال، ہندوستان کی تجارت کا اجارہ دار بن گیا۔ 'An Advanced History of India' میں یہ حقیقت یوں درج ہے:

It was Alfonso De Albuquerque (1453_1515) who laid the real foundation of Portuguese power in India. He first came to India in 1503 as the commander of a squadron, and the record of his naval activities being satisfactory, was appointed Governor of Portuguese affairs in India in 1509. In November 1510, he captured the rich post of Goa, then belonging to the Bijapur Sultanate, and during his rule did his best to strengthen the fortifications of the city and increase its commercial importance...... The interests of the Portuguese were, however, faithfully served by him,and when he died in 1515 they were left as the strongest naval power in India with domination over the west coast.[23]

ان کی وسعتِ سلطنت میں تیس (۳۰) کوٹھیاں اور تجارت گاہیں تھیں۔ شہر گوا (Goa)، ہندوستان کے مغربی ساحل پر چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں، جزیرہ نما سنگل دیپ (Singal Dip) [۲۴]، جزیرہ نما ملایا (Malaya) میں ملاکا (Malacca)، بنگال میں ہگلی (Hugli) اور چٹا گانگ (Chittagong) میں بھی ان کی عمدہ بستیاں تھیں۔ گجرات میں بندرگاہ دیو (Diu) اور چھوٹے چھوٹے مقامات ان کے قبضے میں تھے۔

ہندوستان میں پرتگالی دور لرزہ خیز مظالم کی ایک طویل داستان ہے۔ ظلم و ستم میں پرتگیزی سمندر کے چنگیزی تھے [۲۵]۔ وہ جبر اور ظلم سے تبدیلیِ مذہب کو جائز سمجھتے تھے [۲۶]۔ اس جبر کی بنا پر گوا ایک نصرانی شہر بن گیا [۲۷]۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کا رویہ یک ساں جابرانہ تھا۔ تجارت میں بھی پرتگالیوں کے ہاں زبردستی روا تھی۔ دوسری اقوام کے تجارتی جہازوں کو لوٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اشیا کی من مانی قیمتیں مقرر کرتے اور راجاؤں کے ساتھ غرور سے پیش آتے۔ پرتگالیوں کے مظالم کی وجہ سے ہندوستانی ان سے بدظن ہو گئے۔ چوں کہ یورپین سے متعلق ہندوستانیوں کا یہ پہلا تجربہ تھا اس لیے سواحل پر روا پرتگالیوں کے مظالم، لوٹ مار، بددیانتی اور بداخلاقی کی داستانیں اندرونِ ملک پھیل گئیں۔

پرتگالیوں نے ہند میں اپنی سلطنت کو تین حصوں میں منقسم کیا تھا۔ ایک حصے کا دارالحکومت سیلون (Ceylon) تھا، دوسرے کا گوا اور تیسرے کا ملاکا۔ الفانسو دالبوکرک (Alfonso De Albuquerque) کے بعد اس کے جانشین کی نااہلی کے سبب ۱۶۲۲ء میں اہلِ ایران نے جزائر ہُرمز (Hormuz) کو واپس اپنے تسلط میں لے لیا۔ افریقہ کے مشرقی کنارے پر امامِ مسقط نے رفتہ رفتہ پرتگالیوں کو مار بھگایا۔ ۱۶۳۲ء میں بنگال میں ہگلی کے مقام پر شاہ جہان کے صوبے داروں نے پرتگالیوں کی عمل داری کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ ۱۶۵۶ء میں سیلون سے ڈچ (Dutch) قوم نے انھیں نکال دیا۔ ۱۶۶۲ء میں پرتگالی مرہٹوں کے فرماں بردار اور باج گزار ہو گئے۔ ۱۷۳۹ء میں بیسین (Bassein) بھی سخت محاصرے کے بعد پرتگالیوں کے ہاتھ سے مرہٹوں نے چھین لیا۔

'An Advanced History Of India' میں یوں درج ہے:

Though the earliest 'intruder into the East', the Portuguese lost their influence in the sphere of Indian trade by the eighteenth century.[28]

اٹھارھویں صدی تک پرتگالی ہندوستان میں حاکم ،تاجر اور مشنریوں کی حیثیت سے موجود رہے۔ ہندوستان کے جنوبی ساحل کے مختلف حصوں پر قابض ہونے کے سبب اُن علاقوں میں پرتگالی نو آبادیاں قائم ہوئیں۔ اس دوران میں مقامی باشندوں سے میل جول اورنظم ونسق کی ضرورتوں کے تحت پرتگالی زبان کا اثر ونفوذ مقامی بولیوں پر ہوا۔ برِصغیر پاک و ہند کی عام زبان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی بلکہ پرتگالیوں ہی کے توسط سے اردو/ ہندوستانی زبان یورپ میں متعارف ہوئی۔ اُس زمانے میں یورپ میں پرتگالیوں کے سیاسی تفوق کی بنا پر پرتگالی تہذیب وزبان نمایاں حیثیت کی حامل تھی۔ پرتگالی زبان کے بہت سے الفاظ جو ہندوستانی زبان میں مل جل گئے تھے وہ انگریزی زبان میں بھی شامل ہو گئے۔

یورپی زبانوں میں انگریزی زبان کے بعد اردو کو سب سے زیادہ متاثر پرتگالی زبان نے کیا۔ پرتگالی زبان نے ہندوستان کی قریباً تمام زبانوں کو متاثر کیا۔خصوصاً ہند کی دراوڑی زبانوں: مرہٹی، بنگالی اور آسامی زبانوں پر نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے[۲۹] ۔ پرتگالی مستشرقین کی مؤلفہ اردو لغات کے بہ غور جائزے سے اردو زبان میں شامل پرتگالی الفاظ کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔مثلاً اچار، بوتل، پستول، پرات، کمرہ وغیرہ۔ 'The British Raj In India' میں پرتگالی الفاظ کی اردو میں شمولیت کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

They added a surprisingly large number of words to the vocabulary of the Indian languages. For example, the Urdu word 'Achar' (Pickle), 'Mez' (Table), 'Baramda' (Verandah), Almari' (Cupboard), 'Qamiz' (Shirt), and 'Nilam' (Auction) are derived from Portuguese.[30]

پرتگالی ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو منشورِ شاہی عطا ہوا اس کے مطابق برصغیر آنے والے پادریوں کے لیے اردو/ ہندوستانی زبان سیکھنا لازمی تھا۔ امداد صابری نے 'فرنگیوں کا جال' میں لکھا ہے:

ہر فوج اور ہر بڑے کارخانے میں ایک پادری رکھا جائے جس پر یہ لازم ہو کہ ہندوستان پہنچنے سے بارہ مہینے کے اندر 'ہندوستانی' سیکھ لے۔[۳۱]

پرتگال کی روز افزوں دولت اور ترقی کو دیکھتے ہوئے تمام یورپی اقوام ہندوستان پر ٹوٹ پڑیں۔ ڈینش (Danish)، ولندیزی (Holland)، فرانسیسی (French) اور جرمن (German) اس تگ ودو میں شامل تھے۔ ہندوستان نے پرتگال کی راج دھانی کو حسین ترین شہر بنا دیا۔ لندن نے حاسدانہ نگاہوں سے لزبن کی جانب دیکھا، لزبن نے ہندوستان کی طرف اشارہ کر دیا۔[۳۲]

ہالینڈ اور فرانس کے لوگوں نے بھی تجارتی کمپنیاں قائم کیں، بحری بیڑے بنائے اور افریقہ، ہندوستان اور جزائر شرق الہند کے ممالک سے تجارت شروع کر دی۔

اہلِ ہالینڈ کو ڈچ یا ولندیزی بھی کہتے ہیں۔ ۱۶۰۰ء میں ہسپانیہ کے جبر واستبداد سے آزادی کے بعد ولندیزیوں کو بھی حالات نے ہندوستان کی راہ سُجھا دی۔ ہندوستان میں تجارت کی غرض سے ہالینڈ میں دو تجارتی کمپنیاں قائم ہوئیں۔ دونوں کا نام 'ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی' رکھا گیا۔ دونوں کمپنیوں نے باہمی اتفاقِ رائے کے پیشِ نظر آٹھ جہاز ہندوستان کی طرف 'ہاٹ مین' (Houtman) کی زیرِ نگرانی ۱۵۹۵ء میں روانہ کیے۔ یہ متحد بیڑہ سماٹرا (Sumatra) اور جاوا

(Java) کے کناروں پرلنگرانداز ہوا۔ یہاں گرم مصالحوں سے بھرے چار جہاز اپنے دارالسلطنت میں لے جا کر ولندیزیوں نے کامیاب تجارت کا آغاز کر دیا۔ اس طرح مزید ڈچ تجارتی کمپنیاں وجود میں آئیں۔ انفرادی حیثیت سے تجارت کرنے کی بنا پر یہ کمپنیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں لگی رہتیں جس سے نہ صرف تجارت میں انھیں نقصان ہوتا بلکہ یہ اپنے بحری دشمن، پرتگالیوں کی مخالفت کا مقابلہ بھی نہ کر پاتیں۔ اسی سبب ۱۶۰۲ء میں تمام ڈچ تجارتی کمپنیوں کو ضم کر کے ایک کمپنی بنا دی گئی۔ متحد 'ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی' کا نام:

"Verenidge Landsche Ge_Oktroyeerde Oostindische Compagnie"

رکھا گیا جسے مختصراً 'VOC' کہا گیا۔[۳۳]

ابتدا میں ولندیزی اُنھی تجارت گاہوں پر کاروبار کرتے تھے جہاں پرتگالی سوداگری کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ انھوں نے پرتگالیوں کو تجارت میں مات دینے اور ان کا کاروبار ٹھنڈا کرنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ ہندوستانی سواحل پر ولندیزی بلاشرکتِ غیر تجارت کے اجارہ دار بن جائیں۔ ہندوستانیوں پر بے جا ظلم روا رکھنے کی وجہ سے پرتگالی اپنا اعتماد و مقام پہلے ہی کھو چکے تھے۔ ایسی صورت میں ولندیزیوں کے لیے اپنے تجارتی تسلط کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا مشکل نہ تھا۔ بالآخر ملاکا میں کوچین (Cochin) کے اندر مقامی باشندوں نے پرتگالی جبر و استبداد کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے ولندیزیوں کے تعاون سے پرتگالی قلعے پر حملہ کیا، تمام حصار نشینوں کو قتل کر ڈالا اور متعدد تجارت گاہوں پر قابض ہو گئے۔ ولندیزیوں نے اپنی روز افزوں فتوحات کی بنا پر ارادہ کیا کہ کوئی بڑا شہر آباد کر کے اپنا دار السلطنت بنایا جائے۔ جاوا کے مشرقی کنارے پر موجود شہر بٹاویا (Batavia) ان کے اسی ارادے کی عملی صورت تھی۔

ولندیزی شروع ہی سے بنگال میں بہ کثرت آباد ہوئے۔ ہگلی کے قریب قصبے، چن شُورا (Chinsurah)[۳۴] میں ولندیزیوں کا قلعہ تھا جسے بنگال میں ان کے دارالریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ علاوہ ازیں ۱۶۶۰ء میں ولندیزیوں نے پرتگالیوں سے ناگاپٹنم (Nagapattinam) بھی چھین لیا تھا۔ ہندوستان میں انھوں نے مقامی باشندوں سے اچھے تعلقات قائم کر کے اپنا کام نکالنے کی پالیسی اختیار کی، البتہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کو اپنی نوآبادی بنانے کا خیال کبھی نہ کیا۔ ان کا بنیادی مقصد تجارت کر کے زیادہ نفع کمانا تھا۔ 'A History Of India' میں درج ہے:

The Dutch had factories and warehouses as far north as Agra but they took no part in politics or cultural contacts.[35]

ولندیزی قطعاً دیانت دار اور راست باز نہ تھے۔ ان کے ملازمین رشوت لینے میں حد سے زیادہ بدنام تھے۔ وہ نجی تجارت کر کے بھی اپنی دولت میں اضافہ کرتے تھے۔ ڈچ تجارتی کمپنی نے رشوت ختم کرنے کے لیے سنجیدگی سے کبھی بھی کوشش نہیں کی اور یہی بدعنوانیاں ان کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں[۳۶]۔ پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) میں انگریزوں کی کامیابی کے بعد ہالینڈ سے ہندوستان کی رہی سہی تجارت بھی انگریزوں کے قبضے میں آ گئی اور ہندوستان سے ان کی تجارتی اجارہ داری کا خاتمہ ہو گیا۔ البتہ رشوت ستانی اور بے رحمی کے قصے باقی رہ گئے۔

فرانسیسیوں نے ہندوستان کا راستہ ہالینڈ اور پرتگال کے باشندوں سے بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ البتہ انھوں نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش بہت بعد میں کی[۳۷]۔ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے متعلق ایک مغربی تاریخ دان لکھتا ہے:

The first East India Company (Compagnie Des Indes Orientales), founded by Colbert in 1664 during the reign of Louis xiv, established posts at Pondicherry,[38] Chandernagore and Masulipatnum, and on the Malabar coast.

فرانسیسی ۱۶۷۲ء میں فرانسوا مارٹن (Franscois Martin) کی معیت میں سورت پہنچے[۴۰]۔ مارٹن نے آتے ہی بیجاپور (Bijapur) کے عامل

کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کیے۔ دوسری جانب ولندیزیوں نے شاہِ گولکنڈہ (Golkunda) سے مراسم بڑھا لیے۔ ۱۶۷۴ء میں سینٹ ٹومے (Saint Thome) پر قابض ہونے کی غرض سے ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کے مابین تصادم ہوا، جس میں فرانسیسیوں کو شکست ہوئی اور انھوں نے ہار مان لی۔ ۱۶۷۷ء میں شیواجی نے کرناٹک (Carnatic) فتح کر لیا۔ مارٹن نے شیواجی کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی مخالفت نہ کرنے کا عہد کر لیا۔ مارٹن نے کرناٹک میں

فرانسیسیوں کے لیے گھر تعمیر کروائے، سٹور اور بارود خانے بنوائے اور ۱۶۸۹ء میں شیواجی کے بیٹے، سمبھاجی سے اجازت لے کر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کر لیا۔

اس زمانے میں بحرِ ہند میں فرانس کے علاقے، انگریزوں کی پریذیڈنسیوں کی طرح، دو حکومتوں میں منقسم تھے۔ ایک حکومت میں جزیرہ بوربان (Bourbon) اور جزیرہ ماریشس (Mauritius) شامل تھے۔ ہر جزیرہ ایک سو اسّی (۱۸۰) میل کے رقبے کو محیط تھا۔ دوسری حکومت میں پانڈی چری اور اس کے کچھ نواحی علاقے اور تین کوٹھیاں شامل تھیں۔ ایک کوٹھی ساحلِ مالا بار پر، دوسری ساحلِ کارومنڈل (Coromandel) پر اور تیسری بنگال میں ہگلی کے مقام پر واقع تھی۔ ''جزائرِ فرانس کا گورنر، برٹرینڈ فرانسوا ماہے د لابوغدنی (Bertrand Francois Mahe De La Bourdonnais) تھا۔ اس کی ذہانت اور قابلیت جزائرِ فرانس کی خوش حالی اور ترقی کا باعث بنی۔''[۴۱]

جوزف فرانسوا دوپلے (Joseph Francois Dupleix) حکومتِ فرانس کے زیرِ تسلط دوسری حکومت، پانڈی چری میں گورنر تھا۔ اس کے عہد میں دو ہزار (۲۰۰۰) پختہ مکانات چندر نگر میں اور ایک کوٹھی پٹنہ میں تعمیر کی گئی۔ وہ ۱۷۴۲ء میں پانڈی چری اور اس سے ملحقہ علاقوں کا حاکمِ اعلیٰ مقرر ہوا۔ ''فرانسیسیوں میں دوپلے ہی وہ پہلا شخص تھا جسے ۱۷۴۰ء کے لگ بھگ زوال آمادہ سلطنتِ مغلیہ کی شکستہ عمارت کو ڈھا کر ایک وسیع فرانسیسی سلطنت کے قیام کا خیال سوجھا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اُس نے تدابیر بھی سوچ رکھی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اہلِ یورپ مقامی راجاؤں اور نوابوں کو کاٹھ کی پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر نچا کر ہندوستانی علاقوں پر قابض ہونے میں کام یاب ہو سکتے ہیں۔''[۴۲]

۱۷۴۷ء میں دوپلے نواب انوارالدین کو اپنا حلیف بنانے میں کام یاب ہو گیا۔ اسی سال فرانسیسیوں اور انگریزوں میں جنگ چھڑ گئی۔ آرکاٹ (Arcot) کے نواب نے فرانسیسیوں کی برتری مان لی اور انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دوپلے کی فتوحات کا سلسلہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ۱۷۴۹ء میں ترشراپلی (Tiruchirappalli) کا علاقہ بھی فرانسیسیوں کے قبضے میں آ گیا۔[۴۳]

۱۷۵۱ء میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے رابرٹ کلائیو (Robert Clive) کو ہندوستان بھیجا۔ دس (۱۰) اکتوبر ۱۷۵۱ء میں کلائیو نے کرناٹک کے راجہ محمد علی کی پروا نہ کی اور پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے پہلے ترشراپلی اور پھر سینٹ ڈیوڈ تک جا پہنچا۔ ۱۷۵۴ء میں کرناٹک کے مقام پر دوپلے کو شکستِ فاش ہوئی اور فرانسیسی اقتدار کا بت پاش پاش ہو گیا۔[۴۴]

اردو زبان و ادب کے ضمن میں فرانسیسیوں کے کارنامے پرتگالیوں کے مقابلے میں مقدار کے لحاظ سے زیادہ اہم ہیں۔ ہندوستان پر فرانسیسی تسلط کے

سبب یورپی محققین میں ہندوستانی زبانوں کے حوالے سے تحقیق و مطالعے کا سلسلہ روز بہ روز پروان چڑھتا گیا۔ فرانسیسی سیاحوں اور پادریوں نے اردو زبان و ادب کے مطالعے میں وسعتِ نظر کا ثبوت دیا۔ اردو زبان کے لغات و قواعد کی تدوین اور اردو ادب کی تاریخ کے ضمن میں فرانسیسی مصنفین کے کارنامے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں[۴۵]۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں فرانسیسی اقتدار کے خاتمے کی وجہ سے فرانسیسیوں نے ہندوستان کے تمدن اور زبانوں پر دیرپا اثرات

مرتب نہیں کیے[۴۶]۔ فرانسیسی اور ولندیزی زبانوں کا اثر ہندوستانی زبانوں پر کچھ زیادہ نہیں ہوا اور اگر کچھ ہوا بھی تو ان مقامات تک محدود رہا جہاں ان کے کارخانے اور آبادیاں تھیں۔ گویا ان ولایتی زبانوں کا اثر وقتی اور عارضی تھا[۴۷]۔ البتہ ہندوستانی زبانوں خصوصاً اردو کے حوالے سے مستحکم علمی روایت پیرس میں موجود تھی۔

فرانس میں مشرقی علوم کا ادارہ ۱۶۶۹ء میں قائم ہوا۔ انقلابِ فرانس کے بعد اردو کو فرانس میں اہم مشرقی زبان کی حیثیت سے قبولیت حاصل ہوئی۔ لوئس

لانگلے (Louis Langley) کی کوششوں کے نتیجے میں عربی اور فارسی کا چرچا ہوا۔۱۷۹۰ء میں لانگلے (۱۷۶۳ء-۱۸۲۴ء) نے حکومت کے سامنے پیرس میں مشرقی زبانوں کی تدریس کے لیے ایک مدرسے کے قیام تجویز پیش کی۔ جس کی بنا پر حکومتی سرپرستی میں مشرقی زبانوں کا مدرسہ ۱۷۹۵ء میں قائم کیا گیا۔ البتہ اس وقت صرف تین زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کے پروفیسروں کی آسامیاں منظور ہوئیں۔ مدرسے میں اردو زبان کی تدریس کا آغاز ۱۸۲۸ء سے ہوا۔ اردو زبان کا نامور فرانسیسی مستشرق، گارسیں دتاسی اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے اس مدرسے میں ۱۸۲۸ء سے ۱۸۷۸ء تک خدمات انجام دیتا رہا۔ گارسیں نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے فرانسیسی زبان میں بیش قیمت سرمایا چھوڑا۔[۴۸]

انگریز مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت پر ۱۵۸۸ء میں آمادہ ہوئے، جب سپین کے بحری بیڑے 'آرمیڈا' (Armada) کو انگلستان کے ہاتھوں شکست ہوئی[۴۹]۔ اس سے ایک طرف تو سپین کی ابھرتی ہوئی سمندری طاقت زوال پذیر ہوئی اور دوسری طرف انگلستان کو اپنی بحری فوقیت کا احساس ہوا اور اس نے

بھی یورپ کی دیگر اقوام کی طرح مشرق کی دولت سے ہاتھ رنگنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ۱۵۹۹ء میں انگریزوں نے ملکہ الزبتھ اوّل (Queen Elizabeth I) سے مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت طلب کی۔ چناں چہ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء مین ملکہ الزبتھ نے شاہی منشور کے ذریعے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو باضابطہ حیثیت دلوائی۔ شاہی فرمان میں یہ الفاظ شامل تھے:

"The Governor and Company of Merchants of London Trading into the East Indies."

اس چارٹر کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ اختیارات دیے گئے کہ وہ 'Cape Of Good Hope' سے لے کر 'Straits Of Mazellom' تک کے سارے علاقے کو پندرہ سال (۱۵) تک کی مدت کے لیے تجارت کی غرض سے استعمال کرے[۵۰]۔ کمپنی کا سب سے پہلا گورنر جنرل 'سر تھامس سمتھ' (Sir Thomas Smith) تھا[۵۱]۔ کمپنی کو ایک گورنر اور چوبیس (۲۴) کمیٹیوں کے زیرِ انتظام رکھا گیا[۵۲]۔ ابتدا میں کمپنی کا نام 'The Society Of Adventures' تھا[۵۳]۔ بعد ازاں میں ناموں کی کئی تبدیلیوں کے بعد یہ 'ایسٹ انڈیا کمپنی' (East India Company) کے نام سے موسوم و مشہور ہوئی[۵۴]۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کی اجارہ داری کے حصول کے لیے دیگر یورپی تجارتی کمپنیوں سے مقابلہ کرنا پڑا جن میں پرتگالی، ڈچ اور فرانسیسی شامل تھے۔ اس مقابلے کی وجہ سے ان کی آپس میں جنگیں ہوئیں جن میں بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی کام یاب رہی۔

۱۶۰۱ء میں انگریزوں کا پہلا تجارتی جہاز ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ ۱۶۰۵ء سے ہندوستان میں مغل بادشاہ، جہاں گیر کا دورِ حکومت شروع ہوتا۔

۱۶۰۸ء میں کپتان ہاکنز (Captain Hawkins) نے بادشاہ جہاں گیر سے سورت میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت طلب کی مگر پرتگالیوں نے اپنے تجارتی مفادات کے پیشِ نظر ہاکنز کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ ۱۶۰۹ء میں جیمز اوّل (James I) نے چارٹر کے الفاظ میں ترمیم کی جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشرقی تجارت کا دوامی اجارہ دار بنا دیا گیا۔ ۱۶۱۲ء میں کپتان بیسٹ (Captain Best) نے جب پرتگالیوں کے ایک بیڑے کو شکست دی تو اُس وقت انگریزوں کو سورت میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ ''فیکٹری کا نگران 'صدر' کہلاتا تھا اور فیکٹری کے ملازمین کو 'فیکٹرز' کہا جاتا تھا''[۵۵]۔ ۱۶۱۵ء میں جیمز اوّل کے دربار سے ایک سفیر، سر تھامس رو (Sir Thomas Roe) جہاں گیر کے دربار میں حاضر ہوا[۵۶]۔ اس نے جہاں گیر کا اعتماد حاصل کر کے اسے پرتگالیوں سے بدگمان کیا اور اپنے ملک کے تاجروں کے لیے اہم مراعات حاصل کیں۔ شاہی فرمان کے ذریعے سے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو فیکٹری کے گرد نہ صرف فصیل بنانے کی اجازت مل گئی بلکہ ایک دوسرے فرمان کی رو سے بادشاہ جہاں گیر نے انگریز کمپنی کو اپنی سلطنت میں تجارت کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ چناں چہ اسی زمانے

میں آگرہ، اجمیر، احمد آباد اور بھراچ میں برطانوی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوگئیں۔ مغل بادشاہوں کے لطف وعنایات سے متاثر ہوکر سر تھامس رو نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ مشورہ دیا:

If you will profit, seek it in sea and in quiet trade.[57]

انگریزوں میں سب سے پہلے تھامس کوریٹ (Thomas Coryate) نے ۱۶۱۶ء میں 'ہندوستانی' زبان کا ذکر کیا۔ ۱۶۳۴ء میں مغل بادشاہ، شاہ جہان کے فرمان سے بنگال میں انگریزوں کی پہلی فیکٹری قائم ہوئی۔[۵۸]

۱۶۴۰ء میں چندر گیری کے راجا سے انگریزوں نے مدراس کا علاقہ خرید لیا اور وہاں اپنی پہلی قلعہ بند فیکٹری قائم کی اور اس کا نام 'فورٹ سینٹ جارج' (Fort Saint George) رکھا۔ ۱۶۵۱ء میں انھوں نے ساحلی علاقوں سے اندرونِ ملک تجارت کے لیے تگ و دو شروع کی اور اس کے لیے ہگلی میں فیکٹری قائم کی۔ اس کے بعد سے کمپنی کی تجارت مضبوط بنیادوں پر جاری رہی۔ کمپنی بہت جلد تجارت کے ساتھ سیاست کے میدان میں بھی کود پڑی۔ اب اس کے پیشِ نظر 'تجارت اور ملک گیری' تھی۔ ۱۶۶۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اختیار دے دیا گیا کہ:

To make peace and war with non-Christian people and it was thus invested with political powers.[59]

اس سے بہ تدریج انگریزوں کے پاؤں جمتے چلے گئے۔ ۱۶۶۲ء میں چارلس دوّم نے چار (۴) اہم چارٹر جاری کیے جن کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہر قسم کے اختیارات حاصل ہوگئے۔ وہ علاقوں پر حملہ کر کے انھیں فتح کر سکتی تھی اور اپنا سکّہ چلا سکتی تھی۔ افواج اور قلعے اس کے زیرِ نگیں ہوگئے۔ سیاسی دوست اور دشمن بنانا، جنگ کرنا، امن قائم کرنا اور ہر قسم کی شہری وقانونی کارروائیاں کرنا کمپنی کے اختیارات میں شامل ہوگیا تھا۔ اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں بہت سے اہم مقامات آگئے تھے۔ ہگلی (بنگال)، وزاگا پٹنم (مدراس)، سورت (بمبئی) وغیرہ۔ صوبائی افسروں کی نااہلی، اندرونی تفرقات واختلافات اور ملکی بدنظمی دیکھ کر انگریزوں نے ہندوستان کی حکم رانی حاصل کرنے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔

۱۶۹۸ء میں اورنگ زیب نے کمپنی کو تین (۳) گاؤں (کلکتہ، چٹرنٹی، گوبند پور) خریدنے کی اجازت دے دی۔ بعد ازاں ان علاقوں کی قلعہ بندیاں کر لی گئیں۔ اس نئی قلعہ بندی کو سر چارلس آئرس (Sir Charles Ayers) نے شاہِ انگلستان، ولیم سوّم (William III) کے نام سے موسوم کر دیا اور اسے 'فورٹ ولیم' (Fort William) کہا جانے لگا[۶۰]۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت تیزی سے رو بہ زوال ہوئی۔ حکم رانوں کی بے ترتیبی اور نااہلی کی کوئی حد نہ تھی۔ رفتہ رفتہ دور دراز کے صوبے مرکز سے کٹتے جا رہے تھے۔ دکن میں مرہٹے، پنجاب میں سکھ اور بنگال میں بعض مسلم نواب سر اٹھا رہے تھے اور مغلیہ حکومت میں ان سب طاقتیں سے مقابلے کی سکت نہ رہی تھی۔ علاوہ ازیں ہر صوبے میں بالا دستی کے لیے ہمہ وقت سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان حالات سے انگریزوں نے بھر پور فائدہ اٹھایا۔ ۱۷۴۰ء سے ۱۷۶۰ء تک کے درمیانی عرصے میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی معاملات میں مداخلت سے برِصغیر کے خاصے بڑے رقبے پر تسلط قائم کر کے وسیع سلطنت حاصل کرنے میں کام یاب ہوگئی۔

۱۷۵۷ء میں پلاسی کی فیصلہ کن جنگ کے فوراً بعد برطانوی اقتدار نے برِصغیر پر اپنی گرفت اس طرح مضبوط کی کہ دیگر تجارتی کمپنیوں اور ان کے مقبوضات کی اہمیت گھٹ گئی۔ اسی سال رابرٹ کلائیو (Robert Clive)[۶۱] کو کلکتے کا گورنر بنا دیا گیا اور وہ بنگال میں برطانیہ کا سول اینڈ ملٹری کمانڈر بن گیا۔

۱۷۶۰ء میں کلائیو کے یورپ جانے کے بعد وان سٹارٹ (Vansittart) کو بنگال کا گورنر بنا دیا گیا۔ وان سٹارٹ کے پانچ سالہ دورِ اقتدار (۱۷۶۰ء۔۱۷۶۵ء) میں اہم واقعہ بکسر (Buxar) کی جنگ میں انگریزوں کی فتح یابی کا ہے۔ اس جنگ میں انگریزوں کی فتح نے فیصلہ سنا دیا کہ اب ہندوستان پر کمپنی کی حکومت کا باقاعدہ آغاز ہو چکا ہے اور ہندوستان کی افواج مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

۱۷۶۵ءتک پرتگالی، ولندیزی، جرمن، فرانسیسی اور انگریز انفرادی حیثیت سے اردو زبان وادب کی آب یاری میں مصروف رہے۔ ان مستشرقین کی انفرادی علمی کاوشوں سے اردو زبان وادب میں لغت وقواعد کا سرمایہ اس قدر ہو گیا کہ غیر ملکیوں کے لیے اردو زبان سیکھنا مشکل نہ رہا۔ اردو زبان کی طرف ان مستشرقین کی توجہ کا اصل مقصد زبان کی تدریس سے زیادہ عیسائیت کی تبلیغ یا انتظامِ سلطنت میں سہولت کا حصول تھا [۶۲]۔ انھوں نے نہ صرف اردو لغات وقواعد بلکہ

بائبل مقدس کے متعدد حصوں کے اردو تراجم کے ذریعے سے اپنے مقاصد کے حصول کو ممکن بنایا۔ اردو کی لسانی تاریخ میں بائبل کے یہ ابتدائی تراجم بلا شبہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تراجم میں مستشرقین کو بے شک مقامی علما وا کابرین کا تعاون درپیش رہا مگر اس کے باوجود ان اوّلین مبلغین اور مستشرقین کی ذاتی مساعی کو بہ ہر حال زیادہ دخل رہا۔ ان تراجم کی صورت میں اٹھارہویں صدی کی بول چال کے وہ اہم نمونے میّسر آ گئے ہیں جو اس زمانے کی دیگر تصانیف میں ناپید ہیں۔ ان دست یاب نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبلغین کی توجہ بول چال کی زبان کی طرف زیادہ تھی اسی سبب انھوں نے تراجم کو عام گفت گو کے بہت قریب رکھا۔ مسیحی مبلغین نے بائبل کے ان تراجم کے ذریعے سے بہ ظاہر عیسائیت کی خدمت کی مگر بالواسطہ اردو زبان کی خدمت بھی ہو گئی۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد بہت پہلے سے پڑ چکی تھی لیکن ہندی سیاسیات میں ان کی فعالیت کا قصہ ۱۷۶۵ء سے شروع ہوتا ہے جب انگریزوں نے شاہ عالم سے چھبیس (۲۶) لاکھ روپے سالانہ کے عوض بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی سند لکھوا کر ان علاقوں میں اپنی بالواسطہ حکومت کی اساس رکھ دی۔ انگریز مستشرقین کی اردو زبان وادب میں دل چسپی کی مسلسل ومربوط روایت اسی دور سے شروع ہوتی ہے [۶۳]۔ اب زبانوں کے مطالعے کا مسئلہ فقط وسط ایشیائی نہ رہا بلکہ اس

میں دیگر ایشیائی حوالے بھی شامل ہو گئے۔ عربی اور فارسی کے مطالعے کے ساتھ ساتھ سنسکرت، بنگالی، ہندی، اردو اور بعض دیگر مقامی زبانوں کا سیکھنا مخصوص مقاصد کے لیے لازم ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں مستشرقین کی انفرادی علمی وتحقیقی کاوشوں کے بہ جائے منظّم اور مربوط اداروں نے نظم ونسق کی ضرورتوں کے تحت علم وتحقیق کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔

۱۷۶۷ء میں کلائیو نے بہ وجہ علالت استعفاء دے دیا۔ کلائیو کے بعد ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء تک کلکتے میں کونسل کے پریذیڈنٹ ہیری ویرلسٹ (Harry Verelst) کو بنگال کا گورنر بنا دیا گیا۔ ویرلسٹ کے بعد کارٹیئر (Cartier) نے ۱۷۶۹ء سے ۱۷۷۲ء تک گورنر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ملکی بربادی اور رشوت ستانی نے ایسے شکستہ حالات پیدا کیے کہ خود کمپنی کو اپنا وجود خطرے میں نظر آنے لگا۔ ۱۳؍اپریل ۱۷۷۲ء میں وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) نے بنگال کے گورنر کی حیثیت سے اپنا منصب سنبھالا تو اسے بھی انہی مسائل کا سامنا تھا۔ وارن ہیسٹنگز کے عہد (۱۷۷۲ء۔۱۷۸۵ء) کو ہند کی تاریخ میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ گورنر اگرچہ کمپنی کی مملکت میں ایک انچ کا اضافہ بھی نہ کر سکا تاہم انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی مختلف ومتعدد طاقتوں کو کم زور اور منتشر کرنے میں کام یاب ضرور ہوا۔

ہیسٹنگز نے مقامی باشندوں سے حقارت ونفرت کے بہ جائے پدرانہ شفقت اور حوصلہ افزائی کی پالیسی اختیار کی۔ اسی سبب مشرقیات اور مشرقی زبانوں سے ہیسٹنگز کو خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔ مشرقیات کے حوالے سے ہیسٹنگز کے نقطۂ نظر کو ایس این مکرجی نے درج ذیل لفظوں میں بیان کیا ہے:

> A history of oriental Studies is incomplete without a mention of Hastings. He came to India at an early age and a long stay in this country had made him an admirer of Indian manners and customs. He learnt the Persian language, gathered Indian paintings and manuscripts. It was only natural that he should patronize Oriental learning. He encouraged most the pioneer Indologists in their work, fought for them in the Supreme Council and had long discussions with them on their subjects.[64]

'The British Raj In India' میں ہیسٹنگز کی 'شرق دوستی' پر یہ اقتباس درج ہے:

By reason of his respect for the people and their culture, Hastings enjoyed among the natives a popularity such as no other govrenor has been able to attain. He was conversant in Persian, Arabic and Bengali and was responsible for the foundation of an Arabic College at Calcutta. He also encouraged Sanskrit Studies.[65]

وارن ہیسٹنگز نے مشرقیات کے لیے عملی اقدامات کیے۔اس سلسلے میں ہندوستانی علوم کی ترقی کے لیے۱۷۸۱ء میں کلکتے میں ایک مدرسے کی بنیاد رکھی گئی۔اس یادگار دور میں سر ولیم جونز (Sir William Jones) جیسا مستشرق گزرا جسے بلاشبہ 'مشرقیات کا بانی' کہا جاسکتا ہے۔ولیم جونز کا اہم کارنامہ 'ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال' (Asiatic Society Of Bengal) کا قیام ہے جس کی بنیاد۱۷۸۴ء میں رکھی گئی۔اس سوسائٹی کا مقصد ہندوستان کی قدیم تہذیب وتمدن اور کلچر کی دریافت تھا۔ولیم جونز کے قائم کردہ اس ادارے کے توسط سے اہلِ یورپ نے مشرقیات میں بے پناہ دل چسپی کا اظہار کیا۔اس سے نہ صرف مستشرقین کی ایک مستقل روایت کی بنیاد پڑی بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں میں مشرقیات کے حوالے سے علم وادب کا وسیع ذخیرہ جمع ہوگیا۔۱۷۸۴ء سے۱۷۹۴ء تک ولیم جونز اس سوسائٹی کا سیکریٹری رہا۔اُس دور میں یہ کوشش کی گئی کہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا صحیح تلفظ متعین کیا جائے۔سوسائٹی نے ہند وفلسفہ، ادب، تاریخ، زبان، موسیقی اور ستاراشناسی پر متعدد کتابیں طبع کیں۔تاریخ میں اشوک، کنشک اور گپت خاندان پر تحقیق ہوئی۔[۶۶]

۱۷۸۵ء میں وارن ہیسٹنگز کلکتے سے گورنر جنرل کے منصب سے استعفاء دے کر انگلستان چلا گیا۔وارن ہیسٹنگز کی ریٹائرمنٹ کے بعد سر جان میکفرسن (Sir John Macpherson) کو۱۷۸۵ء سے۱۷۸۶ء تک کے لیے ہندوستان کا عبوری گورنر جنرل بنادیا گیا۔میکفرسن کلکتہ کونسل کا سینئر ممبر تھا۔

ستمبر۱۷۸۶ء میں لارڈ کارنوالس(Lord Cornwallis) نے گورنر جنرل کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا تو حاکم ورعایا کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔کارنوالس سات سال(۱۷۸۶ء۔۱۷۹۳ء) تک ہندوستان میں بہ حیثیت گورنر جنرل رہا۔

ہندوستان میں کمپنی کے حکم رانوں میں دو قسم کے خیالات کے حامل لوگ شامل تھے۔ایک قسم اُن حکم رانوں کی تھی جو ہندوستان کی قدیم تہذیب، کلچر اور زبانوں سے متاثر تھے اور انھیں برقرار رکھتے ہوئے حکومت کرنے کے حامی تھے۔دوسری قسم کا حکم ران طبقہ اس خیال کا حامی تھا کہ ہندوستان ایک پس ماندہ ملک ہے، اس لیے اسے جدید تہذیب سے روشناس کرایا جائے۔وارن ہیسٹنگز کا تعلق پہلی قسم اور کارنوالس کا تعلق دوسری قسم کے حکم رانوں سے تھا۔[۶۷]

ہندوستانی تہذیب وکلچر سے عدم دل چسپی کی بنا پر کارنوالس کو اس سے بھی کچھ غرض نہ تھی کہ ہندوستانی زبانوں، خصوصاً اردو، ہندوستانی اور دیگر مشرقی علوم کی سرپرستی وآب یاری کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات کیے جائیں۔کارنوالس کے سات سالہ دورِ حکومت میں اردو لغات وقواعد اور دیگر ادبی شعبوں میں مستشرقین کی تصنیفات وتالیفات زیادہ تر انفرادی مساعی کا نتیجہ تھیں۔

۱۷۹۳ء میں کارنوالس کی انگلستان واپسی پر کونسل کے سینئر ممبر، سر جان شور(Sir John Shore) کو عبوری طور پر ہندوستان کا گورنر جنرل بنادیا گیا۔بورڈ آف کمشنرز(Board Of Comissioners) نے اس عہدے پر پانچ سال کے لیے سر جان شور کی تقرری کی توثیق کردی۔سر جان شور۱۷۹۳ء سے۱۷۹۸ء تک گورنر جنرل رہا مگر اپنی لیاقت واہلیت کے باوجود وہ برطانوی اور مقامی باشندوں کے مابین حقارت وبے گانگی کی دیوار کو گرا نہ سکا۔

۱۷۹۸ء میں لارڈ ویلزلی(Lord Wellesley) کا گورنر جنرل کے عہدے پر تقرر ہوا۔ویلزلی نے اپنے دورِ حکومت (۱۷۹۸ء۔۱۸۰۵ء) میں کمپنی کو ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت بنادیا۔اسی کے عہدِ حکومت میں پیشوا اور نظام کا خاتمہ ہوا۔سلطان شہید(ٹیپو سلطان) نے اسی دور میں جامِ شہادت نوش کیا[۶۸]۔ویلزلی کے عہد میں مقامی لوگوں کا انگریزوں سے رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ہندوستان میں انگریزوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ رعونت میں بھی اضافہ ہوا۔نسلی برتری نے حاکم ومحکوم کو ایک دوسرے سے بدظن کردیا۔اسی سبب ویلزلی نے فیصلہ کیا کہ کمپنی کے انگریز ملازمین کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ ہندوستانی زبانوں پر عبور حاصل کریں تا کہ وہ مقامی زبان اور مزاج آشنائی سے ماتحت مقامی عملے سے پوری طرح بے نیاز ہوجائیں۔

ہندوستانی زبانوں کی آموزش کے سلسلے میں بہ ہر حال یہ طے کرنا بھی اہم تھا کہ عملی ضرورتوں کے پیش نظر کس کس زبان پر کس قدر توجہ دی جائے؟ مقامی میل جول اور کاروباری معاملات کے حوالے سے بول چال کی زبانیں ہی تفہیم و ترسیل کا ذریعہ ہو سکتی تھیں، مگر فارسی کی سرکاری اور دفتری حیثیت کے سبب ضروری تھا کہ اردو سے زیادہ فارسی میں استعداد و مہارت حاصل کی جائے۔ فارسی کی آموزش کے لیے کمپنی کے ملازمین ہندوستانی منشیوں کے محتاج تھے اور منشی[۲۹] مغربی

زبانوں سے واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے فارسی کی تدریس مقامی زبانوں اور خصوصاً اردو ہی کے ذریعے کرتے تھے۔ اسی سبب یہ لازم قرار دے دیا گیا کہ نو وارد سول ملازم فارسی سیکھنے سے قبل اردو میں کسی قدر شدھ بدھ پیدا کریں تا کہ منشیوں کی باتیں سمجھ سکیں اور اِن سے فارسی کا درس لے سکیں۔ کلاسیکی زبانوں (عربی، فارسی، سنسکرت) سے اردو کی طرف مراجعت کا سبب یہی امر تھا۔

لارڈ ویلزلی نے پہلے مدرسے اور پھر فورٹ ولیم کالج (Fort William College) کے ذریعے کمپنی کے داخلی نظام کو تجربہ کار زبان دان اور تربیت یافتہ افراد تیار کر کے مؤثر اور مفید بنا دیا۔ اس ضمن میں پہلا تجربہ ۱۷۹۹ء میں 'مدرسہ شرقیۂ (Oriental Seminary) کے اجرا کی صورت میں ہوا۔ ویلزلی، گل کرسٹ کی اردو آموزی اور اردو کی تصنیفی و تالیفی صلاحیتوں سے بہ خوبی واقف تھا اسی سبب گل کرسٹ مدرسے کا انچارج مقرر ہوا۔ کمپنی کے جونیئر نویسندوں کی تعلیم و تدریس اسی کے ذمے کی گئی، بلکہ اس تجویزِ تدریس کا آغاز گل کرسٹ ہی کی طرف سے ہوا تھا۔ استعداد کے اعتبار سے گل کرسٹ نے طلبہ کو چار جماعتوں میں منقسم کیا۔ تین جماعتیں اردو زبان کی تدریس کے لیے اور ایک فارسی کی آموزش کے لیے تھی۔ جو طلبہ اردو میں کسی قدر مہارت حاصل کر لیتے انھیں فارسی کی مبادیات پر لگا دیا جاتا تا کہ بعد میں وہ حسبِ ضرورت منشی سے فارسی کا درس لینے کے قابل ہو جائیں۔ مدرسہ چوں کہ درسِ مبادیاتِ زبان تک محدود تھا اور زبانوں کے علاوہ دیگر تدریسی ضروریات کا اہتمام نہیں رکھتا تھا، اسی بنا پر ۱۸۰۰ء میں اسے تحلیل کر دیا گیا۔

ویلزلی کا دوسرا تجربہ ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کی صورت میں تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے لیے لارڈ ویلزلی نے اپنی سفارش میں لکھا:

> ہندوستانی بول چال کی زبان میں (نو وارد رنویسندے) جو مہارت حاصل کریں گے اس کی بہ دولت کمپنی کی ملازمت کے دوران میں اپنے منصب کے تمام فرائض بھی وہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے۔

یہ کالج دراصل مدرسہ شرقیہ کے منصوبے کی جامع تر شکل تھا۔ مدرسہ شرقیہ فقط فارسی اور اردو کی تدریس کا ادارہ تھا۔ جب کہ فورٹ ولیم کالج، سول سروس اکیڈمی کی ابتدائی کاوش کے طور پر تھا جس میں مشرقی زبانوں کی تدریس کے ساتھ ساتھ برِصغیر کی ثقافت اور تمدن سے واقفیت اور انتظامی امور کی تربیت کو بھی شاملِ نصاب کیا گیا تھا تا کہ انگریز محض تجارتی ادارے کے ملازم ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ ہندوستانی تہذیب سے روشناس ہو کر ہندوستان میں برطانوی سامراج کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے بھی اہل ہوں۔ گویا فورٹ ولیم کالج کے مخاطب ہندوستانی نہیں انگریز تھے۔ مگر کچھ عرصے بعد اسے زیادہ تر زبان دانی کا ادارہ بنا دیا گیا۔ ہندوستان میں لارڈ ویلزلی کی موجودگی فورٹ ولیم کالج کے لیے کسی طرح بھی ایک فصیل سے کم نہ تھی مگر ۱۸۰۵ء میں تقرری کی مدت پوری ہونے پر ویلزلی کے انگلستان جاتے ہی یہ فصیل ٹوٹ گئی۔ ۱۸۰۶ء میں لندن میں ہیلی بری کالج (Haileybury College) کے قیام سے فورٹ ولیم کالج کی کارگزاری پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ۱۸۰۷ء میں اس کے اخراجات میں کمی کر دی گئی۔ ۱۸۳۰ء میں اس کی تدریسی حیثیت کو قریباً ختم کر دیا گیا اور یہ فقط 'امتحانی ادارہ' ہو کر رہ گیا۔ ۱۸۵۴ء میں اسے 'بورڈ آف اگزامینرز' (Board Of Examiners) میں پوری طرح ضم کر دیا گیا۔ اسی لیے ۱۸۰۱ء سے ۱۸۳۰ء تک کا دور ہی فورٹ ولیم کالج کا علمی و تدریسی دور تصور کیا جائے گا۔ گل کرسٹ کالج میں اردو کا پہلا پروفیسر تھا جو ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۴ء تک اس کالج سے منسلک رہا۔ گل کرسٹ نے اردو کی بالواسطہ اور بلا واسطہ، دونوں طرح سے خدمت کی۔

فورٹ ولیم کالج سے مستشرقین کی اردو خدمات کا ایک اہم دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ایشیائی زبانوں میں اردو کو بنیادی حیثیت حاصل ہوئی اور مستشرقین کی توجہ مشرقیات اور ایشیائی مطالعات کے حوالے سے اس پر مرتکز ہو گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے تربیتی منصوبوں میں اردو کو خصوصی نمائندگی ملی۔ اردو کی درسی کتب کی خرید و فروخت کا سلسلہ کالج کی چار دیواری سے باہر نکلتے ہی اردو زبان کی شہرت میں اضافہ ہوا جس کا خوش آیند اثر اردو نثر پر بھی ہوا۔ فورٹ ولیم

کالج کے شعبہ ہندوستانی کی سرپرستی میں اردو لغت اور گرامر کی تدوین کیضمن میں مستشرقین کی خدمات بلاشبہ قابلِ ستائش ہیں [۴۱] ۔اس دور میں نہ صرف ہندوستان

بلکہ مغرب میں بھی مشرقی زبانوں، خصوصاً اردو، ہندوستانی کی تفہیم وتدریس میں روز افزوں ترقی ہوئی۔ یورپ میں اردو، ہندوستانی کی خاطر خواہ پذیرائی کا سہرا بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے اشاعتی پروگرام اور نقطۂ نظر کے سر بندھتا ہے۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی طرز پر یورپ میں متعدد سوسائٹیاں قائم کی گئیں، جہاں مشرقی زبانوں کی تدریس کو بہ طورِ خاص نصاب میں شامل کیا گیا۔علاوہ ازیں برطانیہ اور فرانس کی یونی ورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کے شعبوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۱۸۰۵ء میں لارڈ ویلزلی کی تقرری کے خاتمے پر سر جارج بارلو (Sir George Barlow) کو دو سال (۱۸۰۵ء۔۱۸۰۷ء) کے لیے گورنر جنرل کا عہدہ سونپ دیا گیا۔لارڈ ویلزلی کی وضع کردہ تعلیمی پالیسیوں کے تحت مستشرقین کا مربوط و مسلسل علمی و تحقیقی عمل لارڈ بارلو کے عہدِ اقتدار میں بھی جاری رہا [۴۲] ۔۱۸۰۷ء میں جارج بارلو کو مدراس کا گورنر بنا دیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ منٹو (Lord Minto) کو ہندوستان کے برطانوی

مقبوضات کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔منٹو چھ سال (۱۸۰۷ء۔۱۸۱۳ء) تک گورنر رہا۔ بارلو کی طرح لارڈ منٹو نے بھی ریاستی معاملات میں عدمِ مداخلت کا عہد کیا۔

منٹو کا شش سالہ دورِ اقتدار نہ تو کمپنی کی ملکیت میں اضافے کا سبب بنا اور نہ ہی ہندوستانی زبانوں اور مشرقی علوم کی روایت میں کسی اہم موڑ یا کارنامے کا مؤجب۔اس دور میں بھی فورٹ ولیم کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی سرپرستی میں مستشرقین علم و تحقیق کی شمعیں روشن کرتے رہے۔علاوہ ازیں اردو، ہندوستانی زبان وادب کے حوالے سے ایسی تصنیفات وتالیفات بھی سامنے آئیں جو بعض مستشرقین کی انفرادی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔

۱۸۱۳ء میں لارڈ منٹو کی عہدے سے سبک دوشی کے بعد مارکوئیس آف ہیسٹنگز (Marquis Of Hastings) [۴۳]

ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضات کا گورنر جنرل بنا۔ہیسٹنگز برطانوی افواج کا افسرِ اعلیٰ بھی تھا۔۱۸۲۲ء میں لارڈ ہیسٹنگز اپنے منصب سے مستعفی ہو گیا اور یکم جنوری ۱۸۲۳ء کو واپس انگلستان روانہ ہو گیا۔وہ 'عدمِ الحاق' کی پالیسی لے کر ہندوستان آیا تھا [۴۴] ۔۱۸۲۳ء میں 'بورڈ آف کنٹرول' نے لارڈ ایمہرسٹ (Lord Amherst) کو وائسرائے ہند بنا دیا۔

لارڈ ایمہرسٹ کے دورِ اقتدار کی اہم یادگار 'سنسکرت کالج، کلکتہ' ہے جو ۱۸۲۴ء میں معرضِ وجود میں آیا۔علاوہ ازیں ۱۸۲۵ء میں 'دہلی کالج' بھی قیام پذیر ہوا [۴۵] ۔فورٹ ولیم کالج کی طرح دہلی کالج محض زبان دانی کا ادارہ نہیں تھا بلکہ اس کی حیثیت علمی اور سائنسی تھی۔۱۸۲۸ء میں 'برٹش ریزیڈنٹ کمشنر'، سر چارلس مٹکاف (Sir Charles Metcalfe) کی سفارش سے دہلی کالج میں انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا۔ [۴۶]

لارڈ ایمہرسٹ کو پارلیمنٹ نے برما کی فتح کے صلے میں 'ارل' (Earl) بنا دیا گیا۔وہ فروری ۱۸۲۸ء میں واپس انگلستان چلا گیا۔اس کے بعد لارڈ ولیم بینٹنک (Lord William Bentinck) کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ بینٹنک کے دورِ حکومت میں مستشرقین نے اہم علمی و تحقیقی اداروں، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج، کی سرپرستی میں اردو نوازی کا مربوط سلسلہ جاری رکھا۔اس گروہی علمی کاوشوں کے ساتھ مستشرقین ذاتی طور پر بھی مشرقی علوم اور اردو کی آب یاری میں مصروف رہے۔

دہلی کالج کو بلا مبالغہ شمالی ہندوستان میں نشاۃِ ثانیہ کا علم بردار کہا جا سکتا ہے۔اس کالج کے توسط سے پہلی بار اردو کے ذریعے سے مغربی علوم، ریاضی، سائنس، علمِ ہیئت اور فلسفہ وغیرہ کی تدریس کا آغاز کیا گیا۔مارچ ۱۸۳۵ء تک دہلی کالج میں ذریعہ تعلیم اردو تھا [۴۷] ۔کالج سے وابستہ مستشرقین میں تین شخصیات

بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔مسٹر جوزف ایچ ٹیلر (Mr. Joseph H.Taylor)، مسٹر بوترس (Mr. Boutros) اور ڈاکٹر آلوئس سپرینگر (Dr. Aloys Sprenger)۔یہ تینوں شرق شناس مختلف ادوار میں دہلی کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ان صاحبان کی ذاتی توجہ سے مشرقی زبانوں خصوصاً اردو کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان مستشرقین کی سرپرستی میں مقامی علما و اکابرین نے بھی مشرقی علوم کی طرف توجہ کی اور خاص طور پر اردو لغات اور صرف ونحو کے حوالے سے اہم کتابیں تالیف کیں۔

انیسویں صدی کے ربع دوّم میں برطانوی سامراج کے ہندوستان میں استحکام کی بہ دولت برطانوی پالیسی میں اہم

تبدیلی رونما ہوئی۔ اس دور میں آقا اور رعایا کی نسبت اُس باپ بیٹے کی سی ہو گئی جن میں کوئی ذہنی اشتراک یا جذباتی تعلق نہیں ہوتا بلکہ یہ رشتہ اس امر پر قائم ہے کہ بیٹا باپ کو اپنی فلاح کا ذمے دار سمجھتے ہوئے اس کے ہر حکم کو من وعن تسلیم کرے۔ ایلن جے گرین برگر (Allen J. Green Berger)[78] نے ہندوستان میں برطانوی راج کے ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۰ء تک کے دور کو 'اعتماد کا دور' (The Era Of The Confidence) قرار دیا ہے[79]۔لیکن مس رضیہ نور محمد کے مطابق اعتماد کے اس دور کی ابتدا ۱۸۳۰ء سے ہو چکی تھی۔

اس دور میں ہندوستان میں مغربی افراد کے دو گروہ موجود تھے جو مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کے حوالے سے علاحدہ نظریات کے حامل تھے۔ان میں سے ایک گروہ اُن مستشرقین پر مشتمل تھا جنھوں نے ذاتی پسند کی بنا پر مشرقی زبان وادب کو جدید مغربی طریقوں سے روشناس کرانے کے لیے فلالوجی، گرامر اور لغت کی تالیف و تدوین میں دل چسپی کا اظہار کیا۔مستشرقین کا خیال تھا کہ مقامی باشندوں کی تعلیمی ذمے داریاں اپنے سر لینے ہی سے ان کے دلوں کو مسخر کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مقامی افراد کے تعاون کے حصول کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ ان کے ذہنی رجحانات سے آگاہی حاصل کی جائے۔ یہ امر بھی روشن تھا کہ برطانوی سامراج کے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے مقامی باشندوں کے ذہنوں کو'مغربی طرزِ فکر' اسی صورت عطا کیا جا سکتا ہے کہ جب علم کو اُن کے کوچے تک اُن کی من پسند مشرقی کلاسیکی زبانوں اور مقامی بولیوں کے توسط سے لے جایا جائے۔یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں انگریز مستشرقین کی دل چسپی کا مرکز کلاسیکی زبانیں (عربی، فارسی، سنسکرت) تھیں۔ بنگال میں اُنھی زبانوں کے مدارس کی حوصلہ افزائی ہوئی۔اسی طرح اُس دور میں بمبئی میں مقامی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا رواج بھی پروان چڑھا۔دوسرا گروہ اُن افراد پر مبنی تھا جو مقامی باشندوں کو انگریزی زبان کے وسیلے سے براہِ راست مغربی علوم تک لے جانے کے لیے کوشاں تھے۔مؤخرالذکر گروہ 'مغرب پسند' یعنی 'Anglicists' کہلایا۔مختلف نظریات کے حامل ان دونوں گروہوں میں البتہ برطانوی برتری کا احساس ایک نمایاں مشترک رجحان رہا۔ برتری کے اس احساس نے جارحانہ رنگ اختیار کیا۔یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مستشرقین اور مغرب پسند اردو کے حوالے سے جو کام بھی کرتے وہ خود اردو زبان کی آموزش کے لیے نہیں تھا، بلکہ مقامی باشندوں کو درج ذیل دو طرح کے احساس سے بارور کرانے کے لیے تھا:

(۱) غیر ملکی ہونے کے باوجود وہ رعایا کی زبانیں جدید طرز سے پڑھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

(۲) وہ اس ملک میں تہذیبی، شائستگی اور علم دوستی کی روایت قائم کرنے کے لیے آئے ہیں اور یہاں کے لوگوں کو جہالت سے پاک کریں گے۔

۱۸۳۵ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں 'ذریعہ تعلیم' کے مسئلے کی بنا پر ایک انقلاب انگیز سال ہے[80]۔ ۲ فروری ۱۸۳۵ء کو ایک مغرب پسند، تھامس بابنگٹن میکالے (Thomas Babington Macaulay) نے عربی، سنسکرت یا کسی اور زبان (اردو رہندوستانی) کے ذریعے سے تعلیم و تدریس کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی مشہور یادداشت 'Macaulay's Minute' میں مخصوص افراد پر مشتمل ایک ایسی جماعت بنانے کی تجویز پیش کی جو:

> A class of persons, Indian in blood and colour but English in taste, in opinions, in morals and in intellect.[81]

میکالے کی یہ تجویز انگریزی زبان کی اہمیت و ترویج کے توسط سے برطانوی سامراج کے تحفظ کی ضامن تھی اور اُس استعماری ذہنیت کی آئینہ دار بھی جس کے حصول کی خاطر حکومتِ برطانیہ نے نصف صدی کو محیط سازشوں کا ایک طویل اور مربوط جال بُنا۔'Macaulay's Minute On Education' پر ایک یورپی نقاد، ایلمر ایچ کٹس (Elmer.H.Cutts) کا تجزیاتی بیان درج ذیل ہے:

> Thomas Babington Macaulay's Minute On Education, written in 1835 for Lord William Bentinck, Governor General of British India, was the decisive and final piece in a long series of propaganda articles written over a period of more than half a century in the formation of British educational policy in India.

Macaulay's standing in British intellectual and political circles made his advocacy of English-Language education for Indian students enrolled in government supported colleges and universities had sufficient justification for Bentinck's adoption of that program immediately after Macaulay's treatise appeared in print. The Bentinck educational policy, which remained the essential educational policy of the British Raj, called not only for the study of the English Language by Indian students but required that instruction in all courses of study at college level should be given through the medium of the English Language. This meant that all Indian aspirants for college degree must thoroughly learn a foreign language prior to embarking upon a career in higher education .[82]

۷ مارچ ۱۸۳۵ء کا تعلیمی ریزولیوشن، جو لارڈ بینٹنک کے نام سے موسوم ہے، مشرقی علوم کے حق میں سمِ قاتل ثابت ہوا۔ بینٹنک نے میکالے کی تجویز پر رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی سفارش میں لکھا:

The great object of the British Government ought to be the promotion of Europeanliteratureandscienceaimingthenativesof India.[83]

اس سفارش کی منظوری کے سبب ہندوستانی درس گاہوں میں انگریزی زبان وادب کو رواج پا جانے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ میکالے کی خواہشات کے مطابق مقامی باشندوں کو مغربی علوم انگریزی زبان میں سکھائے جانے لگے۔ نئے حالات میں کمپنی کے ملازمین اپنا کام انگریزی سے چلا سکتے تھے۔ ماقبل انگریز ہندوستان کی معاشرت اور فضا سے مانوس ہونے کے لیے مقامی زبانوں کے محتاج تھے اور اب اس کے برعکس مقامی باشندوں کی آنکھیں مغرب کی طرف کھلنے لگی تھیں۔ اب مستشرقین کی جگہ مغرب پسندوں کا دور دورہ تھا کہ جنھیں اپنے ملک کی محبت میں مقامی علوم وزبان سے قطعاً کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اب تعلیم کا بنیادی مقصد حصولِ علم کے بہ جائے حصولِ برائے ملازمت ہو گیا۔ تعلیم کلرک بنانے کی ٹکسال ہوگئی جہاں انگریزی حکومت کے وفادار تیار کیے جانے لگے۔ اس اقدام سے مستشرقین کے اثر و نفوذ کا سلسلہ رکاوٹ کا شکار ہونے سے ان کی سرگرمیاں اپنے ہم عصر انگریزوں کو مقامی زبان سے روشناس کرانے تک محدود رہ گئیں۔

۱۸۳۵ء میں لارڈ بینٹنک اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر انگلستان روانہ ہوا۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۳۶ء تک سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل رہا۔ سر چارلس کی طرف سے کمپنی کی مملکت میں 'آزادیٔ صحافت' کے اعلان نے برطانوی پارلیمنٹ کی شدید مخالفت کا سامنا کیا۔ چناں چہ اسی مخالفت کی بنا پر اسے بہت جلد اپنا عہدہ چھوڑنا پڑا۔

مارچ ۱۸۳۶ء میں لارڈ آک لینڈ (Lord Auckland) نے جب کلکتہ میں حکومتی ذمے داریاں سنبھالیں تو ہندوستان کے تعلیمی نظام میں بے اطمینانی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے 'جنرل کمیٹی تعلیمِ عامہ' کے نام نومبر ۱۸۳۹ء کی یادداشت میں مشرقی تعلیم کے فروغ نیز دیسی زبانوں میں تعلیم کی اجازت کی سفارش کی۔ ۱۸۴۰ء میں تعلیمی کتابوں کے ترجمے اور ابتدائی تدریسی کتب کی تیاری میں لارڈ آک لینڈ کی خصوصی توجہ کی بنا پر تعلیمی کمیٹی نے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے سفارشات ترتیب دیں مگر ان پر مزید عملی اقدام نہ ہو سکا۔

۱۸۴۲ء میں لارڈ آک لینڈ اپنی جارحانہ جنگی پالیسیوں کے سبب انگلستان روانہ ہوا۔ اس کا جان نشین لارڈ ایلن برو (Lord Ellenborough) بنا، جسے امن پالیسی کے خلف کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس کے دوسالہ دورِ اقتدار (۱۸۴۲ء۔۱۸۴۴ء) میں تلوار کبھی نیام میں نہ

رہی [۸۴] ۔لارڈ ایلن برو کے عہد میں بعض علم دوست مستشرق اور مقامی حضرات نے ایک انجمن 'اشاعتِ علوم بہ ذریعۂ السنۂ ملکی' تشکیل دی۔ 'Dehli Vernecular Translation Society' کمیٹی کا انگریزی نام تھا۔[۸۵] اس کے مقاصد میں انگریزی، سنسکرت اور عربی کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا اردو، بنگالی اور ہندی میں ترجمہ کرنا اور دیسی زبانوں کی درسی کتب تیار کرنا شامل تھا۔

بہ قول گریرسن مستشرقین نے ۱۷۴۴ء سے ۱۸۵۳ء تک قریباً دوسو اٹھانوے (۲۹۸) کتب تالیف کیں جن میں اردو یا ہندوستانی زبان کی لغات اور صرف و نحو کی امدادی کتب شامل ہیں [۸۶] ۔اردو زبان میں دست رس کے لیے مستشرقین نے اس دور تک اردو لغات وقواعد کی تالیفات کا ایک عمدہ اور بڑا ذخیرہ جمع کر دیا۔ بعد

ازاں سائنسی طرز پر ڈکشنریاں اور کتبِ قواعد تالیف کی گئیں جو ابتدائی خامیوں سے پاک تھیں۔ان مستشرق مؤلفین میں بعض فورٹ ولیم کالج سے تعلیم یافتہ اور بعض دہلی کالج سے فارغ التحصیل تھے۔بعض نے تحصیلِ علم ہیلی بری کالج سے کیا تھا۔اکثر نے یورپ ہی میں رہ کر اردو زبان وادب کے لیے معیاری اور یادگار کام کیا۔ بعض مؤلفین کمپنی کے ملازمین تھے، جنھوں نے انتظامی اور ملازمتی زندگی میں فرصت کے لمحات میسر آتے ہی اپنے علمی وادبی ذوق کی تسکین کا ساماں کیا۔

۱۸۴۴ء میں سال کے شروع ہی میں لارڈ ایلن بروکو اس کے اقتدار کی مقررہ مدت ختم ہونے سے قبل ہی 'کورٹ آف ڈائریکٹرز' نے اس کے جنگی جنون کی وجہ سے بر طرف کر دیا۔ اس کی جگہ سر ہنری ہارڈنگ (Sir Henry Hardinge) کو چار سال (۱۸۴۴ء۔۱۸۴۸ء) کے لیے ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر بھیج دیا گیا۔[۸۷]

۱۸۴۸ء میں لارڈ ڈلہوزی (Lord Dalhousie) برسرِ اقتدار آیا۔ڈلہوزی نے یہ پالیسی اختیار کی کہ اگر کوئی والیِ ریاست بغیر وارث کے مر جائے تو اُس ریاست پر کمپنی قبضہ کر سکتی ہے۔اس پالیسی کے تحت جھانسی، سَتارا اور ناگ پور کی ریاستوں کو کمپنی نے اپنے تسلط میں کر لیا۔کمپنی کا یہ منصوبہ بھی تھا کہ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بعد بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جائے اور شاہی خاندان سے لال قلعہ خالی کرا لیا جائے۔انیسویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایک سیاسی طاقت بن کر ہندوستان میں 'کمپنی بہادر' بن گئی [۸۸] ۔۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی کی انگلستان روانگی پر لارڈ کیننگ (Lord Canning) نے گورنر جنرل کے اختیارات سنبھال

لیے۔اس دور میں کمپنی کے ملازمین کو مقامی زبانیں سیکھنے کی زیادہ ضرورت نہ رہی تھی، کیوں کہ اب مقامی باشندے اِن سے انگریزی میں بات چیت کر سکتے تھے۔ لیکن اس دور کے مستشرقین نے ذاتی ذوقِ زبان شناسی کے سہارے اپنا کاروبارِ شوق بہ ہر حال جاری رکھا۔۱۸۵۷ء میں ایک مستشرق، ولیم ناسولیس (William Nassau Lees) نے انگریزی زبان کے حوالے سے کمپنی کے درج بالا زعم کی تردید اور السنۂ شرقیہ کی حمایت میں ایک رسالہ لکھا، جس کا عنوان ہے:

'Instructions in the Oriental Languages Considered'

اس رسالے میں لیس نے اپنے بیان کی مدلل وضاحت درج ذیل الفاظ میں پیش کی:

> السنۂ شرقیہ اور خاص کر اردو زبان کی تحصیل ملکی اور قومی خدمات کے لیے نہایت ضروری ہے اور یہ خیال خام ہے کہ انگریزی زبان ہندوستان میں ایسی مقبول ہو جائے گی کہ تھوڑے عرصے میں انگریز السنۂ شرقیہ سے بے نیاز ہو جائیں گے۔[۸۹]

۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں 'جنگِ آزادی' کا تاریخ ساز واقعہ پیش آیا۔انگریز اور یورپی مؤرخ اسے 'غدر' یا 'Mutiny' کہتے ہیں۔کچھ اسے سپاہیوں کی بغاوت قرار دیتے ہیں، مگر اکثر مقامی مؤرخ اسے 'جنگِ آزادی' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔کمپنی کی حکومت نے اس واقعے کو 'غدر' کہا اور جن لوگوں نے اس کے خلاف ہتھیار اُٹھائے، وہ باغی کہلائے۔۱۸۵۷ء کی جنگ نے ہندوستان کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔اس کے بعد ایک طرف تو مغل بادشاہت کا خاتمہ ہوا اور دوسری جانب ملکہ وکٹوریہ کے درج ذیل اعلان کے ساتھ کمپنی کی حکومت بھی اپنے انجام کو پہنچی:

> کمپنی کا راج اب ختم ہوا۔اس کی جگہ حکومتِ ہندوستان کی باگ ہم نے اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔سوائے اُن لوگوں کے جو ہماری انگریزی رعایا کے قتل میں حصہ لینے کے مجرم ہیں، باقی جو لوگ بھی ہتھیار رکھ دیں گے ان سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ہندوستانیوں کی گود لینے کی رسم آئندہ سے جائز سمجھی جائے گی اور گود لیے لڑکے کو باپ کی جائیداد اور گدّی کا مالک مانا جائے گا۔کسی کے مذہبی عقیدوں یا

مذہبی رسم ورواج میں کسی طرح کی مداخلت نہ کی جائے گی۔ ہندوستانی والیانِ ریاست کے ساتھ کمپنی نے اس وقت تک جتنے عہد نامے کیے ہیں ان کی سب شرطوں پر آئندہ ایمان داری کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے گا۔اس کے بعد کسی ہندوستانی رئیس کی ریاست یا اس کا کوئی حق نہ چھینا جائے گا۔[90]

اس کے بعد سے ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ایک برطانوی ہندوستان اور دوسرا ریاستوں کا ہندوستان۔ یہ ریاستیں اپنے اندرونی معاملات میں آزاد تھیں۔البتہ جانشینی کے معاملات میں انگریز ریذیڈنٹ کو دخل حاصل تھا۔۱۸۵۸ء میں فوج کی تشکیلِ نو کی گئی تاکہ دوبارہ سے بغاوت کے امکانات کو ختم کیا جا سکے[91]۔۱۸۵۸ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان پر تاجِ برطانیہ کی حکومت رہی جو برِ صغیر کی آزادی اور تقسیم کے بعد ختم ہوئی۔اس عرصے میں قریباً بائیس (۲۲)

وائسرائے ہندوستان بھیجے گئے۔ برِ صغیر پاک وہند کی تقسیم کا تاریخی فیصلہ ۱۹۴۷ئمیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mountbatten) کے دورِ اقتدار میں ہوا۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریز مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں پر زیادہ مہربان ہو گئے، جس کے سبب مستشرقین ہندوؤں کی معاشرتی زندگی اور زبانوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔البتہ کچھ سیاسی، سماجی اور تعلیمی اسباب کی بنا پر شمال مغربی ہند میں اردو زبان وادب پر خصوصی توجہ ہوئی۔دہلی میں دیگر مقبوضات کی نسبت تعلیمی اور ادبی تحاریک بہت جلد نمودار ہوئیں۔صوبہ پنجاب میں اردو زبان و ادب کی خدمات میں جن مستشرقین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں ،میجر اے آر فلر (A.R.Fuller)، کپتان ہالرائیڈ(Captain Holroyd)

اورڈاکٹر لائٹنر (Dr. Leitner) کوخصوصیت حاصل ہے۔انجمنِ پنجاب کی تاسیس(۱۸۶۵ء) میں ڈاکٹر لائٹنر اورسرڈانلڈ میکلوڈ (Donald Macload) کی خدمات تعارف کی محتاج نہیں۔ان مستشرقین نے پنجاب میں ادبی سرگرمیوں کومہمیز کرنے کے لیے مقامی مصنفین کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کے اشتراک سے متعدد کتب بھی لکھیں۔لسانیات کی تحریک کو خاص طور پر ان مستشرقین کی علمی کاوشوں سے بڑا فائدہ پہنچا۔انجمنِ پنجاب نے سائنسی موضوعات پر اردو میں لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا۔مشرقی علوم کی تدریس اوراحیا کے ساتھ ساتھ انجمنِ پنجاب جدید مغربی علوم کو مقامی زبانوں میں پڑھائے جانے کی شدید حامی تھی۔انجمن کی رائے میں اردو اور ہندی کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک کہ عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کو اہمیت حاصل نہ ہو۔

۱۸۶۵ء میں لائٹنر نے ایک اردو یونی ورسٹی کے قیام کا خاکہ اس نصب العین کے تحت تیار کیا تھا کہ اردو زبان وادب کو فروغ دینے اور اردو زبان میں ایک جدید ادب کو وجود میں لانے کے لیے اہم تدابیر اختیار کی جائیں۔۱۸۶۹ء میں پنجاب یونی ورسٹی کی بنیاد رکھی گئی تو اس میں مشرقی زبانوں کی تدریس کے لیے مخصوص شعبے قایم کیے گئے۔حتی الامکان کوشش کی گئی کہ پنجاب کی دیسی زبانوں کے توسط سے یورپی

علوم وفنون کی اشاعت کی جائے اور دیسی ادبیات کو وسعت وترقی دی جائے۔ یونی ورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اردو تجویز ہوا، جو بعدازاں قائم نہ رہ سکا۔ پنجاب عدلیہ کے فیصلے اور قانونی اخبار، ’’ گنج شائگاں‘‘ طویل عرصے تک اردو میں شائع ہوتے رہے۔علاوہ ازیں پنجاب گزٹ اور سول لسٹ بھی بہ یک وقت اردو اور انگریزی میں اشاعت پذیر ہوتے رہے۔

مستشرقین کے علاوہ مشنریوں نے بھی اس دور میں اردو زبان کی وسعت اور ترقی میں خاطر خواہ حصہ لیا۔اردو زبان پر ان کی عنایات اگرچہ مخصوص مقاصد کے تحت ہوئیں مگر پھر بھی ان کے توسط سے مختلف مذہبی کتابوں، رسائل اوراخبارات کی اشاعت نے اردو زبان وادب کے ارتقائی سفر میں اہم کردار ادا کیا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان مکمل طور پر تاجِ برطانیہ کے زیرِ اقتدار تھا۔البتہ اس صدی کے ربع اول کے بعد ہندوستان میں سیاسی بے داری کے آثار رونما ہوئے جس کی وجہ سے حکم رانوں کی توجہ ادبی اور تہذیبی معاملات سے ہٹ کر سلطنت کے استحکام کی طرف مبذول ہوئی۔توجہ کی اس تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ مشرقی زبانوں خصوصاً اردو کے حوالے سے اربابِ اختیار کا اندازِ نظر بدل گیا۔البتہ مستشرقین نے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کا سلسلہ سابقہ طرز سے جاری رکھا۔صدی کے آغاز ہی سے انگریزی زبان کو سرکاری سر پرستی کی بنا پر بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔صوبائی گزٹ اردو کے بہ جائے انگریزی میں لکھے جانے لگے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ عدالتوں میں بھی انگریزی زبان کا دور دورہ ہوا جس کی وجہ سے نظامِ تعلیم بھی ردّ و بدل سے دوچار ہوا۔کئی یونی ورسٹیاں وجود میں آئیں۔۱۹۱۷ء میں ’سیڈلر کمشن‘(Sadler Commission) نے یونی ورسٹیوں کو’امتحانی‘ کے بہ جائے ’تدریسی‘ ادارے بنا دیا۔اس کے تحت ڈھاکہ اور علی گڑھ کی یونی ورسٹیاں وجود میں آئیں۔۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت یونی ورسٹیاں حکومتی تحویل سے آزاد ہو گئیں۔حکومتی عمل دخل فقط سکولوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔جس کی وجہ سے سکولوں کے اوپری درجوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان کو بنایا گیا، جب کے ثانوی درجوں میں اردو کے قدم جمے رہے۔لیکن یہ صورتِ حال مشرقی زبانوں اور اردو

کے لیے زیادہ خوش آئند نہ تھی۔ حاکمیت کے غرور نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین مغائرت کی دیوار کھڑی کر دی۔ جو انگریز فوجی انتظامی ضرورت کے تحت مقامی زبانیں سیکھنے کے خواہش مند ہوتے، اُن کے لیے رومن رسم الخط تجویز کیا جاتا۔ اس طرح دیسی زبانیں سیکھتے ہوئے بھی حاکم محکوم کے ذہنی فاصلے برقرار رکھے گئے۔ اُس دور میں مستشرقین کی اردو کی طرف کم توجہ درج ذیل دو وجوہ کی بنا پر ہوئی:

(۱) انیسویں صدی میں سرزمینِ ہند پر مکمل حاکمیت حاصل کرنے کے بعد تاجِ برطانیہ کی توجہ وسط ایشیائی ممالک کی طرف منتقل ہو گئی۔ یورپی افواج کو ان علاقوں میں اثر و نفوذ کے لیے وہاں کی زبانوں سے واقفیت ضروری تھی۔ مستشرقین کی توجہ بھی عربی، فارسی اور ترکی زبان کی طرف مبذول ہونے سے اردو کی حیثیت ان کے نزدیک ضمنی ہو گئی۔ اسی سبب بیسویں صدی میں ایشیائی زبانوں کے مطالعے سے اردو کی نسبت ان زبانوں میں کثرت سے کتابیں تالیف ہوئیں۔

(۲) ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں میں انگریزوں کی زیادہ دل چسپی کے سبب سنسکرت اور دیگر دیسی زبانوں کی اہمیت مستشرقین کے نزدیک بڑھ گئی اور 'اردو' مسلمانوں کی زبان ہونے کی حیثیت سے اُس توجہ کے اہل نہ سمجھی گئی جو اُسے پہلے حاصل تھی۔ انگریزوں کی اس سیاسی اور لسانی پالیسی نے اُس زمانے میں 'ہندی اردو تنازع' کو خوب ہوا دی۔

چناں چہ لسانی مطالعے کی وہ تحریک جس کا آغاز اردو زبان کے ماضی کی بازیافت کے حوالے سے عہدِ گل کرسٹ سے ہوا، جب اُس دور میں جارج ابراہام گریرسن (George Abraham Grierson) کے دائرہ کار میں داخل ہوئی تو زبانوں کا مطالعہ لسانی رشتوں کو ٹٹولتا ہوا سنسکرت اور پراکرتوں کی حدوں سے اس طرح جا ٹکرایا کہ 'Linguistic Survey of India' میں علاقائی زبانوں کے مطالعے کی نسبت اردو فقط ایک جلد ہی میں سمٹ سکی اور اس طرح اردو کے لسانی مطالعے کی توانا روایت پورے ایشیا کی لسانی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئی۔

مستشرقین کی اردو نوازی کا علمی و تحقیقی سلسلہ ۱۴۹۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء تک ایک خاص سمت میں جاری رہا۔ اس دوران میں کئی مد و جزر آئے۔ پانچ سو سال کی مدت میں سرزمینِ ہندوستان یورپی اقوام کی توجہ اور عنایات کے سبب جن سیاسی، تہذیبی، لسانی اور معاشی حالات سے دوچار رہی، اُن کا اجمالی جائزہ بیان کرنے کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ اردو زبان کی صورت گری کے ارتقائی مراحل اور مخصوص مقاصد کے تحت اردو زبان سے مستشرقین کی شعوری و غیر شعوری دل چسپی کا مطالعہ کیا جا سکے۔ اردو زبان پر ان کی عنایات کو فقط ادب دوستی اور علم پروری کے تحت نہیں پرکھا جا سکتا۔ یورپی ممالک میں اردو زبان و ادب کا باقاعدہ مطالعہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے، البتہ اُن کا ذکر مقالے کی حد میں شامل نہیں۔

اردو کی لسانی تاریخ، لغات نگاری، قواعد نویسی اور درسی کتب کی تدوین میں جو معیار مستشرق اکابرین نے قائم کیا وہ آج بھی قابلِ تحسین ہے اور نئے محققین کے لیے سنگِ میل بھی۔ زیرِ نظر باب کے آئندہ صفحات میں ۱۵۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک مستشرقین کی اردو لغات، قواعد اور لسانی مباحث پر مبنی تالیفات کو علاحدہ علاحدہ عنوانات کے تحت مفصل بیان کیا گیا ہے۔

باب سِوُم ۔ اردو میں مستشرقین کی لسانی تحقیقات (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)
فصل دُوُم

اردو کے مستشرق لغات نویس

زبان کے ارتقا، ثروت مندی اور یہاں تک کہ زندگی کا انحصار اس کے ذخیرۂ الفاظ کی وسعت، تنوع اور ہمہ گیری پر ہوتا ہے۔ اس ذخیرۂ الفاظ کو سائنسی بنیادوں پر خاص منطقی ترتیب سے منضبط کرنے کا نام 'لغت نویسی' (Lexicography) ہے۔ لغت نویسی کا علم زبان کی حفاظت، اس کے استعمال کی حدود کا تعین اور فصاحت کے معیار کو طے کرنے میں حد درجہ معاون ہوتا ہے۔ سامی لفظ 'لغت' دراصل یونانی لفظ 'لوگس' (Logas) کا ہم معنی ہے۔ عربی میں لفظ 'لغت' اصوات و کلمات یعنی آوازوں اور بولوں، دونوں کے لیے مستعمل ہے اور مخصوص معنوں میں فرہنگ (فارسی)، ڈکشنری [۹۲] (انگریزی) یا کوش (سنسکرت) کا متبادل ہے [۹۳] ۔

لغت میں الفاظ کا صحیح املا، تلفظ، مآخذ، مادہ یا اشتقاق، حقیقی اور اصطلاحی معنی، الفاظ میں تغیر و تبدل کی نوعیت، مفاہیم، تشریح، معنوی پہلو، متروکات کی کیفیت، رواجی شکل اور محلِ استعمال کے حوالے سے معلومات یک جا کی جاتی ہیں۔

اردو زبان کے اوّلین لغات مرتّب کرنے کا سہرا بلا شبہ مستشرقین (Orientalists) کے سر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سولھویں صدی کے اوائل میں یورپی اقوام اور بالخصوص انگریز قوم، سیاحوں، مذہبی مبلغوں، تاجروں اور سیاست کاروں کے روپ میں ہندوستان وارد ہوئی۔ یہاں کے داخلی انتشار اور حکمران طبقے کی بے راہ روی نے انھیں تختِ شہی پر قبضے کا سنہری موقع فراہم کیا جس سے وہ قطعاً نہ چوکے۔ حکومت کرنے اور دیگر سرگرمیوں کی فعالیت کی غرض سے انھیں ایک ایسی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہو، جو ملک کی 'رابطے کی زبان' (Lingua Franca) ہو۔ تاجروں اور سیاسی مصلحت شناسوں کے علاوہ عیسائی مشنریوں کو بھی تبلیغی مقاصد کے لیے بہ ظاہر اور حقیقی معنوں میں غیر ملکی عیسائی آقاؤں کے تسلط کی راہ ہموار کرنے کے لیے بنیادی دیسی زبان سیکھنا ناگزیر تھا۔ اس مقصد کے لیے ان کی نظرِ انتخاب اردو/ ہندی پر پڑی جس سے ذولسانی لغات (Bilingual)، تثلیث اللغات (Trilingual) اور بسا اوقات چہار لسانی لغات (Quadrilingual) کی تالیف کا علمی و تحقیقی سلسلہ چل نکلا۔ علمی و تبلیغی سرگرمیوں کے پس منظر میں مستشرقین کے مقاصد کسی بھی نوعیت کے ہوں مگر ان کے ثمرات ادبیاتِ اردو کی آب یاری اور ترقی کی صورت میں سامنے آئے۔

اردو کے مستشرق لغات نویس اور ان کی تالیفات کا سنین وار ذکر اس طرح سے ہے:-

جروم زاویر (Jerome Xavier):[۹۴]

جارج ابراہام گریرسن (George Abraham Grierson) نے 'جائزہ لسانیاتِ ہند' میں اردو/ ہندوستانی قواعد و لغات کا جائزہ لیتے ہوئے سورت (گجرات) کے انگریزی کارخانے میں ۱۶۳۰ء میں تالیف کیے جانے والے چہار لسانی لغت (فارسی، ہندوستانی، انگریزی، پرتگالی) کو اردو کا پہلا لغت قرار دیا ہے۔ زمانہ ماضی قریب تک قریباً سبھی لسانی محقق گریرسن کی اس تحقیق سے متفق تھے۔ لیکن حالیہ تحقیق کی رو سے ایک ایسے قدیم لغت کا سراغ ملا ہے جو اب تک محفوظ ہے ۔ اس نادرو مقدم لغت کی دریافت کا سہرا

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ایک مستشرق شاگرد کے سر بندھتا ہے۔ نذیر آزاد اپنے تحقیقی مقالے 'اردو لغت نگاری: مستشرقین کا حصّہ' میں مزید بیان کرتے ہیں کہ یہ لغت ۱۵۹۹ء کی تالیف ہے[۹۵]۔ جب کہ ابواللیث صدیقی اسے ۱۵۹۹ء سے قبل کی تالیف بتاتے ہیں[۹۶]۔ اس کا مؤلف ایک ہسپانوی مستشرق، جروم زاویر

(۱۵۴۹ء۔۱۶۱۷ء) ہے۔ جو کہ مغلیہ فرماں روا اکبر کے زمانے کا ایک عیسائی مشنری تھا اور جہاں گیر کے دربار میں بھی حاضر ہوا تھا۔ زیادہ عرصہ یہ آگرہ میں مقیم رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی زندگی کے آخری چند سال گوا میں گزارے اور اسی شہر میں انتقال کیا۔ لغت کا عنوان ہے:

'Vocabularium Portugalico_Hindustano Persicum'

اس لغت کا ایک قلمی نسخہ لندن کے کنگز کالج کے کتب خانے میں ہے۔ اس کی مائیکرو فلم ڈاکٹر جان جوزف (Dr.John Joseph) نے حاصل کی تا کہ تالیف و تدوین کے بعد اس کی اشاعت عمل میں لائی جائے[۹۷]۔ یہ لغت پرتگالی، ہندوستانی (اردو) اور فارسی میں ہونے کی بنا پر اردو کا قدیم سہ لسانی لغت ہوگا۔

مسٹر کورچ (Mr.Quaritch):

ڈاکٹر عطش درّانی[۹۸] اور مس رضیہ نور محمد[۹۹]، گریرسن کی تحقیق کے حوالے سے 'کورچ کے' نامی شخص کو ۱۶۳۰ء میں تالیف ہونے والے لغت کا مؤلف بتاتے ہیں جو کہ درست نہیں۔ گریرسن کی فراہم کردہ تفصیلات کے مطابق اردو کے ایک قدیم، چہار لسانی لغت کا ذکر ایک پرتگالی مستشرق، مسٹر کورچ نے 'Oriental Catalogue' مرتبہ ۱۸۸۷ء میں کیا ہے۔ کورچ کے مطابق یہ لغت دراصل ایک قلمی نسخہ تھا جس کی تالیف سورت کے ایک انگریزی کارخانے میں ۱۶۳۰ء میں ہوئی[۱۰۰]۔

یہ نسخہ فارسی، ہندوستانی، انگریزی، اور پرتگالی الفاظ کے لغات پر مشتمل تھا۔ ہندوستانی الفاظ رومن اور گجراتی رسم الخط میں جب کہ فارسی الفاظ اپنے اصل رسم الخط اور رومن حروف میں درج تھے[۱۰۱]۔ مؤلف کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔ گریرسن کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ نادر نسخہ حاصل کرنا چاہا مگر انھیں اِس کا کہیں سراغ نہ مل سکا[۱۰۲]۔

فرانسسکو ماریا دتُور (Francisco Maria De Tours):

سورت کے مقام پر ۱۷۰۴ء میں تالیف ہونے والے، قریباً ایک ہزار (۱۰۰۰) صفحات پر مشتمل، اردو کے چہار لسانی (لاطینی، فرانسیسی، اردو، ہندی) قدیم لغت 'Lexicon Linguae Indostanicae' کا ذکر کم و بیش سبھی محققین نے اپنی تالیفات میں کیا ہے۔ لغت کو دو افراد سے منسوب کرنے کی بنا پر محققین کے ہاں مؤلف کے حوالے سے اختلافی صورت سامنے آئی ہے۔ اطالوی پادری، کاسیانو بیلی گاتی کے رسالے 'الفابیٹم براہمانیکم' میں بھی اِس لغت کا ذکر موجود تھا۔ رسالے کا دیباچہ امادوزی (۱۷۴۰ء۔۱۷۹۲ء) نے تحریر کیا تھا جس میں ایک کیپوچن (Capuchin) عقیدے کے راہب، فرانسسکس تُورونینسس (Franciscus Turonensis) کو اس قدیم لغت کا مؤلف قرار دیا ہے جو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اِس لغت کی اصلیت اور مؤلف کی بابت آغا افتخار حسین نے اپنی تالیف 'یورپ میں تحقیقی مطالعے' کے مضمون 'اردو کی بابت فرانسیسیوں کی چند تحریریں' میں آنکتیل دوپروں (۱۷۳۱ء۔۱۸۰۵ء) کے بیان کے حوالے سے بڑی محنت اور وضاحت کے ساتھ تحقیق پیش کی ہے[۱۰۳] جس کا خلاصہ اس طرح سے ہے:

۱۶۸۰ء میں لغت کا مؤلف، فرانسسکو ماریا دتُور (سنہ وفات۔۱۷۰۹ء) پانڈی چری (Pondicherry) کے مشنری کتب خانے میں ملازم تھا۔ غالباً اسی زمانے میں اُس نے اس لغت کی تالیف کا آغاز کیا۔ ۱۷۰۳ء میں فرانسسکو نے پاپائے روم سے لغت کی اشاعت کے لیے درخواست کی جو منظور نہ ہوئی۔ ۱۷۰۴ء

میں فرانسسکو نے مسوّدہ نشر واشاعت کے کتب خانے میں جمع کرادیا۔ ۱۷۵۸ء میں سورت کے مقام پر انکتیل دوپروں (Anquetil Du Perron) نے مسوّدہ ایک عیسائی مشنری کے پاس دیکھا۔ نقل کرنا چاہا مگر بعض مصروفیات اور علالت کی بنا پر ایسا نہ کرسکا۔ ۱۷۷۸ء میں امادوزی کا دیباچہ مشمولہ 'الفابیٹم براہمانیکم' دوپروں کی نظر سے گزرا جس سے معلومات حاصل ہوئیں کہ روم کے صیغہ تبلیغ واشاعت کے کتب خانے میں قدیم ہندوستانی لغت، مرتبہ ۱۷۰۴ء بہ مقام سورت، کا مسوّدہ موجود ہے۔ گویا یہ وہی نسخہ تھا جسے وہ ۱۷۵۸ء میں دیکھ چکا تھا۔ ۱۷۸۳۔۱۳ء میں پاپائے روم کے مہر وتعاون سے اس نے وہ مسوّدہ حاصل کرلیا۔ پورے مسوّدے موسومہ 'ہندوستانی زبانوں کا خزانہ' (Thesaurus Linguae Indianae) کو انکتیل دوپروں نے تین بار اس احتیاط سے نقل کیا کہ ایک نقطے کا فرق بھی باقی نہ رہے۔ اس نے اپنے لغت کی بنیاد اِسی مسوّدے کو قرار دیا تھا۔ انکتیل دوپروں نے اپنی طرف سے اس مسوّدے میں درج ذیل چند اضافے بھی کیے:

(۱) قوسین میں چند الفاظ کا اضافہ لاطینی رسم الخط میں کیا۔

(۲) چند ایسے الفاظ درج کیے جو اس کے خیال میں صحیح طور پر ترجمہ نہیں کیے گئے تھے۔

انکتیل دوپروں لاطینی، فرانسیسی، مور (Moor) اور فارسی زبانوں کا لغت ترتیب دینے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ۱۷۸۹ء میں انقلابِ فرانس کی وجہ سے اور بعد کے ہنگامی حالات نے اسے اِس کام کی مہلت نہ دی اور یوں اُس کے ارادے کی تکمیل نہ ہوسکی۔

آغا افتخار حسین کی بہم کردہ ان معلومات کی سندی اہمیت اس طرح سے ہے کہ آغا صاحب نے اپنے دورۂ فرانس ۱۹۶۳ء میں پیرس کے مشہور کتب خانے 'ببلیو تک ناسیونال دفرانس' (Bibliotheque Nationale De France) میں اردو کے مذکورہ قدیم لغت کا مسوّدہ، مخطوطہ نمبر ۸۳۹، دیکھا، پرکھا اور اس کے ذکر کو حوالہ قلم کیا۔

ڈیوڈمل (David Mill):

'Mill's Dissertationes Selectae' کے عنوان سے ڈیوڈمل (۱۶۹۲ء۔ ۱۷۵۶ء) کے مضامین کا مجموعہ پہلی بار ۱۷۲۴ء میں لائڈن (Leiden) سے منظرِ عام پر آیا[۱۰۴]۔ اس تالیف کا پورا نام ہے:

'Davidis Millii Theologiae D. ejusdemque, nec non

Antiquitatum sacrarum, & Linguarum orientalium in

Academia Trajectina, Professoris ordinarii, Dissertationes

selectae, varia s. Litterarum et Antiquitatis orientalis

Capita exponentes et illustrantes. Curis secundis,

novisque Dissertationibus, Orationibus, et Miscellaneis

Orientalibus auctae. Lugdni Batavorum'[105]

دوسری بار یہ تالیف ۱۷۴۳ء میں لائڈن ہی سے طبع ہوئی۔ دوسرے اڈیشن کا ایک حصہ متفرق مشرقی مباحث (Miscellanea Orientalia) کا بھی ہے جو دراصل کیٹیلر کی صرف ونحو اور لغت پر مشتمل ہے۔ کتاب لاطینی زبان میں ہے۔ ہندوستانی الفاظ کا املا ولندیزی طریقۂ تلفظ کے مطابق ہے اور انھیں لکھنے کے لیے فارسی وعربی حروف کے استعمال کی تصریح کی گئی ہے۔ ابتدا میں کتاب کا کچھ حصہ اردو ہندوستانی زبان پر مباحث سے متعلق ہے۔ چند صفحات لاطینی، ہندوستانی اور فارسی لغت پر مبنی ہیں اور اس کے بعد عربی، فارسی اور ہندوستانی الفاظ کو مقابلتاً دکھایا گیا ہے۔

جان جوشوا کیٹیلر (Joan Josua Ketelaar):[۱۰۶]

ڈچ مستشرق جان جوشوا کیٹیلر (۱۶۵۹ء۔۱۷۱۸ء) کواردو رہندوستانی زبان کے پہلے قواعد نویس ہونے کا اعزاز حاصل ہے[۱۰۷] کیٹیلر نے ہندوستانی

زبان کے قواعد ولغت بہ زبانِ ڈچ مرتب کیے تھے۔ کتاب کا عنوان طویل ہے جسے کتاب کے تفصیلی ذکر کے ساتھ قواعد کی ذیل میں درج کیا جائے گا۔ البتہ سہولت کے پیشِ نظر محققین کے ہاں اس کتاب کا ذکر 'Lingua Hindostanica' کے عنوان سے ملتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعتِ اوّل ۱۷۴۳ء میں لائڈن سے ڈیوڈ مل (David Mill) کے ہاتھوں ہوئی۔ ڈیوڈ مل نے اپنی کتاب کی اشاعتِ دوّم کے ایک حصے، بہ عنوان 'Miscellanea Orientalia' میں کیٹیلر کی کتاب کے متن کو ضم کر لیا تھا۔ کیٹیلر کی تالیف کا تفصیلی ذکر قواعد نویسی کی ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

بنجمن شُلزے (Benjamin Schultze):

کیٹیلر کی کتاب کے دوسال بعد جرمن مستشرق اور عیسائی مبلغ، بنجمن شُلزے (۱۶۸۹ء۔۱۷۶۰ء) کی اردو رہندوستانی گرامر بہ عنوان 'Grammatica Hindostanica' ۱۷۴۵ء میں منظرِ عام پر آئی[۱۰۸]۔ شُلزے کا رسالہ لاطینی زبان میں ہے۔ اس میں ہندوستانی راردو الفاظ اردو رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔ الفاظ کا تلفظ لاطینی زبان میں درج کرنے کے ساتھ ساتھ دیوناگری میں بھی ان کی وضاحت کر دی گئی ہے[۱۰۹]۔ علاوہ ازیں اس کتاب کا ایک مختصر حصہ لغت پر بھی مبنی ہے۔ قواعد نویسی کی ذیل میں اس کتاب کا نسبتاً تفصیلی ذکر ملاحظہ کیجیے۔

جوہان فریڈرک فرٹز (Johann Friederich Fritz):

جرمنی کے مقام، لائی پزگ (L e i p z i g) سے ۱۷۴۸ء میں ایک کتاب شائع ہوئی جس کا مؤلف ایک جرمن مستشرق، جان فریڈرک فرٹز ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے:

'Orientalisch_und Occidentalischer Sprachmeister, weleher nicht allein
hundert Alphabete nebst ihrer Aussprache, So bey denen meisten
Europaisch-Asiatisch-Alfricanisch-und Americanischen Volchern und Nationen
gebrauchlich sind, Auch einigen Tabulis polyglottis verschiedener Sprachen
und Zahlen vor Augen Leget, Sondern auch das Gebet des Herrn, in 200
sprachen und Mund-Arten mit dererselben Characteren und Lesung, nach
einer Geographischen Ordnung mittheilet. Aus glaubwiirdigen Auctoribus
Zusammen getragen, und mit darzu nothigen Kupfern verseken'[110]

کتاب کا دیباچہ بنجمن شُلزے نے لکھا ہے۔ مندرجات کے اعتبار سے یہ کتاب عجیب مجموعہ ہے۔ اس میں ایک سو (۱۰۰) سے زائد مختلف زبانوں کے حروف تہجی درج ہیں۔ کچھ صفحات ہندوستانی ابجد اور فارسی حروف کے استعمال سے متعلق معلومات پر مبنی ہیں۔ ہندوستانی اعداد ایک سے نو اور پھر دس، بیس، تیس وغیرہ نوے تک مع تلفظ درج ہیں۔ علاوہ ازیں عیسیٰ کی ایک دعا کا ہندوستانی ترجمہ تلفظ کے ساتھ دیا گیا ہے۔

کاسیانو بیلی گاتی (Cassiano Beligatti):

۱۷۷۱ء میں حروفِ تہجی پر ایک رسالہ 'برہمنی ابجد' کے نام سے شائع ہوا۔ گیارہ اسباق پر مشتمل یہ رسالہ لاطینی زبان میں ہے۔ رسالے پر یہ عنوان درج ہے:

'Alphabetum Brammhanicum Sev Indostanum'

حامد حسن قادری[111] اور گریرسن[112] کے مطابق اس رسالے کا مؤلف ایک اطالوی پادری، کاسیانو بیلی گاتی (۱۷۰۸ء-۱۷۹۱ء) ہے۔ رسالے کا دیباچہ اطالوی محقق، امادوزی (Amaduzzi) نے لکھا ہے۔

' امادوزی (۱۷۴۰ء-۱۷۹۲ء) کا پورا نام، 'Giovanni Cristofano Amadduzi' ہے۔ دیباچہ، ہندوستانی زبانوں کے حوالے سے جامع معلومات پر مبنی ہے جن کے تحت سنسکرت کو خواص کی زبان جب کہ 'Bhaka Boli' کو عوام کی زبان قرار دیا گیا ہے۔ آغا افتخار حسین کے مطابق دیباچے میں فرانسیسی مستشرق، فرانسسکو ماریا ڈُور کے اس لغت کا بیان بھی ہے جسے ۱۷۰۴ء میں روم کے تبلیغی کتب خانے میں داخل کیا گیا تھا۔ گریرسن کے مطابق یہ رسالہ مجموعی طور پر اپنے دور کا ایک اہم اور معیاری کام ہے۔[113]

بیلی گاتی کے رسالے کو اس حوالے سے تقدم حاصل ہے کہ اِس میں پہلی بار ہندوستان کی وسیع پیمانے پر بولی اور سمجھی جانے والی رابطے کی زبان (ہندوستانی) کے الفاظ کو ناگری رسم الخط میں درج کیا گیا ہے۔ دیوناگری حروف کو نہ صرف ٹائپ میں لکھا گیا ہے بلکہ 'کائتھی' (Kaithi) حروف کو بھی ٹائپ میں درج کیا گیا ہے۔ گویا پہلی بار دیوناگری رسم الخط اور ہندوستانی صوتیات پر جامع بحث اِس رسالے میں ملتی ہے۔[114]

جارج ہیڈلے (George Hadley):

۱۷۷۲ء میں برطانوی مستشرق، جارج ہیڈلے کی تالیف 'صرف ونحو مع فرہنگ انگریزی ومُور' (مُور یعنی اردو/ہندوستانی) لندن سے شائع ہوئی[115]۔ یہ چوں کہ بنیادی طور پر قواعد کی کتاب ہے اسی سبب اس کا نسبتاً تفصیلی ذکر قواعد کی ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔ لغت نویسی کی ذیل میں اس کتاب کا ذکر اس کے ایک حصے کا لغات پر مشتمل ہونے کی بنا پر ہے۔

جے فرگوسن (J.Fergusson):

۱۷۷۳ء میں برطانوی مستشرق، جے فرگوسن کی تالیف کا ذکر ملتا ہے جو لندن سے شائع ہوئی۔ اس کا عنوان ہے:

'A short Dictionary of the Hindustani Language'

یہ اپنی نوعیت کا پہلا لغت ہے۔ فرگوسن کا لغت مندرجات کے لحاظ سے دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ فقط انگریزی زبان اور دوسرا ہندوستانی و انگریزی[116] کے لیے مخصوص ہے۔ اردو کے الفاظ رومن حروف میں درج ہیں۔ ان دو حصوں کے علاوہ اس کتاب میں ہندوستانی زبان کے قواعد پر بھی ایک مقالہ موجود ہے۔

مارتینو ڈمیلو کاسترو (Martino De Meloe Castro):

لغات کی ذیل میں ۱۷۸۱ء میں لکھی جانے والی ایک اور اہم کتاب کا سراغ ملتا ہے جس کا مؤلف، مارتینو ڈمیلو کاسترو ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق مارتینو کی تالیف ' الفا بیٹا انڈیکا ' (Alphabeta Indica) ہندوستان کی مختلف زبانوں کے حروفِ تہجی پر لکھی گئی ہے اور اس میں دیگر زبانوں کے علاوہ ہندوستانی زبان بھی شامل ہے۔[117]

اوبِرس ایبل (Iwarus Abel):

۱۷۸۲ء میں ایک فرہنگ کوپن ہیگن (Copenhagen)، ڈنمارک سے شائع ہوئی۔ اس فرہنگ کا طویل عنوان ہے:

"Symphona Symphona, sive undecim Linguarum
Orientalium Discors exhibita Concordia Tamulicae videlicet, Granthamicae,
Telugicae, Sanserutamicae, Marathicae, Balabandicae, Canaricae,
Hindostanicae, Cuncanicae, Gutzaratticae, et Peguanicae non
characteristicae, quibus ut explicativo-Harmonica adjecta est Latine"[118]

اس فرہنگ کے مؤلف، اویرس ایبل کا تعلق بھی ڈنمارک سے تھا۔ فرہنگ ترپن (۵۳) الفاظ پر مبنی ہے جن کے معانی گیارہ (۱۱) مختلف زبانوں میں دیے گئے ہیں۔

اوساں (Aussant):

فرانسیسی مستشرق، اوساں کی تالیف 'فرانسیسی اردو ڈکشنری' ۱۷۸۴ء میں منظر عام پر آئی۔ لغت کے شروع میں درج نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اوساں بنگال کے شاہی مترجم تھے۔ اردو زبان سے اوساں کی حد درجہ دلچسپی اور سیکھنے کے شوق کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۷۸۲ء میں ایک کتاب بہ عنوان 'کتاب آموز المنشی' خاص طور پر اوساں کی آموزشِ اردو کے لیے لکھی گئی تھی۔ فارسی اور اردو زبان سکھانے کے لیے قواعد، الفاظ، محاورے اور متعدد کہانیاں اس کتاب میں موجود تھیں۔ بہ قول آغا افتخار حسین، اوساں نے اردو زبان سیکھنے میں اس قدر محنت اور شوق کا ثبوت دیا کہ محض دو سال کی آموزش ہی سے ۱۷۸۴ء میں 'فرانسیسی اردو ڈکشنری' لکھ دی۔[119]

ولیم کرک پیٹرک (William Kirkpatrick):

برطانوی مستشرق، جنرل ولیم کرک پیٹرک (۱۷۵۴ء۔۱۸۱۲ء) نے ہندوستانی ڈکشنری لکھنے کا ڈول ڈالا تھا۔ اپنے منصوبے کو اس نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلا حصہ ان الفاظ پر مشتمل تھا جو عربی اور فارسی سے ہندوستانی میں منتقل ہوئے۔ فقط یہی حصہ طبع ہو سکا جو ۱۷۸۵ء میں لندن سے شائع ہوا۔ باقی حصے ناگری ٹائپ کے وقت پر تیار نہ ہو سکنے کے باعث چھپنے سے رہ گئے[120]۔ بعد ازاں سرکاری مصروفیات نے اس کا دھیان ہی اس علمی منصوبے سے ہٹا دیا۔ اگر کرک پیٹرک کا یہ منصوبہ تکمیل پا جاتا تو اس کا لغت شاید اردو کا پہلا باقاعدہ لغت شمار ہوتا۔[121]

پالاس (Pallas):

دنیا کی تمام زبانوں کے تقابلی لغت کو روسی اکادمی نے مشہور سائنس دان، پالاس کی زیرِ ادارت ۱۷۸۶ء میں شائع کیا۔ اس میں ہندوستانی کی کئی زبانیں شامل تھیں یعنی سنسکرت، ہندوستانی، تلنگی، کنٹری وغیرہ۔ اُس دور میں مستشرقین چوں کہ اردو کو ہندوستانی سے جدا کوئی مستقل زبان کا درجہ نہیں دیتے تھے اسی سبب ان کے ہاں زبان کے لیے لفظ 'اردو' مستعمل نہ تھا۔ اس لغت کے توسط سے پہلی بار ہندوستانی زبان کو مختلف علاقوں کی نسبت سے جانچا گیا یعنی ملتان کی ہندوستانی، بنگال

کی ہندوستانی، دکن کی ہندوستانی وغیرہ۔لغت کی تالیف میں پالاس نے مواد کی جمع آوری کے سلسلے میں اکثر اوقات از خود جدو جہد کی۔ [۱۲۲]

جان بارتھ وِک گل کرسٹ (John Borthwick Gilchrist):

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے روحِ رواں اور اردو کے استادِ اعلیٰ، جان گل کرسٹ (۱۷۵۹ء۔۱۸۴۱ء) نے اردو زبان کی صرف ونحو، لغات، لسانیات اور اردو بول چال پر متعدد کتابیں بڑی محنت اور تحقیق سے لکھیں۔سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والا یہ مستشرق ۱۷۸۲ء میں ہندوستان آیا اور ۱۸۰۴ء تک، قریباً بیس سال یہاں مقیم رہا۔اردو زبان سے ان کی دل چسپی اور ادبی و لسانی خدمات کا اندازہ، حامد حسن قادری کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

> ڈاکٹر گل کرسٹ کا اردو زبان پر کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اردو کا سب سے پہلا لٹریچر گویا ایجاد کیا۔ہندوستان کے ذی علم لوگوں کو جمع کیا اور کتابیں لکھوائیں۔گل کرسٹ صرف چار سال اس کالج میں رہے لیکن ان کا شروع کیا ہوا کام جاری رہا۔ [۱۲۳]

لغات پر گل کرسٹ کی تحقیقات کے بارے میں معلومات درج ذیل ہیں:

(ا) میر بہادر علی حسینی [۱۲۴] کے مطابق ۱۷۸۶ء [۱۲۵] میں کلکتے سے ان کی مشہور انگریزی ہندوستانی ڈکشنری بہ عنوان:

'A Dictionary English and Hindoostanee' طبع ہونا شروع ہوئی اور ۱۷۹۰ء [۱۲۶] میں اس کی طباعت مکمل ہوئی۔

ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد [۱۲۷] ڈاکٹر عطش درّانی [۱۲۸] کی تحقیقات کی رو سے اس کا پہلا حصہ ۱۷۸۶ء میں اور دوسرا حصہ ۱۷۹۰ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔ڈکشنری کے پہلے ایڈیشن میں انگریزی الفاظ کے اردو معانی رومن رسم الخط میں درج ہیں [۱۲۹]۔یہی لغت کپتان روبک کے بھرپور تعاون اور دوبارہ اصلاح و ترمیم اور اضافے کے ساتھ ۱۸۱۰ء میں ایڈنبرا (Edinburgh) سے شائع ہوا [۱۳۰]۔اس ایڈیشن کے سرورق پر یہ عنوان درج ہے:

> 'Hinduoostanee Philology comprising a Dictionary
> English and Hindoostanee, also Hindoostanee
> and English; with a Grammatical Introduction' [131]

سات سو بیس (۷۲۰) صفحات پر مشتمل ڈکشنری کے دوسرے ایڈیشن کے شروع میں چونسٹھ (۶۴) صفحات کا مقدمہ ہندوستانی زبان کے قواعد پر ہے [۱۳۲]۔ اس ایڈیشن میں انگریزی الفاظ کے اردو معانی رومن رسم الخط میں درج کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے انگریزی مترادفات بھی لکھ دیے گئے ہیں۔معنی کی وضاحت میں اردو اور ہندی اشعار بھی رومن رسم الخط میں درج کیے گئے ہیں [۱۳۳]۔ الفاظ کے لسانی ماخذ کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ ہندی الفاظ جو ''ہ'' سے مل کر آتے ہیں، انھیں موجودہ رسم الخط کے مطابق دوچشمی (ھ) سے نہیں بلکہ سادہ ہائے ہوز سے لکھا ہے۔ البتہ رومن میں لکھے گئے ان الفاظ کے نیچے امتیاز کے لیے چھوٹی سی لکیر لگا دی ہے۔بعد کے ایڈیشنز میں ان الفاظ کے لیے ہائے دوچشمی کا استعمال کیا گیا ہے [۱۳۴]۔گل کرسٹ نے اپنی اِس لغت میں جس نو آبادیاتی ذہنیت اور تعصب کا اظہار کیا ہے، اُس پر غلام عباس کے مضمون 'ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری' کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں:

> وہ بار بار اپنے انگریز قاری کو یاد دلاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو ان کی 'اوقات' میں رکھنے کے لیے کون سے اردو الفاظ اور جملے

استعمال کیے جائیں اور کس طرح انگریزوں کے مقامی ملازم ان کی اردو سے ناواقفیت کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کو تعظیم کے ساتھ مخاطب نہیں کرتے نیز یہ کہ اس 'بدتمیزی' کا جواب کس طرح دیا جائے۔ تعجب ہے کہ لغت میں اس طرح کی گفتگو کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لغت لکھنے کا گل کرسٹ کا بڑا مقصد ہی انگریزوں کے قومی اور انفرادی مفادات کو تقویت پہنچانا تھا۔[۱۳۵]

تیسری بار یہ ۱۸۲۵ء میں لندن سے طبع ہوا۔ دوسرے اور تیسرے ایڈیشنز میں ہندی الفاظ کا خاص طور پر اضافہ کیا گیا۔ ۱۸۵۰ء میں اس کا چوتھا ایڈیشن لندن سے طبع ہوا۔[۱۳۶]

(۲) دوسری تالیف 'ہندوستانی گرامر' ہے۔ سرورق کے مطابق اس کا طویل عنوان ہے:

'A Grammar of the Hindoostanee Language or

part three of Volume One of a System of

Hindoostanee Philology'[137]

اس کتاب کا ایک حصہ 'انگریزی ہندوستانی۔ ہندوستانی انگریزی' ڈکشنری[۱۳۸] پر مشتمل ہے۔ ڈکشنری میں اردو الفاظ رومن رسم الخط میں درج ہیں۔ مولوی عبد الحق کلکتے سے اس کی پہلی اشاعت ۱۷۹۶ء میں بتاتے ہیں۔ دوسری بار بھی اسی شہر سے ۱۸۰۲ء میں یہ کتاب منظرِ عام پہ آئی۔[۱۳۹]

(۳) مس رضیہ نور محمد کی تحقیق کے مطابق ۱۷۹۸ء[۱۴۰] میں گل کرسٹ کی تیسری کتاب 'دی اپنڈکس' (The Appendix) کے عنوان سے کلکتے سے شائع ہوئی جو دراصل قواعد و لغت کے مقدمے اور ضمیمے پر مشتمل ہے اور گل کرسٹ کی ہندوستانی لسانیات کے سلسلے کی آخری کتاب ہے۔[۱۴۱]

(۴) جارج گریرسن کی بہم رسانیدہ معلومات کے مطابق گل کرسٹ کی چوتھی تالیف 'مشرقی زبان دان' ۱۷۹۸ء[۱۴۲] میں پہلی بار کلکتے سے طبع ہوئی۔ کتاب کا پورا نام ہے:

'The Oriental Linguist, an easy and familiar Introduction to the popular

Language of Hindoostan, Comprising the Rudiments of the Tongue, with an

extensive Vocabulary, English and

Hindoostanee-Hindoostanee and English; to which is added the English and

Hindoostanee part of the Articles of War (from W.Scott's translation), with

practical Notes and Observations'[143]

کلکتے ہی سے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۲ء میں سامنے آیا۔ زبان کے ابتدائی اصول و قواعد پر مبنی اس کتاب کا ایک حصہ مبسوط 'انگریزی ہندوستانی۔ ہندوستانی انگریزی' فرہنگ پر منحصر ہے۔ ڈکشنری والے حصے کو گل کرسٹ ایک الگ کتابی شکل میں شائع کرنا چاہتا تھا مگر بعض دشواریوں کے سبب وہ ایسا نہ کر سکا۔ ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ہندوستانی رسم

الخط سر ہے[۱۴۴] سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

(۵) ۱۸۰۰ء میں گل کرسٹ کی کتاب 'اینٹی جارگنسٹ' شائع ہوئی۔ سرورق پر درج کتاب کا نام یہ ہے:

'The Anti-Jargonist, or a short Introduction to the Hindoostanee Language (called Moors), comprising the Rudiments of that Tongue, with an extensive Vocabulary English and Hindoostanee-Hindoostanee and English'[145]

اس میں زبان کے ابتدائی اصولوں سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں[۱۴۶] انگریزی ہندوستانی لغت بھی شامل ہے۔ یہ بالکل اسی نوعیت کی کتاب ہے جیسی کہ 'مشرقی زبان دان'، بلکہ درحقیقت اسی کا خلاصہ ہے۔

(۶) 'معلمِ ہندوستانی' کے نام سے گل کرسٹ کی تالیف کلکتے سے پہلی بار ۱۸۰۲ء میں طبع ہوئی۔ سرورق کے مطابق عنوان ہے:

'The Stranger's East Indian Guide to the Hindoostanee, or grand popular Language of India'

دو حصّوں پر مشتمل اس کتاب کا دوسرا حصہ دراصل انگریزی[۱۴۷] اردو الفاظ کی فرہنگ ہے جو سوا سو (۱۲۵) صفحات پر مبنی ہے۔ لندن سے اس کے دو ایڈیشنز بالترتیب ۱۸۰۸ء اور ۱۸۲۰ء میں شائع ہوئے۔ ۱۸۲۰ء والا ایڈیشن ضروری اصلاح و اضافے کے ساتھ طبع ہوا۔[۱۴۸] اس ایڈیشن کا عنوان ہے:

'The Stranger's infallible East-India Guide, or Hindoostanee Multum in Parvo, as a grammatical Compendium of the grand popular and military Language of all India (long, but improperly, called the Moors or Moorish Jargon)'[149]

(۷) اردو رسم الخط میں چھپی گل کرسٹ کی ایک اور اہم کتاب 'اتالیقِ ہندی' کلکتے سے پہلی بار ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ سر ورق پر درج عنوان ہے:

'The Hindee moral preceptor and Persian Scholar's shortest road to Hindustani Language or vice versa'

تذکرۂ لغات کے ضمن میں کتاب کا دوسرا ایڈیشن اہم ہے جو لندن سے ۱۸۲۱ء میں شائع ہوا۔ کتاب کا پہلا حصہ قواعد اور دوسرا حصہ ہندوستانی، فارسی اور انگریزی الفاظ کی فرہنگ پر مشتمل ہے۔ فرہنگ کا اضافہ طبعِ دوّم میں ہوا۔ بر خلافِ روشِ عام اس میں الفاظ کی ترتیب حروف کی صورت پر رکھی گئی ہے۔ یعنی قریب المخرج حروف ایک ساتھ رکھے گئے ہیں۔[۱۵۰]

آنون (Anon) :

۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۷ء تک برطانوی مستشرق، آنون کے درج ذیل لغات منظرِ عام پر آئے جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) گریرسن[۱۵۱] کے مطابق آنون کا پہلا لغت لندن سے ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا۔ لغت کا نام ہے:

'The Indian Vocabulary, to which is prefixed

the Forms of Impeachments'

(۲) انگریزی، ہندوستانی اور فارسی الفاظ پر مشتمل آنون کا ایک لغت مدراس سے ۱۸۵۱ء میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان ہے:

'A Dictionary English, Hindustani and Persian'

(۳) 'Hindustani School Dictionary' کے نام سے آنون کی تیسری تالیف کلکتے سے ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ تالیف رومن رسم الخط میں ہے۔

(۴) انگریزی اور ہندوستانی ذخیرہ الفاظ پر مبنی آنون کی کتاب ۱۸۵۴ء میں مدراس سے طبع ہوئی۔ اس کا عنوان ہے:

'English and Hindustani Vocabulary'

اس کی اشاعت ۱۸۷۹ء میں بنارس سے بھی عمل میں آئی۔

(۵) 'Urdu-English Vocabulary' کے عنوان سے آنون کی کتاب بنارس سے ۱۸۶۰ء میں طبع ہوئی۔

(۶) 'The Romanized Hindustanee Manual' کے نام سے آنون کی ایک اور اہم تالیف ۱۸۶۹ء میں مدراس سے شائع ہوئی۔

(۷) 'A Hindi-English Dictionary for the use of Schools" کے عنوان سے آنون کی تالیف بنارس سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ دوسری بار یہ کلکتے سے ۱۸۸۵ء میں طبع ہوئی۔

(۸) آنون کا ایک لغت ۱۸۷۷ء میں مدراس سے شائع ہوا۔ لغت کا عنوان ہے:

'Glossary of Indian Terms, for Use of Officers of Revenue'

(۹) تکنیکی اصطلاحات پر مشتمل آنون کی ایک ڈکشنری لاہور سے ۱۸۷۹ء میں طبع ہوئی۔ ڈکشنری کا عنوان ہے:

'Vocabulary of Technical Terms used in Elementary

Vernacular School Books'

(۱۰) 'The Student's Hindi-English Dictionary' عنوان سے آنون لغت ۱۸۹۶ء میں بنارس سے طبع ہوا۔

(۱۱) 'دی سٹوڈنٹس پریکٹیکل ڈکشنری' آنون کی اہم تالیف ہے جو دو بار الہٰ آباد ہی سے طبع ہوئی۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کا عنوان ہے:

'The Student's Practical Dictionary, containing English Words, with English

and Urdu meanings in Persian Character'

پہلے ایڈیشن میں انگریزی الفاظ کے معانی انگریزی اور ہندوستانی، دونوں زبانوں میں درج کیے گئے ہیں۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۰ء میں سامنے آیا۔ دوسرے ایڈیشن میں ہندوستانی الفاظ کے انگریزی معانی بھی تحریر کرنے کا التزام ملتا ہے۔ دوسرے ایڈیشن کے سرورق پر یہ عنوان درج ہے:

'The Student's Practical Dictionary, containing Hindustani Words, with English

meanings in Persian Character'

ہنری ہیرس (Henry Harris):

۱۷۹۰ء میں مدراس سے ڈاکٹر ہنری ہیرس (۱۷۴۶ء-۱۸۲۹ء) کا لغت شائع ہوا جسے اردو کا پہلا مکمل لغت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ہیرس کے لغت کا عنوان ہے:

'Analysis, Grammer and Dictionary of Hindustani language'

اپنے موضوع اور مندرجات کے اعتبار سے ایک جامع حوالہ جاتی کتاب ہے۔ بہ قول محمد عتیق صدیقی [۱۵۲]، ابواللیث صدیقی [۱۵۳] اور خلیل الرحمٰن داؤدی [۱۵۴]، ہیرس کے لغت کا سنہ اشاعت ۱۷۹۱ء ہے۔ جب کہ ڈاکٹر مسعود ہاشمی [۱۵۵] اور ڈاکٹر عطش درّانی [۱۵۶]، سالِ اشاعت ۱۷۹۰ء بیان کرتے ہیں۔ ۱۷۹۰ء اس بنا پر لائق ترجیح ہے کہ اس لغت کا ایک نسخہ احسان دانش کے کتب خانے میں موجود ہے اور ڈاکٹر عطش درّانی کی نظر سے گزرا ہے، اُس پر سنہ اشاعت ۱۷۹۰ء درج ہے۔

اپنی تصنیف 'ویسٹیجز آف اولڈ مدراس' (Vestiges Of Old Madras) میں مسٹر لوّ (Love) نے ڈاکٹر ہیرس اور ان کے لغت کی بارے میں چند معلومات بہم پہنچائی ہیں [۱۵۷] جن کے مطابق ڈاکٹر ہیرس ۱۷۸۵ء میں مقامی طور پر افواجِ مدراس میں اسٹنٹ سرجن مقرّ رہوئے۔ ۱۷۸۶ء میں انہوں نے حکومت کے نام اپنے ایک مکتوب میں ایک انگریزی لغت کی تیاری کے سلسلے میں اپنی چار سالہ محنت کا ذکر کرتے ہوئے فارسی رسم الخط کا ٹائپ تیار کرنے والے دو یورپین اسسٹنٹ نیز دو عربی اور ایک پرتگیزی منشی کی اس حوالے سے اپنے پاس ملازمت کا بتایا۔ اسی خط کے توسط سے ٹائپ کی ڈھلائی، اشتہار، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کے اخراجات کے سلسلے میں بھی حکومتی اعانت کے لیے درخواست کی گئی ہے۔ اس خط کے جوابی اقدام کے طور پر حکومت نے سات ماہ کے لیے پچاس روپے ماہ وار کی اعانت منظور کی۔ بعد ازاں اس مدت میں غیر معین توسیع کر دی گئی۔ ڈاکٹر ہیرس اپنے لغت کو دو جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر ۱۷۸۹ء میں لغت کی اشاعت کی بابت حکومتی مطالبے میں شدّت کی بنا پر ڈاکٹر ہیرس نے 'انگریزی ہندوستانی لغت' کا حصہ مدوّن کر کے حکومت کے حوالے کیا اور حکومت کو نامکمل کام کا عذر یہ پیش کیا کہ ابتدا میں یہ ایک چھوٹی سی کتاب تھی مگر بعد میں ہندوستانی زبان کے مفید ترین الفاظ کے اضافے کی وجہ سے اس نے 'انگریزی و ہندوستانی۔ ہندوستانی و انگریزی لغت' کی شکل اختیار کر لی۔ علاوہ ازیں طباعت کی بعض دشواریاں بھی اشاعت میں تاخیر کا سبب ہوئیں۔ لہذا یہ لغت صرف ایک جلد میں شائع ہو سکا۔

ڈاکٹر عطش درّانی کے مطابق اس لغت کے مطالعے سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل میں تدوین کے اُس وقت کے جدید ترین معیار کو پیشِ نظر رکھا گیا [۱۵۸]۔ ہر صفحہ دو کالموں میں منقسم ہے۔ تمام صفحات اور کالموں پر نمبر درج ہیں۔ کتاب دو ہزار باون (۲۰۵۲) کالموں یعنی ایک ہزار چھبیس (۱۰۲۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر لفظ کے بارے میں نشان دہی کی گئی ہے کہ وہ کس زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ زیادہ تر ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی، یونانی اور انگریزی ماخذوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ معنی بیان کرنے سے پیش تر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کس لفظ سے مشتق ہے۔ ہر لفظ کا تلفظ درج کرنے کے ساتھ ساتھ سنسکرت الاصل الفاظ کو دیو ناگری رسم الخط میں بھی تحریر کیا گیا ہے۔ ہر لفظ کے حوالے سے تذکیر و تانیث اور واحد جمع کی نشان دہی کی گئی ہے۔ لغت میں ایک سو اٹھاون (۱۵۸) صفحات کا اشاریہ اور آخر میں اغلاط نامہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس ڈکشنری کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں دکنی الفاظ کی شمولیت پر خاص طور پر زور دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر ہیرس نے اپنے لغت کی ترتیب و تالیف میں لغت نگاری کے جن اصولوں کو پیشِ نظر رکھا یا وضع کیا انھیں لغت نگاری کے جدید تکنیکی نظام اور رجحان میں کلیدی حیثیت حاصل ہے جس سے ان کی محنت، کام کی صحت اور ہندوستانی زبان سے دل چسپی اور واقفیت کا ناقابلِ تردید ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ گل کرسٹ نے نہ صرف ڈاکٹر ہیرس کے لغت کا حوالہ دیا بلکہ اعتراف بھی کیا کہ اس لغت سے کچھ 'منتخب الفاظ' اخذ کر کے انھوں نے اپنے ضمیمے میں شامل کیے۔

گلیڈون (Gladwin):

۱۷۹۷ء میں فرانسیسی مستشرق ،گلیڈون(سنہ وفات-۱۸۱۳ء) کی ایک کتاب ' ڈکشنری آف محمڈن لاء اینڈ بنگال ریو نیو ٹرمز ' (Dictionary of Mohammadan Law & Bengal Revenue Terms) کلکتے سے شائع ہوئی۔ فارسی اور ہندوستانی زبان کا ایک لغت بھی گلیڈون نے ۱۸۰۹ء میں کلکتے ہی سے شائع کیا۔[۶۹]

ٹی رابرٹس (T.Roberts):

برطانوی مستشرق، ٹی رابرٹس نے ہندوستان کا سفر کرنے والے غیر مقامی افراد کو اردو ہندوستانی زبان سیکھنے کے حوالے سے درپیش مسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک لغت ۱۸۰۰ء میں لندن سے شائع کیا۔ لغت کا طویل عنوان ہے:

'An Indian Glossary, consisting of some 1,000 Words and Terms commonly

used in the East Indies, with full Explanation of their respective Meanings,

forming an useful Vade-Mecum extremely serviceable in assisting Strangers

to asquire with ease and quickness the Language of that Country'[160]

ایس روسو (S.Rousseau):

شرع اسلامی اصطلاحات اور مال گزاری پر ایک لغت ۱۸۰۲ء میں لندن سے شائع ہوا۔ اس لغت کا مؤلف ایک برطانوی مستشرق، ایس روسو ہے ۔ روسو نے اسی لغت کا نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن ۱۸۰۵ء میں بھی شائع کیا۔ لغت کا پورا نام ہے:

'Dictionary of Mohamedan Law, Bengal Revenue Terms, Sanskrit, Hindoo

and other words used in the East Indies,

with full explanations'[161]

جوزف ٹیلر (Joseph Taylor):

۱۸۰۵ء میں کلکتے سے ایک بسیط لغت کی تالیف عمل میں آئی۔ اس کا مؤلف فورٹ ولیم کالج کا ایک قابل استاد، کپتان جوزف ٹیلر ہے۔ ابتداً ٹیلر نے اسے ذاتی استعمال کی غرض سے ایک مختصر فرہنگ کے طور پر مرتب کیا۔ ڈاکٹر ولیم ہنٹر (Dr.William Hunter) نے کپتان ٹیلر کے لغت پر نظرِ ثانی کے بعد اپنے دیگر ساتھیوں کے تعاون سے ہندوستانی پریس کلکتہ سے ۱۸۰۸ء میں دو حصّوں میں Dictionary of 'A Hindustani and English' کے عنوان سے پہلی بار باضابطہ طور پر شائع کیا۔ ولیم کارمائیکل سمتھ (William Carmichael Smyth) نے نظرِ ثانی کے بعد اسی لغت کا ایک مختصر ایڈیشن ۱۸۲۰ء میں شائع کیا۔

پہلی جلد 'ا' سے 'خ' تک جب کہ دوسری جلد 'د' سے 'ی' تک ہے۔ گریرسن اپنی تحقیقات میں اس لغت کے جس ایڈیشن کا ذکر کرتا ہے وہ ۱۸۲۰ء کی[۱۶۲] اشاعت ہے جس کے صفحات کی تعداد آٹھ سو پینسٹھ (۸۶۵) ہے۔ مندرجات میں 'ا' تا 'ی' حروف پر مبنی الفاظ، ضمیمہ، محاورات اور اشعار شامل ہیں ۔ ڈاکٹر ڈنکن

فاربس(Dr.Duncon Forbes) نے اپنے لغت کی بنیاد اسی لغت پر رکھی تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے اس کا شمار اچھے لغات میں تھا۔[۱۶۳]

تھامس روبک (Thomas Roebuck):

ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے معاونین میں ایک نام انگریز مستشرق، کپتان تھامس روبک (۱۷۸۱ء۔۱۸۱۹ء) کا بھی شامل ہے۔ روبک ۱۸۰۱ء کے اوائل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہوکر ہندوستان آیا۔ اسے اردو زبان و ادب سے خاص شغف تھا۔ روبک اردو زبان کا ماہر تھا اور اس نے ڈاکٹر گل کرسٹ کو اردو لغات مرتب کرنے میں بہت مدد دی۔ گل کرسٹ کے بعد روبک نے اردو اہل قلم کی سب سے زیادہ سرپرستی کی۔ اردو، ہندوستانی لغات کے ضمن میں روبک کی تالیفات درج ذیل ہیں:

(۱) بحریہ اور جہاز رانی کی اصطلاحات پر مبنی روبک کا لغت ۱۸۱۱ء میں کلکتے سے اور اس کے دوسال بعد ۱۸۱۳ء میں لندن سے شائع ہوا۔ لغت کا عنوان ہے:

'An English and Hindostanee Naval Dictionary
of technical Terms and Sea Phrases'[164]

یہ رومن رسم الخط میں ہے۔ اس میں اصطلاحاتِ بحریہ کے علاوہ انگریزی اور اردو کے ایسے الفاظ اور جملوں کا کثیر ذخیرہ جمع ہے جو انگریزی کمانڈروں کو میدانِ جنگ اور بارکوں میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بول چال میں کار آمد ہو سکتے تھے[۱۶۵]۔ کتاب کی ابتدا میں اردو صرف ونحو پر ایک مقدمہ ہے۔ یہ ایک مختصر مگر کار آمد کتاب ہے۔[۱۶۶]

(۲) کپتان روبک کی دوسری اہم تالیف کا عنوان ہے:

'The Hindostanee Interpreter, containing the Rudiments
of Grammar, an extensive Vocabulary,
and a Useful Collection of Dialogues and
a Naval Dictionary'[167]

پہلی بار یہ کتاب ۱۸۱۸ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ دوسری بار ولیم کارمائیکل سمتھ کی نظرِ ثانی کے بعد لندن ہی سے ۱۸۲۴ء میں طبع ہوئی۔ تیسری بار لندن اور پیرس سے ۱۸۴۱ء میں شائع ہوئی۔ روبک کی یہ تالیف صرف ونحو کے ابتدائی اصول، وسیع فرہنگ، مکالمات اور بحری اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ بعد ازاں مسٹر جی سمال(Mr.G.Small) نے اسے پھر سے مرتب کرکے ۱۸۸۲ء میں لندن سے شائع کیا[۱۶۸]۔ ۱۸۸۲ء کا ایک نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔[۱۶۹]

جان شیکسپیئر (John Shakespeare):

۱۸۱۷ء میں لندن سے برطانوی مستشرق، جان شیکسپیئر (۱۷۷۴ء۔۱۸۵۸ء) کا لغت درج ذیل عنوان سے شائع ہوا:

'A Dictionary, Hindustani and English'

لغت کے دیباچے میں جان شیکسپیئر لکھتا ہے کہ اس لغت کا ماخذ جوزف ٹیلر اور ولیم ہنٹر (۱۷۵۵ء۔۱۸۱۲ء) کا لغت تھا[۱۷۰]۔ اس کا دوسرا ایڈیشن لندن

ہی سے ۱۸۲۰ء[171] میں طبع ہوا جس میں متعدد تبدیلیاں کی گئیں۔ تیسرا ایڈیشن بھی ترمیم و اضافے کے بعد لندن ہی سے ۱۸۳۴ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کے آخر

میں ایک ضخیم اشاریہ بھی شامل کر دیا گیا تھا جس میں وہ تمام انگریزی الفاظ شامل کیے گئے جو اصل لغت میں اردو الفاظ کے مترادفات کے طور پر آئے تھے۔ ان انگریزی الفاظ کے سامنے لغت کا صفحہ نمبر اور کالم درج کر دیا گیا تھا تاکہ ان کے اردو مترادفات تلاش کرنے میں سہولت رہے۔ یہ اشاریہ اندازاً ڈیڑھ سو (۱۵۰) صفحات پر مبنی ہے۔

لغت کا چوتھا ایڈیشن بھی لندن ہی سے ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں بہت ترمیم و اضافہ کیا گیا یہاں تک کہ اشاریے کے بہ جائے پوری انگریزی اردو ڈکشنری شامل کر دی گئی۔ البتہ بعض مقامات پر اردو معنی کے ساتھ زیادہ وضاحت کی خاطر ہندوستانی انگریزی حصہ لغت کے صفحات اور کالم بھی درج کر دیے ہیں۔ اس طرح یہ تالیف 'ہندوستانی انگریزی۔ انگریزی ہندوستانی' ڈکشنری یعنی دو لغات کی ایک جامع شکل اختیار کر گئی۔ اس ایڈیشن میں دکنی الفاظ و محاورات نسبتاً زیادہ شامل کیے گئے جو کہ ڈاکٹر ہنری ہیرس کی لغت اور دیگر دکنی کتب سے ماخوذ ہیں۔ ہر لفظ کے تلفظ اور مآخذ کے اندراج کی پوری سعی ملتی ہے۔ ضرب الامثال کی اہمیت و افادیت سے قطع نظر ضرب الامثال کا حصہ کم زور ہے۔ اس ایڈیشن میں شامل ضمیمہ فقط آٹھ (۸) صفحات پر منحصر ہے۔

ہندوستانی انگریزی ڈکشنری والے حصے میں تمام اردو الفاظ اردو رسم الخط میں لکھنے کے ساتھ ساتھ رومن حروف میں بھی درج کیے گئے اور ہندی کے اکثر الفاظ کو دیوناگری میں بھی لکھنے کی کوشش کی گئی۔ جب کہ انگریزی ہندوستانی ڈکشنری والے حصے میں صرف رومن رسم الخط ہی استعمال کیا گیا۔ یہ لغت اپنی ضخامت اور معیار کی بنا پر اپنے وقت کا سب سے جامع لغت ہے۔ ڈاکٹر عطش درّانی کے مطابق اس لغت کے دو ایڈیشنز، بالترتیب ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۶ء میں سنگِ میل پبلی شرز، لاہور نے شائع کیے۔[172]

ولیم کارمائیکل سمتھ (William Carmichael Smyth):

کپتان جوزف ٹیلر کی ڈکشنری مرتبہ ڈاکٹر ولیم ہنٹر کو چند اضافوں اور ظاہری ردّ و بدل کے ساتھ برطانوی مستشرق، ولیم کارمائیکل سمتھ نے ۱۸۲۰ء میں لندن سے شائع کیا۔ تبدیلیاں عمومی نوعیت کی تھیں اس لیے اصل کتاب بجنسہٖ باقی رہی۔ گویا اصل کتاب میں کسی بھی نوعیت کا کوئی تصرف نہیں کیا گیا[173]۔ مسٹر سمتھ

نے بہ ظاہر جو ردّ و بدل کیا وہ درج ذیل ہے:

- ☆ کتاب کی تقطیع بدل دی یعنی مختصر کر دی۔
- ☆ ہندوستانی زبان کے طلبہ و شائقین کے لیے دیوناگری رسم الخط کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے بالکل خارج کر دیا۔
- ☆ عبرانی رسم الخط بھی خارج کر دیا۔
- ☆ رومن رسم الخط میں بعض خفیف تغیّر عمل میں آئے۔
- ☆ اردو رسم الخط برقرار رکھا۔
- ☆ سند میں دیے گئے اشعار کو متن سے خارج کر کے کتاب کے آخر میں بہ طور ضمیمہ شامل کیا۔

جوزف ٹی تھامپسن (Joseph.T.Thompson):

یورپی مستشرق، جے ٹی تھامپسن کی تالیفات کا ذکر اس طرح سے ہے:

(۱) 'اے ڈکشنری ان اردو اینڈ انگلش' (A Dictionary in Oordoo and English) ۱۸۲۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس تالیف کی ندرت و تقدیم اس واسطے ہے کہ اس میں پہلی بار 'ہندوستانی' کے بہ جائے 'اردو' کا نام لیا گیا[174]۔ یہ لغت مستند حوالوں کی مدد سے حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عطش درّانی کے مطابق اس لغت کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۳۸ء

میں سیرام پور سے طبع ہوا۔ ۱۸۴۶ء میں اس کا ایک ایڈیشن دہلی سے بھی شائع ہوا۔

(۲) جے ٹی تھامپسن کی ایک اور کتاب سیرام پور ہی سے ۱۸۳۲ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کا عنوان ہے:[175]

'An English and Hindustani Spelling Guide'

(۳) مؤلف نے ایک اہم ڈکشنری 'English and Oordoo School Dictionary' تالیف کی جو سیرام پور ہی سے ۱۸۳۶ء میں دوسری بار طبع ہوئی۔ بعد ازاں اس لغت کا رومن رسم الخط میں ایک نسخہ ۱۸۴۱ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔[۱۷۶]

(۴) گریرسن کے مطابق، تھامپسن کا ایک لغت کلکتے سے ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ لغت کا نام ہے:

'English and Urdu School Dictionary in Roman Characters, with the accentuation of the Urdu Words'[177]

(۵) 'A Dictionary in Hindi and English' کے عنوان سے تھامپسن کی ایک اور تالیف ۱۸۴۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی اسی شہر سے ۱۸۷۰ء میں طبع ہوا۔ بعد ازاں اس لغت کو ایک مستشرق، ولیم ناسیولیس (William Nassau Lees) نے نظر ثانی کے بعد بہ طور تیسرا ایڈیشن کلکتے ہی سے ۱۸۸۴ء میں شائع کیا۔

ولیم ییٹس (William Yates):

۱۸۱۵ء میں عیسائی مشنری، ولیم ییٹس (۱۷۹۲ء۔۱۸۴۵ء) ہندوستان آیا۔ زیادہ عرصہ کلکتہ میں قیام کے دوران میں اس نے سنسکرت، بنگلہ، اردو اور ہندی زبانیں سیکھیں[۱۷۸]۔ ییٹس کی تالیفات درج ذیل ہیں:

(۱) ییٹس کی اہم تالیف کا عنوان ہے:

'Introduction to Hindoostanee Language in three parts, viz., Grammar, with Vocabulary and Reading Lessons'[179]

یہ کتاب ۱۸۲۷ء میں پہلی بار کلکتے سے شائع ہوئی۔ تین سو چھبیس (۳۲۶) صفحات پر مشتمل یہ کتاب رومن رسم الخط میں چھپی۔ گرامر، لغت اور اسباقِ زبان دانی کے اعتبار سے یہ تالیف تین حصّوں میں منقسم ہے[۱۸۰]۔ 'لینگو ئسٹک سروے آف انڈیا' میں اس کے مزید تین ایڈیشنز، ۱۸۴۳ء (دوسرا)، ۱۸۴۵ء (تیسرا) اور ۱۸۵۵ء (چھٹا) کا ذکر موجود ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اس مستشرق کا نام 'ٹیٹ' لکھا ہے[۱۸۱] جب کہ مس رضیہ نور محمد نے اسی نام کو ایک جگہ 'ولیم ٹینٹ' اور دوسری جگہ 'ولیم ییسٹس' درج کیا ہے۔[۱۸۲]

(۲) ییٹس کا ایک لغت 'A Dictionary Hindoostany and English' لندن سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ اسی سال اسے بپٹسٹ مشن پریس (Baptist Mission Press)، کلکتہ نے بھی شائع کیا۔[۱۸۳]

پیٹر بریٹون (Peter Breton):

انگریز مستشرق، پیٹر بریٹون ایک قابل ڈاکٹر تھا۔ یہ مستشرق انگریزی کے علاوہ سنسکرت، عربی، فارسی، لاطینی، بنگلہ اور اردو/ہندی پر عبور رکھتا تھا۔
۱۸۲۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیسی طالب علموں کو دیسی زبان (اردو/ہندی) میں تعلیم دینے کی غرض سے ایک شعبہ قائم کیا۔ ڈاکٹر پیٹر بریٹون اسی شعبے کا پروفیسر

تھا [184]۔ پیٹر نے طبّی اصطلاحات اور انسانی جسم کے مختلف اعضاء کے ناموں پر مبنی ایک کتاب تحریر کی جس کا عنوان ہے:

'A Vocabulary of the names of various parts of the human body and of

Medical Technical Terms'

یہ اہم تالیف ۱۸۲۷ء میں کلکتے سے چھپی۔ کتاب میں انسانی جسم کے متعدد اور مختلف اعضاء کے ناموں کو چار زبانوں؛ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی میں درج کیا گیا ہے۔[185]

ایم ٹی ایڈم (M.T.Adam):

اردو ہندوستانی لغات کے ضمن میں مستشرق، ایم ٹی ایڈم کی درج ذیل دو تالیفات کا ذکر ملتا ہے:

(۱) 'Hindi Kosha, a Dictionary of the Hindui Language' کے عنوان سے ایڈم کا لغت کلکتے سے ۱۸۲۹ء میں شائع ہوا۔[186]

(۲) ۱۸۳۸ء میں کلکتے ہی سے ایڈم کا ایک اور لغت 'Dictionary, English and Hindui' شائع ہوا[187]۔

ڈاکٹر ڈنکن فاربس نے اپنے لغت کی تالیف میں اس لغت کے دوسرے ایڈیشن سے استفادہ کیا تھا۔[188]

ڈی روزاریو (D' Rozario):

فرانسیسی مستشرق، ڈی روزاریو (۱۸۰۹ء۔۱۸۳۱ء) انگریزی کے اچھے اور آزاد خیال شاعر تھے۔ 'ایسٹ انڈیا' نامی ایک انگریزی جریدہ نکالا کرتے تھے۔ بنگال کے نوجوانوں میں فکرِ نو کی روح پھونکنے اور انھیں آزاد خیال بنانے میں ان کا کردار نمایاں رہا[189]۔ ڈی روزاریو نے احاطہ بنگال کی خاص اور بڑی زبانوں یعنی انگریزی، بنگالی اور اردو کا لغت لکھا جس کا عنوان ہے:

'A Dictionary of the principal Languages spoken in the Bengal Presidency,

viz., English, Bangali and Hindustani'[190]

یہ لغت ۱۸۳۷ء[191] میں کلکتے سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر عطش درّانی اپنی تالیف 'اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم' میں صفحہ نمبر ۳۰ پر دوسنینِ اشاعت کو، ۱۸۳۵ء ابتدا میں اور ۱۸۳۷ء آخر میں، اس لغت سے منسوب کرتے ہیں۔ ۱۸۳۷ء کو دو وجوہ کی بنا پر درست تسلیم کیا جائے گا۔ اول، مولوی عبدالحق[192] اور گریرسن[193] نے اس لغت کا سالِ اشاعت ۱۸۳۷ء درج کیا ہے۔ دوّم، ڈاکٹر عطش درّانی نے احسان دانش کے کتب خانے کی میں موجود اس لغت کے نسخے پر ۱۸۳۷ء بہ طورِ سنہ اشاعت دیکھا۔

لغت کا مقدمہ ڈنکن فاربس کا تحریر کردہ ہے۔ یہ کتاب پانچ سو (۵۰۰) صفحات پر مشتمل رومن حروف میں شائع ہوئی۔ جارج رینکنگ نے بھی اپنے لغت میں اس لغت کا حوالہ دیا ہے۔[194]

ژاں تولار (Jan Tolar) اور ایڈلف پانز (Adolf Panz):

ہندوستانی سے چیک اور چیک زبان سے ہندوستانی میں لغات مرتب کرنے کا اوّلین سہرا چیکوسلوواکیہ سے تعلق رکھنے والے دو مستشرقین، ژاں تولا راور ایڈلف پانز کے سر ہے۔ ژاں تولار نے ہندوستانی سے چیک زبان میں ڈکشنری ترتیب دی۔ جب کہ ایڈلف پانز نے چیک زبان سے ہندوستانی میں لغت مرتب کیا۔ مذکورہ دونوں تالیفات پراگ (Prague) سے ۱۸۴۱ء میں شائع ہوئیں۔[۱۹۵]

آر لیچ (R.Leech):

۱۸۴۳ء میں میجر آر لیچ کی تالیف بنگال سے شائع ہوئی۔ سرورق کے مطابق عنوان ہے:

'Notes on, and a short Vocabulary of the Hinduvee

Dialects of Bundelkhand'

کتاب کی بنیادی حیثیت لغت کی ہے البتہ اس کا ایک مختصر حصہ قواعد سے متعلق ہے۔[۱۹۶]

ہنری ایم ایلیٹ (Henry.M.Elliot):

ہنری ایم ایلیٹ کا ہندوستانی اصطلاحات پر مبنی ایک لغت 'Glossary of Indian Terms' کے عنوان سے ۱۸۴۴ء[۱۹۷] میں آگرہ سے شائع ہوا۔ برطانیہ سے تعلق رکھنے والا یہ مستشرق بنگال سول سروس میں ملازم تھا۔ اس لغت کو نظر ثانی کے بعد جان بیمز (John Beams) نے بہ عنوان 'Supplimental Glossary' لندن سے ۱۸۶۹ء میں شائع کیا۔ دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں اصل الفاظ رومن رسم الخط میں درج کرنے کے بعد اردو نسخ ٹائپ میں اور پھر ناگری میں درج ہیں۔ اصطلاح کی تشریح انگریزی زبان میں ہے۔[۱۹۸]

ڈنکن فاربس (Duncan Forbes):

سکاٹ لینڈ کے ایک غریب دیہاتی گھرانے سے تعلق رکھنے والے مستشرق، ڈنکن فاربس (۱۷۹۸ء۔۱۸۶۸ء) نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ درس و تدریس سے منسلک رہتے ہوئے گزارا۔ چار سال تک (۱۸۲۳ء سے ۱۸۲۶ء) کلکتہ اکیڈمی میں مدرس رہا۔ بعد ازاں کنگز کالج لندن میں (۱۸۳۷ء سے ۱۸۶۱ء) السنہ وادب شرقیہ کا پروفیسر رہا۔ فاربس نے عربی، اردو اور بنگالی میں تصنیف و تالیف کا وافر ذخیرہ چھوڑا۔ ہندوستانی لغات کے ضمن میں فاربس کی تالیفات کی تفصیل اس طرح سے ہے:

(۱) دو حصوں پر مشتمل فاربس کی اہم تالیف 'The Hindustani Manual' ہے[۱۹۹]۔ مینوئل کے دیباچے میں درج معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۴۵ء میں اس کی پہلی اشاعت لندن سے عمل میں آئی۔ مینوئل کا پہلا حصہ بہ عنوان 'A Compendious Grammar of the Language' تین سیکشنز پر مشتمل ہے۔ پہلے سیکشن میں گرامر کے بنیادی اصول درج ہیں۔ حروفِ تہجی اور ان کی صوتی ماہیت کی ترتیب وار مثالوں سے وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے سیکشن میں مشقیں دی گئی ہیں جو سترہ (۱۷) اسباق پر مبنی ہیں۔ تیسرے سیکشن میں چیدہ چیدہ مکالمے درج ہیں۔ مینوئل کا دوسرا حصہ ایک مختصر ڈکشنری ہے جس کا عنوان ہے:

'A Vocabulary of useful words English and Hindustani'

اس میں انگریزی سے ہندوستانی اور ہندوستانی سے انگریزی میں ترجمے بھی دیے گئے ہیں۔ محاوروں، ضرب الامثال اور جملوں کی ایک طویل لسٹ بھی

اس حصے میں شامل ہے۔ دو بار لندن ہی سے اس کا ایڈیشن ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۹ء میں سامنے آیا۔ ہندوستانی لسانیات کے ابتدائی نقوش کے ضمن میں کچھ سرسری مباحث بھی اس مینوئل کا حصہ ہیں۔ مینوئل کو طالب علموں کے لیے مزید مفید بنانے کی غرض سے جان ٹی پلیٹس نے اسے بعض ترامیم اور حوالوں کے ساتھ دوبارہ ترتیب دیا۔ جسے ایلین اینڈ کو (Allen & Co) نے ۱۸۷۴ء میں لندن سے شائع کیا۔

(۲) ۱۸۴۶ء میں فاربس نے ہندوستانی قواعد پر کتاب شائع کی۔ کتاب کا نام ہے:

'A Grammar of the Hindustani Language in the

Roman and Oriental characters'

کتاب میں اردو سے انگریزی لغات بھی شامل کیے گئے۔[۲۲۰]

(۳) فاربس کا خیال تھا کہ کسی بھی ملک کی زبان سیکھنے کے لیے محض اس زبان میں مستعمل الفاظ اور ان کے معانی جان لینے کی سعی کافی نہیں بلکہ اپنی زبان کے توسط سے اس میں ترجمے کی مشق بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاربس نے اپنے تیس سالہ قیام کے دوران میں وسیع تر جائزے اور عمیق مشاہدے کو اس امر پر منتج کیا کہ صحیح معنوں میں زبان سیکھنے کے عمل کو کارگر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ لغت کو انگریزی سے ہندوستانی اور ہندوستانی سے انگریزی دونوں طرح سے مرتب کیا جائے[۲۰۱]۔ چناں چہ ۱۸۴۸ء میں لندن سے فاربس نے اپنے ایک وقیع لغت کی اشاعت کو ممکن بنایا۔ بہ قول وارث سرہندی اس ڈکشنری کی تالیف ۱۸۳۷ء میں مکمل ہوئی[۲۰۲]۔ دو حصوں پر مشتمل اس لغت کا عنوان ہے:

'A Dictionary, Hindustani and English, to which is added a reversed Part,

English and Hindustani'

لغت کا پہلا حصہ دس +پانچ سو چھیاسی (۱۰ + ۵۸۶) صفحات پر مشتمل ہے[۲۰۳]۔ اس حصے میں (ہندوستانی سے انگریزی) اصل اردو الفاظ کو اردو رسم الخط میں (نسخ ٹائپ) درج کیا گیا اور ان کے عربی، فارسی یا ہندی اصل کی طرف بالترتیب ' ع '، 'ف' اور ' ہ ' سے اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ لغت کا دوسرا حصہ تین سو اٹھارہ (۳۱۸) صفحات پر مبنی ہے۔ دوسرے حصے میں (انگریزی سے ہندوستانی) انگریزی الفاظ کے اردو معانی رومن رسم الخط میں دیے گئے اور ایک انگریزی لفظ کی وضاحت اردو کے متعدد مترادفات کے توسط سے کی گئی۔ لغت کے مقدمے سے علم ہوتا ہے کہ پندرہ ہزار (۱۵ ۰۰۰) الفاظ پر مشتمل اس لغت میں اردو ہندی کے مختلف لغات کے علاوہ باغ و بہار، اخوان الصفا، اخلاقِ ہندی اور گل بکاؤلی وغیرہ سے الفاظ لیے گئے[۲۰۴]۔ اس نسخے میں فاربس نے اپنے پیش رو لغات نویس، ولیم ہنٹر، گل کرسٹ، گلیڈ ون، ایلیٹ، جانسن، ڈاکٹر ایڈم اور تھامپسن کے لغات سے استفادہ بھی کیا ہے[۲۰۵]۔ ترمیم اور اضافے کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن، Wm.H.Allen & Co نے لندن سے ۱۸۶۶ء میں شائع کیا۔ پہلا حصہ (ہندوستانی سے انگریزی) آٹھ +آٹھ سو دو (۸ + ۸۰۲) صفحات پر مشتمل جب کہ دوسرا حصہ (انگریزی سے ہندوستانی) تین سو اٹھارہ (۳۱۸) صفحات پر مبنی ہے[۲۰۶]۔ بہ قول ڈاکٹر عطش درّانی اس کا ایک عکسی ایڈیشن ۱۹۲۸ء میں بہ طور صدی ایڈیشن، علمی مجلسِ دہلی نے لکشمی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے شائع کرایا[۲۰۷]۔ ۱۹۸۷ء میں اسے اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے اس عنوان سے شائع کیا:

'A Dictionary, Hindustani & English accompanied by a reversed Dictionary,

English & Hindustani'

یہ ایڈیشن دو حصوں میں ہے اور دونوں حصے ایک ہی جلد میں ہیں۔ دونوں حصوں کے ساتھ ڈکشنری کے دوسرے ایڈیشن کے سرورق کا عکس بھی دیا گیا ہے جس سے لغت کے دوسری بار ۱۸۶۶ء میں شائع ہونے کی تصدیق ملتی ہے۔

وارث سرہندی کے مطابق اس لغت کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

☆ پہلے حصے میں بنیادی الفاظ کو اردو رسم الخط میں درج کر کے معانی رومن رسم الخط میں دیے گئے ہیں تا کہ نو آموز آسانی سے سمجھ کر اردو زبان پر جلد قادر ہو سکے۔

☆ اردو اور فارسی کی اعلیٰ ادبی کتابوں میں مستعمل الفاظ کے ساتھ ساتھ روزمرّہ گفت گو کے الفاظ بھی اس لغت میں شامل ہیں۔ فارسی الفاظ کی معقول تعداد خصوصاً شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان میں مستعمل الفاظ کا بہ خوبی احاطہ کیا گیا ہے۔ ہندی، سنسکرت اور عربی کے وہ الفاظ جو اردو تحریر اور تقریر میں بالعموم استعمال ہوتے ہیں، انھیں بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مؤلف نے اُس زمانے میں دست یاب قریباً تمام عربی، اردو، فارسی، سنسکرت اور ہندو لغات سے استفادہ کیا تا کہ لغت کی جامعیت میں کوئی کمی نہ رہے۔

☆ لغت میں ضرب الامثال کم تعداد میں ہیں۔

☆ ہر لفظ کے مآخذ کی نشان دہی کی گئی ہے اور اکثر مآخذ درست درج ہیں۔ البتہ کوئی حدِ فاصل قائم نہ کرنے کی بنا پر اکثر ہندی اور سنسکرت الفاظ خلط ملط ہو گئے ہیں۔

☆ مختلف المعانی اور مختلف الماخذ الفاظ میں امتیاز نہیں کیا گیا اور ان کو ایک لفظ مان کر تمام معانی ایک ساتھ درج کر دیے گئے ہیں جس سے مغالطے کا امکان بڑھ گیا ہے۔

☆ اس میں بعض الفاظ کے ساتھ اُن کی قدیم اور متروک صورتیں بھی درج ہیں جس سے الفاظ کے ارتقائی اور تدریجی مراحل کو جاننے میں سہولت رہتی ہے۔

☆ بعض عربی اور فارسی مرکبات کی وضاحت اور تشریح میں مؤلف سے لغزش ہوئی ہے۔

فاربس کے اس لغت کی بابت پلیٹس کی رائے ہے کہ اس کی تالیف کے بعد اردو ہندی زبان میں بے پناہ وسعت ہوئی جس کا تذکرہ اس لغت میں شامل نہیں اور ساتھ ہی پلیٹس نے اعتراف بھی کیا کہ فاربس کے لغت کو سند اور معیار کے اعتبار سے اپنے دور کا بہترین لغت قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۴) 'یورپ میں اردو کے مراکز' کا مؤلف، فاربس کے ایک مختصر لغت کی اشاعت کا پتہ دیتا ہے جو رومن رسم الخط میں ۱۸۶۱ء [۲۰۸] میں لندن سے طبع ہوا [۲۰۹]۔ لغت کا نام ہے:

'A smaller Hindustani and English Dictionary'

رابرٹ شیدون ڈوبی (Robert Sheddon Dobbie):

۱۸۴۶۔۴۷ء کے دوران میں لندن سے ایک انگریزی ہندوستانی لغت کی اشاعت عمل میں آئی۔ لغت کا نام ہے:

'A Pocket Dictionary of English and Hindustani' [۲۱۰]

یہ جیبی لغت ہے۔ اس کا مؤلف ایک برطانوی مستشرق، کپتان رابرٹ شیڈون ڈوبی ہے۔

ناتھے برائس (Nathe Brice):

ناتھے برائس کی تالیف 'Dictionary, Hindustani and English' کلکتے سے ۱۸۴۷ء میں طبع ہوئی جو رومن رسم الخط میں لکھی گئی ہے۔[۲۱۱] اس لغت کو بعد نظرِ ثانی لازرس (Lazarus) نے بنارس سے ۱۸۸۰ء میں شائع کیا۔

ڈبلیو بائر (W.Bayer):

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے ایک مستشرق، ڈبلیو بائر کا ذکر کیا ہے۔ بائر کی ڈکشنری درج ذیل عنوان سے کلکتے سے ۱۸۴۸ء میں شائع کی۔[۲۱۲]

'The Hindi Language: Thompson's Dictionary'

ہنری این گرانٹ (Henry N.Grant):

انگریز مستشرق، ہنری گرانٹ کی ڈکشنری ۱۸۵۰ء میں کلکتے سے طبع ہوئی۔ ڈکشنری کا عنوان ہے:

'An Anglo-Hindustani Vocabulary, adapted for European Sojourners in India'[213]

سی پی براؤن (C.P.Brown):

انگریز مستشرق، سی پی براؤن کا لغت مدراس سے ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا۔ لغت کا عنوان ہے:

'The Zillah Dictionary in the Roman Character: explaining the various Words used in Business in India'[214]

پیٹرک کارنیگی (Patrick Carnegy):

الہ آباد سے دفاتر، عدالت، مال گزاری اور صنعت وحرفت کی اصطلاحات پر مبنی ایک اہم لغت ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا۔ لغت کا عنوان ہے:

'Kachahri Technicalities, or a Glossary of Terms Rural, Official and General in daily Use in the Courts of Law and in Illustration of the Tenures, Customs, Art and Manufactures of Hindustan'[215]

کمشنر رائے بریلی، پیٹرک کارنیگی نے اپنی اس تالیف میں بعض اصطلاحات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔[۲۱۶] اصل اردو الفاظ رومن حروف میں درج ہیں اور ان کی تشریح انگریزی زبان میں کی گئی ہے۔ الہ آباد سے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۷۷ء میں طبع ہوا۔

ہاریس ہیمن ولسن (Horace Hayman Wilson):

فرہنگِ ولسن (۱۷۸۶ء۔۱۸۶۰ء) اپنی ضخامت، سند اور معیار کے اعتبار سے نہایت اہم کتاب ہے[۲۱۷] ۔فرہنگ کا نام ہے:

'Glossary of Judicial and Revenue terms'

برطانوی مستشرق، ولسن کی یہ وقیع تالیف لندن سے ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی۔ فاضل مؤلف ایسٹ انڈیا کمپنی میں لائبریرین اور آکسفورڈ یونی ورسٹی میں سنسکرت کا پروفیسر رہا۔ اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں ولسن نے غیر معمولی محنت اور تحقیق سے کام لیا۔ لغت میں حکومتی نظم و نسق کے ہر شعبے کے الفاظ، اصطلاحات اور دیگر تمام الفاظ جو کسی نہ کسی صورت سے عدالتی و مالی قانون سے متعلق ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ اصل الفاظ رومن حروف میں درج کرنے کے علاوہ انھیں ان کے متعلقہ رسم الخط میں بھی لکھا گیا ہے۔ قوسین میں الفاظ کا تلفظ واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ہر لفظ کے سامنے اس کی ماخذ زبان کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ الفاظ کی تشریحات انگریزی زبان میں دی گئی ہیں۔ لغت میں عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت، بنگالی، مرہٹی، تلنگی، تامل اور ملیالم کے الفاظ شامل کیے گئے ہیں۔ ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی ہونے کی نسبت سے عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ نسبتاً زیادہ ہیں۔ سات سو اٹھائیس (۷۲۸) صفحات پر مشتمل اس لغت میں اشاریہ بھی شامل ہے۔ آخر میں چار (۴) صفحات پر مبنی اغلاط نامہ بھی دیا گیا ہے۔

اے سی گنگولی اور این ڈی باسو نے نظرِ ثانی کے بعد اسے ۱۹۴۰ء میں کلکتے سے شائع کیا۔ بعد ازاں ۱۹۸۵ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے اسے دوبارہ طبع کیا۔[۲۱۸]

برٹرینڈ (Bertrand):

۱۸۵۸ء میں فرانسیسی مستشرق، برٹرینڈ (برتراں) کا اردو لغت پیرس سے شائع ہوا۔[۲۱۹]

ریڈ ہنری سٹیوارٹ (Red Henry Stewart):

ریڈ ہنری سٹیوارٹ کا لغت بہ عنوان 'تثلیث اللغات' الہ آباد سے ۱۸۵۸ء میں طبع ہوا۔[۲۲۰] اس لغت میں اصل الفاظ کو پہلے اردو رسم الخط میں درج کیا گیا پھر ناگری اور پھر رومن رسم الخط میں۔ اسی سبب اس لغت کا نام 'تثلیث اللغات' رکھا گیا۔

ایس ڈبلیو فیلن (S.W.Fallon):

۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۹ء تک برطانوی مستشرق، ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن (۱۸۱۷ء۔۱۸۸۰ء) کے اہم اور معیاری لغات کی اشاعت اردو کے علمی ذخیرے میں اضافے کا سبب بنی۔ ڈاکٹر فیلن نے لغت نویسی کے کام کو تا دمِ مرگ جاری رکھا اور مندرجہ ذیل لغات ترتیب دیے:[۲۲۱]

(۱) 'انگریزی ہندی، قانونی و تجارتی' لغت ۱۸۵۸ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔ لغت کا عنوان ہے:

'An English-Hindustani Law and Commercial

Dictionary of Words and Phrases used in civil,

criminal, revenue and mercantile Affairs; designed

especially to assist Translators of Law Papers'[222]

دوسو دو (۲۰۲) صفحات پر مبنی یہ تالیف ایسے الفاظ و محاورات پر مشتمل ہے جو فوج داری، دیوانی، مالیاتی اور تجارتی معاملات میں مترجموں اور قانون دانوں

کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں [223]۔اس کی ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس کی لسانی وتاریخی حیثیت اور قدر سے انکار نہیں۔لسانی مباحث میں انگریزی کا ہندوستانی سے مقابلہ کیا گیا ہے۔یہ لغت انگریزی سے ہندوستانی میں ہے۔آخر میں پانچ (۵) صفحات کا اغلاط نامہ بھی دیا گیا ہے۔اس کا ایک نسخہ بنارس سے لالہ فقیر چند کی نظرِ ثانی کے بعد ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ڈاکٹر عطش درّانی کے مطابق، گارسیں دتاسی نے اس لغت کو اپنے دور کا مفید لغت قرار دیا ہے۔[224]

(۲) ۱۸۷۹ء میں ڈاکٹر فیلن کا لغت میڈیکل ہال پریس، بنارس سے طبع ہوا۔لغت کا عنوان درج ذیل ہے:

'A Hindustani-English law and Commercial Dictionary, comprising many Law Phrases and Notes in addition to the Law Phrases given in the general Dictionary'[225]

موضوع کے اعتبار سے یہ لغت، ۱۸۵۸ء میں شائع شدہ لغت سے مماثل تھا۔فرق بس اتنا تھا کہ ۱۸۵۸ء والا لغت 'انگریزی سے ہندوستانی' میں جب کہ یہ لغت 'ہندوستانی سے انگریزی' میں تھا اور معیار وضخامت میں نسبتاً بہتر تھا [226]۔مگر ۱۸۸۰ء میں فیلن کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے باقی ماندہ تالیف کا کام ان کے معاونین لالہ فقیر چند، لالہ چرنجی لال، لالہ ٹھاکر داس، لالہ جگن ناتھ اور مسٹر واٹلنگ [227] نے مسٹر جے بی بیٹ (Mr.J.B.Bate) کی نگرانی میں مکمل کیا [228]۔فیلن کی جائیداد کے مالک، ایم ڈی فیلن (M.D.Fallon) نے اس کا مقدمہ لکھا [229]۔اس لغت کی تالیف میں مؤلف نے محنتِ شاقہ سے کام لیا۔اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ لغت کے مواد کی فراہمی میں فیلن نے صرف اردو کے تحریری سرمائے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ غیر منقسم ہندوستان کے متعدد ومختلف علاقوں میں گھوم پھر کر اور مختلف شعبہ ہائے حیات سے وابستہ افراد کے تعاون سے اُن کے زیرِ استعمال الفاظ و تراکیب اور محاورات واصطلاحات کا کثیر ذخیرہ فراہم کیا [230]۔ایک ہزار دو سو سولہ (۱۲۱۶) صفحات پر مبنی اس لغت کی قیمت اس دور میں باون (۵۲) روپے مقرّر ہوئی۔

فیلن کے لغت کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

- ☆ لغت میں مقامی بولیوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔
- ☆ اصل الفاظ درج کرنے کے بعد ان کے مآخذ کا حوالہ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، یونانی، لاطینی، ترکی، پرتگالی اور پنجابی وغیرہ سے دیا گیا ہے۔
- ☆ عربی اور فارسی میں پوری دست گاہ نہ ہونے کے سبب بیش تر عربی و فارسی الفاظ کا نہ صرف تلفظ غلط درج ہے بلکہ اِن الفاظ کے مآخذ کے تعین میں بھی تسامحات سامنے آئے ہیں۔
- ☆ ہندی یا سنسکرت الفاظ کو اردو رسم الخط میں لکھنے کے بعد ناگری میں بھی لکھ دیا گیا ہے۔
- ☆ انگریزی محاوروں اور روزمرّوں کا سلیس وبامحاورہ ترجمہ دیا گیا ہے۔
- ☆ مثالیں عام مروّجہ بولیوں سے دی گئیں اور حوالے مستند مصنفین کے شامل کیے گئے ہیں۔
- ☆ یہ لغت چوں کہ بنیادی طور پر انگریزوں کے لیے تالیف کیا گیا تھا اس لیے اسناد و امثال درج کر کے اِن کا انگریزی ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے۔
- ☆ رومن رسم الخط میں درج شعرا، ادبا اور لوک قصّوں کے حوالے اس لغت کی خصوصیت ہے۔
- ☆ فیلن نے اردو کے ادبی الفاظ کو اِس خیال سے اپنے لغت میں بہت کم شامل کیا کہ ایسے الفاظ محض فضیلت مآبی جتانے

کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔یہ درست نہیں۔کسی بھی زبان میں ادبی الفاظ خاص اہمیت رکھتے ہیں اور کوئی لغت ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔

لغت کے آخر میں نو(۹) صفحات پر مشتمل اغلاط نامہ بھی شامل کیا گیا ہے ۔لغت کے دیباچے میں درج معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس امر کا بہ غور مشاہدہ کیا کہ اردو زبان مختلف صوبوں یا ایک ہی صوبے کے مختلف حصوں میں تلفظ اور معانی کے فروق کے ساتھ بولی جاتی ہے۔اسی سبب مؤلف نے ہر لفظ کے متعدد معانی درج کیے اور سند کے طور پر اُن محاورات اور اشعار کو بھی درج کیا جس میں وہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیلن نے اردو زبان کا ہر پہلو سے مطالعہ کیا اور اپنی ڈکشنری کو دیگر ڈکشنریوں سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ فیلن کی ڈکشنری کلاسیکی ڈکشنریوں سے نسبتاً جدید تسلیم کی جاتی ہے۔ خواتین کے ہاں مستعمل الفاظ اور اُن کی مثالیں شامل کر کے فیلن نے آنے والے دور میں لغاتِ انسا کی راہ ہم وار کی۔

اس لغت کے ناشر کے طور پر دو برطانوی کمپنیوں کے نام درج ہیں۔لازرس (Lazarus) کمپنی کی بنارس شاخ اورٹرو بیز اینڈ کمپنی، لندن [۲۳۱] ۔ لغت کو ۱۹۲۷ء میں رائے گلاب سنگھ نے چھوٹی تقطیع پر لاہور سے شائع کیا۔ بعد ازاں اسی ایڈیشن کا

نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن مرکزی اردو بورڈ لاہور(حالیہ 'اردو سائنس بورڈ') نے ،'انگریزی اردو لغت' کے عنوان سے ۱۹۷۶ء میں طبع کیا۔لغت کا ایک نسخہ کتب خانہ مجلسِ زبانِ دفتری پنجاب میں اور ایک نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔[۲۳۲]

(۳) ۱۸۷۹ء میں بنارس سے فیلن کا ایک اور لغت شائع ہوا۔لغت کا عنوان ہے:

'A New Hindustani-English Dictionary, with Illustrations from Hindustani Literature and Folk-Lore'[233]

(۴) ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کے مطابق اردو، لاطینی اور انگریزی ذخیرہ الفاظ پر مبنی ڈاکٹر فیلن کی ایک اور تالیف ۱۸۸۲ء میں بنارس سے طبع ہوئی [۲۳۴] ۔اس کتاب کا عنوان ہے:

'A Vocabulary in Urdu, Latin and English'

(۵) ہندوستانی ضرب الامثال پر مبنی ڈاکٹر فیلن نے ایک مبسوط کتاب درج ذیل عنوان کے تحت ترتیب دی:

'Dictionary of Hindustani Proverbs'

یہ اس نوعیت کی معیاری تالیف ہے۔اس میں مارواڑی، پنجابی اور بھوج پوری کہاوتوں کو بھی شامل کیا گیا۔ کپتان سر ٹیمپل نے نظرِ ثانی کے بعد مرتب کر کے بنارس اور لندن سے ۱۸۸۶ء میں شائع کر دیا۔[۲۳۵]

لغات و قواعد کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں فیلن کے معاونین میں سے ہر کسی نے لغت و زبان پر اپنی کوئی نہ کوئی تالیف ضرور چھوڑی۔[۲۳۶]

ہنری جارج ریورٹی (Henry George Raverty):

۱۸۵۹ء میں ہرٹ فورڈ(Hertford)،انگلستان سے ایک انگریزی ہندوستانی لغت شائع ہوا۔لغت کا عنوان ہے:

'Thesaurus of English and Hindustani Technical Terms

used in Building and other useful Arts; and scientific Manual of Words and Phrases in the higher Branches of Knowledge; containing upwards of five thousands Words not generally to be found in the English and Urdu Dictionaries'[237]

لغت کا مؤلف ایک برطانوی مستشرق، ہنری جارج ریورٹی (۱۸۲۵ء۔۱۹۰۶ء) ہے۔لغت ان اصطلاحات پر مبنی ہے جو فنِ تعمیر اور دوسرے علوم وفنون میں مستعمل ہیں۔ان الفاظ واصطلاحات کی تعداد تخمیناً پانچ ہزار (۵۰۰۰) سے زائد ہے۔[۲۳۸]

رابرٹ کاٹن ماتھر (Robert Cotton Mather):

انگریز مستشرق، رابرٹ کاٹن ماتھر (۱۸۰۸ء۔۱۸۷۷ء) نے عہد نامہ جدید (انجیل) میں موجود الفاظ کو ایک علاحدہ ڈکشنری کی حیثیت سے ۱۸۷۱ء[۲۳۹] میں لندن سے شائع کیا[۲۴۰]۔ڈکشنری کا عنوان ہے:

'Glossary, Hindustani and English, to the new Testament and Psalms'

جی پی ہازل گروو (G.P.Hazel Grove):

آرڈیننس (جنگی) سٹور اور فوجی اصطلاحات پر مشتمل انگریزی ہندوستانی ڈکشنری ۱۸۶۵ء میں ممبئی سے طبع ہوئی۔اس ڈکشنری کا مؤلف، ہازل گروو ہے[۲۴۱]۔ڈکشنری کا نام درج ذیل ہے:

'A Vocabulary, English and Hindustani'

ہنری یول (Henry Yule):

ڈاکٹر آغا افتخار حسین کے مطابق[۲۴۲] 'ہابسن جابسن' (Hobson Jobson) لغاتِ اردو کی تاریخ میں ایک اہم اور منفرد مقام کا حامل لغت ہے۔

اشتقاقی نقطہ نظر سے غالباً اپنی طرز کی یہ پہلی تالیف ہے۔الفاظ کے ماخذ اور معانی کے اعتبار سے جس انداز سے اس کتاب میں مواد سمیٹا گیا وہ اقدام اپنی مثال آپ ہے۔ہابسن جابسن کی اشاعت نتیجہ ہے سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے مستشرق، سر ہنری یول (۱۸۲۰ء۔۱۸۸۹ء) اور برطانوی مستشرق، آرتھر کوک برنل کی (۱۸۴۰ء۔۱۸۸۲ء) کڑی محنت، محققانہ صلاحیتوں اور اردو دوستی کا۔الفاظ پر بیش تر تحقیق یول ہی کی ہے۔آٹھ سو ستر (۸۷۰) صفحات پر مبنی ہابسن جابسن پہلی بار ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔ایک ہزار اکیس (۱۰۲۱) صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن اضافوں کے بعد ۱۹۰۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔

اس فرہنگ میں ان الفاظ ومحاورات کو ذخیرہ کیا گیا ہے جو اس دور کے ہندوستان میں انگریزوں کی بول چال میں رچ بس گئے تھے۔لغت کے مؤلفین نے لغات نویسی کے عام اصولوں سے قطع نظر محض الفاظ ومحاورات کے مطالب اور محلِ استعمال ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بیش تر الفاظ پر اشتقاق، تاریخ اور جغرافیے کے نقطہ نظر سے مدلل بحثیں چھیڑی ہیں۔سند کے طور پر جن مغربی ومشرقی زبانوں کی تحریروں کے حوالے دیے ہیں ان پر درج تاریخوں سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلفین نے تحقیق کی غرض سے متعدد زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، پرتگیزی، ولندیزی، یونانی، عربی، فارسی اور سنسکرت کے قریباً دو ہزار سال قدیم متن سے استفادہ کیا ہے۔

پہلی اشاعت میں چار (۴) صفحات کا دیباچہ ہے۔دیباچے سے اس لغت کے نام اور تالیف کے حوالے سے اہم معلومات ملتی ہیں۔لغت کی تالیف کی بنیاد یول، خط و کتابت کے اس سلسلے کو قرار دیتا ہے جو پالرمو، سسلی کے دوران قیام میں یول اور اس کے مرحوم دوست، آرتھر کوک برنل (Arthur Coke Burnell) کے مابین ہوا اور جو سنہ۱۸۸۲ء یعنی برنل کی وفات تک چلا۔دونوں مستشرقین اپنے تئیں 'Anglo Indian' الفاظ کی فرہنگ ترتیب دے رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے الفاظ کے بارے میں اہم معلومات اور معانی واشتقاق کے حوالے سے تبادلہ خیالات کیا۔برنل کے انتقال کے بعد یول نے اس کام کو تنہا جاری رکھا اور برنل کے فراہم کردہ اہم اور گراں قدر مواد کی بہ دولت اس اصول پر یہ تالیف مرتب کی کہ وہ الفاظ جو ہندوستانی سے انگریزی میں آئے، انھیں شامل کیا جائے۔'ہابسن جابسن'' دو ناموں 'حسن اور حسین' کی بنا پر ہے۔یول کا عقیدہ تھا کہ اس سے 'یول اور برنل' کے ناموں کی طرف اشارہ ملتا ہے اور اس کتاب کا اس سے بہتر کوئی اور نام نہیں ہوسکتا تھا۔

دیباچے کے بعد فہرستِ مضامین ہے اور پھر مقدمہ شروع ہوتا ہے جو دس (۱۰) صفحات پر مشتمل ہے۔مقدمے میں یول نے ہندوستانی الفاظ کی انگریزی میں شمولیّت کی تاریخ بیان کی ہے جو بہ قول یول، ملکہ الزبتھ اوّل کے زمانے سے ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی الفاظ کے قدیم زبانوں، یونانی، عربی اور رومن میں شامل ہوجانے کے بعد فرانسیسی، پرتگالی، لاطینی، ولندیزی اور انگریزی میں ان کی شمولیّت کا ذکر مدلل بحثوں اور مستند حوالوں سے کیا ہے۔مقدمے کے بعد بائیس (۲۲) فرہنگوں کی ایک فہرست دی گئی ہے۔جن میں عام لغات کے ساتھ ساتھ خصوصی استعمال اور فنی اصطلاحات کی فرہنگیں بھی ہیں۔

فرہنگوں کی فہرست کے بعد ہند پرتگیزی زبان کے قواعد اور صوتیات پر مختصر مقالہ ہے۔اس کے بعد سات سو دس (۷۱۰) حوالہ جاتی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ان میں عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، فرانسیسی، جرمن، پرتگیزی، ولندیزی اور متعدد دیگر زبانوں کی کتابیں اور رسائل شامل ہیں۔اس فہرست کے بعد ایک اغلاط نامہ ہے اور پھر اصل فرہنگ کا متن شروع ہوتا ہے۔ ہر لفظ کے جدید معنی، اشتقاق اور معنی کا ارتقا درج کیا گیا ہے۔سند کے طور پر ان تحاریر اور اقتباسات کو درج کیا گیا ہے جن میں یہ لفظ استعمال ہوا۔ ہر اقتباس کے ساتھ کتاب کا نام اور اس کا سالِ اشاعت درج ہے۔

'ہابسن جابسن' تحقیقی نقطہ نظر سے مستند، معیاری اور گراں قدر تالیف ہے جو اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔

سی ایچ بلوم ہارٹ (C.H.Blumhardt):

۱۸۶۷ء میں بلوم ہارٹ کی مرتبہ ڈکشنری سیرام پور سے طبع ہوئی۔ڈکشنری کا عنوان ہے:

'Outline of Amharic, containing an English, Oordoo and Amharic Vocabulary,

Phrases in English, Amharic and a rudimentary Grammar, for the Use of the

Force proceeding to Abyssinia'

امہری (حبشہ کی سرکاری زبان)، اردو اور انگریزی زبان میں مرتبہ یہ ڈکشنری اس فوج کے لیے تالیف کی گئی جو حبشہ جارہی تھی۔[۲۴۳]

جی ای بوراڈیل (G.E.Borradaile):

احاطہ مدراس کے فوجی طلبا کے لیے تالیف کی جانے والی ڈکشنری ۱۸۶۸ء میں مدراس سے شائع ہوئی۔ڈکشنری کا عنوان ہے:

'A Vocabulary, English and Hindustani, for the Use of Military Students,

Madras Presidency'

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے مطابق دو سو چھیالیس (۲۴۶) صفحات کی اس[۲۴۴] ڈکشنری کے ابتدائی ایک دو ہی اوراق موجود ہیں۔مؤلف کا نام، سالِ طبع اور مقامِ اشاعت کا پتہ کتب خانے کے کیٹلاگ رجسٹر ہی سے دست یاب ہوسکا۔

ایچ انڈرس (H.Andras):

'Urdu_English Dictionary' کے عنوان سے ڈکشنری کا ساتواں ایڈیشن، بیپٹسٹ مشن پریس کلکتہ نے (Baptist Mission Press, Calcutta)[۲۴۵] ۱۸۶۹ء میں شائع کیا۔ پہلے ایڈیشنز کا علم نہیں، فقط ساتواں ایڈیشن ہی دست یاب ہے۔ ڈکشنری کا مؤلف، ایچ انڈرس ہے۔

جے ڈبلیو فریل (J.W.Furrell):

۱۸۷۳ء میں فریل کی فرہنگ کلکتے سے چھپی۔ یہ فرہنگ ایسے ہندوستانی مترادفات پر مبنی ہے جو روزمرّہ استعمال میں آتے ہیں۔ مترادفات کے معنوی فروق کو تشریح اور مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ فرہنگ کا عنوان ہے:

'Hindustani Synonyms; a Collection of proximately Synonymous Words in

daily Use in the Hindustani Language: with Explanations of the Differences of

Meaning obtaining

between them'[246]

پاؤلو ماریا ہومیم (Paulo Maria Homem):

پرتگالی مستشرق، پاؤلو ماریا ہومیم کا، پرتگالی، کوکنی، انگریزی اور ہندوستانی لغت بمبئی سے ۱۸۷۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ لغت کا نام درج ذیل ہے:

'Novo Vocabulario em Portuguez, Concanim, Inglez e Hindustani.

Co-ordenado para o uso dos seus patricios que percorrem a India Ingleza'[247]

جے ڈی بیٹ (J.D.Bate):

جے ڈی بیٹ کی ڈکشنری 'A Dictionary of the Hindee Language' کے عنوان سے ۱۸۷۵ء میں بنارس سے طبع ہوئی۔[۲۴۸]

جی ٹی پلنکٹ (G.T.Plunkett):

تین زبانون یعنی فارسی، ہندوستانی اور پشتو کے قواعد و لغات پر مبنی ایک کتاب درج ذیل عنوان سے ۱۸۷۵ء میں لندن سے منظرِ عام پر آئی:

'The Conversation Manual in English, Hindustani,

Persian and Pushto'

اس کا مؤلف جی ٹی پلنکٹ ہے۔[۲۴۹] دوسری بار یہ تالیف ۱۸۹۳ء میں لندن ہی سے طبع ہوئی۔ یہ تالیف بنیادی طور پر گرامر ہے لہذا تفصیلی ذکر گرامر کی ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

فرانسوا دیلونکل (Francois Deloncle):

فرانسیسی مستشرق، فرانسوا دیلونکل نے نام ور فرانسیسی مؤرخ، گارسیں دتاسی کی زیرِنگرانی پیرس میں ۱۸۷۵ء میں اردو لغات پر کام[۲۵۰] شروع کیا جو ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مطابق اس لغت کے فقط بتیس (۳۲) صفحات ہی چھپ سکے۔ دیباچہ گارسیں دتاسی نے تحریر کیا تھا۔ 'اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم' کے مؤلف نے لغت کا سالِ اشاعت ۱۸۷۴ء اور صفحات کی تعداد چوالیس (۴۴) بیان کی ہے[۲۵۱]۔ لغت کا عنوان ہے:

'Dictionaire Hindoustani_Francais Et Francais_Hindoustani, suivi d'un Vocabulaire mythologique, historique et geographique de l' Inde, publie sous la Direction de M.Garcin de Tassy'

ہنری فرڈننڈ بلاک مین (Henry Ferdinand Blochmann):

بلاک مین (۱۸۳۸ء۔۱۸۷۸ء) کی 'English_Hindustani School Dictionary'[۲۵۲] کا آٹھواں ایڈیشن ۱۸۷۷ء میں کلکتے سے چھپا۔ سابقہ ایڈیشنز دست یاب نہیں۔ یہ لغت رومن رسم الخط میں ہے۔

ڈی ایف ڈائس (D.F.Dais):

پانچ زبانوں (انگریزی، پرتگالی، گووی، مرہٹی اور ہندوستانی) پر مشتمل رومن رسم الخط میں ایک فرہنگ ۱۸۷۹ء میں سَتارا (ہندوستان) سے شائع ہوئی۔ فرہنگ کے مطالعے[۲۵۳] سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے پرتگالی الفاظ اردو کی زینت بنے اور کتنے اردو الفاظ پرتگالی زبان میں جا سمائے۔ فرہنگ کا مؤلف، ڈی ایف ڈائس ہے۔ لغت کا عنوان ہے:

'A Vocabulary in five Languages: English, Portuguese, Goa, Marathi and Hindustani'[254]

چارلس جیمز (Charles James):

برطانوی مستشرق، چارلس جیمز کی، 'New Hindustani-English Dictionary'[۲۵۵] ۱۸۷۹ء میں بنارس کے علاوہ لندن سے بھی شائع ہوئی۔ ان ہی دو مقامات سے ۱۸۸۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن سامنے آیا۔

ریورنڈ ہوپر (Reverend Hooper):

چار سو پینتالیس (۴۴۵) صفحات پر مشتمل ایک لغت بہ عنوان، ' عبرانی اردو لغت ' ۱۸۸۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اردو ڈِونٹی کالج لاہور (Urdu Divinty College, Lahore) کے پرنسپل، ریورنڈ ہوپر کی اس تالیف کا مقامِ اشاعت مولوی عبدالحق[۲۵۶] نے 'لاہور'، جب کہ ڈاکٹر عطش درّانی نے رینکنگ (Ranking) کے حوالے سے، مشن پریس کے توسط سے پنجاب ریلیجس بک

سوسائٹی(Religious Book Society)،الہ آباد درج کیا ہے۔کتاب کی دونوں زبانیں،عبرانی اور اردو،ٹائپ میں شائع ہوئیں۔اس لغت کی ترتیب کا انحصار الفاظ کے مادوں پر ہے۔[۲۵۷]

تھامس کریون (Thomas Craven):

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے مطابق[۲۵۸] انگریز مستشرق پادری،تھامس کریون نے درج ذیل لغات مرتب کیے:

(۱) ۱۸۸۱ء میں کریون کا ایک جیبی لغت لکھنؤ سے شائع ہوا۔لغت کا عنوان ہے:

'The Gem Dictionary in English and Hindustani'

اسی سال کریون کی مرتبہ ایک اور ڈکشنری لکھنؤ ہی سے درج ذیل عنوان سے چھپی۔

'The Royal School Dictionary in English and Roman Urdu'

(۲) ۱۸۸۸ء میں کریون کا لغت لندن اور لکھنؤ سے شائع ہوا۔لغت کا نام ہے:

'The Popular Dictionary In English_Hindustani And Hindustani-English'

بعدازاں اسی لغت کو پی ایچ بیڈلے(P.H.Badley)نے نظرِ ثانی اور اضافے کے ساتھ ۱۸۸۹ء میں لکھنؤ سے شائع کیا۔[۲۵۹]

(۳) کریون کی ایک اور ڈکشنری 'The Royal Dictionary, English-Hindustani' لکھنؤ سے ۱۸۹۳ء

میں منظرِ عام پر آئی۔دو حصوں پر مشتمل اس لغت کو دوسری بار میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس نے لکھنؤ ہی سے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا۔

(۴) ۱۹۱۱ء میں کریون کا ایک اور لغت 'نیو رائل ڈکشنری'(New Royal Dictionary) کلکتے سے شائع ہوا۔رومن رسم الخط میں مرتبہ یہ لغت دو حصوں میں منقسم ہے ۔ دو سو پچپن(۲۵۵) صفحات پر مشتمل لغت کا پہلا حصہ انگریز ی سے انگریزی اور ہندوستانی میں ہے۔ جب کہ تین سو تینتالیس(۳۴۳) صفحات پر مبنی دوسرا حصہ ہندوستانی سے ہندوستانی اور انگریزی میں ہے ۔اسی لغت کو نظرِ ثانی اوراضافوں کے بعد بشپ، جے آر چیتامبر (J.R.Chitamber)نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ اس نسخے میں تین سو اٹھائیس(۳۲۸) صفحات پر مبنی حصہ اوّل انگریزی سے ہندوستانی میں اور تین سو بہتر(۳۷۲) صفحات پر مبنی حصہ دوّم ہندوستانی سے انگریزی میں ہے۔

آر ایف ہاچنسن (R.F.Hutchinson):

طبی اصطلاحات پر مبنی ایک فرہنگ ۱۸۸۱ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔آر ایف ہاچنسن کی اس تالیف کا نام ہے:[260]

'Glossary of Medical and Medico_Legal Terms'

ڈبلیو کیگن (W.Keegan):

۱۸۸۲ء میں رومن کیتھولک آرفن پریس نے سردھنے سے ایک لغت اس عنوان سے شائع کیا:

'A Vocabulary in Urdu, Latin and English'

لغت کا مؤلف،ڈبلیو کیگن ہے۔لغت میں اردو الفاظ کے معانی لاطینی اور انگریزی میں دیے گئے ہیں۔[۲۶۱]

جان تھامپسن پلیٹس (John Thompson Platts):

برطانوی مستشرق، جان ٹی پلیٹس (۱۸۳۰ء۔۱۹۰۴ء) جنگِ آزادی کے دوران میں صوبہ جات وسط ہند کے انسپکٹر آف سکولز تھے۔ بعد ازاں ہیڈ ماسٹر بنارس کالج رہے۔ آکسفورڈ میں ۱۸۸۰ء میں فارسی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انڈین سول سروس میں اردو کے ممتحن رہے۔ اردو، ہندی اور انگریزی لغت کے علاوہ ہندوستانی زبان کے قواعد بھی مرتب کیے۔[۲۶۲]

پلیٹس کا لغت 'A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English' لندن سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ پلیٹس نے پہلے کی تمام لغات کا مطالعہ کیا، ان سے استفادہ کیا اور ان پر اضافہ بھی کیا ہے[۲۶۳]۔ اس کی ضخامت ایک ہزار دو سو چوّن (۱۲۵۴) صفحات ہے اور اکثر لغات کی طرح یہ بھی دو کالمی لغت ہے[۲۶۴]۔ ضخامت، معیار، جامعیت اور صحتِ طباعت کے اعتبار سے پلیٹس کی ڈکشنری کو فیلن کی ڈکشنری پر فوقیت حاصل ہے۔ چند صفحات پر مشتمل صحت نامے میں بعض اشتقاقیاتی اضافے اور تبدیلیاں ہیں جو مؤلف کی عرق ریزی اور صحت پسندی کی دلیل ہیں۔[۲۶۵]

پلیٹس نے اپنی ڈکشنری کی درج ذیل چار امتیازی خصوصیات کا ذکر کیا ہے:[۲۶۶]

The distinguishing featuers of the work are:

(1) The space assigned to the etymology of words.

(2) The arrangement of words which are similarly spelt but differently derived into separate paragraphs according to their etymology.

(3) The indicating the post position by means of which an indirectly transitive verb governs its object, and the change of meaning which frequently takes place by the employment of different post positions after a verb.

(4) The admission of numerous words which do not find place in the literary language.

پلیٹس کی ڈکشنری کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

☆ اردو، ٹھیٹھ ہندی، فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کا کثیر ذخیرہ موجود ہے۔

☆ ہر لفظ کے لسانی مآخذ (Etymology) کی نشان دہی اس زبان کے نام کے پہلے حرف کے ذریعے کی گئی ہے۔ شیکسپیئر کے بعد پلیٹس کے ہاں الفاظ کی اشتقاقی کیفیّت کے حوالے سے بہت منضبط اور محققانہ انداز میں پیش رفت ہوئی ہے۔

☆ ایسے الفاظ جن کی اصل تو کچھ اور ہے لیکن جو کسی دوسری زبان کے توسط سے اپنی شکل بدل کر اردو میں داخل ہو گئے ہیں، ان کے مادے (Root) کو بھی بتایا گیا ہے اور اس کے اشتقاق (Derivation) پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مخصوص لفظ کس شکل میں کس زبان سے متعلق ہے اور کس زبان کے توسط سے اردو میں داخل ہوا ہے۔

☆ اصل لفظ اردو کا درج ہے۔ اس کے بعد انگریزی میں اس کے معانی، مصادر اور اس سے بننے والے محاورات درج کیے ہیں۔

ماسوائے دخیل عربی اور فارسی الفاظ کے ہر لفظ کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔

☆ الفاظ کا تلفظ رومن رسم الخط میں درج ہے اور تلفظ کی مختلف صورتوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت تلفظ کی بگڑی ہوئی یا بازار میں مروّج صورت(Corrupt Pronunciation) بھی دی گئی ہے۔

☆ ایسے الفاظ جن کا املا یکساں ہے مگر تلفظ علاحدہ، انھیں الگ الگ اندراجات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پلیٹس کے لغت میں مختلف علاقوں اور طبقوں کے حوالے سے تلفظ کی نشان دہی کی ہے۔

☆ پلیٹس نے ہر لفظ کے ارتقائی مدارج پر روشنی ڈالی ہے۔ یعنی انگریزی الفاظ کے سلسلے میں یونانی اور لاطینی تک، عربی الاصل کے حوالے سے عبرانی تک، فارسی کے حوالے سے قدیم پہلوی تک اور ہندی الاصل کے سلسلے میں سنسکرت تک دیدہ ریزی سے کھوج کی ہے۔

☆ مفردات (Single Words) کے علاوہ لاحقوں سے بننے والے مرکبات کو راس لفظ کی حیثیت دی گئی ہے۔ جب کہ دیگر الفاظ سے بننے والے مرکبات کو ذیلی اندراجات میں رکھا گیا ہے۔ اسی طرح سابقوں کو راس لفظ کی حیثیت دے کر اس سے بننے والے مرکبات کو ذیل میں درج کیا گیا ہے۔

☆ ڈکشنری میں ہر لفظ کے مختلف معنی یا معنوی پہلوؤں کی وضاحت کے ساتھ ساتھ معنوی توسیع اور معنوی تغیر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ معنیاتی تصرفات کی بھی وضاحت ملتی ہے۔

☆ لفظ کی ترکیبی اور محاوراتی شکلوں کے معنی بھی حسبِ ضرورت مترادفات یا تشریحات کی شکل میں دیے گئے ہیں۔

☆ الفاظ کی قواعدی نوعیت کے ساتھ ساتھ ادبی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

بہ حیثیتِ مجموعی پلیٹس کی ڈکشنری اس ارتقا کا نقطۂ عروج معلوم ہوتی ہے جس کی ابتدا سولھویں صدی عیسویں میں عیسائی مشنریوں نے کی تھی۔ لغت نویسی کے سائنسی اصولوں پر مبنی اس لغت کے مطالعے سے مؤلف کے علمی قد، محققانہ صلاحیتوں اور اردو زبان سے گہری انسیّت و دلچسپی کا جو اظہار محسوس ہوتا ہے اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دیگر متقدم مستشرقین کی نسبت لغت کی تالیف کے حوالے سے پلیٹس کا مقصد سیاسی تھا نہ تجارتی۔ بلکہ کلی طور پر تعلیمی و لسانی مقاصد کے تحت اس ڈکشنری کی تالیف عمل میں آئی۔ پلیٹس کے لغت کے بعد بھی مستشرقین نے ذولسانی لغات تالیف کیے مگر وہ پلیٹس کے لغت کی خصوصیات میں کسی قسم کا اضافہ نہ کرسکے۔

۱۹۱۱ء میں شائع ہونے والا نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں اور ۱۸۸۴ء والا نسخہ کتب خانہ مجلس زبانِ دفتری پنجاب میں موجود ہے۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی نے اس کے تین ایڈیشنز بالترتیب سنہ ۱۹۶۰ء، سنہ ۱۹۶۵ء اور سنہ ۱۹۶۸ء میں شائع کیے۔ ۱۹۸۳ء میں اس کا ایک نسخہ سنگِ میل پبلی شرز، لاہور نے بھی شائع کیا۔[۲۶۷]

جارج کلیفورڈ وہٹ ورتھ (George Clifford Whitworth):

برطانوی مستشرق، جارج کلیفورڈ کا لغت 'اینگلو انڈین ڈکشنری' لندن سے ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔ اچھا ضخیم لغت ہے۔ اصل الفاظ رومن میں درج ہیں۔ تشریح انگریزی زبان میں دی گئی ہے۔ ہر لفظ کے سامنے قوسین میں اس کی ماخذ زبان کا نام لکھ دیا گیا ہے۔[۲۶۸] یہ لغت ان الفاظ و اصطلاحات پر مبنی ہے جو دفاتر میں، خصوصاً مال گزاری اور زراعت میں مستعمل ہیں[۲۶۹]۔ تین سو سڑسٹھ (۳۶۷) صفحات پر مبنی اس کا ایک نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

ریورنڈ ایونگ (Reverend Eiving):

ریورنڈ ایونگ کا مُرتبّہ 'یونانی اردو لغت' لدھیانے سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔[۲۷۰]

سائمن میتھیو زایڈوِن کیمپسن (Simon Mathews Edwin Kempson):

ہندوستانی گرامر پر انگریز مستشرق، کیمپسن (۱۸۳۱ء۔۱۸۹۴ء) کی کتاب ۱۸۹۰ء میں درج ذیل نام سے لندن سے شائع ہوئی:

'The Syntax and idioms of Hindustani'

اس کا ایک حصہ ہندوستانی لغات پر مبنی ہے۔ کتاب کے مزید دو ایڈیشنز بالترتیب ۱۸۹۳ء[۲۷۱] اور ۱۹۰۶ء میں لندن ہی سے طبع ہوئے۔[۲۷۲]

اے این فلپس (A.N.Phillips):

۱۸۹۲ء میں برطانوی مستشرق، کرنل فلپس کا لغت لندن سے چھپا۔ لغت کا عنوان ہے:

'Hindustani idioms with Vocabulary and Notes'

لغت ہندوستانی الفاظ و محاورات پر مشتمل ہے۔ قریباً چھ سو اٹھاون (۶۵۸) محاورات کا انگریزی ترجمہ درج کیا گیا ہے۔[۲۷۳]

جے ایف بلوم ہارٹ (J.F.Blumhardt):

'Military Vocabularies. I _ English_Hindustani;' کے عنوان سے جے ایف بلوم ہارٹ کا لغت لندن سے ۱۸۹۲ء میں طبع ہوا۔[۲۷۴]

ایس ایس جیئس (S.S.Dias):

پرتگالی مستشرق[275]، ایس ایس جیئس کا چہار لسانی لغت بمبئی (ممبئی) سے ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔ لغت کا عنوان ہے:

'Tres Mil Vocabulos em Portuguez, Concani, Inglez-e-Industani'

تھامس ولیم بیل (Thomas William Beale):

'An Oriental Biographical Dictionary' کے عنوان سے بیل (سنہ وفات۔۱۸۷۵ء) نے ایک کتاب کی تالیف کا آغاز کیا۔ تالیف ابھی تکمیلی مراحل طے نہ کر پائی تھی کہ مؤلف چل بسا۔ بیل ہی کی خواہش کے مطابق جارج کین (Goerge Keene) نے اسے ترمیم و اضافے کے ساتھ ۱۸۹۴ء میں شائع کیا۔[۲۷۶]

ڈبلیو ایل تھابرن (W.L.Thoburn):

'انگلش ہندوستانی ڈکشنری' کے نام سے تھابرن کی تالیف ۱۸۹۸ء[۲۷۷] میں لکھنؤ سے طبع ہوئی۔[۲۷۸]

پولاک (Pollock):

۱۹۰۰ء میں پولاک کی ایک جیبی ڈکشنری 'Pollock's Pocket Hindustani' کلکتے سے طبع ہوئی۔[۲۷۹]

ایف۔آر۔ایچ چیپ مین (F.R.H.Chapman):

انگریز مستشرق، میجر چیپ مین کا پندرہ سو(۱۵۰۰)الفاظ پر مشتمل ایک مختصر لغت پہلی بار پارک ٹاؤن سے۱۹۰۴ء میں اور دوسری بار دو ہزار دو سو(۲۲۰۰) الفاظ کے ساتھ لندن سے ۱۹۰۸ء میں طبع ہوا۔ رومن رسم الخط میں مرتب کی گئی اس ڈکشنری کا عنوان ہے:[280]

'English_Hindustani Pocket Vocabulary'

جارج رینکنگ (George Ranking):

برطانوی مستشرق، جارج رینکنگ (سنہ پیدائش۔۱۸۵۲ء) نے متعدد انگریزی اردو اور اردو انگریزی لغات ترتیب دیے۔ ۱۹۰۵ء میں رینکنگ کے ایک اہم اور جامع لغت 'انگلش ہندوستانی ڈکشنری' کی اشاعت کلکتے اور لندن سے عمل میں آئی۔ بہ قول ڈاکٹر عطش درّانی اس کا ایک نسخہ احسان دانش کے کتب خانے کی زینت ہے۔[۲۸۱]

ڈی کریون فلاٹ (D.Craven Phillott):

برطانوی مستشرق اور ممتحن بورڈ کلکتہ کے سیکرٹری، کرنل ڈگلس کریون فلاٹ (۱۸۶۰ء۔۱۹۳۰ء) کی ہندوستانی لغات کے ضمن میں تالیفات درج ذیل ہیں:

(۱) کرنل ڈی سی فلاٹ نے گوبن لال کے تعاون سے مختلف پرندون کے نام اور ان کے متبادل انگریزی ناموں پر مشتمل ایک کتاب 'Hindustani_English Vocabulary of Indian birds' کے عنوان سے رومن رسم الخط میں ترتیب دی۔ اناسی (۷۹)صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے کلکتے سے ۱۹۰۸ء میں شائع کیا۔[۲۸۲]

(۲) فلاٹ کی مشہور اور بنیادی تالیف ' ہندوستانی مینوئل' (Hindustani Manual) ہے۔ تین ہزار(۳۰۰۰) الفاظ پر مشتمل اس کتاب کو فلاٹ نے اعلیٰ مدارج کے طلبا کے لیے ترتیب دیا تھا۔ یہ کتاب کلکتے سے ۱۹۱۱ء میں چھپی۔ رومن رسم الخط میں مرتبہ یہ کتاب ڈنکن فاربس کے مینوئل سے زیادہ جامع اور سلیس ہے۔[۲۸۳] انگریزی جملوں کا اردو میں شستہ اور با محاورہ ترجمہ، دونوں زبانوں پر مؤلف کے عبور کا ثبوت ہے۔[۲۸۴] اس کا دوسرا ایڈیشن کلکتے ہی سے ۱۹۱۷ء میں طبع ہوا۔ سر ورق کے مطابق ہندوستانی مینوئل کا عنوان ہے:

'An Eng.-Hind. Vocabulary of 3000 Words for Higher Standard and Proficiency Candidates or The Right Word in the Right place'

(۳) فلاٹ کی ایک اہم تالیف ' خزینہ محاوراتِ اردو' کلکتے سے۱۹۱۲ء میں طبع ہوئی۔ اس میں اردو محاورات کا ترجمہ انگریزی میں درج کیا گیا ہے۔[۲۸۵]

جے این سین (J.N.Sane):

جے این سین کی تالیف '20th Century, English-Urdu Dictionary' ۱۹۱۲ء میں الہ آباد سے منظرِ عام پر آئی۔ اس میں اردو الفاظ ٹائپ میں درج ہیں۔[۲۸۶]

ایس سی پال (S.C.Paul):

برطانوی مستشرق، ڈاکٹر ایس سی پال (۱۸۶۸ء۔۱۹۴۲ء) کی تالیف درج ذیل نام سے ۱۹۳۲ء میں الہ آباد سے طبع ہوئی:

'New Royal Persian-English Dictionary'

'پرشین' سے مؤلف کی مراد 'اردو' ہے۔[۲۸۷]

ولیم تھامس وائٹ بریخٹ (William Thomas Weitbrecht):

۱۹۳۸ء میں ولیم تھامس وائٹ بریخٹ کی ایک مختلف و منفرد تالیف 'معجم العربیہ' کے عنوان سے منظرِ عام پر آئی۔ یہ عربی اردو لغت ہے جسے پنجاب ایڈوائزری بورڈ برائے کتب لاہور نے ایک ہزار تین سو اکہتر (۱۳۷۱) صفحات میں شائع کیا۔ دیباچے میں مؤلف نے عربی انگریزی لغت اور ترجمے کے مسائل پر بحث سمیٹی ہے۔ اضافی صفحات میں صحت نامہ لغت بھی شامل ہے۔[۲۸۸]

نامکمل حوالوں کی حامل تالیفات

ذیل میں درج ہندوستانی لغات پر مستشرقین کی اُن تالیفات کا ذکر ہے جن کے حوالے نامکمل ہیں:

☆ 'یورپ میں اردو' کے مؤلف نے ایک یورپی مستشرق، پالی نس بارتھولو میو (۱۷۴۸ء۔۱۸۰۶ء) کا ذکر کیا ہے کہ پالی نس بارتھولُومیو (Paulinus Bartholomaeo) نے ایک کتاب کا دیباچہ لکھا ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے:

'Alphabeta Indica, id est Granthamicum seu Sanscrdamico-Malabaricum, Indostanum sive Vanarense, Nagaricum Vulgare, et Talenganicum'[289]

یہ کتاب ہندوستانی ابجد پر ہے اور ۱۷۹۱ء میں روم سے شائع ہوئی۔ کتاب کا مؤلف نامعلوم ہے۔[۲۹۰]

☆ ڈاکٹر سیّد سلطان محمود حسین کے مطابق ڈبلن (Dublin) یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر، ولیم رائٹ (W.Wright) نے ایک 'انگریزی ہندوستانی لغت' بھی تالیف کیا ہے۔ گارسیں دتاسی کے مطابق اس لغت کی تدوین میں بہترین مآخذ تک رسائی حاصل کی گئی اور ولیم رائٹ (۱۸۳۰ء۔۱۸۸۹ء) نے اصل کتابوں کے ذاتی مطالعے سے بھر پور استفادہ کیا۔ لغت کا سنہ اشاعت معلوم نہ ہوسکا۔[۲۹۱]

☆ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، کونکنی اور دکھنی (اردوئے قدیم) میں مرتبہ ایک قدیم لغت کا ذکر کرتے ہیں۔ کتاب میں لاطینی مترادفات، قواعد اور کونکنی دکھنی لغات کے علاوہ ایک پوری فصل دکھنی اور کونکنی بولیوں کی خصوصیات پر لکھی گئی ہے۔ لغت کا مؤلف ایک عیسائی مشنری، اِگنا سیو آرکامونے (Ignacio Arcamone) تھا۔ اِگناسیو ۱۶۱۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۸۳ء میں وفات پائی۔

لغت کا سالِ اشاعت معلوم نہ ہوسکا۔[۲۹۲]

☆ 'ہندوستانی گرامر از بنجمن شلز' میں گیساپے ماریا دی برنینی دا گاگنانو(Guisappe Maria De Bernini) نامی ایک مستشرق کا ذکر موجود ہے۔مؤلف کے مطابق برنینی (۱۷۰۹ء۔۱۷۶۱ء) نے ہندوستانی میں کئی کتب لکھیں۔لغت پر اس کی دو اہم تالیفات ہیں: 'ہندی لاطینی اطالوی لغت' اور 'اطالوی ہندی لغت'۔لغات کا سال اشاعت معلوم نہیں۔[۲۹۳]

☆ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ایک پرتگالی مستشرق، یوجینو تری گیرُس(Eugino Trigueiros) کی مرتبہ دو اہم لغات کا ذکر کیا ہے۔یو جینو تری گیرُس (۱۶۸۶ء۔۱۷۴۱ء)نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ برِصغیر کے مختلف علاقوں میں بسر کیا۔ یوجینو کی مرتبہ ان دو لغات کا پتہ ملتا ہے:

(۱) پرتگالی ہندوستانی فارسی لغت:

'Nomes de Consas a Mezin Has em Portugues e Indostan,Oer.Persico'

(۲) لغتِ زبانِ ہندوستانی:

'Fragments de un Vocabulario de Lingua Indostana'

لغات کا سالِ اشاعت نامعلوم ہے۔[۲۹۴]

☆ ایک عیسائی مشنری، سٹیفامس پیٹرو(سنہ وفات۔۱۷۶۶ء) کے حوالے سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کچھ معلومات بہم پہنچائی ہیں جن کے مطابق سٹیفامس پیٹرو(Stephamus Petro) مالا بار مشن سے منسلک تھے ۔ ہندوستانی(اردو) پر اُن کی دو اہم کتابیں تالیف کیں ۔ایک کتاب بہ عنوان:

'Alphabetum Indostanum, cui Grammatica,

Dictionariolum et Doctrina Christiana'

ہندوستانی کے حروفِ تہجی، قواعد و لغت اور عیسائیت کے حوالے سے کچھ تحاریر پر مشتمل ہے۔ ان کی دوسری تالیف 'اطالوی ہندوستانی۔ ہندوستانی اطالوی' لغت ہے۔اس کا قلمی نسخہ بھارت کے شہر الہ آباد میں موجود ہے۔[۲۹۵]

اردو لغت نویسی کی ابتدا و ترقی کے ضمن میں یورپی اور بالخصوص انگریز مستشرقین کی علمی و تحقیقی کاوشیں لائقِ صد تحسین ہیں۔ابتدا میں مستشرقین نے انفرادی ضرورت کے تحت ذاتی ڈائریوں کی صورت لغات ترتیب دیے۔ان لغات کی اہمیت فہرست ہائے الفاظ سے کسی بھی طرح زیادہ نہ تھی۔ابتدائی دور کی بعض لغات اور لغات نما ذاتی استعمال و آموزش کی مخصوص ڈائریوں سے قطع نظر دیگر نگارشات گراں قدر ہیں۔ مذکورہ بالا قریباً سبھی لغات، جان شیکسپیئر، ڈنکن فاربس، فیلن اور پلیٹس کے لغات سے استفادے کے بعد منظرِ عام پر آئے۔اپنے دور کے اعتبار سے ڈاکٹر گل کرسٹ، ڈاکٹر ولیم ہنٹر، جان شیکسپیئر اور ڈنکن فاربس کے لغات بنیادی حیثیت کے حامل رہے۔گل کرسٹ کا لغت اگرچہ اپنی بعض مضحکہ خیز اغلاط کی بسبب تنقید کا نشانہ بنا مگر اس کے باوجود محنت سے تالیف کیے گئے اس لغت کی اہمیت سے انکار نہیں۔اسی طرح جان شیکسپیئر کے لغت نے مابعد مؤلفہ لغات کے لیے مآخذ کا کام کیا۔ان سب میں بھی فیلن اور پلیٹس کے لغات کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔مستشرقین کے لغات کا اجتماعی مگر اجمالی جائزہ درج ذیل نکات پر منتج ہوتا ہے:

☆ مستشرقین کی ابتدائی تالیفات، قواعد اور لغات دونوں پر مشتمل ہیں۔بعض کتابیں بنیادی حیثیت سے لغات ہونے کے باوجود اردو/ ہندوستانی زبان کے قواعد پر چند صفحات یا ضخیم مقالے کی حامل ہیں۔اسی طرح قواعد کی بعض کتب میں مختصر فرہنگ بہ طور اشاریہ یا ضمیمہ شامل ہے۔ جان جوشوا کیٹلر، بنجمن شُلز ے، جیفر گوسن اور ہنری ہیرس کی تالیفات اس نوع کی قابلِ قدر مثالیں ہیں۔

☆ مخصوص لسانی مقاصد کے تحت تالیف کیے جانے کے سبب مستشرقین کے لغات کا ذولسانی، سہ لسانی اور بعض اوقات چہار لسانی ہونا کئی لحاظ سے مفید ثابت ہوا۔ ان لغات کے توسط سے کئی زبانوں اور ان کے رسوم الخط کو ابتدائی سطح پر بآسانی سمجھا اور سیکھا جا سکتا ہے۔ اس امر کی عمدہ مثال پلیٹس کا لغت ہے جو کئی مقامی زبانوں کے علاوہ دکنی الفاظ کے وسیع ذخیرے کو محیط ہونے کی بنا پر بے حد مفید اور کار آمد لغت ہے۔

☆ مستشرقین کے قریباً سبھی لغات دو کالمی ہیں جو اکثر لغات کی روایت ہے۔

☆ مستشرقین کے لغات میں اعراب کے نظام کا التزام موجود ہے۔ لفظوں کے درست تلفظ اور بامحاورہ ادائیگی کے ضمن میں یہ نظام بلاشبہ اہمیت کا حامل ہے مگر اس کے باوجود خامیوں سے پاک نہیں۔ اس نظام کی بڑی قباحت یہی ہے کہ کاتب کی ذراسی غفلت کے سبب اعراب بدل جانے سے لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں جس سے نہ صرف لغت کا معیار متاثر ہوتا ہے بلکہ تلفظ و مفہوم کی ایسی غلطیاں راہ پا جاتی ہیں جن سے زبان و بیان کو ہونے والے نقصان کی تلافی آسانی سے ممکن نہیں۔

☆ مستشرقین کے شائع کردہ زیادہ تر لغات رومن رسم الخط میں ہیں۔ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں:

(۱) لغت نویسی کا یہ سلسلہ چوں کہ مخصوص مقاصد کے تحت آغاز پذیر ہوا اسی سبب کوشش یہ کی گئی کہ زبان سیکھنے والے نوواردوں کے لیے اردو/ہندوستانی آموزش کا سلسلہ آسان سے آسان تر بنایا جا سکے۔ یہ اُسی صورت ممکن تھا کہ اردو سکھاتے وقت غیر ملکیوں کو پیچیدہ اردو حروفِ تہجی سے بے نیاز کر دیا جائے۔

(۲) اُس دور میں چوں کہ اردو کو ہندی سے علاحدہ انفرادی زبان کی حیثیت سے نہیں پہچانا جاتا تھا اسی لیے مستشرقین نے بہ ظاہر ایک زبان کے دو مختلف رسوم الخط (اردو اور دیو ناگری) کی بھول بھلیوں میں مغربی ملازمین اور دیگر غیر ملکی باشندوں کو الجھانے کے بہ جائے رومن رسم الخط کو آموزشِ زبانِ اردو کے لیے ناگزیر سمجھا۔

☆ مستشرقین کے لغات کی مشترکہ و بنیادی خصوصیت اشتقاق (Etymology) کا التزام ہے۔ ہر لفظ کی اشتقاقی نوعیت کے بیان میں مستشرق لغات نویسوں نے حتی المقدور صحت مندانہ تحقیق سے کام لیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس ضمن میں کئی تسامحات سامنے آتے ہیں۔ ذولسانی لغات میں لفظ کی اشتقاقی چھان بین کی اوّلین مثال جان شیکسپیئر کے لغت سے ملتی ہے۔ فیلن نے ہر لفظ کے ساتھ ماٰخذ زبان کی علامت درج کی مگر لفظ کی اصل تک رسائی میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ پلیٹس کا لغت اس حوالے سے منضبط اور محققانہ پیش رفت کی عمدہ مثال ہے۔ پلیٹس نے ہر لفظ کے اصل کی نہ صرف نشان دہی کی بلکہ لفظ کی اصل شکل اور ارتقائی مدارج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں دیگر زبانوں کے دخیل اردو/ہندوستانی الفاظ کے اصل ماٰخذ تک رسائی کی کاوش بھی کی ہے۔

☆ انیسویں صدی کے مؤلفہ بعض اہم لغات میں مستشرقین نے لفظ کی اشتقاقی نوعیت کے ساتھ ساتھ قواعدی نوعیت کے بیان و تصریح کا اہتمام بھی کیا ہے۔ تحقیق کی یہ عمدہ روایت ڈنکن فاربس، فیلن اور پلیٹس کے لغات کی خاصیت ہے۔ فاربس کے ہاں ہر لفظ کی تصریح مل جاتی ہے کہ وہ اسم ہے، فعل ہے یا حرف۔ اگر اسم ہے تو مذکر ہے یا مؤنث، واحد ہے یا جمع، وغیرہ وغیرہ۔ اسی خوبی کی بنا پر فاربس کے لغت کو اپنے پیش رووں کے لغات میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ لفظ کے ماٰخذ کا کھوج اور قواعدی حیثیت کی وضاحت پر توجہ اردو لغت نویسی کی روایت میں مفید اضافے کا سبب بنی۔

☆ قریباً سبھی مستشرقین نے اپنی تالیفات میں معنی کی وضاحت میں بہ طور سند ادیبوں اور شاعروں کے اشعار یا جملے رقم کیے ہیں۔ اکثر مقامات پر درج یہ

مثالیں درست ہیں مگر بعض اوقات معنی کی صحیح تفہیم نہ ہونے کے سبب درج اشعار یا جملے معنی کی صراحت سے قاصر ہیں۔ اس کی بڑی وجہ مؤلفین کا غیر زبان ہونا ہے۔ اہلِ زبان کو زبان کی سوجھ بوجھ کا قدرتی ملکہ ہوتا ہے جو اکتساب کرنے والے غیر ملکیوں کی علمیت، مطالعے اور محنت پر بہ ہر حال حاوی رہتا ہے۔ فاربس کا لغت ایسی مثالوں اور سندی شعروں سے مبرّا ہے۔

☆ مستشرقین کے بیش تر لغات میں ادبی زبان کے لفظی سرمائے کا فقدان فنی اعتبار سے ان کی بنیادی خامی ہے۔ یہ امر دو وجوہ کی بنا پر ہے:

(۱) لغت کی تالیف کا بنیادی مقصد مغربی افراد کو مقامی بول چال سکھانے کے لیے آموزشِ اردو کو ممکن بنانا تھا۔ اس سلسلے میں مستشرق مؤلفین نے بول چال کی زبان کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے زبان کے ادبی پہلو کو ایک حد تک اہمیت دی۔ بعض نے زبان کے فصیح اور غیر فصیح، دونوں طرح کے الفاظ بلا امتیاز ''زبان کے استعمالات'' کے نام پر لغت میں جمع کر دیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لغات میں علاقائی بولیوں کے الفاظ جگہ پانے لگے۔ مستشرقین کے پیش رو لغات نویس کیٹلر اور شُلزے کے بھی پیشِ نظر زبان کی ادبی اور ٹکسالی صورت نہیں بلکہ بول چال کی زبان تھی۔ فیلن کا لغت عوامی زبان کے الفاظ و محاورات سے بھر پور ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو بول چال کی زبان سیکھنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ تاہم اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پلیٹس نے البتہ اپنے پیش رو ؤں کے بر خلاف ادبی الفاظ کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی۔ خصوصاً میر و سودا اور انشا و مصحفی کے علاوہ نظیر اکبر الہ آبادی کے کلام میں استعمال ہونے والے متعدد الفاظ اس لغت میں موجود ہیں۔

(۲) اردو کے ادبی سرمائے سے مستشرقین کی کم واقفیت بھی لغات میں عوامی زبان کے استعمال کا سبب بنی۔ ہر لغت نویس نے اپنے پیش رو لغات نویسوں سے ذخیرہ الفاظ نقل کیا اور اپنے طور پر بول چال کے کچھ الفاظ اضافہ کر دیے۔
اردو کے ادبی سرمائے سے تہی دامن ہونے کی وجہ سے یہ لغات اہلِ زبان ہندوستانیوں کے لیے سریع فائدے کا سبب نہ بن سکے۔ اردو لغت نویسی کی تحریک میں البتہ ان کا وجود سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆ بعد کے دور میں تالیف کیے گئے کچھ لغات میں لفظ کے تلفظ کی مختلف صورتوں کو ظاہر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں پلیٹس کی تحقیق اور محنت قابلِ ستائش ہے۔ لغت میں پہلے لفظ کا معیاری (Standard) تلفظ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کا عوامی تلفظ تحریر کیا گیا ہے جس کے لیے وہ لفظ 'Vulgar' کا استعمال کرتا ہے۔ حسبِ ضرورت تلفظ کی بگڑی ہوئی یا بازار میں مروّج شکل (Corrupt Pronounciation) بھی درج کر دی گئی ہے۔ اس حوالے سے یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ جدید لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں تلفظ کے لیے 'Vulgar' یا 'Corrupt' جیسے الفاظ کی تخصیص معنی نہیں رکھتی اور تلفظ کی ان مختلف صورتوں کو 'Accental Variations' کے تحت درج کیا جائے گا۔

مستشرق مؤلفین کے لیے اتنا اہم تالیفی عمل بنا کسی مدد کے عمدگی و معیار سے انجام دینا قطعاً آسان نہ تھا۔ الفاظ کے معنی، معنوی تصرفات اور خصوصاً تلفظ کی سند کے لیے مستشرقین کو قدرتی طور پر زبان برتنے والے مقامی اہلِ علم کا تعاون درپیش رہا۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اہلِ زبان میں لغت نویسی کی نہ صرف تحریک پیدا ہوئی بلکہ انھوں نے لغت نویسی کا قیمتی تجربہ بھی حاصل کیا جو ادبیاتِ اردو کے حق میں نعمت ثابت ہوا۔

باب سِوُم۔ اردو میں مستشرقین کی لسانی تحقیقات (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)

فصل سِوُم

اردو کے مستشرق قواعد نگار

کسی بھی دور میں زبان برتنے کے اصول وقواعد دراصل زبان بولنے والے افراد، بالخصوص شعرا اور نثر نگار، سے غیر ارادی طور پر خود بہ خود تشکیل پاتے ہیں اور اہلِ زبان ہی ان اصولوں میں تصرفات کا حق رکھتے ہیں۔ صرفی ونحوی اصول وقواعد دراصل ایک خاص دور میں زبان کی خاص صورت اور ساختیاتی ڈھانچے سے اس کے بولنے والوں (اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان) کو متعارف کرانے کا ذریعہ ہیں۔ ارتقائی مراحل میں، گویا ایک لسانی دور سے دوسرے لسانی دور میں داخل ہوتے ہوئے جب زبان کروٹ لیتی ہے تو اس کی قواعدی نوعیت بھی ردّ و بدل کا شکار ہوتی ہے۔ زبان کی یہ کروٹ ارادی ہوتی ہے اور نہ ہی اچانک۔ اس کروٹ کا عمل زبان کے متروکات پر منتج ہوتا ہے۔ متروکات کی بنا پر کسی بھی زبان کے ایک لسانی دور کو دوسرے لسانی دور سے ممیّز کیا جا سکتا ہے۔

کوئی بھی زندہ زبان کسی واضح اصول اور قاعدے کی پابند نہیں ہوتی اسی سبب اہلِ زبان کو اپنی زبان کے قواعد واصول مرتب کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اُن کا پابند ہونے کی۔ تاریخ سے واضح ہے کہ قواعد نگاری کبھی بھی محض علمی مشغلے کے تحت نہیں کی گئی بلکہ اس مقصد کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی عملی پہلو رہا۔ یہ تالیفی عمل یا تو زبان کے بدلتے ہوئے محاورے کے پیشِ نظر زبان کی اصل صورت کی بقا کے لیے انجام دیا گیا؛ جیسا کہ سنسکرت کے ابتدائی قواعد نگاروں نے کیا۔ یا پھر کسی قدیم مصنف یا قدیم زبان کی تفہیم وتشریح اور تعلیم وتدریس کے لیے اِس کے اصول وقواعد مرتب کرنے کی طرف توجہ کی گئی؛ جیسا کہ یونانیوں نے ہومر کے مطالعے کے ضمن میں یونانی قواعد کی طرف توجہ کی۔ ضرورت اُس صورت میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے جب ایک زبان بولنے والے مخصوص مقاصد کے تحت کسی دوسری زبان کی طرف رجوع کریں۔ کسی بھی زبان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس زبان کے قواعد (گرامر) کو جانا جائے۔ زبان کے قواعد کی زیادہ ضرورت ان غیر اہلِ زبان کو ہوتی ہے جو اسے جاننے اور سیکھنے کے خواہش مند ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین نے اردو/ ہندوستانی زبان کو جاننے، سمجھنے اور سیکھنے کے لیے اس کے لغات وقواعد کی طرف رجوع کیا۔ اہلِ زبان کا دامن اس تالیفی سرمائے سے خالی پا کر انھوں نے اردو/ ہندوستانی زبان کے قواعد کی ترتیب وتالیف کی طرف تحقیقی قدم بڑھایا جو بہ ہر حال اہلِ زبان کی معاونت کے بغیر نہ تھا۔ ہندوستانی زبان سیکھنے کے حوالے سے مستشرقین کے مقاصد کی نوعیت سے قطع نظر اس زبان کے قواعد کی تدوین وتالیف کے ضمن میں ان کی کاوشیں لائقِ صد تحسین ہیں۔

مستشرقین نے اردو/ ہندی قواعد کی ترتیب وتدوین انگریزی قواعد کے ڈھانچے پر کی۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> جن مغربی مصنفین نے ہندوستانی کی قواعد لکھی ہے ان میں سے اکثر کے پیشِ نظر انگریزی زبان کی قواعد کا ڈھانچہ ہے جو خود لاطینی قواعد کے نمونوں پر لکھی گئی ہے۔ اس لیے بعض اصطلاحیں اور بحثیں اس میں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ۔۔ بہت کم مغربی مصنفین ایسے ہیں جو اردو زبان کے مزاج اور اس کی ساخت سے کماحقہ واقف ہیں۔ ان میں سے بعض عربی یا فارسی کے عالم ہیں اور وہ اردو کی قواعد کو فارسی قواعد کے نقشے کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں۔ مغربی قواعد نگاروں میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور گارسیں دتاسی دو ایسے فاضل نظر آتے ہیں جو اردو زبان کے اپنے مزاج سے واقف ہیں۔[۲۹۶]

۱۷۸۴ء میں فرانسیسی مستشرق، اوساں(Aussant) کا لغت طبع ہوا۔ لغت کے شروع میں وہ نوٹ ہے جس میں اوساں نے اردو زبان کے مخالفین کے اِس اعتراض کا جواب دیا ہے، جس کے تحت اردو زبان اس قابل نہیں کہ اس کے قواعد ترتیب دیے جا سکیں۔ اوساں کا بیان ہے:

گرامر کے بغیر کسی زبان کو سیکھنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص موسیقی کے اصول سے واقف ہوئے بغیر کوئی ساز بجانا شروع کر دے۔۔۔اردو زبان پر جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس زبان میں قواعد کے اصول متعین کیے جانے کی صلاحیت نہیں اور یہ کہ اردو زبان فارسی زبان سے اس قدر منسلک ہے کہ اسے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اردو زبان میں قواعد کے اصول متعین کیے جانے کی پوری پوری صلاحیت ہے اور اگر کوئی شخص اردو اور فارسی کی زبانیں سیکھنا چاہے تو بہتر ہوگا کہ وہ اردو قواعد سے ابتدا کرے۔ اس اعتراض میں بھی کوئی جان نہیں کہ اردو میں فارسی کے الفاظ کی بہتات ہے اس لیے اردو سیکھنے کی ضرورت نہیں صرف فارسی کافی ہے۔ انگریزی زبان میں یونانی الاصل الفاظ کی بہتات ہے لیکن اس کے باوجود انگریزی زبان پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ جو فارسی الفاظ اردو میں آ گئے ہیں وہ زیادہ تر اردو قواعد کے اصولوں کے لحاظ سے استعمال ہوتے ہیں نہ کہ فارسی قواعد کے اصولوں کے لحاظ سے۔ [۲۹۷]

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو سیکھنے کے خواہش مند مستشرقین کو ابتدا میں کن مسائل سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اردو کے مستشرق قواعد نگار اور ان کی تالیفات کا سنین وار ذکر اس طرح سے ہے:-

جان جوشوا کیٹیلر (Joan Josua Ketelaar):

اردو /ہندوستانی زبان کے قواعد پہلی بار ایک ڈچ سکالر، جان جوشوا کیٹیلر (۱۶۵۹ء۔۱۷۱۸ء) کے ہاتھوں مرتب ہوئے۔ یہ ڈچ مستشرق مذہب میں لوتھر کا پیرو (Lutheran) تھا۔ کیٹیلر نے اردو/ ہندوستانی گرامر پر مبنی ایک کتاب، 'لنگوا ہندوستانیکا' (Lingua Hindustanica) تالیف کی جسے ڈیوڈ مل (David Mill) نے ۱۷۴۳ء میں اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں لائڈن سے شائع کیا۔ ڈیوڈ مل نے کتاب کے متن کو اپنی تالیف کے ایک حصے میں ضم کر لیا تھا جس کا عنوان 'Miscellanea Orientalia' ہے [۲۹۸]۔ کیٹیلر نے یہ قواعد ۱۶۹۸ء میں بہ مقام آگرہ مکمل کی [۲۹۹]۔ اس کتاب کا پورا نام ہے:

'Instructie of Onderwijsinghe der Hindoustanse en Persiaanse nevens haare declinatie en conjugationes, als mede taalen, vergelijckingh der Hindoustanse met de Hollandse maat en gewigten mitsgaders beduijdingh, eeniger Moorse naamen, etc.'

(ہدایت یا تعلیمِ زبان ہندوستانی و فارسی ان کی تصریف و مطابقت فعل نیز ہندوستانی اور ڈچ پیمانوں اور اوزان کا موازنہ اور چند مسلمان ناموں کے معانی) [۳۰۰]

کیٹیلر پولینڈ کے شہر، ڈانزک (Danziq ۔موجودہ، Gdansk) کے نزدیکی قصبے، البنگ (Elbing) میں ایک جلد ساز کے گھر پیدا ہوا۔ ۱۶۸۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں شِپ مین (Ship Man) کے طور پر ملازم ہو گیا۔ بٹاویا (جکارتہ) کے راستے ممبئی کے شمال میں سورت کی بندرگاہ پر پہنچا۔ یہاں وہ کمپنی

میں کلرک ہوا اور پھر ترقی کر کے ۱۶۸۷ء میں اسسٹنٹ اور ۱۶۹۶ء میں کھاتے دار (Book Keeper) ہوا۔ بعدازاں احمد آباد میں نائب ناظمِ تجارت اور ۱۷۰۰ء میں آگرہ میں ناظمِ تجارت مقرر ہوا۔ ۱۷۰۵ء میں اس نے جونیئر مرچنٹ کی حیثیت سے اور ۱۷۰۷ء میں تجارتی مشن کے سربراہ کے طور پر عرب ممالک کا سفر کیا۔ ولندیزیوں کی طرف سے، ۱۷۰۸ء تا ۱۷۱۲ء، بہادر شاہ اوّل اور جہاں دار شاہ کے درباروں میں بہ طور ڈچ سفیر کے رہا۔ ۱۷۱۶ء تک وہ سورت میں 'ڈائریکٹر آف ٹریڈ' (Director Of Trade) رہا۔ بعد میں وہ ایران کا سفیر مقرر ہوا۔ اصفہان سے واپسی پر خلیج فارس کے مقام، گمبرون (Gambroon) میں اسے جان لیوا بخار نے آن گھیرا جس سے اس کا انتقال ہو گیا۔

کیٹیلر کی گرامر درج ذیل خصوصیات کی حامل ہے:

☆ ''لنگوا ہندوستانیکا'' ڈچ زبان میں ہے۔ ڈیوڈمل نے اس کا لاطینی ترجمہ شائع کیا تھا۔

☆ ہندوستانی الفاظ اور عبارتیں رومن رسم الخط میں درج ہیں۔

☆ الفاظ کا املا ڈچ زبان کے طریقۂ تلفظ کے مطابق ہے۔[۳۰۱]

☆ قواعد میں حرف 'نے' (جو زمانہ ماضی میں حالتِ فاعلی کے لیے استعمال ہوتا ہے) کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا جب کہ اُس زمانے میں یہ مستعمل تھا۔

☆ کیٹیلر نے 'ہم' کے علاوہ 'آپ' کو بھی (جو گجراتی زبان میں استعمال ہوتا ہے) جمع متکلم کا ضمیر بتایا ہے۔ اس امر کا سبب کیٹیلر کا سورت میں دورانِ قیام اردو بولنے والوں سے اس گجراتی لفظ کو اسی طرز پر بولتے سننا ہو سکتا ہے۔ گویا بعد میں آنے والے مستشرقین ہی کی طرح کیٹیلر کو زبان کی ادبی و ٹکسالی صورت سے سروکار نہ تھا بلکہ قواعد شناسی اور قواعد آموزی سے وہ فقط بول چال کی زبان میں مہارت حاصل کر کے اپنے اغراض میں کام یابی کا خواہش مند تھا۔[۳۰۲]

☆ کتاب میں دیو ناگری رسم الخط کے کچھ نمونے بھی دیے گئے ہیں اور ہندوستانی زبان مگر رومن اسم الخط میں حضرت عیسیٰ کی دعاؤں پر مشتمل انجیل (Bible) کے چند مقدس اقتباسات کا ترجمہ اور اوامر عشرہ (Ten Commandments) بھی درج کیے گئے ہیں۔ ذیل میں اُس کا ترجمہ شدہ ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

یہ ترجمہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ ابتدائی اٹھارہویں صدی کی اردو / ہندوستانی نثر کا نہ صرف پہلا بلکہ قابلِ قدر نمونہ فراہم کرتا ہے[۳۰۳]۔ ایک طویل مدت تک محققین اس امر پر متفق تھے کہ کیٹیلر کی کتاب کا ایک ہی نسخہ دست یاب ہے، مگر عہدِ حاضر کی مستشرق اور ''ہمالیہ سٹڈیز'' کی ماہر ایک ڈچ خاتون، انا پٹلووانی (Anna Pytlowany) نے اپنے مضمون، 'دی ارلیئسٹ ہندوستانی گرامر' (The Earliest Hindustani Grammar) میں بیان کیا ہے:

> ''ایک طویل مدت تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ 'National Archives' ہیگ میں موجود مخطوطہ اپنی نوعیت کا واحد کام اور ڈیوڈمل کے کام کا ماخذ ہے۔ معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا تاہم کیٹیلر کی ہندوستانی قواعد کے مزید دو مخطوطوں کی دریافت کا مطلب ہے کہ تین مخطوطوں اور مل کے ایڈیشن کے درمیان تقابل لازمی تھا۔ اب کیٹیلر کی ہندوستانی قواعد کے تین مخطوطے ہیں۔''[۳۰۴]

کیٹیلر کی گرامر کے دست یاب تینوں نسخوں کی تفصیل یہ ہے:

(1) The Hague, National Archives, Inv. no. 1.13.19.02, Coll. Sypestein, Supplement no. 2 (150 p.: iv (introduction) +125+21 (index)).

(2) Paris, Hotel Turgot, Fundation Custodia library, Institut Neerlandais, Inv. no. 1991_ A615(183p.).

(3) Utrecht University Library, Ms. 1478(1 E 21)(179 p.: iv (introduction)+154+21 (index)).[305]

درج بالا تینوں مخطوطات میں سے 'Utrecht University Library' میں موجود مخطوطہ اہم اور مکمل ہے۔ کیٹیلر کی قواعد سترہویں صدی میں ہندوستان کی لسانی صورتِ حال، نوآبادیاتی لسانی ضرورتوں اور قواعد ولغت کے آغاز وارتقا کے ضمن میں گراں قدر مواد کی حامل ہے۔

یہاں اِس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی، تیج کرشنا بھاٹیا اور اِن کے اتباع میں قدیم ہندی ویاکرن کے دیگر بھارتی مؤرخین نے کیٹیلر کی گرامر کو اپنی زبان (ہندی) کی پہلی گرامر قرار دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اِن کے برعکس اردو کے قدیم متون پر گہری نظر رکھنے والے واحد ماہرِ لسانیات، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اِسے 'ہندی' کے بہ جائے 'ہندوستانی' یعنی 'اردو' کی اوّلین قواعد ثابت کرتے ہیں[۳۰۶]۔ اِس ضمن میں اِن کے درج ذیل چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆ کیٹیلر جس 'ہندوستانی' زبان کا تجزیہ کر رہا ہے اور جس کی پہلی گرامر پیش کر رہا ہے وہ ہندوستانی زبان کوئی اور ہندوستانی نہیں بلکہ وہی ہندوستانی ہے جو آگے چل کر اردو پکاری جانے لگی لیکن یورپی لوگ جس کو بالعموم ہندوستانی کہتے تھے۔[۳۰۷]

☆ زیرِ نظر گرامر میں جس زبان کو ہندوستانی کہا گیا ہے وہ اُس زمانے کی رائج وہی زبان ہے جو اٹھارہویں صدی سے اردو کہی جانے لگی۔ اردو لفظ زبان کے لیے ہنوز چلن میں نہیں آیا تھا لیکن کیٹیلر جس زبان کا صرفی ونحوی تجزیہ پیش کر رہا ہے اور جس کے صیغے اور گردانیں دے رہا ہے، نیز موضوعات کے اعتبار سے لغات کی جو فہرستیں درج کر رہا ہے۔۔۔ وہ اُن عربی فارسی لفظوں سے بھری ہوئی ہیں جو اردو اور صرف اردو زبان کے ذریعے ہندوستان میں مستعمل ہیں۔[۳۰۸]

☆ کیٹیلر کی گرامر کو جو دراصل اردو گرامر ہے اور جس میں کچھ اجزا فارسی گرامر کے بھی مندرج ہیں، کھلم کھلا ہندی گرامر قرار دینا ایک کارنامہ ہی قرار دیا جائے گا۔[۳۰۹]

اسی حوالے سے ولندیزی سکالر، ایچ۔ ایم بودے وِتس (H.M.Bodewitz) بھی کیٹیلر کی قواعد کو اردو کے قدیم نام 'ہندوستانی' کی قواعد ثابت کرتے ہوئے بالخصوص تیج کرشن بھاٹیا کے اُس بیان کی تردید کرتا ہے جس کے مطابق کیٹیلر کی قواعد ہندی زبان کی قواعد ہے[۳۱۰]۔ اِس ضمن میں بودے وِتس کا واضح مؤقف یہ ہے:

"The language described by Ketelaar was not pure Hindi. r As Vogel (1941) already observed, it was rather to called Urdu o Hindustani. Bhatia who wrote a history of Hindi grammatical tradition, tries to deny this fact."[311]

بنجمن شُلز ے (Benjamin Schultze):

جرمن مستشرق و عیسائی مبلغ، بنجمن شُلز ے (۱۶۸۹ء-۱۷۶۰ء) کی اردو/ہندوستانی گرامر بہ عنوان 'گرامیٹیکا ہندوستا نیکا' (Grammatica Hindostanica) ۱۷۴۵ء میں شائع ہوئی۔ سرورق کے درج کتاب کا پورا نام ہے:

'Viri Plur. Reverendi Benjamin Shultzii Missionarii Evangelici Grammatica Hindostanica collectis in diuturna inter Hindostanos Commoratione in justum Oradinem redactis ac large Exemporum (sic) Luce perfusis Regulis constans et Missionariorum Usui consecrata. Edidit et de suscipienda barbararum Linguarum Cultura Prefatus est D.Jo.Henr.Callenberg.' [312]

دیگر مستشرقین کی طرح شُلزے نے بھی اپنی قواعد کی بنیاد روزمرّہ بولی جانے والی زبان پر رکھی۔شُلزے کا رسالہ لاطینی زبان میں ہے۔اس کے درج ذیل چند اسباب تھے:

- ☆ مستشرقین کے لیے لاطینی زبان کا جاننا ضروری تھا۔
- ☆ لاطینی بہ حیثیت ایک علمی زبان کے اعلیٰ درجے کے علمی کارناموں کے لیے مستعمل تھی، بلکہ جدید علوم و فنون کی اکثر اصطلاحیں لاطینی یا یونانی میں ہیں۔ لاطینی مادوں ، سابقوں اور لاحقون کی مدد سے جدید اصطلاحات بنانے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔
- ☆ انگریزی قواعد کا ڈھانچہ اٹھارھویں صدی عیسوی تک لاطینی قواعد کے نمونے پر قائم تھا، جو قواعد نویسی کے ضمن میں ایک مستند نمونہ مانا جاتا تھا۔

شُلزے کا اصل رسالہ نایاب ہے البتہ کتب خانہ انڈیا آفس (موجودہ، کامن ویلتھ آفس لائبریری) میں اس کے انگریزی ترجمے کی دست یابی کی اطلاع، ایتھے (Ethe) کی فہرست، کالم ۱۳۶۲، شمارہ نمبر ۲۵۳۷ اور ۲۸۳۸ کی ذیل میں ملتی ہے۔

'Ethe, Catalogue of Persian Manuscripts' [313]

بعد ازاں اسی قلمی نسخے کا تذکرہ، جے۔ایف بلوم ہارٹ (J.F.Blumhardt) نے کیا ہے۔

'Catalogue Of The Hindustani MSS. In The Library Of The India Office, Oxford University Press, London, 1962.

اس نسخے کے دیباچے میں سنہ تالیف ۱۷۴۱ء درج ہے۔۱۹۶۷ء ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مذکورہ انگریزی ترجمے کی نقل حاصل کی۔حواشی و تعلیقات کے اضافے کے ساتھ از سرِ نو بہ زبانِ اردو مرتب کر کے ۱۹۷۷ء میں مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور کے توسط سے شائع کیا۔[۳۱۴]

شلزے کی قواعد چھ فصلوں میں منقسم ہے۔پہلی فصل حروفِ تہجی، ہجا، اعراب اور حرکات و سکنات سے متعلق ہے۔دوسری فصل اسم اور صفت کی بحث اور ان کی گردانوں کی مشق پر مشتمل ہے۔اہم اسما اور صفات کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے۔اسی فصل میں گنتی اور اعداد کی تفصیل دی گئی ہے۔تیسری فصل کا موضوع ضمیر ہے۔چوتھی فصل میں افعال کی بحث ہے جس میں مفرد اور مرکب افعال کی تشریح و تفصیل دی گئی ہے۔پانچویں فصل حروف کی بحث پر مبنی ہے، یعنی حروفِ ربط، فجائیہ وغیرہ۔چھٹی فصل نحو سے متعلق ہے۔

بعد کے زیادہ تر قواعد نویسوں نے اسی ترتیب و تفصیل پر اپنی تالیفات کی بنیاد رکھی۔کتاب کا دیباچہ درج ذیل اہم معلومات فراہم کرتا ہے:

- ☆ اردو زبان کے آغاز و ارتقا اور اس کے مختلف ناموں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔
- ☆ ہندوستانی الفاظ اردو رسم الخط میں درج ہیں مگر تلفظ لاطینی زبان میں دیا گیا ہے۔
- ☆ ناگری حروف کی تصریح کی ہے مگر بعض حروف بالکل ترک کر دیے ہیں۔

☆ گرامر کی ترتیب میں لاطینی قواعد کی پیروی کی گئی ہے۔ سبب یہ ہے کہ لاطینی زبان کے قواعد اور اصولِ صرف ونحو کو یورپ کی دیگر زبانوں کے قواعد اور اصولِ صرف ونحو کی ترتیب وتدوین میں، بہ طورِ نمونہ، بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

☆ اسمِ صفت، موصوف اور ان کے محلِ استعمال کی نشان دہی کی گئی ہے۔

☆ ضمائر (Pronouns) کا تعارف اور جملوں میں ان کا استعمال سمجھایا گیا ہے۔

☆ فعل اور اس کی مختلف حالتوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

☆ حروفِ اضافی، حروفِ عطف اور حروفِ فجائیہ کی مثالیں درج ہیں۔

☆ کتاب کا ایک حصہ علمِ نحو کے لیے مخصوص ہے جس میں گرامر کے اصولوں کے تحت انگریزی اور رومن رسم الخط میں جملے دیے گئے ہیں۔

☆ قمری، انگریزی اور بکرمی مہینوں کے نام درج کیے گئے ہیں۔

☆ ہفتے کے سات دنوں کے نام فارسی، اردو اور انگریزی میں دیے گئے ہیں۔

☆ ایک سے سو تک گنتی درج ہے۔

کیٹیلر اور شُلز ے کی قواعد کو اردو قواعد نویسی کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔[۳۱۵]

گلسٹن (Glisten):

انگریزی زبان میں اردو کی قدیم قواعد مرتب کرنے کا سہرا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک سول ملازم، مسٹر گلسٹن کے سر ہے جو گورنر، وَن سٹارٹ (Vansittart) کا سیکرٹری اور فارسی مترجم تھا[۳۱۶]۔ گلسٹن نے اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا۔ گلسٹن کی بے وقت موت کے سبب اُس کی یہ علمی وتحقیقی کاوش منظرِ عام پر نہ آسکی۔

گل کرسٹ نے چٹ فیلڈ (Chatfield) کے توسط سے چوں کہ گلسٹن کے مقالے کا ابتدائی حصہ دیکھ رکھا تھا اسی سبب گل کرسٹ نے اپنے قواعد ولغت کے ضمیمے میں گلسٹن کے مقالے کی تعریف کی ہے۔[۳۱۷]

کاسیانو دماسیراتا (Cassiano De Macerata):

فرانسیسی مستشرق اور پادری ، کاسیانو دماسیراتا (۱۷۰۸ء-۱۷۸۵ء) نے اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد ' گرامیٹیکا ہندوستانا ' (Grammatica Hidustana) کے عنوان سے ۱۷۶۵ء میں تالیف کیے۔[۳۱۸]

جارج ہیڈلے (George Hadley):

کیٹیلر اور شُلز ے کے بعد اردو/ہندوستانی گرامر مرتب کرنے کے حوالے سے جاج ہیڈلے تیسرے بڑے ماہر قواعد نویس کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ ہیڈلے کو بجا طور پر برطانوی مستشرقین کا باوا آدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس سے برطانوی مستشرقین کے اُس سلسلے کا آغاز ہوتا ہے جن کی علمی وتحقیقی کاوشوں نے زبانِ اردو کو حد درجہ ثمر آور کیا[۳۱۹]۔ ہیڈلے کے مرتبہ اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد بلاشبہ کسی انگریز مستشرق کے سب سے پہلے شائع ہونے والے قواعد ہیں۔

محمد عتیق صدیقی، ڈوڈوِل (Dodwell) اور مائلز (Miles) کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ہیڈلے ۱۷۶۳ء میں بنگال آرمی میں داخل ہوا۔ ۱۷۶۶ء میں کپتان کے عہدے پر ترقی پائی۔ ۱۷۷۱ء میں اس نے ملازمت سے سبک دوشی کے لیے درخواست دی، بعد ازاں ہیڈلے کو ہندوستانی سپاہیوں کی ایک کمپنی کی

سربراہی سپرد کردی گئی۔ یہاں ہیڈلے کو احساس ہوا کہ جب تک سپاہیوں کی زبان سے پوری واقفیت حاصل نہ کرلی جائے، فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ رہے گی۔ چناں چہ اس نے ۱۷۶۵ء میں ان ہندوستانی سپاہیوں کی زبان کے قواعد مرتب کیے۔ لندن کے ایک ناشر نے قواعد کی ایک[۳۴] نقل حاصل کرکے ۱۷۷۰ء میں اسے چھاپ دیا۔ بعدازاں ہیڈلے نے اس پر نظرِ ثانی کر کے اپنی نگرانی میں اس کا پہلا ایڈیشن ۱۷۷۲ء میں لندن ہی سے شائع کیا ۔اس تالیف کا پورا عنوان ہے:

'Grammatical Remarks on the practical and vulgar Dialect of the Indostan Language, commonly called Moors, with a Vocabulary, English and Moors. The Spelling according to the Persian Orthography, wherein are References between Words resembling each other in Sound, and different in Significations, with literal Translations and Explanations of the Compounded Words and Circumlocutory Expressions, for the more easy Attaining The Idioms of the Language. The whole calculated for the common Practice in Bengal'

ہیڈلے کی صرف ونحو مع فرہنگ، انگریزی ومور، اردو رسم الخط میں ہے۔ ان الفاظ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے جو متحد الصوت مگر مختلف المعانی ہیں۔ قواعدِ زبان کے علاوہ اس کتاب میں ہندوستانی معاشرت اور رسم ورواج پر کچھ ناقص معلومات درج ہیں۔ قواعد کی یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی اور بار بار شائع کی گئی۔ اس کے مختلف ایڈیشنز بالترتیب ۱۷۷۴ء، ۱۷۸۴ء اور ۱۷۹۷ء میں شائع ہوئے۔ ہیڈلے کی وفات کے بعد مرزا محمد فطرت نے تصحیح واضافے کی بعد اس کا پانچواں ایڈیشن لکھنؤ اور لندن سے ۱۸۰۱ء میں شائع کیا اور اسے یہ عنوان دیا:

'A Compendious Grammar of the current corrupt Dialect of the Jargon of Hindoostan (commonly called Moors), with a Vocabulary, English and Moors_Moors and English, with references between words.....with notes descriptive of various Customs and Manners of Bengal'

دوسری بار یہ کتاب لندن سے ۱۸۰۴ء میں طبع ہوئی۔ ترمیم واضافے کے بعد ۱۸۰۹ء میں اس کا ضخیم ایڈیشن لندن سے شائع ہوا۔

اردو/ہندوستانی گرامر پر ہیڈلے کی ایک اور تالیف لندن سے ۱۷۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس گرامر کا نام ہے:

'A short Grammar of the Moors Language'

جے فرگوسن (J.Fergusson):

برطانوی مستشرق، مسٹر جے فرگوسن کا لغت ۱۷۷۳ء میں شائع ہوا۔ لغت کا عنوان ہے:

'A short Dictionary of the Hindustani Language'

اس لغت میں اردو/ہندوستانی گرامر پر ایک مقالہ بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں فرگوسن کی ایک اور تالیف کا پتہ ملتا ہے جو ۱۷۷۸ء میں طبع ہوئی۔ 'Grammatica Hindustanica' کے عنوان سے اس تالیف کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۴ء میں روم سے منظرِ عام پر آیا۔[۳۲۲]

ہنری ہیرس (Henry Harris):

برطانوی مستشرق، ہنری ہیرس (۱۷۴۶ء۔۱۸۲۹ء) کا لغت ۱۷۹۰ء میں مدراس سے شائع ہوا۔ لغت کا عنوان ہے:

'Analysis, Grammar and Dictionary of Hindostani Language'

اس عہد کے دیگر یورپی مصنفین کے مقابلے میں گل کرسٹ نے ہیرس کو اس کے کام کی صحت کی بنا پر اردو کے ممتاز قواعد و لغت نویس کے طور پر تسلیم کیا ہے اور اس کی کتاب سے حوالوں کو اپنی تحاریر میں بہ طور سند استعمال کیا ہے[۳۲۳]۔ اس کتاب کا ایک مختصر حصہ اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد کو محیط ہے۔ البتہ اس کی بنیادی حیثیت و شہرت لغت کی ہے۔

جان بارتھ وِک گل کرسٹ (John Borthwick Gilchrist):

برطانوی مستشرق، ڈاکٹر گل کرسٹ (۱۷۵۹ء۔۱۸۴۱ء) کا شمار بلاشبہ اردو نثر کے بانیوں میں ہوتا ہے[۳۲۴]۔ اردو زبان کا کوئی بھی مؤرخ ان کا احسان مند اور شکر گزار ہوئے بنا اردو زبان و ادب کی تاریخ رقم کرنے کا مجاز نہیں۔[۳۲۵]

اردو قواعد نویسی کے ضمن میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی تصنیفات درج ذیل ہیں:

(۱) ۱۷۹۶ء میں اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر گل کرسٹ کی کتاب کرانیکل پریس، کلکتہ نے شائع کی۔ کتاب کے سر ورق پر یہ نام درج ہے:

'A Grammar of the Hindoostanee Language or part three of Volume One of a System of Hindoostanee Philology'

یہ تالیف درج ذیل خصوصیات کی حامل ہے:

☆ تین سو اڑتیس (۳۳۸) صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سند کے طور پر استعمال کیا جانے والا شعری کلام اور نثری عبارتیں انگریزی (رومن)، اردو (فارسی) اور ہندی (ناگری) رسم الخط میں درج ہیں۔

☆ مسکین کا اکیاسی (۸۱) بند پر مشتمل مرثیہ ہندوستانی زبان کے قواعد میں جا بجا نقل کر دیا گیا ہے۔ پڑھنے والوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پورے مرثیے کو ایک الگ کاغذ پر ترتیب وار نقل کر لیں تا کہ اس کے مطالعے سے استفادہ کیا جا سکے۔

☆ شیکسپیئر کے دو ڈراموں کے ایک ایک ٹکڑے کا اردو ترجمہ اردو رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر گل کرسٹ کی اس کاوش کو انگریزی متن کی اردو میں منتقلی کے ضمن میں اولیّت کا شرف حاصل ہے۔

☆ اردو اور ہندی طباعت کے ابتدائی دور کا سراغ گل کرسٹ کی اس کتاب سے ملتا ہے۔

☆ کتاب کے آخر میں اکتیس (۳۱) صاحبِ دیوان شعرا پر مشتمل فہرست درج ہے۔

(۲) قواعد ولغت کے مقدمے پر مشتمل گل کرسٹ کی کتاب، 'The Appendix'۱۷۹۸ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔

(۳) ۱۷۹۸ء میں گل کرسٹ کی اہم تالیف ،' مشرقی زبان دان' (Oriental Linguist) کا پہلا اڈیشن کلکتے سے شائع ہوا۔سولہ(۱۶)صفحات پر مشتمل زبان کے ابتدائی اصول اور قواعد پر گل کرسٹ کی تحقیق اس کتاب کا حصہ ہے۔کلکتے ہی سے ۱۸۰۲ء میں اس کا دوسرا اڈیشن طبع ہوا۔

(۴) اردو رہندوستانی زبان کے قواعد پر گل کرسٹ کی اہم تالیف،'نوایجاد یعنی نقشۂ افعال مع مصدرات آں ومترادفات ہندوستانی':

(New Theory of Persian Verbs, with their Hindoostanee Synonyms

in Persian and English)

۱۸۰۰ء میں کلکتے سے پہلی بار شائع ہوئی۔کلکتے ہی سے دوسری بار ۱۸۰۴ء میں طبع ہوئی۔[۳۲۶]

(۵) 'معلمِ ہندوستانی' کے نام سے ایک کتاب پہلی بار ۱۸۰۲ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔سرورق کے مطابق پورا نام ہے:

'The Stranger's East India Guide to the Hindoostanee or grand

popular Language of India'

گل کرسٹ کی یہ تالیف دو اہم حصوں میں منقسم ہے۔تین سو چار(۳۰۴) صفحات پر مشتمل پہلے حصے میں اردو علمِ ہجا، صرف ونحو اور زبان کے متعلق مختلف قواعد کا بیان ہے۔لندن سے اس کے دو اڈیشنز کی بالترتیب، ۱۸۰۸ء اور ۱۸۲۰ء میں اشاعت کا ذکر ملتا ہے۔

(۶) ۱۸۰۳ء میں کلکتے سے شائع ہونے والی گل کرسٹ کی اہم کتاب،'اتالیقِ ہندی' ہے۔سرورق کے مطابق پورا عنوان ہے:

'The Hindee moral preceptor and Persian Scholar's shortest road

to Hindustanee Language or vice versa'

کتاب کا پہلا حصہ فارسی صرف ونحو کے ضروری قواعد پر بسیط مقدمے کا حامل ہے۔ پوری کتاب اردو رسم الخط میں ہے۔لندن سے یہ دوسری بار ۱۸۲۱ء میں شائع ہوئی۔

(۷) ۱۸۱۰ء میں گل کرسٹ کی قواعد کا خلاصہ،' قواعدِ زبانِ اردو مشہور بہ رسالۂ گل کرسٹ' کے طور پر شائع ہوا جسے ۱۸۰۴ء میں میر بہادر علی حسینی نے مرتب کیا تھا۔ اس کے دو اڈیشنز بالترتیب، ۱۸۳۱ء اور ۱۸۴۶ء میں کلکتے سے طبع ہوئے۔ ۱۸۴۵ء میں ایک اڈیشن آگرہ اور ۱۸۶۳ء میں حیدر آباد دکن سے سامنے آیا۔ ایک اڈیشن مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلسِ ترقیِ ادب نے لاہور سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔[۳۲۷]

ہرشیم لے بی ڈف (Herasim Lebedeff):

اردو رہندوستانی صرف ونحو پر روسی مستشرق، لے بی ڈف کا رسالہ ۱۸۰۱ء میں لندن سے شائع ہوا ۔اس کا طویل عنوان ہے:

'A Grammar of the Pure and mixed East Indian Dialects, with

dialogues affixed, spoken in all the Eastern Countries, methodically arranged at Calcutta, according to the Brahmenian System, of the Shamscrit language. Comprehending literal Explanations of the Compound Words, and Circumlocutory Phrases, necessary for the Attainment of the Idiom of that Language, etc. Calculated for the Use of Europeans. With Remarks on the Error in former Grammar and Dialogues of the Mixed Dialects called Moorish or Moors, written by different Europeans; together with a Refutation of the Assertions of Sir William Jones, respecting the Shamscrit Alphabets; and several Specimens of Oriental Poetry' [328]

لے بی ڈف ۱۷۸۵ء میں مدراس پہنچا۔ دوسال کے بعد ۱۷۸۷ء میں کلکتے چلا گیا جہاں اس نے ایک پنڈت سے سنسکرت، بنگالی اور اردو زبانیں سیکھیں۔ دہلی میں بھی مقیم رہا۔ قریباً بیس (۲۰) برس بعد انگلستان لوٹا۔ گریرسن کے مطابق لے بی ڈف کا ہندوستانی زبان کا علم بالکل ناقص تھا کیوں کہ اس نے اپنے رسالۂ قواعد میں ہندوستانی الفاظ کا تلفظ بھی غلط لکھا ہے اور قواعد کے بیان کرنے میں بھی اس سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔ [۳۲۹]

لے بی ڈف نے اردو/ہندوستانی کو ممالکِ ہند کی مخلوط قومی زبان کا درجہ دیتے ہوئے اپنے رسالے میں لکھا کہ اگرچہ یہ زبان تحریر میں نہیں آتی مگر کروڑوں باشندے اسے بولتے ہیں۔ مطالب کی ترسیل و تفہیم کے ضمن میں عمدہ اسالیب اس زبان میں تیار ہو گئے ہیں اور دخیل الفاظ کے علاوہ اس میں الفاظ اور محاورات کا وسیع ذخیرہ ابتدا ہی سے موجود ہے۔ [۳۳۰]

چارلس سٹیوارٹ (Charles Steuart):

انگریز مستشرق، چارلس سٹیوارٹ (۱۷۶۴ء۔۱۸۳۷ء) ۱۷۸۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں بھرتی ہو کر بنگال آیا اور ۱۸۰۸ء میں فوج کی ملازمت سے میجر کی حیثیت سے سبکدوش ہوا۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۰۶ء تک فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں فارسی کے نائب پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں [۳۳۱]۔ چارلس سٹیوارٹ کی تالیف مدراس سے ۱۸۰۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کلکتے سے ۱۸۴۳ء میں طبع ہوا۔ تالیف کا عنوان ہے:

'An Introduction to the study of Hindostany Language as spoken in the Carnatic. Compiled for the Use of the Company of Gentlemen Cadets on the Madras Establishment at New Town' [332]

جان شیکسپیئر (John Shakespeare):

برطانوی مستشرق جان شیکسپیئر (۱۷۷۴ء۔۱۸۵۸ء) سٹانٹن ہیرالڈ (Staunton harold) میں پیدا ہوا جو لیسٹر (Leicester) کا ایک قصبہ ہے۔ السنہ شرقیہ خصوصاً عربی، فارسی اور ہندوستانی کے حصول کی طرف شیکسپیئر نوعمری ہی سے متوجہ رہا۔ ۱۸۰۵ء میں بحری فوجی کالج میں السنہ شرقیہ کی پروفیسری کے لیے

اسے نامزد کیا گیا۔ بعدازاں وہ ۱۸۳۲ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی کالج، واقع ایڈسکومب (Addiscomb)[۳۳۳] میں ہندوستانی کا پروفیسر مقرر رہا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام پر وہ اس کا لائبریرین مقرر ہوا اور اپنی وفات تک اسی خدمت پر مامور رہا[۳۳۴]۔ گریرسن نے شیکسپیئر کی درج ذیل تالیفات کا ذکر کیا ہے:

(۱) 'A Grammar of the Hindustani Language' ۱۸۱۳ء میں لندن سے طبع ہوئی۔ اس کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن بالترتیب ۱۸۱۸ء اور ۱۸۲۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ۱۸۴۳ء میں چوتھا ایڈیشن دکنی زبان کی مختصر گرامر کے اضافے کے ساتھ طبع ہوا۔ پانچواں ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا جب کہ ایک ایڈیشن ۱۸۵۸ء میں بھی طبع ہوا۔

(۲) ۱۸۱۵ء میں 'ہندوستانی مبادیات کا سلسلہ' کے عنوان سے شیکسپیئر کی کتاب مدراس سے طبع ہوئی۔

(۳) شیکسپیئر کی ایک اور اہم تالیف ۱۸۴۵ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ کتاب کا نام ہے:

'An Introduction to the Hindustani Language'

تھامس روبک (Thomas Roebuck):

انگریز مستشرق، کپتان تھامس روبک (۱۷۸۱ء۔۱۸۱۹ء) نے اپنے انتقال سے ایک سال قبل اردو یا ہندوستانی زبان کے قواعد پر ایک کتاب شائع کی تھی۔ کتاب کا عنوان ہے:

'The Hindostanee Interpreter, containing the Rudiments of Grammar, an extensive Vocabulary, and a Useful Collection of Dialogues and a Naval Dictionary'

یہ تالیف پہلی بار ۱۸۱۸ء میں طبع ہوئی۔ روبک کی یہ تالیف صرف ونحو کے ابتدائی اصول، وسیع فرہنگ، مکالمات اور بحری ڈکشنری پر مشتمل تھی۔ بعدازنظرِ ثانی، ولیم کارمائیکل سمتھ نے دوسری بار ۱۸۲۴ء میں لندن ہی سے اس کی اشاعت ممکن بنائی۔ ۱۸۴۱ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن لندن اور پیرس سے طبع ہوا۔[۳۳۵]

روبک اور ولیم ہنٹر کی ایک مشترکہ تالیف کو ہندوستان پریس، کلکتہ نے ۱۸۲۴ء میں شائع کیا۔ تالیف کا عنوان ہے:

'A Collection of Proverbs and Proverbial Phrases in the Persian and Hindustani Languages'[336]

یہ تالیف ولیم ہنٹر نے شروع کی اور اسے مکمل روبک نے کیا۔[۳۳۷]

ولیم پرائس (William Price):

گریرسن نے برطانوی مستشرق، کپتان ولیم پرائس کی درج ذیل تالیفات کا ذکر کیا ہے:

(۱) 'تین خاص زبانوں کی قواعد' کے نام سے کپتان ولیم پرائس کی کتاب ۱۸۲۳ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

(۲) ۱۸۲۷ء میں پرائس کی ایک اور تالیف لندن سے طبع ہوئی۔ کتاب کا نام ہے:

'A New Grammar of the Hindoostanee Language, with selections from the best Authors, to which are added Phrases and Dialogues

in the proper Character'

۱۸۳۰ء میں دوسری بار یہ کلکتے سے منظرِ عام پر آئی۔[۳۳۸]

(۳) ہندوستان پریس، کلکتہ نے ۱۸۲۷ء میں پرائس کی درج ذیل کتاب شائع کی:

'Hindee and Hindostanee Selections, to which are prefixed the Rudiments of Hindostanee and Braj Bhakha Grammar'[339]

ولیم ییٹس (William Yates):

برطانوی مستشرق، ولیم ییٹس (۱۷۹۲ء۔۱۸۴۵ء) کی اہم تالیف بپٹسٹ مشن کلکتہ نے ۱۸۲۷ء میں درج ذیل نام سے شائع کی:

'Introduction to Hindoostanee Language in three parts, viz., Grammar, with Vocabulary and Reading'[340]

تین سو چھبیس (۳۲۶) صفحات پر مبنی یہ کتاب رومن رسم الخط میں چھپی۔ گرامر، لغت اور اسباقِ زبان دانی کے اعتبار سے یہ تین حصوں میں منقسم تھی۔ دوسری بار یہ ۱۸۴۳ء میں طبع ہوئی۔ تیسری بار ۱۸۴۵ء میں اور چھٹی بار ۱۸۵۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔

ایم ٹی ایڈم (M.T.Adam):

گریرسن کے مطابق اردو / ہندوستانی گرامر پر ۱۸۲۷ء میں کلکتے سے ایم ٹی ایڈم کی تالیف طبع ہوئی۔ کتاب کا عنوان ہے:

'Hindi Bhasha ka Wyakarana: A Hindi Grammar, for the Instruction of the Young, in the form of easy Questions and Answers'[341]

ایس ڈبلیو بریٹون (S.W.Breton):

اردو / ہندوستانی گرامر پر برطانوی مستشرق، بریٹون کا رسالہ ۱۸۳۰ء میں لندن سے شائع ہوا۔ اس رسالے کا عنوان ہے:

'A Grammar of Hindustan's Language followed by a series of Grammatical Excercises for the Use of the Scotish Naval and Military Academy'[342]

ڈبلیو اینڈریو (W.Andrew):

انگریز مستشرق، ڈبلیو اینڈریو کی تالیف لندن سے ۱۸۳۰ء میں درج ذیل عنوان سے شائع ہوئی۔

'A Comprehensive Synopsis of the Elements of

Hindustani Grammar'[343]

سینڈفورڈ ارناٹ (Sandford Arnot):

اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد کی ترتیب وتالیف کے سلسے میں گارسیں دتاسی کے ہم عصر برطانوی مستشرق، سینڈفورڈ ارناٹ (سنہ وفات ۱۸۳۴ء) کا کام قابلِ ستائش ہے۔ گریرسن کے مطابق گرامر پر ان کی درج ذیل تالیفات شائع ہوئیں:

(۱) ۱۸۳۱ء میں 'جدید خودآموز قواعدِ ہندوستانی' لندن سے طبع ہوئی۔ سرورق پر کتاب کا عنوان یوں درج ہے:

'A New Self Instructing Grammar of the Hindustanee Tongue, the most useful and general Language of British India, in the Oriental and Roman Character'

رومن اور اردو رسم الخط میں طبع شدہ اس کتاب کا ایک مختصر حصہ ضمیمۂ لغت اور مشقی اسباقِ زبان دانی پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا۔

(۲) اردو اور رومن حروف میں چھپی ارناٹ کی دوسری تالیف ہے:

'Grammar of the Hindustanee Tongue in the Oriental and Roman Characters, and a Selection of easy Extracts for Reading in the Persi_Arabic and Devanagari Characters, with a Vocabulary and Notes'

کتاب میں زبان دانی کی آسان آموزش کی غرض سے آسان انتخاباتِ متن کو بہ ضرورتِ اردو اور دیو ناگری حروف میں بھی درج کیا گیا ہے۔ اسے ڈنکن فاربس نے فرہنگ وحواشی اور دیگر ضروری اضافوں کے ساتھ ۱۸۴۴ء میں لندن سے شائع کیا۔[۳۴۴]

(۳) ارناٹ کی تیسری اہم کتاب، 'مقدمہ قواعدِ ہندوستانی برائے افادۂ طلبائے مدراس' ہے۔ اس کے پہلے ایڈیشن کا سالِ اشاعت معلوم نہ ہوسکا البتہ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۱ء میں مدراس سے منظرِ عام پر آیا۔[۳۴۵]

گارسیں دتاسی (Garcin De Tassy):

فرانسیسی مستشرق، گارسیں دتاسی (۱۷۹۴ء۔۱۸۷۸ء) فرانس کے شہر مارسیلز (Marseilles) میں پیدا ہوا۔ یہ شہر اس وقت ایک آزاد بندرگاہ تھا۔ ابتدائی تعلیم دتاسی نے اسی شہر میں پائی۔ دتاسی کا پورا نام ہے:

'Joseph Heliodore Sagesse Vertu Garcin De Tassy'۔ دتاسی نے بیس برس کی عمر میں (۱۸۱۴ء میں) مصر کے دو بڑے فاضل معلمین، جبریل طویل (Jabriel Touil) اور رافائیل دموناخس (Raphael De Monachs) سے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی[۳۴۶]۔ تیئس (۲۳) سال کی عمر میں (۱۸۱۷ء میں) دتاسی پیرس پہنچا جہاں موسیو سلو ستر دی ساسی (Mr. Silvestre De Sacy) السنہ شرقیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ دتاسی نے اس کی نگرانی میں ترکی اور عربی زبانوں پر دست رس حاصل کی۔ دتاسی اردو زبان کا شیدائی تھا۔ انگلستان میں دتاسی نے اردو کی تعلیم مشہور مستشرق، جان شیکسپیئر سے حاصل کی۔ عربی، فارسی اور ترکی سے واقفیت کے باعث

دتاسی نے اردو آسانی سے سیکھ لی۔

'گارسیں دتاسی: سوانح اور تنقید'[۳۴۷] میں ثریا حسین نے دتاسی کی کل ایک سو پچپن (۱۵۵) تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ان میں ادب، تاریخ، قواعد اور لسانیات کے موضوعات شامل ہیں۔ یہ مستشرق یورپ سے کبھی بھی ہندوستان نہیں آیا اس کے باوجود اردو زبان وادب سے لگاؤ کا یہ عالم کہ شاید ہی اردو زبان کے کسی اور مستشرق سکالر نے اتنا علمی اور تحقیقی سرمایہ چھوڑا ہو جو گارسیں دتاسی کا حصہ ہے۔ دیگر علمی اور تحقیقی کارناموں کے علاوہ اس نے اردو قواعد میں بھی بیش قیمت خدمات انجام دیں اور اردو زبان کی صرف ونحو پر فرانسیسی میں کئی کتابیں اور مقالے لکھے۔ اردو زبان کی صرف ونحو کے ضمن میں اس کی کتب اور رسائل کی فہرست کچھ یوں بنتی ہے:

(۱) سو(۱۰۰) صفحات پر مبنی گارسیں کی کتاب، ' ہندوستانی کے مبادیات' ۱۸۲۹ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔سرورق کے مطابق کتاب کا نام ہے:

'Rudiments de la Langue Hindoustanee, a l' Usage des Eleves de l' Ecole Royale et Speciale des Langues Orientales Vivantes'[348]

کتاب میں اردو کے ساتھ دیوناگری کے حروف ِ تہجی بھی دیے گئے ہیں۔ مصادر کی گردانیں اور قلمی نسخوں کی قراء ت کے حوالے سے مشقیں بھی شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ ہے جو ایک مقدمے، منتخب عبارتوں اور گرامر سے متعلق مزید اضافوں اور تصحیحات پر مشتمل ہے۔اردو اور دکھنی سے متعلق کچھ توضیحات کے ساتھ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں طبع ہوا۔[۳۴۹]

(۲) اڑسٹھ (۶۸) صفحات پر مشتمل ایک تالیف ، ' ضمیمہ ہندوستانی مبادیات' ۱۸۳۳ء میں پیرس سے طبع ہوئی۔ کتاب کے سر ورق پر یہ عنوان درج ہے:

'Appendix; contenant, outre quelques Additions a la Grammaire, des Letters Hindoustanis originales, accompagnes d'une Traduction et de Facsimile'[350]

یہ تالیف گرامر سے متعلق چند اضافوں ،اکیس(۲۱)خطوط اور اُن کے فرانسیسی تراجم کی حامل ہے۔ یہ خطوط متفرق موضوعات پر مباحث سے متعلق ہیں اور مراسلہ نگاری کے عمدہ اسلوب کا نمونہ ہیں۔[۳۵۱]

(۳) گریرسن کے مطابق پیرس سے دتاسی کی ایک کتاب، ۱۸۳۴ء میں طبع ہوئی۔کتاب کا نام ہے:

'Prosodie des Langues de l' Orient Musalman, specialement de l' Arabe, du Persan, du Turc, et de l' Hindoustani'[352]

(۴) ۱۸۳۶ء میں ہندوستانی زبان کے مبتدیوں کے لیے گارسیں کی ایک درسی کتاب پیرس سے طبع ہوئی[۳۵۳]۔کتاب کا عنوان ہے:

'Manual de L' Auditeur du Cours d' Hindoustani ,ou Themes gradues pour exercer a la Conversation et au Style epistolaire, accompagnes d'un Vocabulaire Francais_Hindoustani'

کتاب چار(۴) ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں عام بول چال کے جملے فرانسیسی میں درج ہیں۔ دوسرا باب تیرہ (۱۳) خطوط اور اُن کے جوابات پر مبنی ہے۔ تیسرا باب فرانسیسی ہندوستانی لغت، ہندوستانی مہینوں، موسموں اور مختلف سکّوں کے ناموں کا احاطہ کرتا ہے۔ چوتھے باب میں پہلے دو ابواب کو اردو میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ ۱۸۳۷ء میں طبع ہوا۔[۳۵۴]

(۵) 'مینویل کی کنجی'، ۱۸۳۷ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب دراصل مذکورہ بالا 'مینوئل' کی مشقوں کی تصحیحات پر مبنی تھی۔ کتاب کا نام ہے:[355]

'Corrige des Themes du Manuel du Cours d' Hindoustani'

(۶) دو کتابوں، 'صرفِ اردو' (مؤلفہ امانت اللہ شیدا) اور 'قواعدِ زبانِ اردو' (مؤلفہ میر بہادر علی حسینی) پر گارسیں کا طویل تجزیاتی مضمون، 'ژورنال ازیاتک'، (Journal Asiatique Society) میں ۱۸۳۸ء میں شائع ہوا۔ مضمون کا عنوان ہے:

'Analyse des Grammaires Hindoustani originales intitulees, Sarf_i Urdu et Qawaid_i Zuban_i Urdu'[356]

(۷) سو(۱۰۰) صفحات پر مشتمل تالیف 'Rudiments de la Langue Hindoui' ۱۸۴۷ء میں پیرس سے طبع ہوئی۔[۳۵۷]

(۸) گارسیں کے خطبات متعلق زبانِ اردو، سنہ ۱۸۵۰ء تا سنہ ۱۸۷۷ء طبع ہوئے۔[۳۵۸]

جیمز رابرٹ بیلن ٹائن (James Robert Ballan Tyne):

برطانوی مستشرق، جیمز رابرٹ بیلن ٹائن (۱۸۱۳ء-۱۸۶۴ء) نے تیسری سے ساتویں جماعت تک (۱۸۲۴ء تا ۱۸۲۷ء) تعلیم ایڈنبرا اکیڈمی (Edinburgh Academy) سے حاصل کی۔ ۱۸۴۵ء میں 'ایل ایل ڈی' کی سند لی۔ نوجوانی میں ایڈنبرا کی ملٹری اینڈ نیول اکیڈمی میں ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۶۱ء تک گورنمنٹ کالج بنارس میں پرنسپل رہا۔ بعد ازاں ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانے کا ناظم ہو گیا۔

مسٹر بیلن ٹائن اپنی موت سے قبل سنسکرت کی ایک ضخیم کتاب، 'مہابھاشا' کی اشاعت میں مشغول رہا۔ یہ کتاب پانینی کی گرامر کی شرح ہے۔ وہ اسے چار جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس کی زندگی نے فقط ایک جلد کی اشاعت کا موقع دیا۔[۳۵۹] اردو، ہندوستانی زبان کے قواعد پر بیلن ٹائن کی درج ذیل

تین تالیفات کا ذکر ملتا ہے:

(۱) 'ہندوستانی گرامر اور مشقیں' کے نام سے بیلن ٹائن کی تالیف ۱۸۳۸ء میں ایڈنبرا (Edinburgh) سے چھپی۔ سرورق پر کتاب کا پورا عنوان یوں درج ہے:

'A Grammar of the Hindustan's Language followed by a series of Grammatical Exercises for the Use of the Scotish Naval and Military Academy'

دوسری بار یہ ۱۸۳۹ء میں طبع ہوئی۔

(۲) ایک اور کتاب، 'Elements of Hindi and Braj Bhakha Grammar' کے عنوان سے ۱۸۳۹ء ہی میں لندن شائع ہوئی۔ دوسری بار یہ لندن سے ۱۸۶۸ء میں طبع ہوئی۔

(۳) اردو/ہندی افعال پر بیلن ٹائن کی کتاب ۱۸۴۲ء [۳۶۰] میں مدراس سے طبع ہوئی۔ کتاب کا عنوان ہے:

'A Grammar of the Hindustani Language, with Notices of the Braj and Dakhani Dialects' [361]

ای ایچ راجرس (E.H.Rogers):

۱۸۴۱ء [۳۶۲] میں چیتھم (Chatham)، برطانیہ کے اردو پروفیسر، ای ایچ راجرس کی کتاب 'ہندوستانی کیسے بولیں'، شائع ہوئی۔ سرورق کے مطابق عنوان ہے:

'How to speak Hindustani, being an Easy Guide to Conversation in that Language, for the Use of the Soldiers and others proceeding to India'

دتاسی کی رائے میں یہ قابلِ قدر کتاب تھی جو خاص طور پر فوجیوں کے لیے تالیف کی گئی تھی۔ البتہ یہ ان انگریز بیرسٹروں کے لیے بھی کارآمد تھی جو وکالت کی غرض سے ہندوستان جانا چاہتے تھے۔ [۳۶۳]

آنون (Anon):

گریرسن نے 'لینگوئسٹک سروے آف انڈیا' میں اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر آنون کی درج ذیل تالیفات کا ذکر کیا ہے: [۳۶۴]

(۱) روم سے آنون کی گرامر ۱۷۷۸ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کا عنوان ہے:

'Grammatica Indostana a Mais vulgar que se practica no Imperio do gram Mogol offerecida aos muitos reverendos Padres Missionaries do ditto Imperio'

لزبن (Lisbon) سے اسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۵ء میں طبع ہوا۔ دوسرے ایڈیشن کا عنوان ہے:

'Na Estamperia da Sagrada Congregacao de Propaganda Fida'

(۲) ۱۸۲۶ء میں کلکتے سے اردو/ہندوستانی محاورات پر آنون کی کتاب شائع ہوئی۔ کتاب کا عنوان ہے:

'Hindoostanee and English Student's Assistant; or Idiomatical Exercises'

(۳) اردو/ہندی کے بے قاعدہ افعال پر آنون کی تالیف مدراس سے ۱۸۴۲ء میں منظرِ عام پر آئی۔ تالیف کا نام ہے:

'English and Hindustani Exercises of the irregular Verbs'

(۴) مدراس ہی سے اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر آنون کی تالیف ۱۸۴۲ء میں طبع ہوئی۔ تالیف کا عنوان ہے:

'Introduction to the Hindoostanee Grammar, adapted to the Use of Students in the Presidency of Madras'

دوسری بار مدراس ہی سے ۱۸۵۱ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔

(۵) 'Hindustani Spelling Book in the Roman Character' کے عنوان سے آنون کی کتاب کا چوتھا ایڈیشن الہ آباد سے ۱۸۵۰ء میں طبع ہوا۔

(۶) ہندوستان کی طرف سفر کرنے والے غیر ملکیوں کی لسانی اور معاشرتی راہ نمائی کی غرض سے آنون نے ایک کتاب تالیف کی جو لندن اور کلکتہ سے ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی۔ تالیف کا عنوان ہے:

'Anglo_Hindustanee Handbook; or Stranger's Self_Interpreter and Guide to Colloquial and General Intercourse with the Natives of India'

(۷) ۱۸۷۲ء میں اردو/ہندوستانی محاورات اور مکالموں پر مبنی آنون کی کتاب لاہور سے شائع ہوئی۔ کتاب کا نام ہے:

'Idiomatic Sentences and Dialogues in English and Hindustani'

(۸) اردو/ہندوستانی گرامر پر آنون کی ایک کتاب ۱۸۷۲ء میں بہ مقام 'رُڑکی' (Roorkee) شائع ہوئی۔ کتاب کا نام ہے:

'Elements of Hindoostanee Grammar. Prepared for the Thomson Civil Engineering College, Roorkee'

(۹) 'Memorandum on a point of Dakhni Grammar' کے عنوان سے آنون کی کتاب ۱۸۷۸ء میں لندن سے طبع ہوئی۔

(۱۰) 'Polyglot Grammars and Dialogues' کے نام سے ایک تالیف دہلی سے ۱۸۸۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔

(۱۱) آنون کی ایک اور تالیف 'Handbook of Hindustani Conversation' کلکتے اور سیرام پور سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔

(۱۲) 'Hindustani Manual for Beginners' اردو/ہندوستانی گرامر کے ضمن میں آنون کی ایک اور اہم تالیف ہے جو بمبئی (ممبئی) سے ۱۸۸۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

(۱۳) 'How to Speak English. English and Urdu' کے نام سے آنون کی کتاب لکھنؤ سے ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی۔

(۱۴) ۱۸۸۸ء میں لکھنؤ ہی سے آنون کی ایک اور تالیف شائع ہوئی جس کا عنوان ہے:

'Useful Sentences. English and Urdu'

آلوئس شپرینگر (Aloys Sprenger):

دہلی ورنیکلر سوسائٹی (Dehli Vernecular Society) کے روحِ رواں، ڈاکٹر آلوئس شپرینگر (۱۸۱۳ء-۱۸۹۳ء) کا پورا نام 'Aloys Ignatz Christopher Sprenger' تھا۔ شپرینگر آسٹریلیا کے شہر انسبر ک (Innsbruck) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ طب اور مشرقی زبانوں کی

تعلیم ویانا(Vienna) میں حاصل کی۔ ۱۸۳۶ء میں وہ پیرس روانہ ہوا اور اسی سال لندن چلا گیا۔ ۱۸۳۸ء میں اس نے برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی۔ ۱۸۴۱ء میں لائڈن یونی ورسٹی(Leiden University) سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اصل میں طبیب تھا اور بنگال میں اسسٹنٹ سرجن کی خدمت پر مامور رہا۔ اسی عرصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی خدمات حاصل کیں اور وہ کلکتہ آ گیا۔ ۱۸۴۴ء میں 'محمڈن کالج' دہلی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ عربی زبان وادب کے عالم ہونے کی وجہ سے فارسی اور اردو سے بھی خاص شغف پیدا ہو گیا۔ یہی شغف دراصل ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اس کی تعیناتی کا محرک بنا۔ دہلی ورنیکلر سوسائٹی نے شپرینگر کی قیادت میں نہ صرف اردو ادبیات کی بے حد خدمت کی بلکہ اردو زبان کے توسط سے مغربی علوم وفنون کی اشاعت میں بھی حصہ لیا۔

قواعدِ زبانِ اردو رہندوستانی پر سپرنگر کی ایک کتاب، 'انگلش ہندوستانی گرامر' ۱۸۴۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اسی ضمن میں ان کی دوسری تالیف، 'ہندوستانی گرامر' ۱۸۶۳ء میں لاہور سے طبع ہوئی۔

ڈنکن فاربس (Duncan Forbes):

سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے مستشرق، ڈنکن فاربس (۱۷۹۸ء۔۱۸۶۸ء) کی اردو رہندوستانی زبان کے قواعد کے سلسلے میں درج ذیل تالیفات کا پتہ ملتا ہے:

(۱) دو حصوں پر مشتمل فاربس کی اہم تالیف 'The Hindustani Manual' ہے۔ مینوئل کے دیباچے میں درج معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۴۵ء میں اس کی پہلی اشاعت لندن سے عمل میں آئی۔ مینوئل کا پہلا حصہ بہ عنوان:
'A Compendious Grammar of the Language' تین سیکشنز پر مشتمل ہے۔ پہلے سیکشن میں گرامر کے بنیادی اصول درج ہیں۔ حروفِ تہجی اور ان کی صوتی ماہیت کی ترتیب وار مثالوں سے وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے سیکشن میں مشقیں دی گئی ہیں جو سترہ (۱۷) اسباق پر مبنی ہیں۔ تیسرے سیکشن میں چیدہ چیدہ مکالمے درج ہیں۔ مینوئل کا دوسرا حصہ ایک مختصر ڈکشنری ہے جس کا عنوان ہے:

'A Vocabulary Of Useful Words, English and Hindustani'

اس میں انگریزی سے ہندوستانی اور ہندوستانی سے انگریزی میں ترجمے بھی دیے گئے ہیں۔ محاوروں، ضرب الامثال اور جملوں کی ایک طویل لسٹ بھی اس حصے میں شامل ہے۔

ہندوستانی لسانیات کے ابتدائی نقوش کے ضمن میں کچھ سرسری مباحث بھی اس مینوئل کا حصہ ہیں۔ فاربس اپنے تجربے کی بنا پر لکھتا ہے کہ ہندوستانی زبان سیکھنے کے خواہش مند یورپین افراد یہ اصول پیشِ نظر رکھیں کہ ہندوستانی کے صوتی حروف لاطینی یا جرمن زبان کی طرح بولے جاتے ہیں اور اس کے 'Consonants' انگریزی زبان کے مانند ہیں۔ مینوئل کی مشقوں کے توسط سے اس دور میں اردو زبان پر مقامی بول چال کے اثرات اور زبان کے ارتقا کی نشان دہی ملتی ہے۔ دوسری بار یہ لندن ہی سے ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی۔ اسی شہر سے ایک اور ایڈیشن ۱۸۵۹ء میں طبع ہوا۔ مینوئل کو طالب علموں کی لیے مزید مفید بنانے کی غرض

سے جان ٹی پلیٹس نے اسے بعض ترامیم اور حوالوں کے ساتھ دوبارہ ترتیب دیا۔ جسے ایلن اینڈ کو (Allen & Co) نے ۱۸۷۴ء میں لندن سے شائع کیا۔

(۲) لندن سے ۱۸۴۶ء میں فاربس نے اردو رہندوستانی گرامر پر ایک کتاب شائع کی۔ سرورق کے مطابق کتاب کا عنوان ہے:

'A Grammar of the Hindustani Language in the Roman and Oriental Characters, with numerous copper-plate Illustrations of the Persian and Devanagari Systems of alphabetic Writing: to which is

added a copious Selection of easy Extracts for reading, in the Persi-Arabic and Devanagari Characters, forming a complete Introduction to the (Tota_Kahani and) Bagh-o-Bahar, together with a Vocabulary of all the words, and various explanatory Notes'[366]

مس رضیہ نور محمد نے اپنے تحقیقی مقالے میں فوربس کی اس کتاب کے دیباچے سے ایک ٹکڑا رقم کیا ہے، جس سے مقصدِ تالیف کی وضاحت ہوتی ہے:

'پچھلے چند برسوں سے یہ لازم ہو گیا ہے کہ ہر نوجوان افسر جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں ہندوستان جائے اسے ہندوستانی زبان ضرور آتی ہو۔ لازم ہے کہ وہ اس زبان کا امتحان پاس کر سکے جو حصولِ ملازمت کے لیے ضروری ہے۔'[۳۶۷]

مندرجات کے لحاظ سے کتاب متعدد حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں فارسی، عربی، حروفِ ابجد اور ہندوستانی زبان کی بنیادی آوازیں درج ہیں۔ دوسرا، تیسرا اور چوتھا حصہ علمِ نحو کے مباحث پر مشتمل ہے۔ پانچواں حصہ علمِ صرف اور انگریزی سے اردو ترجے کی مشق سے متعلق ہے۔ چھٹے حصے میں دیوناگری اور اردو رسم الخط پر موازنہ درج ہے۔ اسی حصے میں اسلامی اور ہندوی کیلنڈر بھی شامل ہے۔ 'خردافروز' سے اقتباسات درج ہیں جن میں جزم کا استعمال نہیں کیا گیا۔ 'منتخباتِ مختلفہ' کے عنوان سے پچاس (۵۰) حکایتیں درج ہیں۔ آخر میں 'Vocabulary' دی ہے اور پھر ضمیمہ (Appendix) بھی شامل ہے۔

خاص طور پر ہندوستان کی طرف سفر کرنے والے یورپی افراد کے لیے تالیف کی گئی یہ کتاب درج ذیل خصوصیات کی حامل ہے:

☆ اردو اور رومن رسم الخط میں لکھی گئی ہے۔ اردو رسم الخط میں بتیس (۳۲) حروف دیے گئے ہیں۔ حمزہ 'ء' ا ور یائے مجہول 'ے' کو استعمال نہیں کیا گیا۔

☆ دیو ناگری رسم الخط کی ابجد اور ہندسے درج کیے گئے ہیں۔ ناگری میں گیارہ (۱۱) Vowels درج ہیں اور اسی طرح اکتیس (۳۱) Consonants دیے گئے ہیں۔

☆ اردو حروف ٹائپ میں دیے گئے ہیں۔ نستعلیق خوش خطی کے نمونے شامل کیے گئے ہیں تا کہ نسخ اور نستعلیق میں فرق کیا جا سکے۔

☆ حروفِ تہجی میں ہر حرف کے تلفظ اور استعمال کی دس کالموں میں تفصیل درج ہے۔

☆ صیغہ حال اور ماضی کی مثالیں بہت وضاحت سے درج ہیں۔ تذکیر و تانیث کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔

☆ 'باغ و بہار' اور 'طوطا کہانی' کا تفصیلی تعارف، اقتباسات اور ان میں موجود الفاظ کا ذخیرہ بھی درج ہے۔

☆ 'ہندی' کو ہندوؤں کی زبان اور 'کھڑی بولی' کہا گیا ہے۔

☆ 'اردو' کو مسلمانوں کی زبان کہا گیا ہے اور اس کے مختلف ابتدائی ناموں کا ذکر بھی درج ہے۔

☆ کتاب کا مختصر حصہ انگریزی لغت پر مشتمل ہے۔

کتاب کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا ایڈیشن بالترتیب ۱۸۵۵ء، ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۲ء میں چھپے۔

ایڈرورڈ بیک ہاؤس ایسٹ وک (Edward Backhouse Eastwick):

برطانوی مستشرق، ایڈورڈ بیک ہاؤس ایسٹ وک (۱۸۱۴ء-۱۸۸۳ء) سیاسی شخصیت کا حامل تھا۔ اس کا خاندان ایک عرصے تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی خدمت پر مامور رہا۔ ایسٹ وک بائیس (۲۲) برس کی عمر میں بمبئی (ممبئی) کی پیدل سوار فوج میں کیڈٹ بھرتی ہوا مگر السنہ شرقیہ میں قابلیت کی بنا پر اسے کاٹھیاوار میں ایک سیاسی عہدہ سونپ دیا گیا۔ ۱۸۴۵ء میں کمپنی نے اسے ہیلی بری کالج میں پروفیسر ہندوستانی مقرر کیا۔ ۱۸۵۹ء میں انڈیا آفس میں سیاسی سیکریٹری مقرر ہوا۔ ۱۸۷۵ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی نے اسے اعزازی ایم اے کی ڈگری دی۔ ۱۸۴۷ء میں اردو / ہندوستانی گرامر پر ایسٹ وک کی ایک تالیف لندن سے اشاعت

پذیر ہوئی۔ کتاب کا نام ہے:

'A Concise Grammar of the Hindustani Language, to which are added Selections for Reading'

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جارج سمال نے لندن سے ۱۸۵۸ء میں شائع کیا۔ تیسرا ایڈیشن لندن ہی سے ۱۸۶۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ [۳۶۸]

جارج سمال (George Small):

اردو/ہندوستانی گرامر پر جارج سمال کی تالیفات درج ذیل ہیں:

(۱) سمال کی کتاب 'A Grammar of the Urdu or Hindustani Language' پہلی بار لندن سے ۱۸۴۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس میں کچھ انتخاب اردو ادب سے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ دوسری بار یہ ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ ایک نسخہ ۱۸۹۵ء میں کلکتے سے بھی طبع ہوا۔ [۳۶۹]

(۲) سی آر فرانسس (C.R.Francis) اور مسٹر فریزر (Mr.Fraser) کے تعاون سے سمال نے اردو/ہندوستانی گرامر کے ضمن میں ایک اور کتاب تالیف کی جو کلکتے سے ۱۸۹۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ تالیف کا عنوان ہے:

'Anglo_Urdu Handbook; or Hindustani Guide for the Use of Medical Practitioners in Northern India'[370]

سیموئیل سلاٹر (Samuel Slotter):

بہ قول ڈاکٹر سیّد سلطان محمود حسین، سلاٹر کلکتہ میں بشپ کالج کا پروفیسر تھا۔ اردو/ہندوستانی صرف و نحو پر اس کی کتاب بیپٹسٹ مشن کلکتہ سے ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی۔ [۳۷۱]

جے دت لو پراخنو [۳۷۲] (J.Dettlow Prochnow):

اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر جرمن مستشرق، جے دت لو پراخنو کی تالیف ۱۸۵۲ء میں برلن (Berlin) سے طبع ہوئی۔ تالیف کا عنوان ہے:

'Anfangsgrunde einer Grammatik der Hindustanischen Sprache'[373]

الیگزینڈر رفاکنر (Alexander Faulkner):

۱۸۵۳ء [۳۷۴] میں الیگزینڈر رفاکنر کی تالیف، بمبئی (ممبئی) سے طبع ہوئی۔ سرورق پر یہ عنوان درج ہے:

'The Orientalist's Grammatical Vade Mecum: being an easy Introduction to the Rules and Principles of the Hindustani, Persian

and Gujarati Language'[375]

سی پی براؤن (C.P.Brown):

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری اپنی تالیف 'کتابیاتِ قواعدِ اردو' میں انگریز مستشرق، سی پی براؤن کی دو تالیفات کا ذکر کرتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) ۱۸۵۵ء میں مدراس سے براؤن کی کتاب شائع ہوئی۔ کتاب کا نام ہے:

'English and Hindustani Phraseology, or Exercises in idioms'

(۲) 'ہندوستانی قواعد کی مبادیات' کے عنوان سے، براؤن کی اہم تالیف ۱۸۵۸ء میں چیلٹنہم (Cheltenham)، سے شائع ہوئی۔[۳۷۶]

مونیر ولیمز (Monier Williams):

ہیلی بری کالج (Haileybury College) کا پرنسپل، مونیر ولیمز (۱۸۱۹ء۔۱۸۹۹ء) بمبئی (ممبئی) میں پیدا ہوا۔۱۸۲۲ء میں حصولِ تعلیم کے لیے انگلستان چلا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں آکسفورڈ سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۸۳۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں نویسندہ (Writer) بھرتی ہوا، ۱۸۴۰ء میں[۳۷۷] ہیلے بری کالج میں داخلہ لیا۔ پروفیسر ہارسیھمین (Horace Heyman) سے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۴۴ء تا ۱۸۵۷ء ہیلے بری کالج کا پرنسپل رہا ۔۱۸۶۰ء میں

'Boden Professor' کی حیثیت سے آکسفورڈ یونی ورسٹی میں خدمات انجام دیں۔۱۸۸۳ء میں آکسفورڈ میں انڈین انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔[۳۷۸] ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۸ء بیلیول کالج (Balliol College) سے منسلک رہا۔ بعد ازاں ۱۸۹۲ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی میں اعزازی خدمات انجام دیں[۳۷۹]۔ گریرسن کے مطابق اردو/ہندوستانی گرامر پر مونیر کی تالیفات درج ذیل ہیں:

(۱) 'Rudiments Of Hindustani Grammar'، ۱۸۵۸ء میں چیلٹنہم سے طبع ہوئی۔

(۲) 'An Easy Introduction to the Study of Hindustani' لندن سے ۱۸۵۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔

(۳) رومن رسم الخط میں لکھی ہوئی مونیر کی ایک اور کتاب ۱۸۶۰ء میں لندن سے طبع ہوئی۔ کتاب کا عنوان ہے:

'Hindustani Primer; containing a First Grammar suited to Beginners

and a Vocabulary of Common Words on various Subjects.

Together with useful Phrases and short Stories'

کتاب میں اردو/ہندوستانی گرامر کے ابتدائی اصولوں کے ساتھ ساتھ کثیر الاستعمال الفاظ کے معانی، کہانیاں اور لطیفے درج ہیں۔

(۴) اردو/ہندوستانی گرامر پر مونیر اور کاٹن مارتھر کی ایک مشترکہ تالیف لندن سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی۔ سرورق پر یہ نام درج ہے:

'A practical Hindustani Grammar; also Hindustani Selections by

Cotton Mather'

اسی کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن بالترتیب، ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

آرٹسٹ برک (Artist Burke):

جرمن مستشرق، آرٹسٹ برک کی کتاب بہ عنوان 'ہندوستانی میں ہکاری آوازوں کے بارے میں' ۱۸۵۹ء میں طبع ہوئی۔ [۳۸۰]

رابرٹ کاٹن ماتھر (Robert Cotton Mather) :

اردو زبان کے قواعد پر برطانوی مستشرق، پروفیسر رابرٹ کاٹن ماتھر (۱۸۰۸ء۔۱۸۷۷ء) کی تالیف ۱۸۶۴ء میں لندن سے، 'A Practical Hindustani Grammar' کے عنوان سے طبع ہوئی۔ سر مونیر ولیمز نے اسے دوبارہ مرتب کر کے ۱۸۷۶ء میں شائع کیا۔ [۳۸۱]

ڈبلیو آر ایم ہالرائیڈ (W.R.M.Holroyd):

انگریز مستشرق، کپتان ہالرائیڈ اردو زبان کا بڑا حامی اور محسن تھا۔ جدید اردو شاعری کے آغاز اور ترویج کے ضمن میں اس کی خدمات بلاشبہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دس سال تک ہالرائیڈ، پنجاب میں ناظر مدارس کی خدمت پر مامور رہا۔ ۱۸۶۸ء میں مستقلاً پنجاب کا ناظم تعلیمات مقرر کر دیا گیا۔ [۳۸۲]

گریرسن کے مطابق اردو/ہندوستانی گرامر کے ضمن میں کپتان ہالرائیڈ کی تالیفات درج ذیل ہیں:

(۱) 'Tas_hil Al_Kalam, or Hindustani made easy' کے عنوان سے ہالرائیڈ کی تالیف ۱۸۶۶ء میں لاہور، ۱۸۶۷ء میں دہلی اور ۱۸۷۰ء میں پھر لاہور سے طبع ہوئی۔ ۱۸۷۳ء میں لندن سے دوسری بار مکمل ایڈیشن کی صورت میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن ۱۸۸۹ء میں لندن سے طبع ہوا۔

(۲) 'ہر روز کی ہندوستانی' کے نام سے ہالرائیڈ کی تالیف ۱۹۰۶ء میں لاہور اور لندن سے شائع ہوئی۔

بوراڈیل (Borradaile):

۱۸۶۹ء میں برطانوی مستشرق، کپتان بوراڈیل کی کتاب بہ عنوان 'ہندوستانی مینوئل' مدراس سے شائع ہوئی۔ کتاب رومن رسم الخط میں ہے۔ [۳۸۳]

ڈبلیو ایتھرنگٹن (W.Etherington):

اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر برطانوی مستشرق، ڈبلیو ایتھرنگٹن کی تالیفات درج ذیل ہیں:

(۱) 'The Student's Grammar of the Hindi Language' کے عنوان سے ایتھرنگٹن کی کتاب ۱۸۷۰ء میں بنارس اور لندن سے شائع ہوئی۔ ۱۸۷۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بنارس اور لندن ہی سے طبع ہوا۔

(۲) بنارس ہی سے گرامر پر ایتھرنگٹن کی ایک اور کتاب شائع ہوئی۔ کتاب کا نام ہے: [384]

'Bhasha_Bhaskar, a Grammar of the Hindi Language'

جان ڈاؤسن (John Dowson):

۱۸۷۲ء میں 'A Grammar of the Hindustani Language' کے عنوان سے ایک کتاب لندن سے شائع ہوئی۔ مؤلف برطانوی مستشرق، جان ڈاؤسن (۱۸۲۰ء۔۱۸۸۱ء) اُکسبرج (Uxbridge) میں پیدا ہوا۔ اپنے چچا ایڈون نارس (Edwin Norris) سے السنہ شرقیہ کی تعلیم

حاصل کی۔ چچا کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سلسلے میں مدد بھی دی۔اسی سبب ڈاؤسن ہیلی بری کالج (Haileybury College) میں ٹیوٹر مقرر رہا۔۱۸۵۵ء سے۱۸۷۷ء تک ڈاؤسن یونی ورسٹی کالج لندن میں ہندوستانی کا پروفیسر رہا۔سندھرسٹ (Sandhurst) کی فوجی درس گاہ میں بھی ہندوستانی زبان کی تدریس کی۔ دوسواسّی (۲۸۰) صفحات پر مشتمل ڈاؤسن کی گرامر کا ذکر گارسیں دتاسی نے اپنے مقالات میں کیا ہے۔[۳۸۵] دتاسی کا بیان ہے:

> اردو زبان کی صرف ونحو پر نئی کتاب کی ضرورت تو نہ تھی لیکن مسٹر جان ڈاؤسن نے اپنے پیش رووں سے زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے۔مسٹر ڈاؤسن کی کتاب پچھلی سب کتابوں کی نسبت زیادہ مکمل ہے۔اس میں کثرت سے مثالیں ''باغ و بہار'' سے دی گئی ہیں۔خط شکستہ ہے اور رقم لکھنے کے ہندسوں کے متعلق نئی معلومات درج ہیں۔مگر مجھے افسوس ہے کہ مسٹر ڈاؤسن نے بھی شیکسپیئر کی طرح اردو کے فارسی حروفِ تہجی مکمل درج نہیں کیے بلکہ صرف ان کی علاحدہ علاحدہ اصل شکلیں لکھی ہیں۔

اس گرامر کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن بالترتیب ۱۸۸۷ء اور ۱۹۰۸ء میں اشاعت پذیر ہوا۔[۳۸۶]

سموئیل ہنری کیلاگ (Samuel Henry Kellogg):

اردو، ہندوستانی زبان کے قواعد پر امریکی مستشرق، ایس ایچ کیلاگ (۱۸۳۹ء۔۱۸۹۹ء) کی تالیف ۱۸۷۶ء[۳۸۷] میں لندن اور الہ آباد سے شائع ہوئی۔کتاب کا نام ہے:

'A Grammar of the Hindi Language, in which are treated the High Hindi, Braj and Eastern Hindi of the Ramayan of Tulsi Das, also the colloquial Dialects of Rajputana, Kamaon, Avadh, Riwa, Bhojpur, Magadha, Maithla(sic), etc., with copious philological Notes'[388]

اس کا دوسرا ایڈیشن لندن سے ۱۸۹۳ء میں طبع ہوا۔یہی کتاب ۱۹۳۸ء میں دوبارہ چھپی۔

جان بیمز (John Beams):

انگریز مستشرق، جان بیمز (۱۸۳۷ء۔۱۹۰۲ء) نے تین جلدوں پر مشتمل اپنی تالیف کا آغاز ۱۸۶۶ء میں کیا۔تالیف کی پہلی جلد ۱۸۷۱ء میں درج ذیل عنوان سے طبع ہوئی۔

'AComparative Grammar of Modren Arian Languages of India'

بعد ازاں دوسری اور تیسری جلدیں طبع ہوئیں۔دوسری بار یہ تالیف لندن سے ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔[۳۸۹]

جان تھامپسن پلیٹس (John Thompson Platts):

اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر برطانوی مستشرق، جان تھامپسن پلیٹس (۱۸۴۰ء-۱۹۰۴ء) کی تالیف ۱۸۷۳ء [۳۹۰] میں لندن سے منظرِ عام پر آئی۔ کتاب کا عنوان ہے:

'A Grammar of the Hindustani or Urdu Language'

اردو/ہندوستانی زبان کی گرامر پر یہ ایک عمدہ تالیف ہے۔ پلیٹس نے گرامر کی تدوین میں ہند آریائی زبانوں کے مزاج اور گرامر کا خاص طور پر خیال رکھا۔ پلیٹس نے ان سب گرامروں سے استفادہ کیا جو اس کے ہم عصروں نے یا اس سے قبل لوگوں نے لکھی تھیں اور بہت سے اردو کے عالم فاضل لوگوں کی کتابوں سے بھی مدد لی [۳۹۱]۔ کتاب کا پہلا باب حروف اور الفاظ سے متعلق ہے۔ دوسرا باب علمِ نحو پر مباحث کا احاطہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں فارسی اور عربی الفاظ، اسم، صفات اور افعال پر بیان بھی اسی باب میں شامل ہے۔ تیسرا باب فعل پر مباحث پر مشتمل ہے۔ چوتھا باب حرف اور پانچواں باب مآخذ الفاظ کی بحثوں کو سمیٹتا ہے۔ چھٹے سے بارہویں تک، سات ابواب اصولِ نحو پر تحقیق سے متعلق ہیں۔ پلیٹس کی یہ تالیف درج ذیل خصوصیات کی حامل ہے:

☆ کتاب میں بیش تر جملے اور پیراگراف اردو ٹائپ میں ہیں۔ دیوناگری رسم الخط پر ایک تعارفی پیراگراف بھی شامل کیا گیا ہے۔

☆ پلیٹس نے اردو کے حروفِ تہجی پینتیس (۳۵) بیان کیے ہیں۔ اس کے نزدیک اگرچہ اردو میں فارسی اور عربی زبانوں کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے مگر اس کے باوجود اردو زبان کا ماخذ ہندی زبان میں ہے۔ البتہ اسے فارسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔

☆ حصہ نحو میں مثالیں دینے کے لیے اردو جملے اور اقتباسات درج ذیل کتب سے اخذ کیے گئے ہیں:
باغ و بہار، فسانہ عجائب، صوبہ سرحد کی اردو ریڈریں، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔

☆ پلیٹس نے 'ہمزہ (ء)' اور 'ے' کو حروف میں شامل نہیں کیا۔ اور انھیں 'ی' کے ساتھ درج کر دیا ہے۔

☆ ڑ، ٹ اور ڈ پر 'ط' کے شوشے کے بجائے چار نقطے (::) دیے گئے ہیں۔ اس سے فاربس کی تقلید کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ کتاب کے آخر میں اسلامی اور ہندی کیلنڈر بھی دیے گئے ہیں۔

☆ پلیٹس نے بہت سے معاصر علما اور ان کی گرامر سے متعلق تالیفات سے استفادہ کیا ہے جس کا ذکر کتاب کے دیباچے میں ملتا ہے۔ '۱۹۲۰ء میں اس کا چھٹا ایڈیشن لندن سے شائع ہوا۔ اسی ایڈیشن کے نسخے پنجاب پبلک لائبریری اور پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔' [۳۹۲]

ریورنڈ ایڈورڈ سیل (Reverend Edward Sell):

گریرسن کے مطابق اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر انگریز مستشرق پادری، ریورنڈ ایڈورڈ سیل (۱۸۳۹ء-۱۹۳۲ء) کی درج ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

(۱) 'خلاصۃ القوانین ابتدائی قواعد' کے عنوان سے سیل کی کتاب ۱۸۷۴ء میں مدراس سے طبع ہوئی۔ سرورق پر یہ نام درج ہے:

'Khulasatu'l-Qawanin. An Elementary Grammar'

کتاب کے مزید دو ایڈیشنز ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء میں طبع ہوئے۔

(۲) 'جامع القوانین' (Jami'u'l-Qawanin) کے نام سے سیل کی کتاب مدراس سے ۱۸۷۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کا پانچواں ایڈیشن ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا۔ [۳۹۳]

سیل نے 'جامع القوانین' مستشرق قواعد نویسوں کے عام طریقے کے برعکس اردو زبان میں لکھی ہے اور اردو کتبِ قواعد کے طریقے پر اس کے مباحث کو ترتیب دیا ہے مگر اس میں کچھ اس کا اپنا انداز بھی ہے۔ حصۂ نحو میں اوّل مرکباتِ ناقصہ سے بحث ہے، پھر جملے کی اقسام (اسمیہ و فعلیہ، خبریہ و انشائیہ)

سے۔ جملہ فعلیہ کی ذیل میں فاعل ومفعول کی پہچان اور نائب فاعل کا بھی بیان ہے۔ پھر مفعول اور متعلقاتِ مفعول، فعل اور متعلقاتِ فعل اور توابع کا بیان ہے۔ اس کے بعد صفت اور ترکیب کے اعتبار سے جملوں کی قسمیں بیان کی ہیں۔ آخر میں اُن اسموں کا بیان ہے جو دوسرے اسم سے مل کر ہی جملے کا جزو ہو سکتے ہیں۔[۳۹۴]

مانسنیو غے پیزونی (Monsignore Pezzoni):

اطالوی مستشرق، مانسنیو غے پیزونی کی کتاب 'Grammatica Italiana e Indostana' کے نام سے ۱۸۷۴ء میں سردھنے سے شائع ہوئی۔[۳۹۵]

ایچ آغیاک (H.Aurillac):

'Petit Manuel Francias_Hindoustani' کے نام سے اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر ایک تالیف کلکتے سے ۱۸۷۵ء میں طبع ہوئی۔ مؤلف، ایچ آغیاک، ایک فرانسیسی مستشرق تھا۔[۳۹۶]

ڈی ایف ڈائس (D.F.Dais):

۱۸۷۸ء میں دکنی زبان کی گرامر پر یورپی مستشرق، ڈی ایف ڈائس کا رسالہ ریاست ستارا سے طبع ہوا۔[۳۹۷]

چارلس لائل (Charles Lyall):

اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر برطانوی مستشرق، چارلس لائل (۱۸۴۵ء۔۱۹۲۰ء) نے درج ذیل دو کتابیں تالیف کیں:

(۱) 'Sketch of the Hindustani Language' کے نام سے چارلس لائل کی کتاب ۱۸۸۰ء میں ایڈنبرا سے طبع ہوئی۔[۳۹۸]

(۲) چارلس کی ایک اور کتاب 'انگریزی ہندوستانی بول چال' ۱۸۹۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔[۳۹۹]

پی کینیڈی (P.Canady):

'ہندوستانی انگلش پرائمر' کے عنوان سے پی کینیڈی کی تالیف کلکتے سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔[۴۰۰]

جے براؤن (J.Browne):

'Hindi Primer in Roman Character' کا نام سے اردو/ہندوستانی گرامر پر برطانوی مستشرق، جے براؤن کی کتاب ۱۸۸۲ء میں لندن سے طبع ہوئی۔[۴۰۱]

ڈبلیو کیگن (W.Keegan):

۱۸۸۲ء [۴۰۲] میں ایک پادری، ڈبلیو کیگن نے اردو/ہندی زبان کے قواعد پر اپنی تالیف سردھنے سے شائع کی۔تالیف کا عنوان 'Grammatica Lingua Indostana' ہے۔[۴۰۳]

ایڈرڈ ہنری پامر (Edward Henry Palmer):

لندن سے برطانوی مستشرق،ایڈورڈ ہنری پامر(۱۸۴۰ء۔۱۸۸۲ء) کی تالیف ۱۸۸۲ء میں درج ذیل عنوان سے شائع ہوئی۔

'A Simplified Grammar of Hindustani, Persian and Arabic'

دوسری بار یہ ۱۸۸۵ء میں اور تیسری بار ۱۹۰۶ء میں طبع ہوئی۔[۴۰۴]

فریڈرک پن کوٹ (Frederic Pincott):

اردو/ہندوستانی گرامر پر ایک کتاب لندن سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔کتاب کا عنوان ہے:

'The Hindi Manual, comprising a Grammar of the Hindi Language both Literary and Provincial; complete Syntax, Exercises in various Styles of Hindi Composition, Dialogues on several subjects, and a useful Vocabulary'

اس کتاب کا مؤلف ایک برطانوی مستشرق،فریڈرک پن کوٹ ہے۔[۴۰۵]

جے ونسن (J.Vinson):

گریرسن نے فرانسیسی مستشرق، جے ونسن کی درج ذیل دو کتابوں کا ذکر کیا ہے:

(۱) 'Elements de la Grammaire Hindoustani' کے نام سے ونسن کی کتاب ۱۸۸۳ء [۴۰۶] میں پیرس سے منظرِ عام پر آئی۔

(۹) ونسن کی ایک اور کتاب، 'Manuel de la Lingua Hindoustani' ۱۸۹۹ء میں پیرس سے طباعتی مراحل سے گزری۔[۴۰۷]

اے ای فو لک (A.E.Foulques):

۱۸۸۳ء میں اردو/ہندوستانی قواعد پر اطالوی مستشرق، پروفیسر فو لک کی کتاب نیپلز (Naples) سے طبع ہوئی۔کتاب کا نام ہے۔

'Hindostani Zaban ke Qawaid, Grammatica Indostana ad Uso degli Italiani' [408]

ازایز اوریلیس (Azais):

فرانسیسی مستشرق، ازایز اوریلیس کی کتاب 'فرانسیسی ہندوستانی مینوئل' ۱۸۸۵ء [۴۰۹] میں کلکتے سے طبع ہوئی۔اس کتاب کا پانچواں اور تیرھواں ایڈیشن

بالترتیب ۱۸۸۷ء اور ۱۸۹۱ء میں مدراس سے شائع ہوا۔[۴۱۰]

ایم سی رینالڈس (M.C.Reynolds) اور جے ایف بینس (J.F.Baness):

'Household Hindustani_A Manual for New_comers' کے نام سے جے ایف بینس اور ایم سی رینالڈس کی مشترکہ تالیف ۱۸۸۶ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔[۴۱۱]

ای ایچ اوگرز (E.H.Augers):

۱۸۸۷ء میں برطانوی مستشرق، ای ایچ اوگرز کی کتاب، 'ہندوستانی کیسے بولیں' لندن سے طبع ہوئی۔[۴۱۲]

کُرتوا (Courtois):

اردو ہندوستانی گرامر پر فرانسیسی مستشرق، کُرتوا کی کتاب ۱۸۸۷ء میں مدراس سے منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کا عنوان ہے:

'A Manual of the Hindustani Language as spoken in

southern India'

علاوہ ازیں اسی مستشرق کی ایک اور معلوماتی کتاب، 'ہندوستانی میں امتحان کے امیدواروں کے لیے اشارے' کے نام سے ۱۸۸۸ء میں مدراس ہی سے طبع ہوئی۔[۴۱۳]

ارڈلے ولموٹ (Eardley Wilmot):

'Hindustani Idiomatic Sentences' کے عنوان سے ۱۸۸۷ء میں ارڈلے ولموٹ کی کتاب مدراس سے شائع ہوئی۔[۴۱۴]

جارج رینکنگ (George Ranking):

برطانوی مستشرق، پروفیسر جارج رینکنگ (سنہ پیدائش ۱۸۵۲ء) کی اردو ہندی گرامر پر تالیفات کی تفصیل درج ذیل ہے:[۴۱۵]

(۱) ۱۸۸۹ء میں رینکنگ کی اہم تالیف، 'تعلیم زبانِ اردو' کے نام سے بیپٹسٹ مشن پریس کلکتہ نے شائع کی۔

(۲) 'A Guide to Hindustani' کے نام سے رینکنگ کی ایک کتاب ۱۸۸۹ء میں کلکتے سے طبع ہوئی۔ اس کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں ایڈیشن بالترتیب ۱۸۹۵ء، ۱۸۹۷ء اور ۱۹۰۴ء میں طبع ہوا۔

(۳) ۱۸۹۵ء میں 'آسان اردو پاکٹ بک' کے نام سے رینکنگ کی ایک اور کتاب کلکتے سے اشاعت پذیر ہوئی۔

(۴) ۱۸۹۶ء میں کلکتے سے شائع شدہ رینکنگ کی تالیف کا عنوان ہے:

'Introducing Exercises in Urdu Prose Composition. A Collection of

50 Exercises with Idiomatic Phrases and Grammatical Notes,

accompanied by a full Vocabulary and Translations

of each Passage'

اس کتاب کے دیباچے میں درج معلومات کے مطابق اس گرامر کی تالیف میں مولوی محمد یوسف جعفری نے رینکنگ کی مدد کی۔

(۵) رینکنگ کی دوسری اہم تالیف لندن سے ۱۸۹۹ء میں طبع ہوئی۔ اس تالیف کے سرورق پر یہ نام درج ہے:

'Urdu_English Primer for the Use of the Colonial Artillery'

(۶) 'ہندوستانی کے امتحان کے لیے پرچوں کے نمونے' کے نام سے بھی رینکنگ کی ایک کتاب ۱۸۹۹ء میں کلکتے سے چھپی۔

پرسی سمتھ (Percy Smith):

۱۸۹۰ء میں پرسی سمتھ کی تالیف 'Urdu Grammar' کلکتے سے شائع ہوئی۔[۴۱۶]

جے ٹوئیڈی (J.Toydi):

'Hindustani as it ought to be Spoken' کے عنوان سے جے ٹوئیڈی کی کتاب ۱۸۹۰ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔ دوبارہ یہی کتاب کلکتے ہی سے ۱۸۹۳ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ دوسرے ایڈیشن کا عنوان ہے:[417]

'Hindustani as it ought to be Spoken. Supplement'

سائمن میتھیوز ایڈون کیمپسن (Simon Mathews Edwin Kempson):

برطانوی مستشرق اور رائل سٹاف کالج کے پروفیسر، کیمپسن (۱۸۳۱ء۔۱۸۹۴ء) کی انگریزی تالیف ۱۸۹۰ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ کتاب کا عنوان ہے:

'The Syntax and Idioms of Hindustani, or Progressive Exercises in

Translations, with Notes and Vocabulary'

۱۸۹۳ء، ۱۹۰۶ء میں اس کے مزید دو ایڈیشنز لندن ہی سے طبع ہوئے۔[۴۱۸]

رینے دکوئنٹن (Rene De Quentin):

فرانسیسی مستشرق، کوئنٹن کی کتاب 'Abrege de Grammaire Hindoustanie' کے عنوان سے رومن رسم الخط میں ۱۸۹۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔[۴۱۹]

کامیلو تالیابوئے (Camillo Tagliabue):

اطالوی زبان میں اردو کی سب سے پہلی گرامر ۱۸۹۲ء میں نیپلز (Naples) سے شائع ہوئی۔ برِصغیر پاک و ہند کے ادب پر ایک مختصر مضمون بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ اطالوی مستشرق، کامیلو تالیا بوئے کی تالیف ہے۔ کامیلو روم کے 'مشرقی انسٹی ٹیوٹ' (Instituto Orientale) میں اردو/ہندی کے پروفیسر تھے۔ کامیلو نے کئی کتابیں لکھیں لیکن گرامر پر ان کی کتاب

'Grammatica della Lingua Indostana O Urdu' بہت مشہور ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ جلد اوّل کے دو سو اٹھاون (۲۵۸) صفحات ہیں جب کہ جلد دُوّم دو سو نوے (۲۹۰) صفحات پر مبنی ہے۔ ۱۸۹۸ء میں نیپلز ہی سے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔[۴۲۰]

اے زائڈل[۴۲۱] (A.Seidel):

اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر جرمن مستشرق، اے زائڈل کی تالیف ۱۸۹۳ء میں لائی پزگ (Leipzig) سے اشاعت پذیر ہوئی۔ سرورقِ کتاب کا یہ عنوان درج ہے:

'Theoretische_praktische Grammatik der Hindustani_Sprache, mit Ubungstucken in arabischer Schrift, und ein Deutsch_Hindustani Worterbuch'[422]

جی ٹی پلنکٹ (G.T.Plunkett):

برطانوی مستشرق، کرنل جی ٹی پلنکٹ کی کتاب ۱۸۹۳ء میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب تین زبانوں، یعنی فارسی، ہندوستانی اور پشتو کی گرامروں کا خلاصہ ہے جس میں پندرہ سو (۱۵۰۰) الفاظ پر مشتمل ڈکشنری بھی شامل ہے۔ پلنکٹ کا مینوئل دراصل ایک 'پاکٹ بک' (Pocket Book) ہے جس میں لغت و قواعد کے علاوہ بھی دیگر معلوماتی مواد درج کیا گیا ہے۔ کتاب کا نام ہے:

'The Conversation Manual in English, Hindustani, Persian and Pushto'

اس مینوئل کا تالیف کا مقصد ہندوستان کی طرف آنے والے افراد اور خصوصاً مستشرقین کو زندگی کے ہر شعبے سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ مذکورہ بالا تینوں زبانوں کے حروفِ تہجی سے تعارف پر مشتمل ہے۔ صفحہ تیرہ (۱۳) سے سولہ (۱۶) تک ہندوستانی زبان کے قواعد و اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں تذکیر و تانیث، واحد اور جمع درج کرنے کے بعد ان کی وضاحت رومن رسم الخط میں کی گئی ہے۔ صفحہ سترہ (۱۷) سے بیس (۲۰) تک فارسی گرامر اور صفحہ اکیس (۲۱) سے بتیس (۳۲) تک پشتو گرامر کے بنیادی اصولوں پر مباحث کو سمیٹا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں جملوں کے بارے میں اسم، فعل، فاعل وغیرہ سمجھانے کے بعد مشقیں دی گئی ہیں۔ ہر جملے کا ترجمہ انگریزی، ہندوستانی، فارسی اور پشتو یعنی چاروں زبانوں میں بہ یک وقت درج کیا گیا ہے۔

گریرسن کے علاوہ پلنکٹ وہ مستشرق ہے جس نے پشتو زبان کو ہندوستانی اور فارسی زبانوں کے ساتھ مطالعے کے لیے پیش کیا۔[۴۲۳]

ایم شُلزے (M.Schultze):

'Grammatik der Hindustanischem Sprache' کے عنوان سے ۱۸۹۴ء میں اردو/ہندوستانی گرامر پر جرمن مستشرق، ایم شلزے کی تالیف لائی پزگ سے منظرِ عام پر آئی۔[۴۲۴]

اے او گرین (A.O.Green):

اے او گرین کی کتاب، 'A Practical Hindustani Grammar' ۱۸۹۵ء میں آکسفورڈ سے دو حصّوں میں طبع ہوئی۔[۴۲۵]

ایل میکارتھی (L.Mc Carthy):

فرانسیسی مستشرق، ایل میکارتھی کی تالیف 'Grammaire Hindustani-Francaise' ۱۸۹۵ء میں طبع ہوئی۔[۴۲۶]

ایڈون گریوز (Edwin Greaves):

ایڈون گریوز کی تالیف 'A Grammar of Modern Hindi' ۱۸۹۶ء میں بنارس سے شائع ہوئی۔ ترمیم اوراضافے کے بعداس کتاب کادوسراایڈیشن ۱۹۰۸ء میں منظرِ عام پرآیا۔[۴۲۷]

ٹی وولزلے ہیگ (T.Wolseley Hagg):

'اردو کے مطالعے کے اشارے' (Hints of the study of Urdu) کے عنوان سے ۱۸۹۸ء میں اردو، ہندوستانی گرامر پرٹی وولزلیہیگ کی کتاب الہ آباد سے طبع ہوئی۔[۴۲۸]

جارج جے ڈَن (George J.Dann):

جارج جے ڈَن کی تالیف ۱۹۰۰ء میں بنارس سے شائع ہوئی۔ کتاب کاعنوان ہے:

'An Introduction to Hindi Prose Composition'

اسی مستشرق کی ایک اور کتاب، 'First Lesson in Urdu' کے نام سے ۱۹۱۱ء میں کلکتے سے طبع ہوئی۔[۴۲۹]

ڈبلیوہوپر (W.Hooper):

لندن سے 'Helps to Attainment of Hindustani Idioms' کے نام سے برطانوی مستشرق، ڈبلیوہوپر کی تالیف ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔[۴۳۰]

ای یگیلو (E.Ugolev):

روسی مستشرق، ای یگیلو کی کتاب 'ہندوستانی زبان کی عملی قواعد' ۱۹۰۲ء میں بہ مقام تاشقند طبع ہوئی۔[۴۳۱]

سی اے تھم (C.A.Thimm):

۱۹۰۲ء میں انگریز مستشرق، کپتان سی اے تھم کی تالیف لندن سے اشاعت پذیر ہوئی۔ کتاب کاعنوان ہے:

'Hindustani Self-Taught. With correct Pronounciation. For Travellers, Students, Officials, Soldiers, Traders, etc.'

یہ کتاب دوسری، تیسری اور چوتھی بار بالترتیب ۱۹۰۷ء، ۱۹۰۸ء، اور ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔ [۴۳۲]

کارل برگمنس (Carl Bergmanson):

۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء کے دوران میں جرمن مستشرق، کارل برگمنسن کی تالیف 'ہند جرمن زبان کی قواعد' آئرس برگ سے منظرِ عام پر آئی۔ [۴۳۳]

آر پی گرولڈ (R.P.Gerold):

۱۹۰۴ء میں اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر آر پی گرولڈ کی تالیف بیٹیا (Bettiah) کے کیتھولک مشن پریس سے شائع ہوئی۔ 'Grammatik Der Hindustanischen Sprache' کے نام سے یہ کتاب دوسو پانچ (۲۰۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ [۴۳۴]

ایف آر ایچ چیپ مین (F.R.H.Chapman):

اردو/ہندوستانی گرامر پر برطانوی مستشرق، میجر ایف آر چیپ مین کی کتابیں درج ذیل ہیں:

(۱) ۱۹۰۵ء میں لندن سے چیپ میں کی ایک کتاب طبع ہوئی۔ اس کتاب کا عنوان ہے:

'How to Learn Hindustani, a Guide to the Lower and Higher Standard Examination'

(۲) اسی سلسلے میں چیپ مین کی دوسری تالیف ۱۹۱۰ء میں لندن ہی سے طبع ہوئی۔ اسی ایڈیشن کا ایک ایک نسخہ کلکتہ، ممبئی اور شملہ سے بھی ۱۹۱۰ء ہی میں شائع ہوا۔ تالیف کا نام ہے:

'Urdu Reader for Military Students, containing Urdu alphabets; notes on reading and writing Urdu: Simple Grammatical Exercises(Urdu and Romanized Urdu); Easy Selections from various Authors; Military Selections and Historical Selections. Together with a complete Vocabulary of all the Words occurring in the text' [435]

ولیم ہوئے (William Hoey):

برطانوی مستشرق، ولیم ہوئے اردو اور فارسی دان تھا۔ شاعر بھی تھا۔ 'ہوئے' کے تخلص سے اردو میں غزلیں کہا کرتا تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں۔

اردو/ہندوستانی گرامر پر، ولیم ہوئے کی تالیف ۱۹۰۷ء میں آکسفورڈ سے شائع ہوئی۔ کتاب کا عنوان ہے:

'Urdu Praxis; a Progressive course of Urdu Composition' [436]

لوئی جی ایف پی جوزا (Luigi F.P.Josa):

اردو،ہندوستانی گرامر پر انگریز مستشرق،لوئی جی جوزا کی کتاب لندن سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔کتاب کا نام ہے:

'Introducing Manual of the Hindi Language, with Extracts from the Premsagar, together with technical Vocabularies'[437]

ڈی کریون فلاٹ (D.Carven Phillott):

برطانوی مستشرق اور ممتحن بورڈ کلکتہ کے سیکرٹری، کرنل ڈگلس کریون فلاٹ (۱۸۶۰ء۔۱۹۳۰ء) کی اردو،ہندوستانی زبان کے قواعد پر تالیفات کی تفصیل اس طرح سے ہے:[۴۳۸]

(۱) 'Hindustani Stepping Stone' الہ آباد سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔

(۲) فلاٹ کی ایک اور کتاب ۱۹۰۹ء میں طبع ہوئی۔کتاب کا عنوان ہے:

'Hindustani Stumbling Blocks, being difficult in the Syntax and Idiom of Hindustani explained and examplified"

اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں لندن سے طبع ہوا۔

(۳) 'Hindustani Manual' ۱۹۱۱ء میں پہلی بار کلکتے سے شائع ہوا۔اس کا دوسرا ایڈیشن کلکتے ہی سے ۱۹۱۷ء میں سامنے آیا۔

(۴) 'Khazina-e-Muhawarat or Urdu Idioms' کے عنوان سے فلاٹ کی ایک تالیف کلکتے سے پہلی بار ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا۔

(۵) فلاٹ کی ایک کتاب ۱۹۱۲ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔کتاب کا عنوان ہے:

'Hindustani Exercises for the Proficiency and High Proficiency with Notes and Translations'

(۶) ۱۹۳۱ء میں 'گھریلو ہندوستانی' از فلاٹ کا دوسرا ایڈیشن سامنے آیا۔

این ہیرسن (N.Harrison):

اردو،ہندوستانی زبان کے قواعد کے ضمن میں برطانوی مستشرق، این ہیرسن کی کتاب ۱۹۱۱ء میں لندن سے تیسری بار چھپی۔اس کا پہلا سالِ اشاعت معلوم نہ ہو سکا۔کتاب کا عنوان ہے:

'Manual of Laskari_Hindustani with Technical Terms and Phrases'[439]

ڈبلیو سینٹ کلیر ٹسڈل (W.St.Clair Tisdill):

'A Conversation-Grammar of the Hindustani Language'

کے عنوان سے برطانوی مستشرق، کلیرٹسڈل کی تالیف ۱۹۱۱ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ ۱۹۶۳ء تک اس کتاب کے کئی ایڈیشنز نیو یارک (NewYork)، بوسٹن (Boston)، ہائیڈل برگ (Heidelberg) اور لندن (London) سے چھپے۔[۴۴۰]

پی بارتولومیو دکسولا (P.Bartolomio Da Casola):

اطالوی مستشرق، بارتولومیو دکسولو کی کتاب ۱۹۱۵ء میں دیناپور کے پریس سے طبع ہوئی۔ کتاب کا عنوان درج ذیل ہے:

'Grammatica Elementare Italiano-Indoastana'[441]

ڈبلیو ایس برک (W.S.Burke):

'بول چال کی ہندوستانی' کے عنوان سے برک کی تالیف کلکتے سے ۱۹۲۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔[۴۴۲]

اوتاکر پارتولد (Otakar Partold):

۱۹۳۱ء میں اردو / ہندوستانی گرامر کے ضمن میں، 'مبادی ہندوستانی' (Ucebnic Hindustani) کے عنوان سے ایک تالیف پراگ (Prague) سے شائع ہوئی۔ اس کا مؤلف ایک چیک مستشرق، اوتاکر پارتولد (سالِ پیدائش ۱۸۸۴ء) تھا، جسے چیکوسلوواکیہ میں اردو زبان کے پہلے پروفیسر کا اعزاز حاصل تھا۔ کتاب میں دیوناگری پر مختصر مقدمہ اور نو (۹) اسباق اردو کے شامل ہیں۔ چوبیس (۲۴) اسباق رومن رسم الخط میں ہیں۔ نوآموز اردو سیکھنے والوں کے لیے یہ معیاری کتاب ہے۔ چیکوسلوواکیہ کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی اردو زبان کی تدریس کے لیے یہ کتاب مستعمل ہے۔ 'ہندوستانی روزمرہ' (Hindustani Rozmarrah) کے نام سے پارتولد کی ایک کتاب شعبہ شرقیات (Oriental Section) کے ماہ نامے، 'نوی اوریان' (Novy Orient) میں بالاقساط شائع ہوئی۔ یہ کتاب ہندوستانی گرامر اور ہندوستانی میں روزمرّہ گفت گو کے کئی اسباق پر مشتمل ہے۔ پارتولد کی اس تصنیف کا سنہ اشاعت معلوم نہ ہو سکا۔[۴۴۳]

ولیم ماسے (William Massey) اور جے ایچ ایلن (J.H.Allen):

'اردو کی پہلی کتاب' کے نام سے ولیم ماسے اور جے ایچ ایلن کی مشترکہ تالیف ۱۹۳۶ء میں کرسچین لٹریری سوسائٹی (Christian Literary Society) الہ آباد کی جانب سے شائع کی گئی۔ حروف شناسی کے بعد اس میں نظم و نثر کے مباحث کو مختلف اسباق کے تحت سمیٹا گیا ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔[۴۴۴]

ایچ سی پارکس (H.C.Parks):

'آسان ہندوستانی' کے عنوان سے برطانوی مستشرق، ایچ سی پارکس کی کتاب ۱۹۳۷ء میں لندن سے شائع ہوئی۔[۴۴۵]

جے ولٹ (J.Whillot):

۱۹۳۸ء میں اردو / ہندوستانی گرامر پر برطانوی مستشرق، جے ولٹ کی کتاب آکسفورڈ سے شائع ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں اس کتاب کا پانچواں اور ۱۹۴۵ء

میں چھٹا ایڈیشن طبع ہوا۔[446]

ای جون (E.John):

۱۹۴۲ء میں الہ آباد سے 'سیلف ہندوستانی' (Self Hindustani) کے عنوان سے ایک کتاب طبع ہوئی۔ مؤلف کا نام ای جون ہے۔[447]

اے ڈبلیو کورنیلیس (A.W.Cornelius):

اے ڈبلیو کورنیلیس کی تالیف، 'ہندوستانی روزمرّہ اور قواعد' مسوری سے ۱۹۴۳ء میں منظرِ عام پر آئی۔[448]

ایچ سٹینلے (H.Stanley):

ایچ سٹینلے کی تالیف، 'بول چال کی ہندوستانی' کو ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء کے دوران میں تاراپور والا (ناشر) نے شائع کیا۔[449]

ڈبلیو سٹوفر (W.Stopher):

ڈبلیو سٹوفر کی کتاب، 'ملٹری اردو راہ نما' ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء کے درمیانی عرصے میں طبع ہوئی۔[450]

آر ایف کیفرڈ (R.F.Kafford):

۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء کے درمیانی عرصے میں اردو/ ہندوستانی گرامر پر آر ایف کیفرڈ کی کتاب 'فوقانیہ اردو کی راہ نما' بمبئی (ممبئی) سے طبع ہوئی۔[451]

آر جونسٹن (R.Johnston):

'اردو امتحان پاس کرو' کے نام سے آر جونسٹن کی تالیف بمبئی (ممبئی) سے ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۸ء کے دوران میں شائع ہوئی۔[452]

ایچ ہارلے (H.Horley):

برطانوی مستشرق، ایچ ہارلے کی اردو/ ہندوستانی زبان کے قواعد پر کتاب، 'بول چال کی ہندوستانی کا تعارف' کے عنوان سے ۱۹۴۴ء میں لندن سے پہلی بار شائع ہوئی۔ ۱۹۶۳ء تک اس کے کئی ایڈیشنز سامنے آئے۔[453]

اوسپیس (Ospaic):

'Hindustani Brief' کے نام سے جرمن مستشرق، اوسپیس کی تالیف ۱۹۴۴ء میں لائی پزگ سے منظرِ عام پر آئی۔[454]

ہوگو (Hugo):

۱۹۴۶ء میں لندن سے ایک کتاب 'آسان ہندوستانی' اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کا مؤلف برطانوی مستشرق، ہوگو ہے۔[455]

ایچ سی پال (H.C.Paul):

اردو/ہندوستانی زبان کے قواعد پر برطانوی مستشرق، کپتان ایچ کیچ پال کی تالیف 'ابتدائی اردو: عام اور فوجی' کے نام سے ۱۹۴۶ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ کتاب رومن رسم الخط میں ہے جو فوجی طلبا کے لیے ہندوستانی زبان سے آگاہی کی غرض سے تالیف کی گئی۔ اس کا مقدمہ ای ایچ گارڈ نے (E.H.Guard) لکھا تھا۔[۴۵۶]

ڈبلیو میک ملن (W.MacMillan):

'ہندوستانی کا راہ نما' کے نام سے برطانوی مستشرق، ڈبلیو میک ملن کی تالیف ۱۹۴۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔[۴۵۷]

نامکمل حوالوں کی حامل تالیفات

اردو/ہندوستانی قواعد کے ضمن میں مستشرقین کی وہ تالیفات جن کے سالِ تالیف و اشاعت یا مؤلف کے نام کے حوالے سے زیادہ معلومات بہم نہ ہو سکیں ان کا سرسری ذکر بھی ضروری ہے:

☆ پیرس کے کتب خانے 'ببلیو تک ناسیونال' (Bibliotheque Nationale) کے اردو مخطوطات، کیٹلاگ نمبر آٹھ سو بتیس (۸۳۲) میں ایک فرانسیسی مستشرق، شارل دوشوا (Charles D' Ochoa) کی نوٹ بک موجود ہے۔ نوٹ بک میں درج معلومات کے مطابق دوشوا ایک سائنٹیفک مشن کا انچارج تھا جسے حکومتِ فرانس کے وزیرِ تعلیم نے ۱۸۴۳ء میں ہندوستان بھیجا تھا۔ دوشوا نے نوٹ بک کے صفحہ ایک سو سینتالیس (۱۴۷) پر اردو قواعد لکھنا شروع کیے، لیکن فقط ایک صفحہ لکھا۔ ابتدائی نوٹ کا ترجمہ یہ ہے:

> ہندوستانی زبان کو ہندی، اردو اور ریختہ بھی کہتے ہیں۔ یہ زبان ہندی اور برج بھاشا سے بنی ہے جو اب بھی بعض جگہ بولی جاتی ہے۔ مثلاً قنوج میں جو ایرانی اور عرب فاتحین کا دارالحکومت تھا۔ ہندوستان کے جزیرہ نما کے مغرب میں ہندوستانی، نئی دکھنی زبان بولی جاتی ہے جو عربی اور دیوناگری دونوں حروف میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر عربی رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے۔ دیوناگری رسم الخط صرف برج بھاشا اور ہندی بولیوں کو لکھتے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔[۴۵۸]

☆ گریرسن نے اپنی تالیف 'Linguistic Survey Of India' میں اردو قواعد کے ضمن میں پرتگیزی زبان میں ایک کتاب 'Portuguese Grammatica Indostan' کا ذکر کیا ہے جو ۱۷۷۸ء میں لزبن سے شائع ہوئی۔ مؤلف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔[۴۵۹]

☆ آغا افتخار حسین بیان کرتے ہیں کہ گبرناتس (Count Anglo De Gubernatis) نے اپنی کتاب 'Bullettino Italiano Degli Studii Orientali' (۱۸۷۶ء) میں ہندوستانی گرامر سے متعلق ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

'Gramatic Mora Vooldire Hindustani, Adopera carotteri Devnargri'

یہ کتاب مخطوطے کی شکل میں ہے جو غالباً اٹھارہویں صدی کا ہے۔ مؤلف کا نام معلوم نہیں۔[۴۶۰]

☆ ڈاکٹر عطش درّانی تحریر کرتے ہیں کہ ۱۸۲۲ء میں ہندوستانی زبان کے آغاز اور ساخت پر ایک مقالے کی اشاعت کا پتہ ملتا ہے۔ مقالہ انگریزی زبان میں ہے اور مصنف کے بارے میں اطلاع نہیں۔[۴۶۱]

☆ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بیان کے مطابق پٹنہ کے مشن پریس سے اردو ہندوستانی قواعد کی اشاعت کا پتہ ملتا ہے۔ اس کا مؤلف، جوزف الوئیس (Joseph Alois) ہے۔ کتاب کا سالِ اشاعت معلوم نہ ہو سکا۔[۴۶۲]

☆ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے برطانوی مستشرق، گراہم بیلی (Graham Bailey) کی مرتبہ قواعدِ ہندی 'Teach Yourself Urdu' کا ذکر کیا ہے۔ کتاب کا سالِ اشاعت معلوم نا ہوسکا[۴۶۳]۔ اردو قواعد کے ضمن میں گراہم بیلی کی کئی اہم تصانیف ۱۹۴۷ء کے بعد منظرِ عام پر آئیں مگر اُن کا ذکر مقالے کی حد میں شامل نہیں۔

مستشرقین کی تالیف کردہ اردو قواعد کیمندرجہ لا اجمالی جائزے سے درج ذیل نکات سامنے آئے:

(۱) اردو کے ابتدائی مستشرق قواعد نگاروں کے نزدیک قواعد شناسی اور قواعد آموزی کا اصل مقصد ادب کا حصول نہ تھا بلکہ بول چال کی زبان میں مہارت حاصل کرنا تھا تاکہ وہ اپنی تبلیغی وسیاسی سرگرمیوں کو زیادہ سے زیادہ کارآمد اور ثمر آور بنا سکیں۔ دیگر مستشرق قواعد نویسوں کی تقلید میں بنجمن شلز ے اور ہیڈلے نے بھی اپنی قواعد کی بنیاد روزمرّہ بولی جانے والی زبان یا بولی پر رکھی۔ البتہ بعد کے قواعد نویسوں کے پیشِ نظر عام طور پر زبان کی کتابی اور ادبی صورت رہی۔ اس کا اندازہ اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اِن کی مؤلفہ قواعد میں اکثر و بیشتر مثالیں اساتذہ کے کلام سے دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر گل کرسٹ نے عام بول چال کی زبان سے زیادہ کتابی زبان کے نمونوں کو سند کے طور پر پیش کیا۔ اِس ضمن میں میاں مسکین، مشہور مرثیہ گو، اور مرزا رفیع سودا کی زبان کو اردو کی تفہیم وتشریح کے لیے سب سے زیادہ استعمال کیا۔

اِس میں شبہ نہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کو زبان کا مزاج داں مانا جاتا ہے اور زبان کو قبولیت کی سند انھیں کی تحریروں سے حاصل ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عام بول چال کی زبان ہی کو 'اصل زبان' کا درجہ حاصل ہے۔ اسی سبب جدید ماہرینِ لسانیات بھی زبان کے مطالعے میں سب سے زیادہ اہمیت روزمرّہ بولی جانے والی زبان ہی کو دیتے ہیں اور اسی روپ کو زبان کا اصل روپ مانتے ہیں۔ کتابی اور ادبی زبان خواہ کتنی ہی سادہ اور عام فہم کیوں نہ ہو، کسی نہ کسی حد تک پُر تکلف ہوتی ہے اور اِس میں اہتمام، آورد یا کم از کم اصولوں اور قاعدوں کی پابندی کی جاتی ہے۔ بالخصوص شاعری میں ضرورتِ شعری سے اکثر وبیشتر ایسے تصرفات کرنا پڑتے ہیں جن کا نثر یا بول چال کی زبان میں امکان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ماہرینِ لغت وقواعد سند میں شعر کی شہادت کو ضعیف خیال کرتے ہیں۔

(۲) ابتداءً اردو کے مستشرق قواعد نویسوں نے اپنی تالیفات لاطینی میں لکھیں اور اِن کی ترتیب میں لاطینی قواعد کی پیروی کی۔ لاطینی زبان اور اِس کے قواعدی ڈھانچے کو اختیار کرنے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اُس وقت تک یورپ میں لاطینی کی علمی حیثیت اور اہمیت قائم تھی۔ اعلیٰ علمی کارناموں کے لیے لاطینی کا استعمال عام تھا۔ یہاں تک کہ بعد ازاں لاطینی کا عام رواج نہ ہونے کے باوجود جدید علوم وفنون میں اس کا سکہ رواں رہا۔ اس کی عمدہ ترین مثال اردو زبان وادب میں مستعمل لاطینی اور یونانی اصطلاحیں ہیں۔ بلکہ لاطینی مادوں، سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے جدید علمی اصطلاحات بنانے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ لاطینی زبان کی اِس اہمیت ورواج کے پیشِ نظر اُس دور میں مشنریوں کو اپنی تعلیم وتربیت کے لیے لاطینی کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ علاوہ

ازیں لاطینی قواعد اور اِس کے اصولِ صرف ونحو یورپ کی دیگر زبانوں کی صرف ونحو کی ترتیب وتدوین کے لیے بہ طور نمونہ اختیار کیے جاتے تھے۔ اس لیے مستشرقین کی قواعدِ اردو میں لاطینی اصطلاحات کا در آنا ایک فطری عمل تھا۔

بعد ازاں بیش تر مستشرق مؤلفینِ اردو قواعد کے پیشِ نظر انگریزی زبان کی قواعد کا ڈھانچہ رہا جو بہ جائے خود اٹھارویں صدی عیسوی تک لاطینی زبان کے قواعدی اصولوں پر قائم تھا۔ اردو اور لاطینی کی جداگانہ قواعدی ساخت کے باوجود شلزے نے اپنے مباحث کی تقسیم اور ان کی ترتیب بڑی حد تک اُس طرز پر کی جو بہت بعد کے اردو کے ماہرینِ صرف ونحو کے ہاں نظر آتی ہے۔ وجہ اس مماثلت کی فقط اِس ایک امر کے سوا کچھ نہیں کہ اردو اور انگریزی دونوں اپنی اصل میں آریائی ہیں اور اِن میں اتحاد واشتراک کی متعدد مثالیں بھی موجود ہیں۔ لہٰذا بہت ممکن ہے کہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والی مختلف زبانوں میں بعض بنیادی مباحث قدرتی طور پر مشترک ہوں۔

(۳) حرفِ فاعلی 'نے' کو اکثر مستشرق قواعد نویسوں نے نظر انداز کر دیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم اردو میں 'نے' کا استعمال بالالتزام نہیں ہوتا۔

(۴) گل کرسٹ کی 'قواعدِ اردو' مطبوعہ ۱۸۲۰ء کی تلخیص اردو زبان میں میر بہادر علی حسینی نے 'رسالہ گل کرسٹ' کے عنوان سے مرتب کی جسے پہلی بار ۱۹۶۲ء میں دوسری بار ۲۰۰۸ء میں مجلسِ ترقیِ ادب نے لاہور سے شائع کیا۔ اِس رسالے میں درج بیش تر قواعدی مباحث سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مستشرق قواعد نگار اردو کے قواعدِ صرف بیان کرتے وقت عربی قواعد کی تشریحات کو پیشِ نظر رکھتے تھے، مثلاً اسمِ تفضیل کی بحث میں گل کرسٹ لکھتے ہیں:

> اسمِ تفضیل وہ ہے کہ دلالت کرے اوپر اِس بات کے کہ اِس کے مدلول کو فضیلت یعنی زیادتی ہے غیر پر۔ پس اسمِ تفضیل کے واسطے کوئی صیغۂ خاص موضوع نہیں، بلکہ لفظ 'سے' اور 'میں' اور حرف 'کا' اُس کی علامت ہے، جیسا: 'وہ تجھ سے بھلا ہے'، 'اُن آدمیوں میں یہ قابل ہے'، یعنی 'قابل تر'، 'سب کا بڑا وہ ہے'۔[۴۶۴]

اِس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اردو قواعد نویس کے ذہن میں عربی اسمِ تفضیل ہے، اگرچہ اردو میں اس کے لیے کوئی خاص صیغہ موجود نہیں۔

(۵) اردو کے مغربی قواعد نگاروں میں بہت کم ایسے تھے جو صحیح معنوں میں اردو زبان کے مزاج اور ساخت سے واقف تھے۔ اِن میں سے بعض عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ اسی سبب اردو قواعد کی تالیف میں قدرتی طور پر اُن کے پیشِ نظر عربی اور فارسی قواعد کا نقشہ تھا۔ اِن میں البتہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور گارسیں دتاسی دو ایسے فاضل نظر آتے ہیں جو اردو زبان کے اپنے مزاج سے واقف تھے۔ گل کرسٹ نے اردو قواعد اور ہندوستانی لسانیات پر بہت کچھ لکھا۔ گارسیں نے اردو قواعد پر اگرچہ کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی لیکن 'فرانسیسی میں ہندوستانی کے عناصر' کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں اردو زبان کی ساخت اور ہیئت سے بحث کی گئی ہے۔

پلیٹس نے بھی ہندوستانی زبان کی گرامر کو زیادہ مستند انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی اور اردو الفاظ کے اشتقاقات (Etymology) اور مآخذ کی طرف خصوصی توجہ کی۔ پلیٹس نے اپنی تحقیق کی بنا پر اِس امر پر زور دیا کہ اگرچہ فارسی اور عربی کا اردو پر گہرا اثر ہے لیکن اس کے باوجود اردو/ہندوستانی دراصل ہندی زبان ہی کی ایک شاخ ہے۔

اردو لغت نگاری اور قواعد نویسی کے شعبے میں کوئی جامع ومستند تالیف اگرچہ ان مستشرقین سے یادگار نہیں البتہ اس سلسلے میں ان کے ابتدائی قلمی نسخے اور ذاتی معلوماتی ڈائریاں کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔ سرکاری سرپرستی، کسی منظّم علمی ادارے کی رہ نمائی ومنصوبہ بندی اور سائنٹیفک تحقیقی وتجزیاتی طریق کار پر مبنی کسی مخصوص نظام سے واسطہ نہ ہونے کی بنا پر یہ انفرادی علمی کارنامے نقائص سے پاک نہیں۔ اسی سبب ان کی حیثیت علمی سے زیادہ تاریخی رہ جاتی ہے۔ اعلیٰ تحقیقی معیار اور عالمانہ قدر ومنزلت کی حامل نہ ہونے کے باوجود یہ نگارشات وہ سنگِ بنیاد فراہم کرتی ہیں جو اہم علمی وفکری نظریات کے ظہور اور ایک عظیم علمی روایت کا مؤجب بنا۔ ادبیاتِ اردو کے ابتدائی خزینوں کے طور پر ان نگارشات کی اہمیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

فصل چہارم

اردو کے مستشرق ماہرینِ لسانیات

زبان ایک قدرتی مظہر ہے۔ اِس کی پیدائش اور ارتقا اُن اصول و قواعد ہی کے رہینِ منت ہیں کہ جن کے تحت دیگر قدرتی مظاہر پنپتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ اِس کی ایجاد کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ کوئی زبان کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی؟ کن زبانوں کے خلط ملط ہونے کے نتیجے میں وجود میں آئی؟ اس کی نشو و نما اور ارتقا میں کیا کیا عصری حالات اور انسانی رویے کارفرما رہے؟ یہ سب اور اسی نوع کے مزید سوالات وقت کے ہر بڑے دورانیے میں اہلِ زبان کے اکابرین اور دیگر ماہرینِ السنہ کے حلقوں میں ابھرتے، گردش کرتے، قبول اور رد کیے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان مباحث کے نتیجے میں علم السنہ اور لسانیات کے شعبوں میں تحقیق کی نئی راہیں دریافت ہونے سے کئی اہم انکشافات ہوئے اور نظریات قائم کیے گئے مگر زبان کی پیدائش و ارتقا سے متعلق سوالات آج تک ماہرین کی اختلافی آرا کا شکار ہیں۔

اردو کے اوّلین لغات اور قواعد کے باب میں مستشرقین کی علمی و تحقیقی کاوشوں کا جائزہ اِس امر پر منتج ہوتا ہے کہ ابتدائی مستشرق مؤلفین میں سے بیش تر کے پیشِ نظر زبان (اردو/ہندوستانی) کا تدریسی پہلو تھا تا کہ اپنے مخصوص سیاسی، معاشرتی، معاشی اور حکومتی مقاصد کے حصول کے لیے عام مروجہ زبان کو سیکھا جائے۔ متعدد مستشرق مؤلفین اِس طرف بہت کم متوجہ ہوئے کہ اردو/ہندوستانی کی اصل کیا ہے؟ اِس کی ابتدا کن لسانی و سماجی حالات میں ہوئی اور یہ کن ارتقائی مراحل سے گزری؟ اسی سبب اِس نہج پر اُن کی تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے۔ اِن میں سے اکثر مستشرقین کی نگارشات کے دیباچوں میں اردو/ہندوستانی کی ابتدا پر سرسری مواد موجود ہے جو کہ تحقیق سے زیادہ قیاس پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ البتہ بعد کے مستشرق مؤلفین نے اردو زبان سے فطری و ذاتی دل چسپی کی بنا پر اپنی تحقیقات میں اِس کی ابتدا و ارتقا اور دیگر لسانی مسائل کو خصوصی جگہ دی۔

ذیل میں اردو کے اُنھیں مستشرق مؤلفین اور اُن کی نگارشات کا جائزہ لیا جائے گا کہ جنھوں نے اردو زبان کی آفرینش و ارتقا کے حوالے سے با قاعدہ تحقیق پیش کی:۔

بنجمن شلزے (Benjamin Schultze):

جرمن مستشرق، بنجمن شلزے (۱۶۸۹ء۔۱۷۶۰ء) کی گرامر 'Grammatica Hindostanica' کے عنوان سے ۱۷۴۵ء میں شائع ہوئی، البتہ اس کا سنہ تصنیف ۱۷۴۱ء ہے [۴۶۵]۔ لاطینی زبان میں تحریر کردہ شلزے کی یہ تالیف نایاب ہے، البتہ کتب خانہ انڈیا آفس لندن (موجودہ، کامن ویلتھ آفس لائبریری) میں اس کے انگریزی ترجمے کی دست یابی کی اطلاع ایتھے (Ethe) کی فہرست: کالم ۱۳۶۲، شمارہ نمبر ۲۵۳۷ اور ۲۵۳۸ کی ذیل میں ملتی ہے۔[۴۶۶]

بعد ازاں اس قلمی نسخے کا تذکرہ جے ایف بلوم ہارٹ (J.F.Blumhardt) نے بھی کیا۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے ۱۹۶۷ء میں مذکورہ انگریزی ترجمے کی نقل حاصل کی اور اُسے حواشی و تعلیقات کے اضافے کے ساتھ

از سرِ نو بہ زبانِ اردو مرتب کر کے ۱۹۷۷ء میں مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور سے شائع کیا[۴۶۷]۔

شلزے کے رسالے کی تبویب اور مندرجات کے حوالے سے قدرے تفصیلی ذکر قواعد کے حصے، 'اردو کے مستشرق قواعد نگار' کے تحت کر دیا گیا ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا اور اس کے مختلف ناموں پر بحث کے حوالے سے اِس رسالے کا دیباچہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ دیباچے میں درج شلزے کے لسانی مباحث اور اُن پر ابواللیث صدیقی کے تنقیدی بیانات کا جائزہ درج ذیل ہے:

☆ شلزے کے بیان کے مطابق ہندوستان میں بولی جانے والی 'رابطے کی زبان' کو اہلِ یورپ 'مورس' (Moors)[۴۶۸] پکارتے ہیں۔ یہ نام دراصل پرتگالیوں نے اسے بخشا جو اسے 'موروِیکو' (Morvico) کہا کرتے تھے۔ جب کہ اس کا اصل اور صحیح نام 'ہندوستانی' ہے۔ مسٹر فریزر (Mr. Fraser)[۴۶۹] کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے شلزے ہندوستانی' کی وجہ تسمیہ لفظ 'ہندو' بتاتا ہے، جس کے معنی سیاہ کے ہیں۔ مزید واضح کرتا ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے ' ہندو' کا لفظ پہلے پہل مغلوں نے استعمال کیا جو نسبتاً زیادہ گوری رنگت کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے رہنے والے اور اُن کی زبان، دونوں 'ہندوستانی' کہلائے۔[۴۷۰]

شلزے کے درج بالا بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ اہلِ یورپ مسلمانوں کو بالعموم اور مسلمانانِ سپین کو بالخصوص ' مورس' پکارتے تھے۔ غالباً اسی سبب اردوئے قدیم کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہوئے اکثر یورپی مصنفین نے اسے 'مورس' کہا ہے۔ لفظ 'مورس' کی اصل اور اس کے مختلف معانی میں اختلاف ہے۔ شلزے کے اس بیان سے اختلاف نہیں کہ 'ہندوستانی' کو پہلے پہل 'مورس' کہنے والے پرتگالی ہی تھے۔

شلزے کے رسالے کے انگریزی مترجم نے مسٹر فریزر کی اس وضاحت سے اختلاف کیا ہے کہ ' ہندو' کے لفظی معنی 'سیاہ فام' کے ہیں اور یہ کہ مغلوں کو لفظ 'ہندو' کے استعمال میں اوّلیت حاصل ہے، بلکہ اس ملک کو مغلوں کے حملے سے قبل ہی 'ہند' کہا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ مغل جنوبی صوبوں کے ہندوؤں سے قطعاً گورے نہیں تھے اور شمالی علاقوں کے لوگوں کے بارے میں یہ بیان اور بھی غیر مصدقہ ہے۔

گل کرسٹ جو ۱۷۸۲ء میں بمبئی (ممبئی) پہنچا، اپنے رسالے میں لکھتا ہے:

چناں چہ اس زبان کو، جسے اس زمانے میں مورس (Moors) کہتے تھے، سیکھنے کے لیے میں جم کر بیٹھ گیا۔[۴۷۱]

درج بالا سطور سے شلزے کے اِس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر تک اردوئے قدیم کو اہلِ یورپ 'مورس' اور 'ہندوستانی' دونوں ناموں سے پکارتے تھے۔

☆ دیباچے کے صفحہ ۷ پر حاشیے میں شلزے لکھتا ہے کہ ' ہندوستانی' دراصل 'فارسی' کی ایک علاقائی بولی ہے جو مختلف صوبوں اور علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ مختلف علاقائی اثرات کی بنا پر یہ تمام بولیاں نہ صرف اپنی اصل سے مختلف ہیں بلکہ بناوٹ، لہجے اور تلفظ میں ایک دوسرے سے بھی اختلاف رکھتی ہیں۔ یہ اختلاف اس امر پر منحصر ہے کہ کوئی علاقہ فارس کی سرحد سے کس قدر قریب یا دور ہے۔ دراصل دارالخلافے سے جو علاقہ جس قدر فاصلے پر ہو گا، زبان اسی قدر غیر معیاری ہو گی۔ دیباچے کے صفحہ ۸ پر شلزے مزید غلط فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے محض بعض نحوی تراکیب میں مماثلت کی بنا پر اردو/ہندوستانی کو تامل اور تیلگو زبانوں سے ملاتا ہے۔

شلزے کا یہ بیان کہ اردو/ ہندوستانی دراصل 'فارسی' کی ایک علاقائی بولی ہے، قطعاً درست نہیں۔ اردو میں اگرچہ فارسی اسما اورالفاظ وتراکیب بہ کثرت ہیں،اصنافِ سخن بھی فارسی ہی کی رائج ہیں، یہاں تک کہ اردوقواعدمرتب کرنے میں ماہرین نے بڑی حد تک عربی اور فارسی کے قواعد نویسوں کا اتباع کیا ہے مگر اِس کے باوجود اردو کا اپنا علاحدہ قواعدی ڈھانچا ہے جو فارسی سے مختلف ہے۔ کسی بھی زبان کی اساس اُس کے افعال ہوتے ہیں۔ اردو کے افعال، صیغے اور مصادر فارسی نہیں بلکہ ہندوستانی نژاد ہیں۔ جدا گانہ صوتیاتی نظام، قواعدِ صرف ونحو اور سرمایۂ لغت کی حامل ہونے کی بنا پر بلا شبہ اردو ایک علاحدہ مستقل زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ شلزے بھی دیباچے کے صفحہ ۸ پر اردو بہ حیثیت فارسی کی ذیلی بولی کے حوالے سے اپنے بیان کی خود تردید کرتے ہوئے اردو کی جداگانہ لسانی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے۔ لہٰذا اردو/ ہندوستانی نہ تو فارسی کی کوئی علاقائی شکل ہے اور نہ ہی تامل یا تیلگو کی۔

اس میں شک نہیں کہ علاقائی اثرات کے سبب مختلف علاقوں کی بولیوں میں اختلاف ہوتا ہے مگر شلزے کا یہ کہنا کہ صوبہ فارس سے بہ تدریج فصل کی بنا پر زبانِ ہند فارسی سے قدرے مختلف ہوتی چلی گئی ، درست نہیں۔ علاقائی فرق زبان کے مخصوص حصے، محاورہ و روزمرّ ہ کو متاثر کرتا ہے۔ گویا مختلف علا قوں میں بولی جانے والی ایک ہی زبان علاقائی فرق کی بنا پر محاورے اور روز مرّ ہ میں معمولی ردّوبدل کے باوجود ایک ہی بنیادی ساختیاتی ڈھانچے کی حامل ہوتی ہے۔

☆ دیباچے میں رسوم الخط کی بحث میں شلزے نے ' ہندوی'، 'سنسکرت' اور ' دیوناگر' (Devonagar) کو ایک ہی چیز گردانتے ہوئے اسے اوّلین مگر مردہ رسم الخط قرار دیا ہے۔ دوسرے رسم الخط کے طور پر وہ 'ہندی' یا ' ناگری' کا ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح شلزے کے مطابق تیسرا رسم الخط ' بنگلہ' ، چوتھا ' گورمکھی' اور پانچواں ' تاکری' (Takri) [۴۷۲] ہے۔ علاوہ ازیں شلزے ساحلِ کارومنڈل، مالابار اور گجرات کے علاقوں میں رائج مزید رسوم الخط کا ذکر کرتا ہے۔

یہاں نہ صرف شلزے بلکہ اس کے مترجم نے بھی اصطلاحات کا غلط استعمال کرتے ہوئے زبانوں اور رسوم الخط میں حدِّ امتیاز سے قطع نظر انھیں خلط ملط کر دیا ہے، جو خاصا گمراہ کن ہے۔ ' ہندوی' یا 'سنسکرت' یا ' دیو ناگر' کو شلزے اردو/ ہندوستانی کا اوّلین مگر مردہ رسم الخط کہتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں ' ہندوی' اور 'سنسکرت' زبانوں کے نام ہیں جب کہ ' دیو ناگر (دیو ناگری)' ایک رسم الخط ہے۔ آریوں کی مقدس وید کی حامل زبان 'سنسکرت' ایک قدیم تر زبان ہے جو شلزے کے مطابق برہمنوں کے اسرار و رموز، ادب اور دیو مالا قصّوں کا مجموعہ ہے۔ ' ہندوی' پراکرت کی ایک شکل کا نام ہے جو اردوئے قدیم کہلاتی ہے۔ گویا ' ہندوی' کو کسی صورت بھی 'سنسکرت' کے متوازی نہیں کہا جا سکتا۔ شلزے ' ہندی' یا ' ناگری' کو اردو/ ہندوستانی کا دوسرا رسم الخط بتاتا ہے، جب کہ اِن میں 'ہندی' اردوئے قدیم کا ایک نام ہے جو آج کل بھارت کی سرکاری زبان ہے اور ' ناگری(دیوناگری)' رسم الخط ہے۔ شلزے نے ' دیو ناگر' اور ' ناگری' کو الگ الگ رسوم الخط بتایا ہے، جب کہ یہ ایک ہی رسم الخط یعنی ' دیو ناگری' ہے۔ شلزے کے مطابق اردو/ ہندوستانی کا تیسرا رسم الخط ' بنگلہ' ہے، جو قطعاً درست نہیں ۔ ' بنگلہ' ایک علاحدہ رسم الخط ہے،جس کے تحت بنگلہ زبان تحریر کی جاتی ہے۔ اردو/ ہندوستانی کا بنگلہ زبان سے وہی ناتا ہے جو دیگر متوازی ہند آریائی زبانوں اور بولیوں سے ہے۔ اسی طرح

شلزے کے نزدیک اردو/ ہندوستانی کا چوتھا رسم الخط 'گورمکھی' ہے، جو خلطِ مبحث ہے۔ 'گورمکھی' در اصل سکھوں کی 'پنجابی زبان' کا رسم الخط ہے۔البتہ شلزے کا یہ بیان درست تسلیم کیا جائے گا کہ سواحلِ کارومنڈل، مالابار اور گجرات کے علاقوں میں ایک مخصوص رسم الخط رائج رہا ہے۔

☆ اردو/ ہندوستانی رسم الخط (دیو ناگری) اور اس کے حروفِ تہجی کے ضمن میں شلزے کا بیان ہے کہ یہ سب عبرانی زبان سے مستعار ہے۔علاوہ ازیں شلزے نے اردو / ہندوستانی کی پیدائش کو تیمور کے فتحِ ہندوستان کے بعد مسلمانوں اور مقامی افراد سے میل جول کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مزید لکھتا ہے کہ نو مولود زبان کے لیے فارسی رسم الخط مغلوں نے یا تو بہ طورِ فخر اپنائے رکھا، یا بہ سبب کاہلی کوئی اور رسم الخط سیکھنے کے بہ جائے اسے جاری رکھا۔

اوّل شلزے کا یہ بیان درست نہیں کہ تیموری حملے کے بعد اردو / ہندوستانی زبان کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا۔ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے مطابق زبانوں کا اختلاط عہدِ تیمور اور مغلوں سے قبل کی داستان ہے۔ اس زبان کے لیے فارسی رسم الخط اختیار کرنے میں نہ کسی نوع کے فخر کو دخل حاصل تھا اور نہ ہی اس کی وجہ کاہلی اور سستی تھی۔ بلکہ ابتدا ہی سے مسلمان اپنی تحاریر عربی اور فارسی میں لکھا کرتے تھے، جس کے سبب ان کے پاس ایک مربوط و مستقل رسم الخط موجود تھا۔ چناں چہ نئی زبان(اردو/ ہندوستانی) کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے قدرتی طور پر مسلمانوں نے مستعمل رسم الخط ہی کو جاری رکھا۔

عبرانی سے ماخوذ رسم الخط اور حروفِ تہجی کے حوالے سے بھی شلزے کا بیان حقیقت پر مبنی نہیں۔ دیو ناگری رسم الخط دراصل قدیم شمالی سامی یا فنیقی رسم الخط سے ماخوذ ہے،جس کے نمونے اسوری(Asuri) اوزان اور باٹوں میں ملتے ہیں۔میسو پوٹامیہ (Mesopotamia) تجّار کے توسط سے یہ رسم الخط ہندوستان پہنچا۔ برہمی (Brahmic) رسم الخط اسی رسم الخط سے اخذ کیا گیا ہے۔اصل سامی رسم الخط کی بائیس(۲۲) علامتوں سے برہمی رسم الخط کی چھیالیس(۴۶) علامتیں اختراع کی گئیں۔ پانِنی نے چوتھی صدی قبل مسیح میں مؤلفہ اپنی قواعد میں اس رسم الخط کی با قاعدہ حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں یہ رسم الخط ایک مکمل و مربوط نظام کا حامل تھا۔

دیباچے کی آخری سطور میں درج شلزے کا یہ بیان کہ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں وسیع مغلیہ سلطنت میں مسلمانوں کی بول چال کی زبان اردو/ہندوستانی تھی، اہم اور قابلِ قدر ہے۔علاوہ ازیں شلزے کا یہ تجزیہ بھی درست ہے کہ ہندوؤں میں دو زبانیں مستعمل تھیں، 'سنسکرت' اور 'ہندی'۔ 'سنسکرت' مذہب اور ادب کی زبان تھی۔اس کا علم فقط کتابی تھا اور بول چال کی حیثیت سے یہ مردہ ہو چکی تھی۔

اردو زبان کے آغاز و ارتقا، دیگر زبانوں سے اختلاط اور اس کے مختلف ناموں پر بحث کے ضمن میں شلزے کی لسانی توضیحات اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے محققانہ و ناقدانہ تجزیے کے درج بالا اجمالی جائزے سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فاضل مصنف (شلزے) کی گرفت زبان کے ساختیاتی علم پر کم زور ہونے کے سبب بیانات کی تحقیقی حیثیت خاصی گم راہ کن ہے۔البتہ اس امر سے انکار نہیں کہ ابتدائی ماہرینِ اردو کے لسانی شعور سے آگاہی کے حوالے سے شلزے کے درج بالا کوائف کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے۔

انکتیل دو پروں (Anquetil Du Perron):

ابراہام ہائسنتھ انکتیل دو پروں(Abraham Hyacinthe Anquetil Du Perron) دسمبر ۱۷۳۱ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔مشرقی

ممالک اور خصوصاً ہندوستان سے اس کی دلی وابستگی کا سبب 'ژندزبان' میں درج وہ مخطوطات بنے جو پارسیوں کی مذہبی کتابوں کے بارے میں تھے۔ یہ مخطوطات انکتیل دوپروں نے اوائل عمری میں اپنے قیامِ لندن کے دوران میں دیکھے۔ ہندوستان کی طرف سفر کی خاطر اُس نے ایک سپاہی کی حیثیت سے فرانس کی بحریہ میں شمولیت اختیار کی اور اپنے جہاز کے کپتان کی ہم دردی کے سبب انکتیل دوپرون بالآخر ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوا۔ نو (۹) ماہ کے طویل اور کٹھن سفر کے بعد وہ پانڈی چری پہنچا۔ یہاں کچھ عرصے قیام کے بعد وہ چندرنگر گیا، جہاں اس نے سنسکرت زبان سیکھی۔ انکتیل دوپروں نے چندرنگر، سورت اور ماہی میں کچھ عرصہ قیام کیا اور اِن علاقوں کا زیادہ تر سفر پیدل ہی طے کیا۔ ان سفروں کے دوران میں اس نے ہندوؤں کے تاریخی مقامات اور مندروں کی سیاحت سے ہند تہذیب وثقافت کے حوالے سے تاریخی معلومات حاصل کیں۔ علاوہ ازیں اسی دوران میں اس نے 'ژند' اور 'پہلوی' زبانیں بھی سیکھیں۔ انکتیل دوپروں قریباً سات سال (۱۷۵۵ء۔ ۱۷۶۱ء) ہندوستان میں رہا۔ اس عرصے میں اس نے جنوبی ہندوستان، بنگال اور وسط ہندوستان کا دورہ کیا اور اٹھارھویں صدی کے اوائل اور وسط کے ہندوستان کی تاریخ، مذہب، ثقافت اور سیاسیات کے حوالے سے مفید معلومات حاصل کیں۔ ۱۷۶۲ء میں پیرس روانگی کے وقت وہ اپنے ساتھ ہندوستان سے ایک سو اسّی (۱۸۰) مخطوطات اور نوادرات کا بیش بہا خزانہ پیرس لے گیا۔ پیرس پہنچ کر اسے شہنشاہِ فرانس کے لیے مشرقی زبانوں کا مترجم مقرر کر دیا گیا۔ اس نے ہندوستان سے متعلق متعدد موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ بعد ازاں اسے فرانس کی اکادمی کا رکن منتخب کیا گیا۔ اس کا انتقال ۱۸۰۵ء میں ہوا۔

اردو/ہندوستانی پر انکتیل دوپروں کی علمی بحثیں اردو لسانیات کے شعبے میں گراں مایہ حیثیت کی حامل ہیں۔ انکتیل دوپروں نے یہ لسانی مباحث درج ذیل کتب کے تحت سمیٹے ہیں:

(ا) ۱۷۸۶ء میں پیرس سے دوپروں کی یہ کتاب شائع ہوئی:

'Recherches Historiques et Geographiques Sur l 'Inde'

یعنی 'ہندوستان پر تاریخی اور جغرافیائی تحقیق'۔ اِس میں وہ ہندوستانی زبانوں سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سنسکرت ایک اہم زبان ہے مگر یہ اب مر چکی ہے۔ انکتیل دوپروں کے ہندوستان چھوڑنے کے زمانے تک فارسی زبان اگرچہ سب سے زیادہ کارآمد زبان تھی جو ہندوستان کے مشرق اور جزائر مالدیپ میں بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی، لیکن اس کے باوجود انکتیل نے 'ہندوستانی' کو وہ واحد زبان قرار دیا جو شمالی ہند سے لے کر خلیج بنگال تک، کھمبایت اور پورے ہندوستان میں بولی جاتی تھی۔ 'ہندوستانی' کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ اہلِ یورپ اسے 'مُور' یا 'مُورس' کہتے ہیں۔ اسے دیوناگری اور فارسی، دونوں رسوم الخط میں لکھا جا سکتا ہے۔ فارسی رسم الخط میں لکھتے وقت اس کے حروفِ تہجی میں مزید کچھ لفظوں کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، تاکہ اس میں ان آوازوں کا اظہار ممکن بنایا جا سکے جو فارسی میں موجود نہیں۔ مزید لکھتا ہے کہ 'ہندوستانی' زبان میں عرب، ایرانی، تاتاری، بنگالی اور مرہٹوں کی زبانوں کی تمام آوازوں کا اظہار ہو سکتا ہے۔

شمالی ہند اور ہمالیہ کے سرحدی علاقے میں بولی جانے والی زبانوں کے ضمن میں انکتیل دوپروں رقم طراز ہے کہ ان علاقوں میں تبتی، ہندوستانی اور فارسی زبانیں بولی جاتی ہیں، جب کہ بہار اور بنگال میں ہندوستانی کے علاوہ فارسی زبان بھی رائج ہے۔ اس کے بعد انکتیل دوپروں نے جنوبی ہندوستان میں رائج بولیوں کا ذکر کافی حد تک صحت اور سند کے ساتھ کیا ہے، بلکہ اس ضمن میں ان علاقوں کی تخصیص اس خوبی اور تفصیل سے کی ہے کہ بعض اوقات ان علاقوں کا طول البلد اور عرض البلد بھی بیان کر دیا ہے کہ جہاں وہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ گجرات، احمد آباد اور ٹھٹھہ (سندھ) میں رائج زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے انکتیل دوپروں لکھتا ہے کہ ان علاقوں میں فارسی، مرہٹی اور ہندوستانی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ مزید بیان کرتا ہے کہ ان زبانوں کو اس علاقے سے 'بنیوں' نے تبدیل کر لیا ہے اور وہ ان زبانوں کے لیے ناگری رسم الخط کا استعمال کرتے ہیں۔

انکتیل دوپروں نے معاشرے کے مختلف طبقوں اور متعدد پیشوں میں مستعمل بولیوں کا ذکر بھی خصوصیت سے کیا ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے:

تجارت (جو ہندوستان میں یورپ کے لوگوں کا پہلا مقصد ہے)، سیاسیات کے فروغ اور کام یابی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ یورپ کے لوگ عوام سے گہرا رابطہ رکھیں اور وہ زبانیں سیکھیں جو ان علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔[۴۷۳]

اس کے خیال میں گویا وہ افراد جو ہندوستان کے قریباً سب علاقوں کی عوام سے قریبی رابطہ استوار کرنے کے خواہش مند ہوں، اُن کے لیے نو (۹) مختلف ہندوستانی زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے۔ یہ نو زبانیں ہندوستان کی سب سے زیادہ اہم زبانیں ہیں، جن میں سے ہر ایک علاحدہ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

ہندوستانی زبانوں پر پہلی بار خالص لسانیاتی نقطہ نظر کے حامل مباحث اس کتاب کی خصوصیت اور انفرادیت ہے۔

(۲) کسی بھی ملک میں کام یاب اور بامقصد قیام کے لیے وہاں کی تہذیب وثقافت سے آشنائی اور زبانوں کو سیکھنے، سمجھنے کی ضرورت سے انکتیل دوپروں پوری طرح سے آگاہ تھا۔ ۱۷۹۸ء میں پیرس ہی سے اس کی ایک کتاب دو جلدوں میں درج ذیل عنوان سے طبع ہوئی:

'L'Inde en Rapport Avec I 'Europe Ouvrage Divise en Deux Parties'[474]

انکتیل نے اپنی کتاب میں زبانوں کی اہمیت اور انھیں سیکھنے کی ضرورت کے حوالے سے اہم تجاویز پیش کیں جو درج ذیل ہیں:

☆ انکتیل دوپروں نے ہندوستان میں ایک ایسے ادارے کے باقاعدہ قیام کی ضرورت پر زور دیا جو ہندوستان آنے والے غیر ملکی افراد کو مقامی زبانیں سکھانے کا انتظام کرے اور انھیں اُن مسائل سے آگاہ کرے جن سے وہ یہاں دوچار ہو سکتے تھے۔ نیز ان مسائل کا حل تجویز کرے۔ انکتیل دوپروں کی رائے میں اس ادارے کا قیام تین اہم مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہے: اوّل تجارت، دوّم ہندوستان کی مختلف طاقتوں سے مذاکرات اور سوّم انتظامی امور کی سوجھ بوجھ۔

☆ فقط ایسے نو جوان ہندوستان کی طرف روانہ کیے جائیں جو زمانۂ طالب علمی ہی سے متعدد زبانوں میں فطری دل چسپی اور انھیں سیکھنے کا اشتیاق رکھتے ہوں۔

☆ ہندوستانی زبانوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہندوستان ہی میں کیا جائے۔

☆ انکتیل دوپروں نے ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دینے والے مترجمین کے لیے ایک مفصل سکیم پیش کی۔ اس کی پیش کردہ اس سکیم کے توسط سے اٹھارھویں صدی کے ہندوستان میں ملک کی لسانی تقسیم اور متعدد و مختلف زبانوں کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سکیم کو کار آمد بنانے کی غرض سے اس نے ہر علاقے کے لیے مترجمین کی تعداد کا تعین بھی کر دیا۔

یورپی مترجمین کا ذکر کرتے ہوئے انکتیل دوپروں نے لکھا ہے:

بدقسمت سراج الدولہ، نواب بنگالہ نے ۱۷۵۷ء میں خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اسے ایک ایسے فرانسیسی کی ضرورت ہے جو

فارسی جانتا ہو۔[۴۷۵]

سورت کے نواب نے بھی انکتیل دوپروں سے اسی قسم کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے مندرجات میں ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی کارگزاری اور در پیش مسائل کا ذکر موجود ہے۔ دربارِ مغلیہ کے سرکاری جریدوں اور دیگر اہم سرکاری دستاویزات سے متعدد اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ انتظامیہ، عدلیہ، پولیس اور فوج کے اہم عہدے داروں کے فرائض کے ذکر میں مفصل بیان درج ہے اور سورۃ توبہ کی چند آیات کا عربی متن مع فرانسیسی ترجمے کے پیش کیا گیا ہے۔

(۳) تین جلدوں پر مشتمل انکتیل دوپروں کی تیسری اہم تصنیف پیرس سے ۱۸۰۸ء میں اِس عنوان کے تحت شائع ہوئی:

'Du Voyage De L'Auteur Aux Indes Orientales'

یعنی 'مشرقی ہندوستان کا سفر'۔ اِس کتاب کے مندرجات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

☆ سندھ، اجمیر، ملتان، لاہور، دہلی، آگرہ، اودھ، بنگال، بہار، بھوٹان، نیپال اور تبت کی تقسیم پر مبنی نقشہ پیش کیا ہے۔

☆ ہندوؤں کی ذات پات، رسوم و روایات، مشاغل، فنونِ لطیفہ اور جڑی بوٹیوں سمیت متعدد مقامی بولیوں اور زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ملکی انتظام وانصرام کے ذکر میں وزارت اور عدالتی عہدوں کی تفصیلات کو قلم بند کیا ہے۔

☆ زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے انکتیل نے سنسکرت کے بعض الفاظ کا فارسی زبان سے مقابلہ کیا ہے۔

☆ 'آئینِ اکبری' پر تبصرہ اور بعض اہم سیاسی دستاویزات پر تحقیقی کام بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

انکتیل دوپروں کی تصنیفات بلاشبہ دل چسپ اور معلومات افزا ہیں۔[۴۷۶]

جان بارتھ وِک گل کرسٹ (John Borthwick Gilchrist):

مقاصد کی نوعیت سے قطع نظر مؤرخین ڈاکٹر گل کرسٹ (۱۷۵۹ء۔۱۸۴۱ء) کی اردو نوازی کے اعتراف میں شکر گزار ہوئے بنا اردو، ہندوستانی ادب کی تاریخ رقم کرنے سے قاصر ہیں۔ گل کرسٹ نے اردو کے لغات وقواعد کو وسیع پیمانے پر مدوّن کرنے کی اہم خدمات انجام دی۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ہندوستانی میں اردو، ہندوستانی کی جو کتب گل کرسٹ کی زیرِ نگرانی تالیف کی گئیں اُن سے فقط ہندوستانی نثر کا ادبی معیار ہی قائم نہیں ہوتا بلکہ انھیں اردو کے جدید نثری ادب میں، نیز ہندی اور اردو طباعت کی تاریخ میں بھی اوّلیت حاصل ہے[۴۷۷]۔ ہندوستانی لسانیات کے ضمن میں گل کرسٹ کی تحقیقی وتالیفی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ ہندوستانی لسانیات پر اس کی درج ذیل دو کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

(۱) ۱۲ x ۸ سائز کے ایک سو چانسٹھ (۱۶۴) صفحات پر مبنی گل کرسٹ کی ایک کتاب 'Oriental Linguist' کے عنوان سے کلکتے سے ۱۷۹۸ء میں شائع ہوئی۔ سرورق کے مطابق کتاب کا ذیلی عنوان ہے:

'مقبولِ عام زبان ہندوستانی کا آسان اور عام فہم مقدمہ'

سرورق کے آخری حصے میں مرزا رفیع سودا کے تین مصرعے رومن رسم الخط میں درج ہیں۔ کتاب ہندوستان کے سابق گورنر جنرل اور 'ایشیاٹک سوسائٹی' (Asiatic Society) کے سابق صدر سر جان شور (Sir John Shore) کے نام معنون ہے۔ انتساب سے اندازہ ہوتا ہے کہ گل کرسٹ ایشیاٹک سوسائٹی کا ممبر بھی رہا۔

'مشرقی زبان دان' رومن رسم الخط میں ہے اور اس میں اردو رسم الخط قطعاً استعمال نہیں کیا گیا۔ چھ ابواب پر مشتمل اس کتاب کے مندرجات کی تفصیل اس طرح سے ہے:

☆ ہندوستانی لسانیات پر کام کرنے کا جو وسیع خاکہ گل کرسٹ کے ذہن میں تھا، ' مشرقی زبان دان' اسی لسانی سلسلے کی چوتھی کڑی کی صورت میں سامنے آئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے پہلے دو ابواب دراصل گل کرسٹ کی اسی سلسلے کی پہلی تین کتب کا خلاصہ ہیں، یعنی پہلے دو ابواب سولہ (۱۶) صفحات کی قواعد اور چوّن (۵۴) صفحات کی مبسوط 'انگریزی ہندوستانی' لغت پر مشتمل ہیں۔

☆ کتاب کا تیسرا باب 'ہندوستانی انگریزی' لغت پر مشتمل ہے۔ گل کرسٹ کتاب کے اس حصّے کو علاحدہ کتابی شکل میں بھی شائع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر بعض مشکلات کے سبب وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

☆ کتاب کا چوتھا باب ' ہندوستانی قصّے' (Hindoostanee Tales) ہے۔ یہ باب تین قصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلا قصّہ دراصل ایک انگریزی کہانی کا ترجمہ ہے۔ گل کرسٹ نے ترجمے کے ساتھ اصل انگریزی عبارت بھی نقل کر دی ہے۔ باقی دو ہندوستانی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کے انگریزی تراجم بھی درج کیے گئے ہیں۔ یہ باب اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں گل کرسٹ کی ہندوستانی تحریر کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں، جس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گل کرسٹ کو ہندوستانی زبان پر کس حد تک دست گاہ حاصل تھی۔

☆ پانچواں باب 'فوجی آئین کی دفعات' (Articles Of War) کے عنوان سے ہے۔ اس باب کا مترجم کرنل سکاٹ (Colonel. Scott) ہے۔ یہاں بھی ترجمے کے ساتھ اصل انگریزی متن درج کیا گیا ہے۔ ترجمے میں کرنل سکاٹ کو گل کرسٹ کا تعاون حاصل رہا ہے، اس امر کا اندازہ کمانڈر انچیف کے نام کرنل سکاٹ کے اس مکتوب سے ہوتا ہے جو حاشیے میں رقم کر دیا گیا ہے۔

☆ کتاب کے آخری باب کا عنوان ' ہندوستانی نظم' (Hindoostanee Odes) ہے۔ یہ باب اردو اور فارسی غزلوں اور ان کے تراجم پر مشتمل ہے۔ پہلی غزل خواجہ میر درد کی ہے۔

'مشرقی زبان دان' اردو کو ایک جامع زبان کا درجہ دینے میں معاون ثابت ہوئی۔ اس تالیف کے توسط سے گل کرسٹ نے ہند آریائی خاندان کی تمام بولیوں کو نہ صرف با قاعدہ 'زبان' کہا بلکہ اس 'جدید زبان' کا نیا نثری ادب بھی تخلیق کیا۔ علاوہ ازیں اس میں اردو اور فارسی کی متعدد غزلوں کی دھنیں انگریزی موسیقی کی دھنوں کے سانچوں میں ڈھالی گئیں ہیں۔ اُن انگریزی دھنوں کے نقشے بھی شامل کیے ہیں، جنھیں سامنے رکھ کر پیانو پر دھنیں بجائی جا سکتی ہیں [۴۷۸]۔ دوسری بار یہ کتاب کلکتے ہی سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔ [۴۷۹]

(۲) ہندوستانی لسانیات کے سلسلے کی ایک اور اہم کتاب 'Anti Jargonist' ہے۔ گل کرسٹ کی یہ دل چسپ کتاب دراصل ان لوگوں کی ہدایت کے لیے شائع کی گئی جو زبان کے بگاڑنے والے ہیں۔ 'انٹی جارگنسٹ' کلکتے سے ۱۸۰۰ء میں طبع ہوئی۔ کتاب کے شروع میں زبان کے ابتدائی اصولوں سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں 'انگریزی ہندوستانی' لغت بھی شامل ہے۔

'Anti Jargonist' دراصل 'Oriental Linguist' کا خلاصہ ہے۔ [۴۸۰]

جوہان کرسٹوف اڈیلنگ (Johann Christoph Adelung):

اردولسانیات کے ضمن میں جرمن مستشرق، جوہان کرسٹوف آڈیلنگ (۱۷۳۲ء۔۱۸۰۶ء) کی وفات کے کچھ ہی عرصہ قبل اُس کی اہم تالیف 'Mithridates, Oder Allgemeine Sprachenkunde'۱۸۰۶ء میں برلن(Berlin) سے شائع ہوئی۔مندرجات کے اعتبار سے کتاب ان تمام اہم معلومات کا مجموعہ ہے جو ہندوستانی زبانوں کے بارے میں اٹھارھویں صدی کے آخر تک حاصل کی جا چکی تھیں۔آڈیلنگ نے اردو زبان کو 'موہرچ' (Mohrich) کہہ کر پکارا ہے۔'Mithridates'اردو زبان کی ساخت پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے[۴۸۱]۔برلن ہی سے ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۷ء تک اس کی چار جلدیں منظرِ عام پر آئیں۔[۴۸۲]

ڈنکن فاربس (Duncan Forbes):

ڈنکن فاربس (۱۷۹۸ء۔۱۸۶۸ء) کا تعلق سکاٹ لینڈ سے تھا۔فاربس نے آرناٹ کے تعاون سے ہندوستانی زبان کے مآخذ اور ساخت پر ایک مضمون تحریر کیا جو لندن سے ۱۸۲۸ء میں شائع ہوا۔بعدازاں یہ تحقیقی کام لندن ہی سے ۱۸۴۴ء اور پھر ۱۸۶۱ء میں کتابی صورت میں طبع ہوا۔مضمون کا عنوان ہے:

'An Essay On The Origin And Structure Of The Hindustani Tongue'[483]

گارسیں دتاسی (Garcin De Tassy):

فرانسیسی مستشرق، گارسیں دتاسی (۱۷۹۴ء۔۱۸۷۸ء) نے مشرقی زبانوں،خصوصاً اردو،ہندوستانی اور مشرقی تہذیب وثقافت پر متعدد تحقیقی وتالیفی کتب لکھیں اور لیکچرز دیے۔دتاسی کو اردو زبان سے عشق تھا اور وہ اس کی ترقی کا خواہاں تھا،حال آنکہ وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا۔اردولسانیات کے ضمن میں دتاسی کے مباحث اس کی درج ذیل کتب اور مقالوں کے تحت سمیٹے گئے ہیں:

(۱) 'اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم' کا مؤلف دتاسی کی تالیف 'ضمیمہ ہندوستانی مبادیات' کا ذکر کرتا ہے جو پیرس سے ۱۸۳۳ء میں شائع ہوئی۔یہ تالیف بنیادی طور پر اردو قواعد سے متعلق مباحث، اکیس (۲۱) خطوط اور ان کے فرانسیسی تراجم پر مبنی ہے۔تالیف کی خصوصیت اس میں شامل دتاسی کی اُس فاضلانہ تحریر کی بنا پر ہے جو اردو زبان کی ابتدا اور ساخت پر ہے۔[۴۸۴]

(۲) اردو،ہندوستانی ادب پر تحقیق وتدوین کے حوالے سے دتاسی کا اہم کارنامہ 'تاریخِ ادبیاتِ ہندی وہندوستانی' ہے۔سرورق کے مطابق عنوان ہے:

'Historic De la Literature Hindoui et Hindostanie'

اس تاریخ کی تدوین میں دتاسی نے اپنی زندگی کے کئی سال صرف کیے اور مواد کی فراہمی میں فقط تذکروں پر انحصار کرنے کے بہ جائے خطوط، قلمی نسخوں اور گرامر کی کتب سے بھی استفادہ کیا۔یہ دتاسی کی سب سے زیادہ ضخیم اور اہم تالیف ہے۔۱۶+۶۳۰صفحات[۴۸۵] پر مبنی پہلے ایڈیشن کی جلد اوّل ۱۸۳۹ء میں لندن کی 'اورینٹل ٹرانسلیشن کمیٹی' کی سرپرستی میں فرانس کے سرکاری مطبع سے شائع ہوئی۔اسی مطبع سے ۳۲ + ۶۰۳صفحات پر مشتمل جلد دوّم ۱۸۴۷ء میں طبع ہوئی۔پہلے ایڈیشن کی دونوں جلدیں ملکہ انگلستان 'وکٹوریہ' (Victoria) کے نام معنون ہیں۔تین جلدوں پر مشتمل دوسرا ایڈیشن نظرِ ثانی، تصحیح اور اضافے کے بعد پیرس سے ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۱ء میں طبع ہوا۔یہ تینوں جلدیں بالترتیب ۶۲۴، ۶۳۰ اور ۶۰۳ صفحات[۴۸۶] پر مشتمل ہیں۔تین

جلدوں پر مبنی گارسیں دتاسی کی تاریخِ ادبیات کا تیسرا ایڈیشن نیویارک (امریکہ) سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔[487]

اس کتاب کا فرانسیسی سے براہِ راست اردو میں ترجمہ سکستان لیلیان نذرؤ نے کیا اور اہم تنقیدی حواشی اور مقدمے کے اضافے کے ساتھ کراچی یونی ورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔[488]

لسانی اعتبار سے دتاسی کی تاریخ کے دوسرے ایڈیشن کی جلد اوّل کا مقدمہ اہم، دل چسپ اور معلومات افزا ہے۔ اکہتر (۷۱) صفحات پر مشتمل اس مقدمے میں اردو ہندوستانی زبان کی ابتدا اور ارتقا کے معاملات اور ساخت کو زیرِ بحث لایا گیا ہے[489] ۔مقدمہ درج ذیل لسانی مباحث کا احاطہ کرتا ہے:

☆ دتاسی کے مطابق ہندوستانی زبانوں کی تاریخ کا آغاز سنسکرت سے ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں آریہ قوم کے ہم راہ سنسکرت ہندوستان میں داخل ہوئی تو دیگر مقامی بولیوں کا رواج قطعاً ختم نہیں ہوا بلکہ عوام الناس اپنا ما فی الضمیر انھیں مقامی بولیوں کے توسط سے بیان کرتے تھے۔ یہ بولیاں 'پراکرتیں' کہلائیں، جس سے مراد 'معمولی' یا 'قدرتی' ہے۔ اس کے برعکس 'سنسکرت'، جس سے مراد 'مکمل' اور 'پختہ' ہے، کبھی بھی کہیں بھی عوام کی زبان نہیں رہی بلکہ

اعلیٰ طبقے کے افراد کی زبان رہی ہے۔ سند کے طور پر قدیم ناٹکوں کو لیا جا سکتا ہے، جن میں اعلیٰ کردار 'سنسکرت' اور ادنیٰ کردار 'پراکرت' میں مکالمے ادا کرتے تھے۔ 'سنسکرت' چوں کہ علما کے مخصوص دائرے تک محدود اور مقدس کتابوں کی زبان تھی اسی سبب یہ 'پراکرت' کے مقابلے میں کم مقبول تھی۔ ملک کے شمال میں ان پراکرتوں سے جو بولی صورت پذیر ہوئی اسے 'بھاشا' کا نام دیا گیا۔ بھاشا کے معنی 'زبان' کے ہیں۔ یہی زبان بعد ازاں 'ہندوی' کہلائی۔ محمود غزنوی کی آمد کے بعد اس زبان کا رنگ و آہنگ بدلنے لگا۔ تیمور لنگ کے حملے اور پھر ۱۵۰۵ء میں بابر کے قیامِ سلطنت کے بعد نو وارد افواج سے ربط و مراسم سے اس زبان پر فارسی کے اثرات نمایاں طور پر مرتب ہونے لگے، جس سے عربی الفاظ بھی 'بھاشا' میں بڑی سرعت سے داخل ہوئے۔ محاورں اور روز مرّہ کے انتخاب کے حوالے سے اردو اور ہندوی میں موجود اختلاف کے باوجود یہ دو مختلف زبانیں نہیں بلکہ صرف و نحوی اعتبار سے ایک ہی زبان ہے۔ اسی زبان کو اہلِ یورپ نے 'ہندوستانی' کا نام دیا جس میں 'ہندوی'، 'ہندی'، 'اردو' اور 'دکنی' سبھی شامل ہیں۔

دتاسی 'ہندوی' کو 'ہندی' کا مترادف قرار دیتا ہے، جو درست نہیں۔ لفظ 'ہندوی' دراصل ہمیشہ سے اہلِ علم کے ہاں 'اردو' اور 'ریختہ' کے مترادف سمجھا گیا ہے۔ گویا 'ہندوی' سے مراد وہ ہندوستانی زبان ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔[490]

☆ دتاسی لکھتا ہے کہ ہندوستان کی عام بولیوں میں 'ہندوستانی' (اردو) سب سے زیادہ فصیح البیان اور لچک دار زبان ہے۔ اس کا جاننا اسی سبب بہت سود مند ہے کہ یہاں عموماً یہی زبان سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ شمالی ہند اور شمالی علاقے کی عدالتوں اور دفتروں میں فارسی کی جگہ ہندوستانی (اردو) کے رواج سے اسے مزید ترقی اور قبولیت حاصل ہوئی۔

☆ دتاسی نے متحدہ برِصغیر میں ہندوؤں کی جانب سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط پر مذموم الزامات اور رقیق حملوں کی

بھر پور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ایک دل کش ادبی سرمایے کی حامل زبان ہے اور اس کے برعکس ہندی کی ادبی حیثیت قریباً ختم ہو چکی ہے۔ مزید یہ کہا کہ مسلمانوں نے جس حوصلہ مندی سے ہندوؤں کی اردو مخالف گھناؤنی سازشوں کا مقابلہ کیا وہ قابلِ ستائش ہے۔

(۳) تاریخِ ادب کے بعد دتاسی کا دوسرا اہم علمی کارنامہ اس کے خطبات ہیں۔ ہر تعلیمی سال کے آغاز میں دتاسی ہندوستان کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے جائزے پر مشتمل ایک خطبہ اپنے شاگردوں کو دیتا تھا۔ یہ خطبات ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۷ء تک ہر سال مدرسہ السنہ شرقیہ، پیرس میں باقاعدگی سے دیے گئے۔ البتہ ۱۸۵۷ء میں غدر (جنگِ آزادی) کے باعث اس سال خطبہ ممکن نہ ہوسکا۔ یہ خطبات: مختلف کتب کی اشاعت کی تفصیلات، تبصروں، برِصغیر کی معاشی و سیاسی حالت، اردو زبان اور اس سے متعلق مسائل، عیسائیت کے تبلیغی اداروں کی مساعی، اخبارات کی اشاعت کے ضمن میں معلومات، ادبی و سماجی انجمنوں کے کارناموں کے علاوہ اہم شخصیات کے بارے میں معلوماتی مواد، بعض مستشرقین کی وفات، متعدد اردو داںوں کی حیات اور علمی ادبی کارناموں کے بارے میں اہم معلومات پر مبنی ہیں۔ خطبات کی کل تعداد ستائیس (۲۷) ہے اور یہ فرانسیسی زبان میں ہیں۔

۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک کے خطبات کتابی صورت میں 'ہندوستانی زبان اور ادبیات' کے عنوان سے پیرس سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئے۔ بقیہ خطبات علاحدہ کتابی شکل میں بعد میں طبع ہوئے۔ ان خطبات میں اردو زبان اور اس سے متعلق اہم مباحث کو کلیدی اہمیت حاصل رہی۔ قریباً ہر خطبے میں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی حوالے سے اردو زبان کا ذکر ضرور ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کتابی صورت میں ان خطبات کی اشاعت سے اردو زبان و ادب کے حوالے سے گراں قدر معلوماتی ذخیرہ محفوظ ہو گیا۔ یہ خطبات ہندوستان کی ادبی تاریخ کے لیے نہایت اہم مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر خطبہ سالِ خطابت کی شائع شدہ کتب کی تفصیل، مصنفین و مؤلفین سے متعلق اہم اطلاعات، کتاب کی قدر و قیمت پر دتاسی کی عالمانہ رائے، نئے چھاپہ خانوں کے ذکر، ادبی شخصیات (ہندوستانی و مستشرق، دونوں) کے انتقال کی اطلاع اور نئے اخبار و رسائل کے اجرا سے متعلق گراں مایہ معلومات پر مبنی ہوتا۔

بہ قول ڈاکٹر آغا افتخار حسین:

> یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر گارسیں دتاسی کے مقالات و خطبات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہندوستان کی ادبی و ثقافتی تاریخ کے اُس دور کے بارے میں کوئی اور مآخذ مشکل سے ملے گا۔[۴۹۱]

اردو زبان کی آفرینش، ترقی و ترویج اور اس زبان سے دتاسی کے والہانہ پن کے اظہار میں خطبات سے اہم بیانات درج ذیل ہیں:

☆ ۱۸۵۲ء کے خطبے میں دتاسی نے کہا:

> حضرات! مجھے اُمید ہے کہ میرے لیکچر ہندوستان کی جدید زبان کے علمی اور ادبی مطبوعات کے پڑھنے میں آپ کی کافی طور پر راہ نمائی کریں گے۔ میری تعلیم کا طریقہ، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، تجزیے کے اُصول پر مبنی ہے۔[۴۹۲]

☆ گارسیں دتاسی اردو زبان کا آغاز اُس وقت سے بتاتے ہیں جب برِصغیر میں مسلمان وارد ہوئے۔ چناں چہ اپنے خطبے میں لکھتے ہیں:

> آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے پہنچے۔ خاص کر محمود غزنوی نے ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ شان دار فتوحات حاصل کیں اور اُسی وقت سے شہروں میں ہندوستانی بھاکا میں شان دار تغیر واقع ہوا۔[۴۹۳]

دتاسی نے اردو کو ہندوستان کی اہم 'جدید زبان' کا درجہ دیا۔ اس نے نہ صرف اپنے شاگردوں میں اردو کی تعلیم کے حصول کا جذبہ بیدار کیا بلکہ مختلف مقامات پر اردو کی درس گاہیں اور اردو کی پروفیسری کے قیام کی خواہش کا اظہار کیا۔ برطانیہ کی دیگر قدیم یونی ورسٹیوں کا ذکر کرتے ہوئے دتاسی نے ۱۸۶۱ء کے خطبے میں مدلّل تجویز پیش کی کہ آئر لینڈ، سکاٹ لینڈ اور امریکہ میں بھی اردو کی پروفیسری قائم کی جائے۔

☆ سیاسی ضرورتوں کے تحت انگریزوں نے ہندوستان میں 'ہندی اردو تنازعہ' کی آڑ میں عوام کو جس لسانی نفاق کے گڑھے میں دھکیلا اُس سبب ہندوستان لسانی بنیادوں پر دو گروہوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک گروہ ملک میں سنسکرت آمیز ہندی کو دیو ناگری میں لکھنے کا خواہاں تھا، جب کہ دوسرا گروہ ملک میں سب سے زیادہ مستعمل زبان 'اردو' کی ترقی و ترویج کا خواہش مند تھا۔ دتاسی نے اس بحث میں ایک محبِّ اردو کی حیثیت سے حصّہ لیا اور بہت واضح الفاظ میں اپنے مؤقف کا اظہار کیا:

(i) ہندو فضلا جتنا چاہیں اردو کو کالک لگائیں لیکن یہ اِن کے بس کی بات نہیں کہ اردو نے ہندوستان میں جو حیثیت اختیار کر لی ہے وہ اس سے چھین لیں۔ وہ اگر چاہیں کہ لوگوں کو عربی اور فارسی الفاظ ترک کرنے پر آمادہ کریں تو اس میں بھی انھیں کام یابی نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ ہندو عوام خود بہ جائے اس کے کہ ہندی کو اردو پر ترجیح دیں، اپنی زبان کو اردو کے قریب تر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔[۴۹۴]

(ii) میں اور مسٹر بیمز (Mr. Beams) اردو کی حمایت میں تنہا نہیں ہیں جو دہلی کی ٹکسالی زبان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی آمیزش ہے۔ ہم نہ اس کے قائل ہیں کہ عربی فارسی الفاظ اردو میں سے خارج کر دیے جائیں اور نہ اس کے کہ ہندی کی خاطر اردو کو فنا کر دیا جائے۔[۴۹۵]

(iii) مجھے اردو زبان اور مسلمانوں کے ساتھ جو لگاؤ ہے، وہ کوئی چُھپی ہوئی بات نہیں۔[۴۹۶]

اردو/ہندوستانی زبان کے عملی فائدے اور ادبی حیثیت کے حوالے سے دتاسی اپنے ایک خطبے میں لکھتا ہے:

(iv) عام طور لوگ پوری طرح یہ نہیں جانتے کہ ہندوستانی ہندوستان کے تمام صوبوں میں بولی جاتی ہے۔ چاہے اِس طور پر کہ بعض جگہ اس کے ساتھ صوبے کی دوسری بولیاں بھی شریک ہوں۔۔۔۔ تو میں کہوں گا کہ اس کے لیے ہندوستانی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی ملازمت (ملکی ہو یا فوجی) میں ان ہی اشخاص کو داخل کرتی ہے جو ہندوستانی زبان جانتے ہیں اور ہندوستانی زبان کے امتحان میں شریک ہو کر کام یاب ہو چکے ہیں۔[۴۹۷]

(v) ۔۔۔ اس وقت ہندی کی حیثیت بھی ایک بولی کی سی رہ گئی ہے، جو ہر گاؤں میں الگ الگ طریقے سے بولی جاتی ہے۔ چناں چہ ہندوؤں کی کوشش ہے کہ اردو کے بہ جائے ہندی کو فروغ دیا جائے۔ حال آنکہ اردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ شستہ زبان ہے۔ لیکن ہندی ان کے نزدیک خالص ہندوستان کی زبان ہے۔ اس واسطے کہ وہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ اردو زبان میں فارسی اور عربی کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں (عربی اور فارسی) اسلامی مشرق کی قابلِ احترام السنہ ہیں اور دنیا کے تمام علما، فضلا ان دونوں کو اسی نظر سے دیکھتے آئے ہیں۔[۴۹۸]

اردو دوستی کا یہ احساس خود اہلِ زبان کے ہاں بھی کم ملتا ہے۔ اردو سے دتاسی کی محبت تا دمِ آخر قائم رہی۔ اردو کی بھرپور حمایت کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی و ترویج میں بھی دتاسی نے عملی طور پر حصّہ لیا۔[۴۹۹]

☆ اردو/ ہندوستانی زبان کی مختصر تاریخ کے بیان کے حوالے سے دتاسی کا ۱۸۵۴ء کا پانچواں سالانہ تبصرہ اہم ہے۔ خطبے کے آغاز میں اردو زبان کی آفرینش کے حوالے سے دتاسی بیان کرتا ہے کہ کس طرح یہ زبان سنسکرت سے پراکرت بنی، پھر برج بھاشا اور آخر میں دو بولیوں (اردو اور ہندی) کی شکل اختیار کر لی ۔ ایک شمالی اور دوسری جنوبی اور ان یہ کو بعد ازاں بالترتیب ہندوستانی اور دکنی کا نام دیا گیا۔ اردو پر لسانی نقطہ نظر سے دتاسی کا یہ خطبہ قریباً سترہ (۱۷) صفحات کو محیط ہے۔

گارسیں دتاسی نے اپنے خطبات کی تیاری میں مواد سرکاری اخبارات، ہفتہ وار اور ماہانہ رسالوں، مختلف کتب خانوں کی فہرستوں، کتابوں اور ذاتی خطوط سے لیا۔ بے لاگ تنقیدی تبصرے اور اردو زبان و ادب سے گہرے لگاؤ اور دلچسپی کے سبب یہ خطبات نہ صرف فرانس اور دیگر یورپی ممالک میں مقبول ہوئے بلکہ ہندوستان میں بھی انھیں بہت پذیرائی ملی۔ خطبات کے منتخب اجزا کا اردو ترجمہ بھی ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوا۔ بالآخر دتاسی کے تمام خطبات اور تقاریر کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں طبع ہوا۔ آٹھ سو تیرہ صفحات (۸۱۳) پر مشتمل جلد اوّل (۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۹ء) بہ مقام اورنگ آباد ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ چار سو چھ (۴۰۶) صفحات پر مبنی جلد دوّم (۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۳ء) دہلی سے شائع ہوئی۔ اسی طرح تین سو چورانوے (۳۹۴) صفحات کی حامل جلد سوّم دہلی ہی سے ۱۹۴۳ء میں منظرِ عام پر آئی۔

چار جلدوں اور کل اٹھارہ سو ستر (۱۸۷۰) صفحات پر مشتمل تراجم کی اشاعت ثانی انجمنِ ترقیِ اردو، پاکستان سے ڈاکٹر حمید اللہ کی نظرِ ثانی اور اضافوں کے بعد ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۹ء کراچی سے عمل میں آئی۔[۵۰۰]

(۴) 'ہندوستانی، جسے ہندوستان کی عام زبان کا نام دیا گیا ہے، اس کا آغاز و توسیع' کے عنوان سے دتاسی کا ایک مقالہ فرانس کے شہر 'کاں' (Caen) کی اکیڈمی کی یادداشت میں صفحہ ۳۱۳ تا ۳۳۷ پر ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا۔

مقالے کا موضوع اردو/ ہندوستانی کی ابتدا اور ارتقا ہے۔ برِصغیر کی جدید زبانوں کی آفرینش سے متعلق دتاسی نے اس عام نظریے کی تائید و توثیق کی ہے کہ یہ سب زبانیں سنسکرت سے پیدا ہوئیں۔ شمال میں سنسکرت کے بعد بہت سی پراکرتیں وجود میں آئیں۔ دتاسی اس تبدیلی کا سبب یہ بیان کرتا ہے کہ سنسکرت قواعد چوں کہ خاصی پیچیدہ ہے، لہٰذا مشکل سے آسان کی طرف رجحان ایک فطری عمل تھا جس کے باعث آسان مقامی بولیاں پیدا ہوئیں۔ دتاسی کے نزدیک سنسکرت زبان میں عام بول چال کی زبان بننے کی صلاحیت نہیں اور وہ یورپ کی قدیم مردہ زبانوں کی طرح فقط تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ سنسکرت سے متعلق اپنے خیالات کا مزید اظہار وہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

> بالآخر سنسکرت کو خود ہندوؤں نے نظر انداز کر دیا، لیکن آہستہ آہستہ وہ کلکتے کی ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام کے بعد انگریزوں کو متوجہ کرنے لگی۔۔۔۔ مجھے یہ بات بدیہی نظر آتی ہے کہ ہندو رجعت پسند ہیں، ایسے ہی جیسے یورپین، جو عنقریب یہ خواہش کریں گے کہ جدید قومی زبانوں کی جگہ دوبارہ لاطینی کو رائج کیا جائے۔[۵۰۱]

بعد ازاں دتاسی اردو اور ہندی ادب کے تقابلی جائزے کے بعد لکھتا ہے کہ ہندی ادب کا بڑا حصّہ مذہبی نوعیت کا ہے، جب کہ اردو ادب میں متنوع

موضوعات پر مبنی تحاریر دست یاب ہیں۔[502]

علاوہ ازیں دتاسی کی مطبوعات میں بڑی تعداد ایسی تحاریر پر مشتمل ہے جو دراصل مختلف زبانوں میں شائع شدہ دیگر مصنفین کے مضامین پر دتاسی کے تنقیدی تبصرے ہیں۔ان تبصروں میں بھی اردو اور ہندوستانی زبان کی آفرینش وارتقا اور ساخت کے حوالے سے دتاسی کے متعدد بیانات بلاشبہ تاریخی ولسانی اہمیت کے حامل ہیں۔

فیلکس بوتروس (Felix Boutros):

فرانسیسی مستشرق فیلکس بوتروس (سنہ وفات ۔۱۸۶۴ء) دہلی کالج کے تین اہم مستشرق پرنسپلز میں سے ایک تھا۔۱۸۴۰ء میں اسے دہلی کالج کی صدارت تفویض ہوئی۔۱۸۴۱ء میں یہ ایک ایسے کمیشن کا معتمد نامزد ہوا جس کے ذمے ہندوستانی طلبا کی ضرورتوں کو مدِّ نظر رکھ کر ایک ایسے نصاب کی تیاری تھی جو مادری زبان، بالخصوص اردو کے ذریعے سے تعلیم کو عام کر سکے۔اس کمیشن نے بوتروس کی قیادت میں ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۵ء تک متنوع موضوعات پر تیس (۳۰) گراں قدر اردو کتب لکھوائیں۔تین کتابیں خود بوتروس نے لکھیں۔[503] بوتروس نے اردو لسانیات پر بھی کام کیا، جس کا اندازہ گارسیں دتاسی اور مولوی عبدالحق کے اکثر

بیانات سے ہوتا ہے۔۱۹ دسمبر ۱۸۴۱ء میں گارسیں دتاسی کے نام اپنے مراسلے میں بوٹرس نے اردو زبان کی وسعت کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ہندوستانی زبان نے دو تین سال سے ایسی اہمیت حاصل کر لی ہے جو اس سے پہلے نہ تھی۔ یہ بہار اور مغربی صوبوں کی، یعنی راج محل سے لے کر ہردوار تک کی سرکاری زبان بن گئی ہے۔ ہردوار ہمالیہ کے دامن میں ایک قصبہ ہے۔مزید برآں یہ زبان سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے اور کم از کم چار کروڑ اشخاص اسے روزمرّہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔اب انگریزی حکومت نے اسے عدالتوں اور سرکاری اخبارات میں جاری کر دیا ہے۔[504]

ولیم ناسولیس (William Nassau Lees):

انگریز مستشرق، میجر ولیم ناسولیس (۱۸۲۵ء۔۱۸۸۹ء) نے ٹرنٹی کالج (Trinity College) ڈبلن (Dublin) سے تعلیم پائی۔ڈبلن سے ایل۔ایل۔ڈی کی اور برلن (Berlin) سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔۱۸۴۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم کی حیثیت سے بنگال آیا اور ۱۸۵۸ء میں ملازمت میں ترقی پا کر میجر جنرل کے عہدے تک پہنچا۔ پہلے پروفیسر اور پھر پرنسپل کی حیثیت سے چند برس کلکتے کے ایک مدرسے میں خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں فورٹ ولیم کالج کے ممتحنوں کے بورڈ کے رکن اور پھر حکومتِ ہند کے مترجم کی حیثیت سے ذمے داریاں نبھائیں۔

ناسولیس کی بنیادی شہرت فارسی زبان میں گراں قدر خدمات کی وجہ سے ہے۔اس مستشرق کی مرتبہ ومدوّنہ شیخ سعدی کی کتب کی اشاعت نے ترتیب و تدوینِ متن کا ایک نیا معیار قائم کیا۔عربی زبان وادب کے حوالے سے بھی ناسولیس کی علمی وتحقیقی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔اردو زبان کے حوالے سے اس کا کام درج ذیل ہے:

(۱) ۱۸۵۷ء میں السنہ شرقیہ کی حمایت میں ناسولیس نے ایک رسالہ لکھا۔رسالے کا عنوان ہے:

'Instructions In The Oriental Languages Considered'[505]

رسالے میں ناسولیس نے اس امر کی اہمیت کو دلائل کے ساتھ واضح کیا کہ ملکی وفوجی خدمات کے ضمن میں السنہ شرقیہ اور خاص طور پر اردو زبان کی تحصیل نہایت ضروری ہے۔ کیوں کہ انگریزی زبان ہندوستان میں کبھی بھی وہ بنیادی اہمیت حاصل نہ کر پائے گی جس کی بنا پر انگریز السنہ شرقیہ سے بے نیاز ہو جائیں۔ایسا سوچنا فقط خام خیالی کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل میں ناسولیس کا ایک مضمون ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا۔مضمون میں ناسولیس نے لارڈ میکالے کی اس تحریک کی پرزور حمایت کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان میں صرف رومن رسم الخط استعمال کرتے ہوئے اردو زبان کو رومن رسم الخط میں لکھا جانا چاہیے۔اپنی اس تجویز کا سبب یہ بیان کیا کہ دراصل اردو زبان کا اپنا کوئی مخصوص رسم الخط نہیں۔فارسی رسم الخط ہندوستانی نژاد نہیں اور دیوناگری رسم الخط میں یہ صلاحیت نہیں کہ فارسی زبان کے عناصر کا بہ خوبی اظہار کر سکے۔دوسری طرف ۱۸۶۴ء ہی میں بابو راجندر لال مترنے اپنے مضمون، مطبوعہ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال میں اردو زبان کے لیے دیوناگری رسم الخط کی تجویز پیش کی۔تاہم گارسیں دتاسی نے ان دونوں مضامین کا منصفانہ جواب ۱۸۶۵ء میں اپنے خطبے کے توسط سے دیا اور ثابت کیا کہ اردو زبان کے لیے فارسی رسم الخط ہی زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔

جان بیمز (John Beams):

برطانوی مستشرق، جان بیمز (۱۸۳۷ء-۱۹۰۲ء) ۱۸۵۸ء میں ہندوستان آیا اور یہاں مختلف اوقات میں متعدد مقامات پر قیام کیا۔وہ بہار اور بنگال کے مختلف اضلاع میں کلکٹر اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے رہا۔بیمز کو بچپن ہی سے زبانوں کے مطالعے سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ہندوستان کی متعدد زبانوں اور بولیوں نے بیمز کے اس شوق کو مہمیز کیا۔اسی دور میں یورپی ماہرینِ لسانیات زبانوں کے سائنسی مطالعے اور تحقیق میں منہمک تھے۔بیمز نے متنوع ہندوستانی زبانوں اور بولیوں کا مطالعہ کیا اور ان کی آفرینش و ارتقا کے حوالے سے تحقیقات کیں، جن کے نتیجے میں لسانیات پر بیمز کی کئی کتب منظرِ عام پر آئیں۔بیمز اپنے علمی تبحر اور علم السنہ میں مہارت کی بنا پر نہ صرف بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا سرگرم رکن رہا بلکہ لندن، پیرس اور برلن کی مختلف لسانی انجمنوں اور اداروں سے وابستہ رہا اور باوجود خرابیِ صحت و دیگر مسائل، بیمز نے لسانیات جیسے سخت محنت طلب کام کی ذمے داری کو بہ طریقِ احسن نبھایا اور پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

بیمز کی درج ذیل تحاریر اور کتب سامنے آئیں:

(۱) 'اردو میں عربی عنصر کی حمایت' کے عنوان سے بیمز کا مضمون ۱۸۶۶ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں شائع ہوا۔اس مضمون کے توسط سے بیمز نے ثابت کیا کہ:

> اردو ہندوستانی کی مہذب ترین شکل ہے۔اس میں ایجاز اور فصاحت بہ درجۂ اتم موجود ہے اور اظہارِ خیال کے لیے اس زبان میں بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے۔۔۔اردو سے عربی، فارسی الفاظ کو خارج کرنا ایسا ہے جیسے آپ انگریزی زبان سے لاطینی الفاظ نکالنے کی کوشش کریں اور چاہیں کہ اس میں صرف سیکسن اصل کے لفظ باقی رہیں۔زبانیں اس طرح بالارادہ نہیں بنائی جاتیں۔[۵۰۶]

(۲) 'An Outline Of Indian Philology' کے عنوان سے بیمز نے ہندوستانی السنہ پر اپنی تحقیقی کام کا آغاز ۱۸۶۶ء میں کیا جو کتابی صورت میں کلکتے سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ماہرینِ لسانیات کے نزدیک یہ کتاب ہندوستانی السنہ پر ایک مستند تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔اس میں زبانوں پر بحث کرتے ہوئے بیمز رقم طراز ہیں:

> ہندوستان پر مسلمانوں کے حملوں نے ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا۔۔۔۔حملہ آور مخلوط قوموں اور قبیلوں کے لوگ تھے۔مثلاً ان میں عرب، ایرانی، افغانی، چغتائی ترک، ازبک ترک، دوسرے قبائل اور خاص کر منگولی قبائل سے تعلق رکھنے والے ترک سبھی شامل تھے۔جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان کے آنے کا واحد نتیجہ یہ ہوا کہ اردو یا ہندوستانی زبان بن گئی اور عربی زبان کے بہت سے الفاظ قریب قریب ہندوستان کی تمام زبانوں میں شامل ہو گئے۔۔۔۔مغرب میں دریائے سندھ سے لے کر مشرق میں دریائے ستلج تک اور پہاڑوں سے لے کر ملتان کے قریب تک پنجابی ملتی ہے۔۔۔۔خالص پنجابی دریائے راوی اور بیاس کے درمیان میں بولی جاتی ہے۔۔۔۔پنجابی درحقیقت ہندی کی ایک بولی کے سوا کچھ اور

نہیں ہے اور غالبًا شورسینی پراکرت سے نکلی ہے۔[507]

اس کتاب کا اردو ترجمہ سیّد احتشام حسین نے 'ہندوستانی لسانیات کا خاکہ' کے عنوان سے کیا، جو ۱۹۶۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

(۳) ۱۸۶۸ء میں 'کواٹرلی جرنل' نمبر ۲۳۴ میں بیمز نے اردو زبان کی حمایت ان الفاظ میں کی:

> اگر سرکاری طور پر ہندوستانی کو سارے ہندوستان کی زبان تسلیم کرلیا جائے تو یہ صرف اُس صورت میں ممکن ہوگا کہ ہندوستانی کو فارسی سے بالکل جدا نہ کیا جائے۔ اگر اردو لکھتے وقت سنسکرت یا ہندی یا عربی یا فارسی کے ہم معانی الفاظ میں سے ایک چلتا ہو تو آخرالذکر زبان کو سب پر ترجیح دینا چاہیے۔[508]

(۴) ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے تقابلی قواعد پر جان بیمز نے اہم لسانی تحقیق کا آغاز بھی ۱۸۶۶ء میں ہی کیا۔ اس ضمن میں بیمز کی تالیف کا عنوان ہے:

'A Comparative Grammar of the Modern Aryan Languages of India'

کتاب کی پہلی جلد ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔ بعدازاں دوسری اور تیسری جلدیں طبع ہوئیں۔ اس کتاب کے توسط سے سات (۷) جدید آریائی زبانیں؛ سندھی، پنجابی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی، اڑیسہ اور ہندی کے قواعد کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں ہندوستانی السنہ پر بحث کرتے ہوئے بیمز لکھتے ہیں:

> ان زبانوں کی صفِ اوّل میں ہندی اور اس کی ضمنی شکلوں یعنی گجراتی اور پنجابی کو جگہ دینا چاہیے۔ ان کی پیدائش کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی ہے جب کہ وہ پراکرت سے جدا ہو کر مستقل زبان کی حیثیت اختیار کرتی ہیں۔۔۔ اگر قیاس آرائی کی جائے تو اس کا قوی امکان نظر آتا ہے کہ ایک یک ساں سی زبان عام طور پر اختیار کرلی جائے گی۔ یعنی فارسی آمیز ہندی (ہندوستانی) جو دریائے سندھ سے لے کر راج محل تک اور ہمالیہ سے لے کر بندھیاچل تک رائج ہو جائے گی۔۔۔ اردو میں جو اس قدر صاف، سادہ اور لطیف زبان ہے، جو ہر طرح کی بات کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جو اب بھی حقیقت میں ہندوستان کے بہت سے حصّوں میں 'لنگوافرینکا' کا کام دیتی ہے۔۔۔۔[509]

مزید لکھتے ہیں:

> فتح ہندوستان کے بعد عرصۂ دراز تک مسلمانوں نے فارسی کو اور ہندوؤں نے ہندی کو محفوظ رکھا۔ مسلمان مدت تک فصیح ہندی بولنے کے عادی رہے اور انھوں نے ہندی میں فارسی الفاظ کو نہیں ملایا تھا۔ اکبر (۹۶۲ھ۔۱۰۱۴ھ) کے زمانے میں جب راجہ ٹوڈل مل نے طریقِ مال گزاری کو رواج دیا تو ہندو فارسی زبان سیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اس زمانے سے ہندی میں فارسی زبان کی آمیزش شروع ہوئی اور یوں اردو کی بنیاد پڑی۔[510]

علاوہ ازیں ہندوستانی لسانیات کے ضمن میں بیمز نے 'بھوج پوری' پر ایک مختصر رسالہ لکھا، 'ماگاز' زبان کی ایک قواعد مرتب کی اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں متعدد مضامین لکھے۔ لسانی تحقیق کے حوالے سے جان بیمز کا شمار بلاشبہ نامور ماہرینِ لسانیات میں ہوتا ہے۔[511]

ایڈورڈ ہنری پامر (Edward Henry Palmer):

انگریز مستشرق، ایڈورڈ ہنری پامر (۱۸۴۰ء۔۱۸۸۲ء) کو زبان کے مطالعے اور خصوصاً اردو زبان پر تحقیقی و لسانی خدمات کے ضمن میں اے جے آربری

(A.J.Arbery) نے بجا طور پر 'The Linguist' کا خطاب دیا ہے [۵۱۲]۔ پامر کو عربی، فارسی اور اردو پر یک ساں دست رس حاصل تھی۔ وہ ان تینوں زبانوں

میں بڑی فصاحت سے شعر کہا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ متعدد یورپی زبانوں کا بھی ماہر تھا۔ سولہ (۱۶) سال کی عمر میں شراب کی دکان پر کام کرنے کی وجہ سے اس کا سابقہ مختلف اقوام کے افراد سے رہا۔ اسی سبب اسے اطالوی اور فرانسیسی زبانیں بولنے اور سمجھنے میں کبھی بھی دشواری کا سامنا نہ رہا۔ ٹرنٹی کالج (Trinity College) آئر لینڈ سے اس نے فارسی، عربی اور ترکی مسوّدوں کی ایک فہرست مرتب کی اور اودھ کے اخباروں میں فارسی اور عربی میں مضامین شائع کیے۔ 'السنہ شرقیہ کا مطالعہ' کے عنوان سے پامر کا مضمون 'انڈین میل' میں ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔ [۵۱۳]

ونٹرنز (Winternitz):

جرمن مستشرق، ڈاکٹر ونٹرنز نے 'ادبیاتِ ہندوستان' کے عنوان سے ایک ضخیم تاریخ لکھی۔ اس مستشرق کے مطابق بارھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے ہندوستان پر تسلط حاصل کر لیا تو عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ برج بھاشا میں شامل ہونے لگے۔ اس تغیّر کے باعث سولھویں صدی عیسوی تک ایک نئی زبان، 'اردو یا ہندوستانی'، پیدا ہو گئی۔ [۵۱۴]

جوزف ارنسٹ ریناں (Joseph Ernest Renan):

ہندوستانی زبانوں کے مباحث پر مشتمل فرانسیسی مستشرق، ریناں (۱۸۲۳ء-۱۸۹۲ء) کا مضمون ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے ایک اقتباس پیش ہے:

> ہمارے معزز قائد ان خطوط میں ایک ہندوستان کے رہنے والے کی طرح جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔۔۔ وہ یقیناً خوب صورت ہندوستانی کے حق میں ہیں، جسے 'اردو' کہتے ہیں اور دیوناگری حروفِ تہجی کے بے جا دعوے کے مخالف ہیں۔ [۵۱۵]

رڈولف ہارنلے (Rudolf Hoernle):

جرمن مستشرق، رڈولف ہارنلے (۱۸۴۱ء-۱۹۱۸ء) برطانوی راج کے دوران سکندرہ (آگرہ) میں ایک پروٹسٹنٹ پادری کے گھر پیدا ہوا۔ اِس مستشرق نے ہند آریائی زبانوں کے مطالعے میں اپنی تمام عمر صرف کی۔ ہارنلے کی علمی خدمات کے اعتراف میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے ۱۹۰۲ء میں اِسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند سے نوازا۔

۱۸۸۰ء میں بہاری زبانوں کی تقابلی قواعد پر ہارنلے کی تالیف منظرِ عام پر آئی۔ اِس کا عنوان یہ ہے:

'Comparative Grammar Of The Gaudian Languages'

اِس کتاب کے مقدمے میں ہارنلے اردو زبان کی پیدائش پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> اردو مقابلتاً حال کی پیداوار ہے۔ دہلی کے نواح میں، جو مسلم اقتدار کا مرکز تھا، اردو بارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی۔ یہ علاقہ برج، مارواڑی اور پنجابی کے لیے سنگم کی حیثیت رکھتا تھا۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جُلی زبان وجود میں آئی جو صرفی نحوی اصول کی حد تک برج ہے، اگرچہ اِس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اِس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی، یعنی فارسی و عربی۔ [۵۱۶]

اردو زبان کی ابتدا کے حوالے سے ہارنلے کی رائے مسلم علما کی رائے سے کچھ خاص مختلف نہیں۔ مسلمان اکابرین کی طرح اگرچہ وہ اردو کو مسلمانوں کی

ساختہ پرداختہ زبان نہیں بتاتا لیکن اسے مسلمان سپاہیوں اور مقامی ہندو باشندوں کے اختلاط اور ملاپ کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اِس کے مطابق برج، پنجابی اور مارواڑی کے اختلاط و ترکیب کے بعد اردو وجود میں آئی، مگر وہ اِس امر کے ثبوت میں کوئی ٹھوس دلائل پیش نہیں کرتا۔

ہارنلے اردو زبان کو خاص طور سے برج بھاشا پر مبنی بتاتا ہے، جو درست نہیں۔ گریرسن نے اردو کے صرفی اور نحوی سرمائے کو مساوی طور پر مذکورہ زبانوں سے ماخوذ بتایا ہے جب کہ ہارنلے کے مطابق پنجابی اور مارواڑی سرمایہ اردو میں برجی سرمائے کے مقابلے میں کم ہے [۵۱۷]۔ اردو زبان کی اصل اور ابتدا کا حوالے سے ہارنلے کا یہ بیان لسانیات کے مسلّم اصولوں کے خلاف ہے اور ماہرینِ لسانیات نے متفقہ طور پر اِس امر کی تصریح کی ہے۔

جارج ابراہام گریرسن (George Abraham Grierson):

سر جارج ابراہام گریرسن (۱۸۵۱ء۔۱۹۴۱ء) کا تعلق ڈبلن، آئر لینڈ سے تھا۔ اسی شہر میں اس نے تعلیم پائی۔ زبانوں کے مطالعے کی طرف فطری میلان کے سبب سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانیں سیکھیں۔ گریرسن ۱۸۷۳ء میں بنگال پہنچا۔ ۱۸۸۰ء میں صوبہ بہار میں جوائنٹ مجسٹریٹ مقرر ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں اس نے پٹنہ کے ایڈیشنل کمشنر کی حیثیت سے ذمے داریاں سنبھالیں۔ ۱۸۹۴ء میں مستشرقین کی ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کے دوران میں گریرسن نے ہندوستانی زبانوں کی فہرست مرتب کیے جانے کی ضرورت محسوس کی۔ چناں چہ ۱۸۹۸ء میں حکومتی سرپرستی میں ایک اہم لسانی منصوبے 'جائزہ لسانیاتِ ہند' (Linguistic Survey Of India) پر کام کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس امر کا اظہار گریرسن نے اپنی تالیف کے دیباچے میں درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

> .... I was entrusted with the task of collecting the specimens and of editing them for the press. with the object, the various local officersweredinstructedtorenderme the necessaryassistance.[518]

معاون افراد میں گورنمنٹ کے افسران، یورپین اور ہندوستانی مشنری لوگ اور عوام شامل تھے۔ گیارہ (۱۱) جلدوں پر مشتمل یہ لسانی جائزہ دو سو اکتیس (۲۳۱) زبانوں اور پانچ سو چوالیس (۵۴۴) بولیوں (Dialects) پر مشتمل ہے۔ ۱۹۲۱ء کی شماری (Census) کے مطابق اُس وقت برطانوی ہندوستان میں ایک سو اٹھاسی (۱۸۸) زبانیں رائج تھیں اور بولیوں کا شمار ہنوز دائرہ علم سے باہر تھا۔ گریرسن نے اپنے علمی جائزے کی تکمیل میں ماہرینِ صرف و نحو، ماہرینِ لغات اور ماہرینِ لسانیات کی کتب اور علمی تجرّ سے استفادہ کیا۔ اس لسانی جائزے پر کام تیس برس (۱۸۹۸ء۔۱۹۲۸ء) کے طویل عرصے کو محیط ہے۔ 'جائزہ لسانیاتِ ہند' کی اشاعت کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۹ء سے ہوا [۵۱۹]۔ اس عظیم لسانی منصوبے کو درج ذیل گیارہ بنیادی اور کچھ ذیلی جلدوں کے تحت سمیٹا گیا:

Vol. I Part. I .... Introductory

Part. II ..... Comparative Vocabulary

Vol. II Mon-Khmer and Siamese-Chinese Families

(Including Khassi and Tai)

Vol. III Tibeto-Burman Family

Part. I .... Tibeto-Burman Languages of Tibet dialects, The Hamalian dialects and north Assam groups.

Part. II .... Bodo-Naga and Kachin groups of the Tibet-Burman Languages.

Part. III ..... Kuki-Chin and Burma groups of the

Tibet-Burman Languages.

Vol. IV Munda and Dravidian Languages.

Vol. V Indo-Aryan Family, (Eastern group).

Part. I .... Bengali and Assamese Languages.

Part. II .... Bihari and Oriya Languages.

Vol. VI Indo-Aryan Family, Mediate group (Eastern Hindi).

Vol. VII Indo-Aryan Family, Southern group (Marathi).

Vol. VIII Indo-Aryan Family, North Western group.

Part. I .... Sindi and Lehnda

Part. II .... Dradvic or Pisacha Languages

(Including Kashmiri).

Vol. IX Indo-Aryan Family, Central group.

Part. I .... Western Hindi and Punjabi.

Part. II .... Rajasthani and Gujrati.

Part. III ...... Bhil Languages, (Including Khandesi,

Banjari or Labhani, Bahrupia etc).

Part. IV ...... Pahari Languages and Gujuri.

Vol. X Eranian Familiy.

Vol. XI Gipsy Languages and Suppliment.

متعدد ایشیائی زبانوں پر مباحث کو جامع لسانی جائزے کے تحت سمیٹنے اور خاص طور پر اردو/ہندوستانی زبان پر تحقیق کی وجہ سے گریرسن کی اہمیت درج ذیل اعتبار سے مستند ہے:

(۱) گریرسن نے لسانی جائزے کی صورت میں آئندہ ماہرینِ لسانیات کے لیے مباحث کے نئے سلسلے کا آغاز کر دیا۔ جہاں اس کے بیانات سے استفادہ کیا گیا وہیں پر کئی اختلافی نظریات نے بھی جنم لیا۔ مثلاً گریرسن کی تشکیل کردہ زبانوں کی شجرہ بندی کے حوالے سے بیش تر ماہرین نے اختلاف کیا۔ البتہ دل چسپی کی بات ہے کہ کسی نے بھی اپنے اختلافی مؤقف کی دلیل میں نیا مواد پیش نہیں کیا۔ اپنے دلائل کی سند میں قریباً سبھی ماہرین گریرسن ہی کے جمع کردہ ذخیرۂ الفاظ کو کام میں لائے۔ وجہ اس امر کی یہی ہے کہ گریرسن نے نصف صدی تک گوشۂ گم نامی میں رہ کر 'Linguistic Survey Of India' کی شکل میں ہندوستانی زبانوں کے الفاظ کا ایسا نادر ذخیرہ پیش کر دیا جو بے مثل ہے۔ آج تک دنیا کے کسی بھی فرد نے تنہا اور بنا سرکاری امداد اتنا بڑا علمی و تحقیقی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ علم السنہ اور لسانیات کے نئے نئے آفاق کی بازیابی کے حوالے سے گریرسن کا لسانی جائزہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ علاوہ ازیں متعدد ماہرینِ لسانیات: ڈاکٹر شوکت سبز واری، پروفیسر حافظ محمود شیرانی، سنیتی کمار چیٹر جی، سیّد احتشام حسین اور دیگر کئی علما نے گریرسن کے اخذ کردہ نتائج پر تفصیلی محاکے تحریر کیے۔ گویا گریرسن کا لسانی جائزہ نہ صرف اپنے تئیں جامعیت رکھتا ہے بلکہ جدید لسانی مباحث و نظریات کی آفرینش کا مؤجب بھی ہے۔

(۲) اردو/ہندوستانی کے مختلف ناموں اور بول چال کے نمونوں کو پیش کرنے کے حوالے سے گریرسن کا کارنامہ قابلِ ستائش ہے۔ گریرسن نے دہلی کے مختلف محلّوں اور طبقات کی زبانوں کے نمونے دیے ہیں۔ قبل ازیں اس طرح کے نمونے سوائے انشاﷲ خان انشا کی 'دریائے لطافت' کے کہیں اور دست یاب نہیں۔ اس حوالے سے گریرسن نے خاصے وسیع پیمانے پر تحقیق کی۔ اردو کے مختلف ناموں اور ذیلی بولیوں کے ضمن میں 'جائزہ لسانیاتِ ہند' سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

The earliest writers on India (Such as Terry and Frayer) called the current language of India 'Indostan'. In the earlier part of the eighteenth century writers alluded in Latin to the Lingua Indostanica, Hindustanica, Hondostanica. The earliest English writers in India called the language, 'Moors', and it appears to be Gilchrist who about 1787 first coined the word 'Hindostani' or, as he spelt it, 'Hindoostanee'.

Literary Hindostani, as distinct from vernacular Hindostani, is current, in various forms, as the language of polite society, and as a Lingua Franca over the whole of India proper. It is also a language of literature, both poetical and prose."[520]

(۳) 'جائزہ لسانیاتِ ہند' جیسے اہم، محنت طلب اور طویل دورانیے کو محیط ایک وسیع لسانی و تحقیقی منصوبے کو خود حکومتِ ہند جیسا ادارہ بھی سرکاری سطح پر انجام دے سکتا تھا، مگر اس حوالے سے گریرسن کی مساعی حیران کُن ہے۔ ابتداءً اگرچہ اس لسانی جائزے میں گریرسن کو حکومتی سرپرستی کے علاوہ دیگر ماہرین کا تعاون بھی حاصل رہا، مگر اس کے باوجود ۱۹۰۳ء میں واپس انگلستان جا کر اس نے مزید حکومتی و افرادی امداد سے معذرت کرتے ہوئے تنہا اپنی ذاتی پینشن کے سہارے لندن سے تیس (۳۰) میل دور ایک بستی کے ایک چھوٹے سے گھر میں اس کام کو جاری رکھا اور پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔
گریرسن کی باریک بیں نگاہوں نے نہ صرف مختلف بولیوں کے مابین ساختیاتی فرق کو جانچا بلکہ ایک ہی بولی کے متعدد لہجوں میں باریک فرق کو بھی عوام کے سامنے بے نقاب کیا۔ مختلف و متعدد زبانوں اور بولیوں کے قواعد معلوم کیے۔ مختلف زبانوں کے مشترکہ الفاظ ڈھونڈ کر ان کا باہمی تعلق دریافت کیا اور تلفظ پوچھ پوچھ کر نوکِ زِ قلم کیا۔ اس سلسلے میں اس نے تیس لاکھ اُنہتر ہزار چار سو ستّر (۳۰،۶۹،۴۷۰) 'سندھی' بولنے والے لوگوں اور ستّر لاکھ بانوے ہزار سات سو اکیاسی (۷۰،۹۲،۷۸۱) 'لہندا' زبان بولنے والے افراد سے ملاقاتیں کیں۔ ہر زبان کے مآخذ معلوم کرنے کے لیے حدود اربعہ متعین کیا۔ زبانوں کو سمجھنے کے لیے تاریخی پس منظر کا مطالعہ کیا اور ہر حملہ آور کی زبان کے الفاظ کے اثر و نفوذ کا تجزیہ کیا۔ ہر بولی اور زبان کے ریکارڈ تیار کیے۔ نقشے اور جدولیں بھی شامل کیں۔ حد یہ کہ بعض ایسی بولیوں کا ذکر بھی کر دیا جسے صرف گنتی کے چند افراد ہی بولتے تھے۔

(۴) 'جائزہ لسانیاتِ ہند' کی لسانی اہمیت سے قطع نظر گریرسن کے اس کارنامے کی اہمیت 'کتابیاتی' نقطۂ نظر سے بھی ہے۔ اس نے اردو زبان کی ساخت، صرف و نحو، لغات اور ادب پر اپنے زمانے کی شائع شدہ کتابوں کی تفصیلی فہرست بھی دے دی ہے۔

گریرسن نے لسانی جائزے کی تکمیل کے بعد بھی لسانی مطالعہ وتحقیق پر کام جاری رکھتے ہوئے اپنے سابقہ اخذ کردہ نتائج میں ترمیم کی۔ 'Linguistic Survey Of India' پر گریرسن کو کئی یونی ورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔ برطانوی حکومت نے ۱۹۲۸ء میں 'آرڈر آف میرٹ' (Order Of Merit) دیا۔[۵۲۱]

۱۸۸۰ء میں ہارنلے اور دیگر اہلِ علم سے متاثر ہو کر گریرسن نے اردو کو ملی جلی زبان بتایا تھا۔ لکھتا ہے:

اردو قواعد اور فرہنگِ الفاظ کے لحاظ سے مخلوط، عام اور مشترک زبان ہے۔ اس میں شامل ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، تیلگو زبان کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کے صرفی نحوی قواعد نے شمالی ہند کی عام بولیوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کسی ایک مخصوص اور معین زبان سے ترقی پا کر بنی ہے۔[۵۲۲]

البتہ ۱۹۰۰ء کے قریب ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ لیتے وقت اردو کی ابتدا کے حوالے اپنے غلط تصور کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی رائے کی اصلاح کی اور اردو کو بالائی دوآبے اور مغربی روہیل کھنڈ کی ہندوستانی پر مبنی قرار دیتے ہوئے لکھا:

It will be noticed that this account of Hindostani and its Origin differs widely from that which has been given hitherto by most authors (including the present writer), which was based on Mir Amman's preface to the 'Bagh o Bahar'. According to him Urdu was a mongrel mixture of the languages of the various tribes who flocked to the Delhi bazar. The explanation given above was first put forward by Sir Charles Lyall in the year 1880, and the Linguistic Survey has showm the entire correctness of his view. Hindostani is simply the vernacular of the Upper Doab and western Rohilkhund, on which a certain amount of literary polish has been bestowed, and from which a few rustic idioms have been excluded.[523]

گریرسن کا یہ فیصلہ سائنسی مطالعے کا نتیجہ ہے اور صحیح ہے۔ پہلا فیصلہ تاثراتی تھا اور غلط تھا۔

تھامس گراہم بیلی (Thomas Grahame Bailey):

برطانوی مستشرق، تھامس گراہم بیلی ۱۸۷۲ء میں انبالہ (موجودہ ہریانہ، بھارت) میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق 'سکاچ مشن' (Scotch Mission) سے تھا۔ وہ سکاٹ لینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس ہندوستان آیا اور یہاں پچیس (۲۵) سال قیام کیا۔ زیادہ تر قیام پنجاب میں رہا۔ پھر 'سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، لندن' میں پروفیسر رہا۔ ۱۹۴۲ء میں انتقال ہوا۔

گراہم بیلی نے اردو سمیت متعدد ہندوستانی زبانیں سیکھیں اور تحقیق و تالیف میں وقت صرف کیا۔ اسے اردو، پنجابی اور ہندی پر پورا عبور حاصل تھا۔ بالخصوص اسے پنجابی زبان کا مستند عالم سمجھا جاتا تھا۔ 'ہندوستانی لسانیات' کی تالیف میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ڈاکٹر گراہم بیلی سے استفادہ کیا۔ 'انگریزی پنجابی لغت'، 'ہمالیہ پہاڑ کی لسانیات'، 'پنجابی صرف و نحو' اور 'تاریخِ ادبِ اردو' (A History of Urdu Literature) گراہم بیلی کی اہم تالیفات ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کی ہم نوائی میں گراہم بیلی نے اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ اس کا مولد لاہور (پنجاب) ہے اور یہ کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے:

> اردو ۱۰۲۷ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی، قدیم پنجابی اس کی ماں ہے اور قدیم کھڑی بولی سوتیلی ماں۔ برج سے براہِ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ مسلمان سپاہیوں نے پنجابی کے اس روپ کو، جو ان دنوں دہلی کی قدیم کھڑی بولی سے زیادہ مختلف نہ تھا، اختیار کیا اور اس میں فارسی الفاظ اور فقرے شامل کر دیے۔[۵۲۴]

گراہم بیلی نے ۱۰۲۷ء کو اردو کے آغاز کا سنہ قرار دیا ہے جب کہ کسی اور نے اردو کو مسلمانوں کی فتح دہلی سے پہلے قیاس ہی نہیں کیا۔ اردو کی ابتدا کے حوالے سے اسی نقطۂ نظر کی وضاحت گراہم بیلی نے بعد ازاں اپنی تصنیف 'تاریخِ ادبِ اردو' میں اِن الفاظ میں کی:

> The basis of that language was Punjabi as it emerged from the Prakrit stage, and it cannot have differed from the Khari of that time nearly as much as the two languages differ today. The important fact is that Urdu really began not in Delhi but in Lahore, and that its underlying language was not Khari (much less Braj, as often stated), but old Punjabi.[525]

درج بالا بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ گراہم بیلی نے صریحاً اردو کو قدیم پنجابی سے پیدا کیا۔ شیرانی نے اِس میں برج بھاشا کی آمیزش کی تھی جب کہ گراہم بیلی نے کھڑی بولی کی اہمیت پر زور دیا۔ شیرانی کی طرح گراہم بیلی بھی بیانات میں تضاد کا شکار ہوتے ہوئے اردو کو اوّل لاہور میں پیدا کرتا ہے اور پھر دہلی میں[۵۲۶]۔ پنجاب میں اردو کی ولادت کے نظریے کو حافظ محمود شیرانی نے زیادہ وضاحت اور اضافوں کے ساتھ اپنی تصنیف 'پنجاب میں اردو' میں پیش کیا ہے۔ اِس نظریے کی صحت یا عدمِ صحت کا تفصیلی جائزہ باب چہارم میں لیا جائے گا۔[۵۲۷]

گراہم بیلی کی تصنیف 'تاریخِ ادبِ اردو' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ سو (۱۰۰) صفحات پر مشتمل باب اوّل اہم ہے، جس کے ابتدائی آٹھ صفحات میں اردو زبان کی ابتدا، اردو کے مختلف ابتدائی ناموں اور دیگر زبانوں میں اردو کی حیثیت کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔[۵۲۸]

گراہم بیلی نے 'کھری' اور 'کھڑی' کے تلفظ کے حوالے سے انگریز مستشرقین کے مغالطے کو دور کرتے ہوئے 'کھڑی بولی' کو ایک خاص زبان قرار دیا ہے، جس کی دو شاخیں، اردو اور ہندی بتائی ہیں۔ اُس کے مطابق:

> As I have explained in the *Journal of the Royal Asiatic Society*, October 1926, pp.717-23, the word *khari,* feminine of *khara*, means standing, and *khari boli* means the standard, current or established language.[529]

گراہم بیلی کا یہ بیان درست نہیں۔ 'کھڑی' ایک بولی ہے، باقاعدہ زبان نہیں[۵۳۰]۔ گراہم کی 'تاریخِ ادبِ اردو' کا ترجمہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تلخیص و اضافے کے ساتھ 'ادارہ ادبیاتِ اردو' کی طرف سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔[۵۳۱]

ژول بلاک (Jules Bloch):

فرانسیسی مستشرق، جیولز بلاک (۱۸۸۰ء۔۱۹۵۳ء) ہندوستانی زبانوں اوراُن کے تہذیبی پس منظر کے مطالعے میں خصوصی دل چسپی رکھتا تھا۔اردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے اپنے ایک مضمون بہ عنوان 'ہندآریائی لسانیات کے بعض مسائل' میں لکھتا ہے:

اِس میں شک نہیں کہ پنجاب پہلا صوبہ ہے جو مسلمانوں کے زیرِ اقتدار آیا اور عرصے تک رہا۔ اِس لیے پنجابی اور اردو کی مماثلت یاد رکھیے، لیکن یہ اِس قیاس کے مانع نہیں کہ ہندی لشکروں کے جو لوگ پہلے پہل اپنی زبان کو دکن لے گئے، پنجاب سے متعلق تھے بلکہ مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ اور شمالی دوآبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مغربی رہیل کھنڈ کے متعلق میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اِن اضلاع کی اردو نما زبان شاید بعد کے اثرات کی پیداوار ہے۔۔۔لہٰذا میرے خیال میں مشرقی پنجاب کے اضلاع کی زبان لشکریوں کے ذریعے دکن تک پہنچتی ہے جس نے مرورِ ایام سے شستہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔[۵۳۲]

ژول بلاک کے مزکورہ اشارات سے اردو مین لسانی تحقیق کا ایک نیا باب کھُل جاتا ہے۔ جہاں تک ہریانی کی طرف اشارے کا سوال ہے تو اِس میں جزوی صداقت ضرور پائی جاتی ہے قدیم اردو کا پنجابی پن (جیسا کہ دکنی مخطوطات سے ظاہر ہے) اِس کا ہریانی پن بھی ہے۔لیکن دکنی زبان کی یہ صوتیاتی اور تشکیلیاتی خصوصیات صرف ہریانی ہی سے مخصوص نہیں بلکہ جمنا پار کی کھڑی بولی کے علاقے میں بھی یہی خصوصیات دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے خیال میں ''ژول بلاک دراصل ہریانی بولیوں کی تقسیم کے سماجی ولسانیاتی عوامل اوراُن لسانیاتی خصوصیات سے بے خبر تھا جو جاٹوں اور گوجروں کے ساتھ جداگانہ طور پر مخصوص ہیں۔''[۵۳۳]

گویا ژول بلاک نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں کو یک سر نظر انداز کر کے اردو/ہندی کی ابتدا کے حوالے سے صرف ہریانی زبان کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔

اوتاکر پارتولد (Otakar Partold):

چیک مستشرق، اوتاکر پارتولد (سنہ پیدائش۔۱۸۸۴ء) ۱۹۱۹ء میں جمہوریہ چیکوسلوواکیہ کے پہلے قونصل جنرل کی حیثیت سے تین سال تک بمبئی (ممبئی) میں قیام پذیر رہا اور متعدد ہندوستانی زبانیں سیکھیں۔اردو زبان سے اوتاکر پارتولد کی دل چسپی پہلی جنگِ عظیم سے قبل پیدا ہوئی۔۱۹۲۳ء میں وطن واپسی پر اس نے 'ماسرک انسٹی ٹیوٹ' (Masaryk Institute) میں اور بعد ازاں ۱۹۲۷ء میں اردو/ہندوستانی کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

اردو لسانیات پر اوتاکر پارتولد کی کتاب 'مبادی ہندوستانی' (Ucebnic Hindustani) ۱۹۳۱ء میں پراگ سے شائع ہوئی۔کتاب میں دیوناگری پر مختصر مقدمہ اور نو (۹) اسباق اردو کے شامل ہیں۔ چوبیس (۲۴) اسباق رومن رسم الخط میں ہیں۔اردو زبان کی تدریس کے ضمن میں یہ کتاب نہ صرف چیکوسلوواکیہ بلکہ دیگر ممالک میں بھی مستعمل ہے۔[۵۳۴]

۱۴۹۰ء سے ۱۹۴۷ء کو محیط اردو زبان وادب کے حوالے سے مستشرقین کی لسانی وادبی تحقیقات کا پانچ سو سالہ طویل دور کئی لحاظ سے نا قابلِ فراموش ہے۔ اردو کی لسانی تاریخ، اردو لغت، اردو قواعد اور دیگر ادبی تخلیقات میں جو معیار اِن مستشرق علما نے قائم کیا وہ آج بھی کسی نہ کسی صورت اور کسی نہ کسی قدر موجودہ محققین و ماہرین کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اگر چہ یہ امر صداقت سے خالی نہیں کہ اردو زبان وادب میں مستشرقین کی دل چسپی متعدد سیاسی، تجارتی اور حکومتی مقاصد کی بنا پر ہوئی۔اِس حوالے سے ناقدین مدلّل بحثیں چھیڑ چکے ہیں جن کا سلسلہ گاہے بہ گاہے آج بھی جاری ہے، مگر بہ ہر حال اس سارے منظر نامے میں اردو زبان وادب کی آبیاری اور ترقی وترویج کے ضمن میں مستشرقین کی محققانہ وعالمانہ کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی

۱۔ مرزا خلیل احمد بیگ کی مرتبہ کتاب، 'اردو زبان کی تاریخ' میں شامل مقالے، بہ عنوان 'دکنی زبان' کے مصنف عبدالقادر سروری صفحہ ۱۷۷ پر لکھتے ہیں:

بارھویں صدی کے آخر میں شمال سے فوجوں کی آمد کے ساتھ ہند آریائی کی ایک بولی نہیں بلکہ ایک سے زیادہ بولیاں دکن پہنچی تھیں۔ اس کا اندازہ ہم کو ادبی دکنی قواعد کے روپ اور خاص طور پر ضمیروں اور افعال کی شکلوں کے تنوع سے ہوتا ہے۔

۲۔ نصیرالدین ہاشمی: دکن میں اردو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (طبع سوم۔ ۲۰۱۱ء)، ص ۳۷۔

۳۔ عبدالقادر سروری: 'دکنی زبان'، مشمولہ، اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ): مرزا خلیل احمد بیگ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۰۷ء)، ص ۱۷۷۔

۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: en.wikipedia.org|wiki|Orient

5. *The Oxford English Dictionary*,vol.III(N-Poy), Oxford: Clarendon press, (1933), p.200.

6. *The New Lexicon Webster's Dictionary Of The English Language*, New York: Lexicon Publishers, (1978), p.707.

۷۔ ثریا حسین، پروفیسر: گارسیں دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، (۱۹۸۴ء)، ص ۱۷۔

8. The New Lexicon Webster's Dictionary Of The English Language, p.707.

۹۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: 'An Inroduction To Edward Said's Orientalism'
Renaissance.com.pk|FebBoRe2y6.htm

10. Said, Edward W.: *Orientalism*, London: Penguin Books , (1995), pp.1-2.

۱۱۔ شرق شناسی، ص ۲ تا ۳۔

۱۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: 'An Inroduction To Edward Said's Orientalism'
Renaissance.com.pk|FebBoRe2y6.htm

۱۳۔ 'نوآبادیات' کو انگریزی زبان میں 'Colonialism' کہتے ہیں۔ اس اصطلاح کا اوّلین استعمال رومیوں کے ہاں ملتا ہے۔ مقبوضہ علاقوں میں اپنے اقتدار کے استحکام کی غرض سے رومی اپنی نوآبادیاں قائم کر لیتے تھے۔ نوآبادیاتی نظام کا رواج اُن تمام امپیریل طاقتوں میں رہا جو غیر علاقوں کو اپنے تسلط میں کرتی تھیں۔

14. Orientalism, p.6.

۱۵۔ شرق شناسی، ص ۲۔

۱۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: en.wikipedia.org|wiki|Indology

۱۷۔ شرق شناسی، ص ۴۔

۱۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: en.wikipedia.org|wiki|Manuel-I-of-Portugal

۱۹۔ ’تاریخِ ہندوستان‘ کے صفحہ ۱۱ پر درج منشی ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق پرتگالی بادشاہ، جان دوّم (John II) نے بارتھولومیو دائز کو تین جہازوں کا بیڑا دے کر حکم دیا کہ ساحلِ افریقہ کی غایت سمندر میں جنوبی حد تک جائے۔ سمندری طوفان کے گھیراؤ اور رکاوٹ کے باوجود یہ بیڑا بالآخر ۱۴۸۶ء میں ساحلِ مالابار پر لنگر انداز ہوا۔ اسی سبب بارتھو لومیو نے اس ساحل کا نام ’راس طوفان‘ (Cape Of Row Storm) رکھا۔ مگر بادشاہ جان دُوُم کو اس راس سے ہندوستان کے ملنے کی بڑی آس تھی، اس لیے اس کا نام ’راس امید‘ (Cape Of Good Hope) رکھ دیا گیا۔

۲۰۔ ’زیمورن‘ کو فارسی میں ’سامری‘ کہتے ہیں۔

۲۱۔ ذکاء اللہ، منشی محمد: تاریخِ ہندوستان، جلد اوّل (حصہ سوّم)، دہلی: مطبع مرتضوی، (۱۸۷۹ء)، ص ۱۵ تا ۱۶۔

۲۲۔ تاریخِ ہندوستان، جلد اوّل (حصہ سوّم)، ص ۳۸ تا ۳۹۔

23. R.C.Majumdar, H.C.Raychaudhuri, Kalikinkar Datta: *An Advanced History Of India (vol.II)*, Lahore: Aziz Publishers, (1980), p.632.

۲۴۔ موجودہ ریاست ’سری لنکا‘ کے قدیم ناموں میں سے ایک ’سنگل دیپ‘ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

Names Of Sri Lanka

en.wikipedia.org|wiki|Names_of_Sri_Lanka

۲۵۔ باری علیگ: کمپنی کی حکومت، لاہور: طیب پبلی شرز، (۲۰۰۶ء)، ص ۲۳۔

۲۶۔ زکریا، ڈاکٹر خواجہ محمد: اکبرالہٰ آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۲۰۰۳ء)، ص ۴۶۔

۲۷۔ کمپنی کی حکومت، ص ۲۳۔

28. An Advanced History Of India (vol-II), p.632.

۲۹۔ رضیہ نور محمد، ڈاکٹر مس: اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، (۱۹۸۵ء)، ص ۱۳۔

30. Burke, S. M., Salim-Al-Din Quraishi: *The British Raj In India (An Historical Review),* Karachi: Oxford University Press, (2ooo), p.4.

۳۱۔ امداد صابری: فرنگیوں کا جال، دہلی: امداد صابری پبلی شرز، (۱۹۴۹ء)، ص ۴۸۔

۳۲۔ کمپنی کی حکومت، ص ۲۳۔

۳۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: 'Dutch East India Company, History'

www.sahistory.org.za|topic|dutch-east-india-company-deicvoc

۳۴۔ 'Chinsurah' کو 'Chuchura' بھی کہا جاتا ہے۔ ’ہگلی چاچڑا‘ یا ’ہگلی چن شُورا‘ جنوبی بنگال (انڈیا) میں واقع ایک ریاست کا نام ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: en.wikipedia.org|wiki|Hooghly-(town)

35. Spear, Percival: *A History Of India (vol-II)*, New York: Penguin Books, (1990), p.65.

36. Dodwell H. H.: *The Cambridge History Of India, (Vol.V)*, London, (1922), p.58.

۳۷۔ اکبرالہٰ آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، ص ۴۸۔

38. Yule, Henry and Burnell, Arthur: *Hobson Jobson (A Glossary Of Colloquia Anglo-Indian Words and Phrases)*, New Delhi,

Munshiram Manoharlal Publishers, (1986), p.722.

Pondicherry: This name of what is now the chief French settelment in India, is Pudu-Ch'cheri, or Puthucceri, 'New Town', more recently Pudu-Vai, Puthu Vai, meaning 'New Place'. C. P. Brown, however, says it is Pudi-Cheru, 'New Tank'. The natives sometimes write it Phul-Cheri.

39. The British Raj In India, p.7.

۴۰۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند: اردو ادب (جلد ہفتم)، مدیرِ خصوصی سیّد وقار عظیم، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، (طبعِ اوّل۔۱۹۷۱ء)، ص ۱ تا ۱۲۔

۴۱۔ تاریخ ہندوستان، جلد اوّل (حصہ سوّم)، ص ۱۶۴۔

۴۲۔ تاریخ ہندوستان، جلد اوّل (حصہ سوّم)، ص ۱۷۰ تا ۱۷۱۔

۴۳۔ اسے انگریزی زبان میں عام طور پر 'Trichinopoly' (ترچناپلی) کہا جاتا ہے۔

44. The British Raj In India, p.8.

۴۵۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۵ تا ۱۶۔

۴۶۔ اکبر الٰہ آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، ص ۴۸۔

۴۷۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۶۔

۴۸۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۱۳، ۱۷۰۔

۴۹۔ اکبر الٰہ آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، ص ۴۸۔

۵۰۔ مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، لاہور: فکشن ہاؤس، (۲۰۰۷ء)، ص ۱۴۔

۵۱۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۳۴۔

۵۲۔ ہندوستان (تاریخی خاکہ)، ص ۶۳۔

۵۳۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۴۔

۵۴۔ اکبر الٰہ آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، ص ۱۰۰۔

۵۵۔ برطانوی ہندوستان، ص ۱۶۔

۵۶۔ اکبر الٰہ آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، ص ۴۹۔

57. Kasturi, N.: *History Of The British Occupation Of India*, Calcutta: R. Chatterjee, (1920), pp.4-10.

۵۸۔ ہندوستان (تاریخی خاکہ)، ص ۶۳۔

59. History Of The British Occupation Of India, p.6.

۶۰۔ ہندوستان (تاریخی خاکہ)، ص ۶۴ تا ۶۵۔

61. Valerie Berinstain: *India and Mughal Dynasty*, New York: Abrams Harry N., (1998), p.123.

۶۲۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۸ تا ۲۹۔

۶۳۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۳۰ تا ۳۹۔

64. Mukherjee S. N. , Sir William Jones: *A study in Eighteenth Century British Attitudes to India*, Cambridge: Cambridge University Press, (1968), pp.16,81.

65. The British Raj In India, p.14.

۶۶۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۴۲ تا ۴۴۔

۶۷۔ برطانوی ہندوستان، ص ۴۳۔

۶۸۔ کمپنی کی حکومت، ص ۱۶۳۔

۶۹۔ 'برطانوی ہندوستان' کے صفحہ نمبر ۴۶ پر درج ہے کہ ہندوستانی استاد جو نوجوان انگریز طلبا یا ملازمین کو مقامی زبانیں پڑھاتے تھے، انھیں استاد کے بہ جائے 'منشی' کہا جاتا تھا۔ انگریز طلبا منشیوں کی عزت نہیں کرتے تھے۔ وہ منشی سے توقع کرتے تھے کہ وہ انھیں سلام کرے اور انھیں دیکھ کر بہ طور ادب کھڑا ہو جائے۔

۷۰۔ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند: اردو ادب (جلد سوّم)، مدیرِ عمومی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، (طبعِ دوّم۔ ۲۰۱۰ء)، ص ۴۶۔

۷۱۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،

72. Bhattcharjee, Arun: A History Of Modern India (1707-1947), New Delhi: Ashish Publishing House, (1988), p.78.

۷۳۔ 'دی برٹش راج اِن انڈیا' میں صفحہ نمبر ۲۰ پر درج بیان کے مطابق لارڈ ہیسٹنگز پہلے 'Lord Of Moira' کہلاتا تھا۔

۷۴۔ ہندوستان (تاریخی خاکہ)، ص ۱۷۴۔

۷۵۔ جہاں 'دہلی کالج' قائم ہوا وہاں عرصہ دراز سے ایک تعلیمی درس گاہ، 'مدرسہ غازی الدین خان' کے نام سے موجود تھی۔ ۱۸۲۳ء کے اواخر میں 'مجلسِ تعلیمِ عامہ' (General Committee of Public Instruction) نے تجویز پیش کی کہ کالج فوراً قائم کر دیا جائے اور تعلیم کے لیے مولویوں کا تقرر کیا جائے۔

۷۶۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۱۵۔

۷۷۔ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند: اردو ادب (جلد سوّم)، مدیرِ عمومی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ص ۶۹۔

78. Green Berger, Allen J.: *The British Image Of India (A study in the literature of Imperialism) 1880-1960*, The University Of Michigan: Oxford U.P., (1969), p.5.

۷۹۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۴۵۔

۸۰۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۱۸۔

81. Vivek Srinivasan: *Macaulay's Minute On India Education,* (2008), Retrieved on June 15, 2013, from:

'viveks.info|macaulays-minute-on-indian-education'

82. Cutts, Elmer H.: *The Back Ground Of Macaulay's Minute*, (1953), Retrieved 0n June 15, 2013, from www.jstor.org

83. Thirumalai, M.S. Ph.D: *Lord Macaulay:The man who startd it all, and his minute*, Reterieved on June 15, 2013, from:

'www.languageinindia.com|april2003|macaulay.html'

۸۴۔ ہندوستان (تاریخی خاکہ)،ص۱۹۶۔

۸۵۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (مدیرِ عمومی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) اردو ادب (جلد سوّم)،ص۷۱۔

۸۶۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،ص۱۲۴ تا ۱۲۵۔

۸۷۔ ہندوستان (تاریخی خاکہ)،ص۲۰۲۔

۸۸۔ برطانوی ہندوستان،ص۴۰۔

۸۹۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،ص۱۵۷۔

۹۰۔ برطانوی ہندوستان،ص۷۰۔

۹۱۔ برطانوی ہندوستان،ص۷۱۔

۹۲۔ ڈکشنری : انگریزی زبان میں لغت کے لیے لفظ 'ڈکشنری' مستعمل ہے۔ اس کا ماخذ اطالوی لفظ 'Dictionorious' ہے جس کے معنی الفاظ کے مجموعے کے ہیں۔ یونانی زبان میں لغت کے لیے لفظ 'Lexicon' موجود ہے۔ جس سے مراد ہے : کسی شخص ،زبان یا علم کی کسی شاخ کا ذخیرۂ الفاظ ۔ جب کہ 'Glossary' یعنی مختصر فرہنگ کا ماخذ یونانی لفظ 'Glossa' بہ معنی زبان یا لسان ہے۔

۹۳۔ اجمل خان، محمد: 'نفائس اللغات: مصنفہ اوحدالدین بلگرامی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ): ڈاکٹر رؤف پاریکھ، اسلام آباد :مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۱۰ء)،ص۲۸۳۔

۹۴۔ 'ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلزے'، مطبوعہ ۱۹۷۷ء، کے مقدمے میں صفحہ ۳ پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اردو/ہندوستانی کے قدیم ترین لغت نویس کے ضمن میں فرانسیسی مستشرق، جروم زاویر (Jerome Xavier) کا نام 'جرونیموز اویر' درج کیا ہے۔

'Wikipedia Free Encyclopedia' کی ویب سائٹ: 'en.wikipedia.org' پر دی جانے والی معلومات کے مطابق زیرِ بحث مستشرق کا پیدائشی نام دراصل، جرونیمو داز پیلیٹا گونی (Jeronimo De Ezpeleta Goni) تھا، البتہ یہ اپنی عملی زندگی میں 'جروم زاویر' کے نام سے جانے گئے۔

۹۵۔ نذیر آزاد: 'اردو لغت نگاری: مستشرقین کا حصہ'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص۲۵۳۔

۹۶۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلزے (مرتبہ)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۷۷ء)،ص۳۔

۹۷۔ نذیر آزاد: 'اردو لغت نگاری: مستشرقین کا حصہ'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص۲۵۳۔

۹۸۔ عطش درّانی، ڈاکٹر: اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۱۹۸۷ء)،ص۱۹۔

۹۹۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،ص۱۶۔

100. Grierson, George Abraham: *Linguistic Survey of India,Vol.ix (Part 1)*, Calcutta,(1916),pp.3_4.

۱۰۱۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص۹۷۔

102. Linguistic Survey Of India, Vol.ix (Part 1), p.4.

۱۰۳۔ 'اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم' کے صفحہ ۲۰ پر ڈاکٹر عطش درّانی کے بیان کے مطابق انکتیل دوپروں نے مسوّدہ ۱۷۸۱ء میں حاصل کیا۔

۱۰۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے : 'The Earliest Hindustani Grammar'

bc.library.uu.nl|node|180

105. Linguistic Survey Of India, Vol.ix (Part 1), p.7.

۱۰۶۔ ’لنگوئسٹک سروے آف انڈیا‘ کے صفحہ ۶ پر گریرسن نے ’کیٹلر‘ کے املا Ketelaer, کو ترجیحاً درج کرتے ہوئے اس کی مزید تین املائی صورتیں بتائی ہیں جو یہ ہیں: Kotelar, Kessler, Kettler۔ نیشنل آرکائیوز، ہیگ میں موجود کیٹلر کی قواعد کے نسخے کے سرورق پر "Ketelaar" درج ہے، اسی سبب مقالے میں املا کی یہی صورت اختیار کی جائے گی۔

۱۰۷۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: قواعدِ اردو، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۲۰۰۹ء)، ص ۲۱۔

۱۰۸۔ ’گل کرسٹ اور اس کا عہد‘ کے صفحہ ۱۵ پر مؤلف، محمد عتیق صدیقی نے شُلز کے رسالے کا سالِ اشاعت ۱۷۴۵ء درج کیا ہے۔ جب کہ قواعدِ اردو کے صفحہ ۲۰ پر مولوی عبدالحق نے اسی رسالے کو ۱۷۴۴ء کی تالیف بتایا ہے۔ اسی سلسلے کی تیسری تحقیق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی ہے جو بعض حقائق کی بنا پر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ’ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز‘ کے صفحہ ۶ پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بیان کے مطابق شُلز کا یہ رسالہ ۱۷۴۱ء میں مدراس میں مکمل ہوا اور ۱۷۴۵ء میں ہال سیکسنی سے شائع ہوا۔

109. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.8.

110. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.8.

۱۱۱۔ حامد حسن قادری: داستانِ تاریخِ اردو، کراچی: اردو اکیڈمی، (۱۹۸۸ء)، ص ۸۳۔

112. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.9.

۱۱۳۔ آغا افتخار حسین: یورپ میں اردو، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، (۱۹۶۸ء)، ص ۲۱۔

114. Bhatia, Tej. K.: *A History Of The Hindi Grammatical Tradition: Hindi-Hindustani Grammar, Grammarians, History and Problems,* Leiden: E. J. Brill, (1987), pp. 58-59.

۱۱۵۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: ’اردو لغات اور لغت نویسی‘ مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۹۷۔

۱۱۶۔ عتیق صدیقی: گل کرسٹ اور اس کا عہد، دہلی: انجمنِ ترقیِ اردو ہند، (۱۹۷۹ء)، ص ۱۷۔

۱۱۷۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز (مرتبہ)، ص ۴۔

118. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.12.

۱۱۹۔ آغا افتخار حسین: یورپ میں تحقیقی مطالعے، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۶۷ء)، ص ۳۶۔

۱۲۰۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: ’اردو لغات اور لغت نویسی‘ مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۰۔

۱۲۱۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۵۳۔

۱۲۲۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۳۰۱۔

۱۲۳۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۶۶ تا ۶۷۔

۱۲۴۔ میر بہادر علی حسینی (مؤلف)، خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتب): قواعدِ زبانِ اردو، مشہور بہ رسالۂ گل کرسٹ، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۲۰۰۸ء)، ص ۳۰۔

۱۲۵۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: ’اردو لغات اور لغت نویسی‘ مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، کے صفحہ ۹۸ پر ڈکشنری کا سالِ تالیف ۱۷۸۷ء درج ہے۔

۱۲۶۔ ابو سلمان شاہ جہان پوری، ڈاکٹر: کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۶ء) کے صفحہ ۵۶ پر درج معلومات کے مطابق گل کرسٹ کی ڈکشنری کی تالیف ۱۷۸۷ء تا ۱۷۹۶ء کو محیط ہے۔ ’لنگوئسٹک سروے آف انڈیا‘ کے صفحہ ۱۷ پر اسی ڈکشنری کے آغازِ تالیف اور سالِ تکمیل کے ضمن میں گریرسن نے بالترتیب ۱۷۸۷ء اور ۱۷۹۶ء درج کیا ہے۔

۱۲۷۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۹۶۔

۱۲۸۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۲۶۔

۱۲۹۔ گل کرسٹ اوراس کا عہد،ص ۶۸۔

۱۳۰۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۹۸۔

۱۳۱۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۵۶۔

۱۳۲۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص ۹۶۔

۱۳۳۔ گل کرسٹ اوراس کا عہد،ص ۶۹ تا ۷۰۔

۱۳۴۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۹۸۔

۱۳۵۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر: لغوی مباحث، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۲۰۱۵ء)، ص ۲۵۔

۱۳۶۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سیّد: یورپ میں اردو کے مراکز (انیسویں صدی میں)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۸۴ء)، ص ۱۶۔

۱۳۷۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص ۸۳۔

۱۳۸۔ 'اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم' کے صفحہ ۴۹ پر ڈاکٹر عطش درّانی نے اس تالیف کا سالِ اشاعت ۱۷۹۴ء درج کیا ہے۔

۱۳۹۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۹۹۔

۱۴۰۔ 'کتابیاتِ لغاتِ اردو' کے صفحہ ۵۷ پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے 'The Appendix' کا سنہ اشاعت ۱۷۹۷ء درج کیا ہے۔

۱۴۱۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص ۸۵۔

۱۴۲۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے مقالے 'اردو لغات اور لغت نویسی' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ) کے صفحہ ۹۹ پر 'مشرقی زبان دان کا سالِ طباعت ۱۷۹۹ء تحریر کیا ہے۔

143. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.17.

۱۴۴۔ 'گل کرسٹ اوراس کا عہد' کے صفحہ ۱۵۹ پر ڈاکٹر عتیق صدیقی نے 'Anti Jargonist' کا سالِ اشاعت ۱۸۰۱ء درج کیا ہے۔

145. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.17.

۱۴۶۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۹۹۔

۱۴۷۔ 'قواعدِ زبانِ اردو، مشہور بہ رسالۂ گل کرسٹ' کے صفحہ ۳۱ پر 'معلمِ ہندوستانی' کا سالِ اشاعتِ سوم ۱۸۳۰ء درج ہے۔

۱۴۸۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۹۹۔

149. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.17.

۱۵۰۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۹۹ تا ۱۰۰۔

151. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), pp.17_27.

۱۵۲۔ گل کرسٹ اوراس کا عہد،ص ۱۹۔

۱۵۳۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)، ص ۱۰۔

۱۵۴۔ 'رسالۂ گل کرسٹ سے قدیم تر لغات وقواعدِ زبانِ اردو کی کتابیں' خلیل الرحمٰن داؤدی، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۵۷۔

۱۵۵۔ مسعود ہاشمی، ڈاکٹر: اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، دہلی: ترقی اردو بیورو، (۱۹۹۲ء)، ص ۵۷۔

۱۵۶۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم،ص ۲۳۔

۱۵۷۔ گل کرسٹ اوراس کا عہد،ص ۱۹۔

۱۵۸۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم،ص ۲۳ تا ۲۴۔

۱۵۹۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم،ص ۲۷۔

160. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.18.

161. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.18.

۱۶۲۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۲۷ تا ۲۸۔

۱۶۳۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۲۸۔

164. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.18.

۱۶۵۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۰۷۔

۱۶۶۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۷۔

167. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.19.

۱۶۸۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۷۔

۱۶۹۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۲۸۔

۱۷۰۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۲۹۔

۱۷۱۔ وارث سرہندی: کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد سوم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۷ء) کے صفحہ ۱۵ پر اس لغت کے دوسرے ایڈیشن کا سالِ اشاعت ۱۸۳۰ء رقم ہے۔

۱۷۲۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۲۹۔

۱۷۳۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۱ تا ۱۰۲۔

۱۷۴۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۲۹۔

۱۷۵۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۴۳۔

۱۷۶۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۴۳۔

177. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.20.

۱۷۸۔ یورپ میں اردو، ص ۸۳۔

179. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.19.

۱۸۰۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۶۴۔

۱۸۱۔ قواعدِ اردو، ص ۲۵۔

۱۸۲۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۲۵، ۱۶۴۔

۱۸۳۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۵۹۔

۱۸۴۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۵۳۔

۱۸۵۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۱۰۔

186. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.19.

۱۸۷۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۳۷۔

۱۸۸۔ ڈنکن فاربس: ڈکشنری؛ (دیباچہ) حصہ اوّل: ہندوستانی/انگریزی۔ حصہ دوّم: انگریزی/ہندوستانی، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، (۱۹۸۷ء)، ص ۳۔

۱۸۹۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۳۰۔

۱۹۰۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۲۔

۱۹۱۔ 'کتابیاتِ لغاتِ اردو' کے صفحہ ۸۹ پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے لغت کا سنہ اشاعت ۱۸۲۵ء درج کیا ہے۔

۱۹۲۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۲۔

193. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.20.

۱۹۴۔ اردو زبان اور یورپی اہل قلم، ص ۳۰۔

۱۹۵۔ یورپ میں اردو، ص ۹۰۔

196. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.20.

۱۹۷۔ 'اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ' کے صفحہ ۱۲۸ پر ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد نے لغت کا سنہ اشاعت ۱۸۴۵ء درج کیا ہے۔

۱۹۸۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۸۔

۱۹۹۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۳۰۔

۲۰۰۔ یورپ میں اردو، ص ۷۵۔

۲۰۱۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۲۸۔

۲۰۲۔ وارث سرہندی: کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد ہفتم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۵ء)، ص ۱۱۔

۲۰۳۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۵۲۔

۲۰۴۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، 'اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث' (مرتبہ)، ص ۱۰۳۔

۲۰۵۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۲۸۔

۲۰۶۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۵۲۔

۲۰۷۔ اردو زبان اور یورپی اہل قلم، ص ۳۲۔

۲۰۸۔ 'لینگوئسٹک سروے آف انڈیا' کے صفحہ ۲۱ پر گریرسن نے فاربس کے لغت کا سالِ اشاعت ۱۸۶۲ء درج کیا ہے۔

۲۰۹۔ یورپ میں اردو، ص ۷۵۔

۲۱۰۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۲۔

۲۱۱۔ یورپ میں اردو، ص ۶۶ تا ۶۷۔

۲۱۲۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۳۹۔

213. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.21.

214. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.21.

215. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.21.

۲۱۶۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۸۔

۲۱۷۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۸۔

۲۱۸۔ اردو زبان اور یورپی اہل قلم، ص ۳۳۔

۲۱۹۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۳۹۔

۲۲۰۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۸۷۔

۲۲۱۔ شان الحق حقی (حواشی و تعلیقات)، وارث سرہندی (مبصر): کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دُوّم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۶ء) کے صفحہ ۲ پر لغت کا سالِ اشاعت ۱۸۵۷ء درج ہے۔

222. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.21.

۲۲۳۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص ۱۳۷۔

۲۲۴۔ اردو زبان اور یورپی اہل قلم،ص ۳۴۔

225. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.22.

۲۲۶۔ مولوی عبدالحق،ڈاکٹر:'اردو لغات اور لغت نویسی'،مشمولہ،اردو لغت نویسی: تاریخ،مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص ۱۰۹ تا ۱۱۰۔

۲۲۷۔ اردو زبان اور یورپی اہل قلم،ص ۳۴۔

۲۲۸۔ اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ،ص ۶۰۔

۲۲۹۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)،ص ۵۴۔

۲۳۰۔ کتبِ لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد دُوّم): شان الحق حقی (حواشی وتعلیقات)،وارث سرہندی (مبصر)،ص ۷۱۔

۲۳۱۔ کتبِ لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد دُوّم): شان الحق حقی (حواشی وتعلیقات)،وارث سرہندی (مبصر)،ص ۲۔

۲۳۲۔ اردو زبان اور یورپی اہل قلم،ص ۳۵ تا ۳۶۔

233. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.22.

۲۳۴۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)،ص ۵۵ تا ۵۶۔

۲۳۵۔ مولوی عبدالحق،ڈاکٹر:'اردو لغات اور لغت نویسی'،مشمولہ،اردو لغت نویسی: تاریخ،مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص ۱۰۹۔

۲۳۶۔ مولوی عبدالحق،ڈاکٹر:'اردو لغات اور لغت نویسی'،مشمولہ،اردو لغت نویسی: تاریخ،مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص ۱۰۶۔

237. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.22.

۲۳۸۔ مولوی عبدالحق،ڈاکٹر:'اردو لغات اور لغت نویسی'،مشمولہ،اردو لغت نویسی: تاریخ،مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص ۱۰۹۔

۲۳۹۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے 'کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)' کے صفحہ ۵۷ پر اور گریرسن نے 'لینگوئسٹک سروے آف انڈیا' کے صفحہ ۲۲ پر ڈکشنری کا سالِ اشاعت ۱۸۶۱ء لکھا ہے۔

۲۴۰۔ مولوی عبدالحق،ڈاکٹر:'اردو لغات اور لغت نویسی'،مشمولہ،اردو لغت نویسی: تاریخ،مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص ۱۱۰۔

241. Linguistic Survey 0f India, Vol.ix (Part 1), p.22.

۲۴۲۔ یورپ میں اردو،ص ۵۰ تا ۵۸۔

243. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.22.

244. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.22.

۲۴۵۔ یورپ میں اردو،ص ۶۵۔

246. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.23.

247. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.23.

۲۴۸۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)،ص ۴۰۔

۲۴۹۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص ۲۴۹۔

۲۵۰۔ مولوی عبدالحق،ڈاکٹر:'اردو لغات اور لغت نویسی،مشمولہ،اردو لغت نویسی: تاریخ،مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص ۱۰۳۔

۲۵۱۔ اردو زبان اور یورپی اہل قلم،ص ۳۹۔

۲۵۲۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)،ص ۴۰۔

۲۵۳۔ مولوی عبدالحق،ڈاکٹر:'اردو لغات اور لغت نویسی'،مشمولہ: اردو لغت نویسی: تاریخ،مسائل اور مباحث (مرتبہ)،ص ۱۰۴۔

254. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.24

۲۵۵۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۴۵۔

۲۵۶۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۴۔

۲۵۷۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۴۰۔

۲۵۸۔ 'لینگوئسٹک سروے آف انڈیا' کے صفحہ ۲۴ پر گریرسن نے لغت کا سالِ اشاعت ۱۸۹۵ء اور مقامِ اشاعت لندن درج کیا ہے۔

۲۵۹۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۴۱ تا ۴۲۔

260. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.24.

۲۶۱۔ یورپ میں اردو، ص ۷۷۔

262. Buckland, Charles Edward: Dictionary Of Indian Biography, London: Swan Sonnenschein(1906), p.337.

۲۶۳۔ حنیف کیفی: 'اردو کی ذولسانی لغات ۔۔ ایک جائزہ' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۲۷۵۔

۲۶۴۔ وارث سرہندی (حواشی وتعلیقات)، جابر علی سیّد (جائزہ): کتبِ لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد اوّل)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۴ء)، ص ۷۔

۲۶۵۔ اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، ص ۶۰ تا ۶۴۔

۲۶۶۔ حنیف کیفی: 'اردو کی ذولسانی لغات ۔۔ ایک جائزہ' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۲۷۶ تا ۲۷۷۔

۲۶۷۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۴۰۔

۲۶۸۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی' مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۱۰۹۔

۲۶۹۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۴۱۔

۲۷۰۔ یورپ میں اردو، ص ۶۵۔

271. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

۲۷۲۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص ۲۴۶

۲۷۳۔ یورپ میں اردو، ص ۶۷۔

274. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

275. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

۲۷۶۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص ۲۵۰۔

۲۷۷۔ پروفیسر ایس کے حسینی کے مقالے، 'اردو لغت نویسی اور اہلِ انگلستان' مشمولہ 'اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)' کے صفحہ ۲۶۹ پر ڈکشنری کا سالِ تالیف ۱۸۹۱ء تحریر ہے۔

۲۷۸۔ یورپ میں اردو، ص ۶۷ تا ۶۸۔

279. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

280. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

۲۸۱۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۴۲۔

۲۸۲۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص ۵۳۔

۲۸۳۔ آغا افتخار حسین نے 'یورپ میں اردو' کے صفحہ ۶۷ پر مینوئل کا سنہ اشاعت ۱۹۱۸ء درج کیا ہے۔

۲۸۴۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص ۲۸۴ تا ۲۸۵۔

285. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

۲۸۶۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص۴۳۔

۲۸۷۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص۴۰۔

۲۸۸۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو (مرتبہ)، ص۱۷۔

289. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.11.

۲۹۰۔ یورپ میں اردو، ص۲۲۔

۲۹۱۔ یورپ میں اردو کے مراکز (اُنیسویں صدی میں)، ص۶۶۔

۲۹۲۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)، ص۳۔

۲۹۳۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)، ص۳۔

۲۹۴۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)، ص۴۔

۲۹۵۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)، ص۴۔

۲۹۶۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)، ص۲۳۔

۲۹۷۔ یورپ میں تحقیقی مطالعے، ص۳۶۔

298. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.6.

۲۹۹۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تالیف 'قواعدِ اردو' کے صفحہ ۲۲ پر درج کیا ہے کہ کیٹلر نے اپنی قواعد ولغت کی کتاب کو ۱۷۱۵ء میں تالیف کیا۔ جب کہ روز نامہ 'دی ہندوٗ (The Hindu) کی ویب سائٹ، 'www.thehindu.com' پر موجود اپنے کالم:

"Research Professor Gopi Chand Narang Gives A Fresh Insight Into The Often Misleading Dynamics Of Urdu_Hindi Controversy"

میں شفیع قدوائی نے جان جوشوا کیٹلر کی قواعد پر مبنی کتاب کا سنہ اشاعت ۱۶۹۸ء تحریر کیا ہے۔

۳۰۰۔ غلام عباس گوندل، ڈاکٹر: 'کیٹلر کی قواعد: کچھ نئی دریافتیں'، مشمولہ: معیار (تحقیقی وتنقیدی مجلّہ)، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی (شعبۂ اردو)، جولائی۔دسمبر (۲۰۱۲ء)، ص۱۶۱۔

۳۰۱۔ قواعدِ اردو، ص۲۲۔

۳۰۲۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص۲۲۔

303. Linguistic Survey of India, vol.ix, (Part 1), p.8.

۳۰۴۔ 'کیٹلر کی قواعد: کچھ نئی دریافتیں'، مشمولہ: معیار (تحقیقی وتنقیدی مجلّہ)، ص۱۷۰تا۱۷۲۔

۳۰۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: 'The Earliest Hindustani Grammar'
bc.Library.uu.nl|node|180

۳۰۶۔ 'کیٹلر کی قواعد: کچھ نئی دریافتیں'، مشمولہ: معیار (تحقیقی وتنقیدی مجلّہ)، ص۱۷۲۔

۳۰۷۔ اکرام چغتائی، محمد: 'اردو کی پہلی گرامر (دریافت اور مطالعہ کی روداد، ۱۷۴۳ء۔۲۰۱۲ء)'، مشمولہ: معیار (تحقیقی و تنقیدی مجلّہ)، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی (شعبۂ اردو)، جولائی۔دسمبر (۲۰۱۳ء)، ص۱۵تا۱۶۔

۳۰۸۔ نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند: تپش نامۂ تمنا (تنقیدی وتحقیقی مضامین)، لاہور، (۲۰۱۲ء)، ص۲۰۔

۳۰۹۔ تپش نامۂ تمنا (تنقیدی وتحقیقی مضامین)، لاہور، (۲۰۱۲ء)، ص۲۱۔

۳۱۰۔ تپش نامۂ تمنا (تنقیدی وتحقیقی مضامین)، لاہور، (۲۰۱۲ء)، ص۱۸۔

311. Bodewitz, H. B.: *Ketelaar And Millius And Their Grammar Of Hindustani*, Poona: Bulletin of Deccan College, 54-55, (1994-95), pp.123-131.

312. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.8.

۳۱۳۔ ہندوستانی گرامراز بنجمن شُلزے(مرتبہ)،ص۳۲،۳۶۔

۳۱۴۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص۲۰تا۲۱۔

۳۱۵۔ ابواللیث صدیقی،ڈاکٹر:جامع القواعد(حصہ ٔصرف)،لاہور:اردوسائنس بورڈ،(۲۰۰۴ء)،ص۱۴۲۔

۳۱۶۔ جامع القواعد(حصہ ٔصرف)،ص۱۴۳۔

۳۱۷۔ گل کرسٹ اوراس کا عہد،ص۱۳تا۱۴۔

۳۱۸۔ ہندوستانی گرامراز بنجمن شُلزے(مرتبہ)،ص۴۔

۳۱۹۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص۲۷۔

۳۲۰۔ گل کرسٹ اوراس کا عہد،ص۱۴تا۱۶۔

321. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), pp.16_17.

۳۲۲۔ ابوسلمان شاہ جہان پوری،ڈاکٹر: کتابیاتِ قواعدِ اردو،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،(۱۹۸۵ء)،ص۸۸۔

۳۲۳۔ گل کرسٹ اوراس کا عہد،ص۱۴تا۱۶۔

۳۲۴۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص۶۹۔

۳۲۵۔ قواعدِ اردو،ص۲۴۔

۳۲۶۔ قواعدِ زبانِ اردو،مشہور بہ رسالہ ٔگل کرسٹ،ص۳۱۔

۳۲۷۔ قواعدِ اردو،ص۲۵۔

328. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.18.

329. Linguistic Survey 0f India,Vol.ix (Part 1), p.10.

۳۳۰۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص۳۰۳۔

۳۳۱۔ یورپ میں اردو کے مراکز(اُنیسویں صدی میں)،ص۱۸۔

332. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.18.

۵۴۔ یورپ میں اردو کے مراکز(اُنیسویں صدی میں)،ص۴۷تا۴۹۔

334. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.19.

۳۳۵۔ مولوی عبدالحق،ڈاکٹر:'اردولغات اورلغت نویسی'،مشمولہ،اردولغت نویسی:تاریخ،مسائل اورمباحث(مرتبہ)،ص۱۰۷۔

۳۳۶۔ سلطان محمود حسین،ڈاکٹر سیّد:خطباتِ گارساں دتاسی(تعلیقات)،لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب،(۱۹۸۷ء)،ص۱۹۴۔

۳۳۷۔ کتابیاتِ لغاتِ اردو،ص۱۲۸۔

338. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.19.

۳۳۹۔ یورپ میں اردو،ص۶۷۔

340. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.19.

341. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.19.

۳۴۲۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،۵۴۔

343. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.19.

344. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.19.

۳۴۵۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم،ص۵۴۔

۳۴۶۔ خطباتِ گارساں دتاسی (تعلیقات)،ص۲۱تا۲۲۔

۳۴۷۔ بہ مقام پانڈی چری (Pondicherry) ۱۹۶۲ء میں شائع ہونے والی کتاب،'' گارسیں دتاسی: سوانح اور تنقید''، دراصل ڈاکٹر ثریا حسین کا مقالہ ہے جس پر مصنفہ کو پیرس یونی ورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔

348. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.20.

۳۴۹۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات،علمی کارنامے)،ص۱۲۷۔

350. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.20.

۳۵۱۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات،علمی کارنامے)،ص۱۲۸۔

352. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.20.

353. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.20.

۳۵۴۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات،علمی کارنامے)،ص۱۲۹۔

355. Linguistic Survey f India, Vol.ix (Part 1), p.20.

۳۵۶۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات،علمی کارنامے)،ص۱۳۰۔

۳۵۷۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات،علمی کارنامے)،ص۱۲۸۔

۳۵۸۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات،علمی کارنامے)،ص۹۷تا۹۸۔

۳۵۹۔ یورپ میں اردو کے مراکز (اُنیسویں صدی میں)،ص۷۱تا۷۴۔

۳۶۰۔ جامع القواعد (حصۂ صرف) کے صفحہ۱۵۲ پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کتاب کا سالِ اشاعت ۱۸۴۴ء درج کیا ہے۔

361. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.20.

۳۶۲۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنی تالیف 'کتابیاتِ قواعدِ اردو' کے صفحہ ۲۹ پر راجرس کی کتاب کا سالِ اشاعت ۱۸۶۱ء رقم کیا ہے۔

۳۶۳۔ یورپ میں اردو کے مراکز (اُنیسویں صدی میں)،ص۶۱۔

364. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), pp.17_27.

۳۶۵۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،۵۳۔

366. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.21.

۳۶۷۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،ص۱۲۶تا۱۲۷۔

368. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.21.

۳۶۹۔ یورپ میں اردو،ص۷۳۔

370. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

۳۷۱۔ یورپ میں اردو،ص۷۳۔

۳۷۲۔ 'کتابیاتِ قواعدِ اردو' کے صفحہ ۸۱ پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اس مستشرق کا نام،'' جے دت لو پرشنو' درج کیا ہے۔

373. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.21.

۳۷۴۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنی تالیف ’کتابیاتِ قواعدِ اردو‘ کے صفحہ ۶۰ پر فاکنر کی کتاب کا سالِ طباعت ۱۸۵۳ء درج کیا ہے۔

375. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.21.

۳۷۶۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۵۴، ۶۶۔

۳۷۷۔ یورپ میں اردو کے مراکز (اُنیسویں صدی میں)، ص ۱۶ تا ۱۷۔

۳۷۸۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۳۰۵۔

379. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.22.

۳۸۰۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۸۱۔

۳۸۱۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۵۶۔

382. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.22.

۳۸۳۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۶۶۔

384. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.22.

۳۸۵۔ یورپ میں اردو کے مراکز (اُنیسویں صدی میں)، ص ۵۹۔

۳۸۶۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۵۶ تا ۵۷۔

۳۸۷۔ ’کتابیاتِ قواعدِ اردو‘ کے صفحہ ۶۱ پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے کیلاگ کی تالیف کا سنہ اشاعت ۱۸۷۲ء درج کیا ہے۔

388. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.23.

۳۸۹۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۰۸ تا ۲۰۹۔

390. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.23.

۳۹۱۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۸۲ تا ۲۸۳۔

۳۹۲۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۵۷ تا ۵۸۔

393. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.23.

۳۹۴۔ غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر: جامع القواعد (حصہ نحو)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، (۲۰۱۲ء)، ص ۹۔

395. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.23.

396. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.23.

۳۹۷۔ یورپ میں اردو، ص ۱۴۳۔

398. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.24.

۳۹۹۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۷۷۔

۴۰۰۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۴۷۔

401. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.24.

۴۰۲۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی کتاب ’جامع القواعد (حصہ صرف)‘ کے صفحہ ۱۵۳ پر اس مستشرق کا نام ’’کیگر‘‘ اور اس کی تالیف کا سالِ اشاعت ۱۸۸۳ء درج کیا ہے۔

۴۰۳۔ یورپ میں اردو، ص ۷۷۔

404. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.24.

405. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.24.

۴۰۶۔ 'جامع القواعد (حصہ صرف)' کے صفحہ ۱۵۳ پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس مستشرق کا نام 'جے ولسن' اور اس کی کتاب کا سالِ اشاعت ۱۸۸۲ء درج کیا ہے۔

407. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.24.

۴۰۸۔ 'اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم' کے صفحہ ۶۰ پر ڈاکٹر عطش درّانی نے اس مستشرق کا نام 'فان کیو' تحریر کیا ہے جب کی ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنی تالیف 'کتابیاتِ قواعدِ اردو' کے صفحہ ۶۰ پر اس مستشرق کا نام 'قان کیو' اور کتاب کا سالِ اشاعت ۱۸۸۲ء درج کیا ہے۔

۴۰۹۔ 'کتابیاتِ قواعدِ اردو' کے صفحہ ۸۶ پر ڈاکٹر سلمان شاہ جہان پوری نے اوریلس کی کتاب کا سالِ طباعت ۱۸۷۵ء درج کیا ہے۔

۴۱۰۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۵۹۔

411. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.24.

۴۱۲۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۶۶۔

413. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.24.

۴۱۴۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۹۷۔

۴۱۵۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۶۹ تا ۷۰۔

☆ ریننگ کی تالیفات کے عنوانات کے ضمن میں 'لینگوئسٹک سروے آف انڈیا' کے صفحہ ۲۵ پر درج معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

416. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

417. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

418. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

419. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

۴۲۰۔ یورپ میں اردو، ص ۱۱ تا ۱۲۔

۴۲۱۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی تالیف 'جامع القواعد (حصہ صرف)' کے صفحہ ۱۵۳ پر اس مستشرق کا نام 'اے سی ڈل' تحریر کیا ہے۔

422. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

۴۲۳۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۴۸ تا ۲۴۹۔

424. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

425. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

426. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

427. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

428. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

429. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.25.

430. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

۴۳۱۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۸۵۔

432. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

۴۳۳۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو، ص ۸۱۔

۴۳۴۔ ہندوستانی گرائمر از بنجمن شُلزے، ص ۵۔

435. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

436. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

437. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

438. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

430. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

440. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.26.

۴۴۱۔ ہندوستانی گرائمر از بنجمن شُلز ے،ص ۵۔

۴۴۲۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۶۷۔

۴۴۳۔ یورپ میں اردو،ص ۸۹ تا ۹۰۔

۴۴۴۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۸۷۔

۴۴۵۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۶۷۔

۴۴۶۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۶۳۔

۴۴۷۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۶۸۔

۴۴۸۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۶۱۔

۴۴۹۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۶۵۔

۴۵۰۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۶۵۔

۴۵۱۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۷۷۔

۴۵۲۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۶۸۔

۴۵۳۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۷۹۔

۴۵۴۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۸۲۔

۴۵۵۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۷۹۔

۴۵۶۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۷۴۔

۴۵۷۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۸۷۔

۴۵۸۔ یورپ میں اردو،ص ۸۔

459. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.10.

۴۶۰۔ یورپ میں اردو،ص ۲۱۔

۴۶۱۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم،ص ۵۲۔

۴۶۲۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)،ص ۵۔

۴۶۳۔ کتابیاتِ قواعدِ اردو،ص ۶۷۔

۴۶۴۔ قواعدِ زبانِ اردو،مشہور بہ رسالۂ گل کرسٹ،ص ۵۳ تا ۵۴۔

۴۶۵۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص ۲۰۔

۴۶۶۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)،ص ۳۶۔

۴۶۷۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ،ص ۲۰ تا ۲۱۔

468. *Hobson Jobson (A glossary of colloquia Anglo_Indian words and phrases, and of kindred terms, etymological, historical, geographical and discursive*, pp. 581-582.

M00rs: "......to the Spaniards and Portugues, whose contact was with the Musulmans of Mauritania who had passed over and conquered the Peninsula, all Mahommedans were Moors. So the Mahommedans whom the Portuguese met with on their voyages to India, on what coast so ever, were alike styled 'Mours'; and from the Portuguese the use of this term, as synonymous with Mahommedan, passed to Hollanders and Englishmen."

'ہابسن جابسن' کے صفحہ ۵۸۱ تا ۵۸۲ پر درج معلومات کی رُو سے ابتداءً اہلِ ہسپانیہ (Spain) اور اہلِ پرتگال نے لفظ 'مورس' کا استعمال کیا۔ دراصل اہلِ ہسپانیہ مسلمانوں کو 'مورس' کہتے تھے۔ اُس دور میں عربی اور فارسی آمیز ہندوستانی (اردو) کو مسلمانوں کی زبان کہا جاتا تھا، اسی نسبت سے 'رابطے کی زبان' ہندوستانی بھی 'مورس' کہلائی۔

۴۶۹۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)، ص ۱۳۹۔

۴۷۰۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شُلز ے (مرتبہ)، ص ۴۲۔

۴۷۱۔ قواعدِ زبانِ اردو، مشہور بہ رسالۂ گل کرسٹ، ص ۱۹ تا ۲۰۔

۴۷۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: en.wikipedia.org|wiki|Takri

Takri: "The Takri script (Sometimes called Tankri) is an abugida writing system of the Brahmic family of scripts. It is closely related to, and derived from, the Sharada script employed by Kashmiri. It is also related to the Gurmukhi script used to write Punjabi. Untill the late 1940's, Takri was the official script for writing the Dogri Language in the state of Jammu and Kashmir.

۴۷۳۔ یورپ میں تحقیقی مطالعے، ص ۱۰۹۔

۴۷۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: books.google.com.pk

۴۷۵۔ بہ حوالہ یورپ میں تحقیقی مطالعے، ص ۱۱۱۔

۴۷۶۔ یورپ میں تحقیقی مطالعے، ص ۱۰۲ تا ۱۱۲۔

۴۷۷۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۲۲۔

۴۷۸۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۸۱ تا ۸۴۔

۴۷۹۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۹۹۔

۴۸۰۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر: 'اردو لغات اور لغت نویسی'، مشمولہ، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ)، ص ۹۹۔

۴۸۱۔ یورپ میں اردو، ص ۱۳۷۔

۴۸۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: books.google.com.pk

۴۸۳۔ یورپ میں اردو، ص ۷۵۔

۴۸۴۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۷۰۔

۴۸۵۔ آغا افتخار حسین نے اپنی تالیف 'یورپ میں اردو' کے صفحہ ۱۱۲ پر گارسیں دتاسی کی 'تاریخِ ادبیاتِ ہندی و ہندوستانی' کے پہلے ایڈیشن کی جلد اوّل کے ۶۴۰ صفحات درج کیے ہیں۔

۴۸۶۔ 'یورپ میں اردو' کے صفحہ ۱۱۲ پر دتاسی کی تاریخ کی تینوں جلدوں کی تعداد بالترتیب ۶۲۸، ۶۰۸، ۶۱۱ درج ہے۔

۴۸۷۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)، ص ۷۵ تا ۹۶۔

۴۸۸۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۷۷۔

۴۸۹۔ یورپ میں اردو، ص ۱۱۲۔

۴۹۰۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)، ص ۸۱ تا ۸۲۔

۴۹۱۔ یورپ میں اردو، ص ۱۱۵۔

۴۹۲۔ خطباتِ گارسیں دتاسی (حصہ اوّل۔ ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۴ء): نظرِ ثانی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، (اشاعتِ ثانی۔ ۱۹۷۹) ص ۴۷۔

۴۹۳۔ خطباتِ گارسیں دتاسی (حصہ اوّل۔ ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۴ء)، ص ۶۲۔

۴۹۴۔ خطباتِ گارسیں دتاسی (حصہ دوّم۔ ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۴ء): نظرِ ثانی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، (اشاعتِ ثانی۔ ۱۹۷۴) ص ۱۷۳ تا ۱۷۴۔

☆ خطباتِ گارسیں دتاسی کے ترجمے کی جلد اوّل کے مذکورہ بالا دو حصوں میں سے حصہ اوّل کا سنہ اشاعت ۱۹۷۹ء جب کہ حصہ دوّم کا سنہ اشاعت ۱۹۷۴ء درج کیا گیا ہے جو منطقی اعتبار سے درست معلوم نہیں ہوتا۔ قیاس ہے کہ ایسا محض صرفِ طباعت کے سبب ہوا۔

۴۹۵۔ خطباتِ گارسیں دتاسی (حصہ دوّم۔ ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۴ء)، ص ۱۷۴۔

۴۹۶۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)، ص ۹۸ تا ۹۹۔

۴۹۷۔ خطباتِ گارسیں دتاسی (حصہ اوّل۔ ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۴ء)، ص ۲۹ تا ۳۰۔

۴۹۸۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)، ص ۹۹ تا ۱۰۰۔

۴۹۹۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)، ص ۹۶ تا ۱۰۰۔

۵۰۰۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)، ص ۱۰۷ تا ۱۱۲۔

۵۰۱۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)، ص ۶۸۔

۵۰۲۔ گارسیں دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)، ص ۶۷ تا ۶۸۔

۵۰۳۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۲۱۔

۵۰۴۔ اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، ص ۷۱۔

۵۰۵۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۵۷ تا ۱۵۸۔

۵۰۶۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۰۹۔

۵۰۷۔ احتشام حسین، سیّد: ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، لکھنؤ: دانش محل، (۱۹۶۳ء) ص ۷۷ تا ۷۸۔

۵۰۸۔ اردوزبان اور یورپی اہلِ قلم، ص۲۷۔
۵۰۹۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص۳۰۶۔
۵۱۰۔ اردوزبان اور یورپی اہلِ قلم، ص۳۷۔
۵۱۱۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص۲۰۷ تا۲۰۹، ۲۷۷، ۳۰۶۔
۵۱۲۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص۲۰۹ تا۲۱۱۔
۵۱۳۔ اردوزبان اور یورپی اہلِ قلم، ص۲۷۔
۵۱۴۔ اردوزبان اور یورپی اہلِ قلم، ص۳۷ تا۴۷۔
۵۱۵۔ اردوزبان اور یورپی اہلِ قلم، ص۴۷۔
۵۱۶۔ ہارنلے: گوڑی زبانوں کی گرامر (مقدمہ)، ص۶ تا۷، بہ حوالہ 'اردولسانیات' از ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص۹۔
۵۱۷۔ داستانِ زبانِ اردو، ص۴۸۔

518. Linguistic Survey of India, Vol.i (Part 1), p.18

۵۱۹۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص۲۶۷۔

520. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.43.

۵۲۱۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص۲۶۱ تا۲۶۴، ۲۷۷، ۲۸۰۔
۵۲۲۔ گریرسن، جارج ابراہام: کلکتہ ریویو، جلد۷۱، ص۱۵۶، بہ حوالہ 'اردولسانیات' از ڈاکٹر شوکت سبزواری، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس (۲۰۱۰ء)، ص۹۔

523. Linguistic Survey of India, Vol.ix (Part 1), p.44.

۵۲۴۔ بیلی، ٹی گراہم: جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (۱۹۳۰ء)، ص۳۹۱، بہ حوالہ 'داستانِ زبانِ اردو' از ڈاکٹر شوکت سبزواری، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۶۰ء)، ص۴۸ تا۴۹۔

525. Bailey, T. Grahame: *A History Of Urdu Literature*, New York: Oxford University Press, (2008), p.3.

۵۲۶۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: لسانی رشتے، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (۲۰۰۳ء)، ص۶۷۔
۵۲۷۔ 'اردوزبان اور یورپی اہلِ قلم' کے صفحہ ۶۷ پر گراہم بیلی کی 'تاریخ ادبِ اردو' کا سنہ اشاعت ۱۹۲۸ء درج ہے۔
۵۲۸۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص۲۸۵ تا۲۸۶۔

529. Bailey, T. Grahame: *A History Of Urdu Literature*, New York: Oxford University Press, (2008), p.1.

۵۳۰۔ اردوزبان اور یورپی اہلِ قلم، ص۶۷۔
۵۳۱۔ اردوزبان اورادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص۲۸۵۔
۵۳۲۔ ژول بلاک: 'ہندآریائی لسانیات کے بعض مسائل'، بلیٹن آف دی سکول آف اورینٹل سٹڈیز، جلد۵، (۱۹۲۸ء۔۱۹۳۰ء)، بہ حوالہ 'مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو' از ڈاکٹر مسعود حسین خان، ص۲۳۷۔
۵۳۳۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو کی ابتدا سے متعلق چند مشاہدات'، مشمولہ، اردوزبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص۳۶۔
۵۳۴۔ یورپ میں اردو، ص۸۹ تا۹۰۔

اردو کی آفرینش اور نشو ونما

(مختلف نظریات کا تنقیدی جائزہ)

ماہرینِ لسانیات کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ اردو خالص ہند آریائی زبان ہے اور خاص ہندوستان کی پیداوار ہے[1]۔ دیگر بہت سی ہند آریائی زبانوں کی طرح اردو کی ابتدا بھی اَپ بھرنش کے دھندلکے میں گُم ہے۔ اس کے تاریخی ارتقا کو شورسینی اَپ بھرنش اور پراکرت کے ذریعے قدیم ہند آریائی زبانوں سے مربوط کیا جاسکتا ہے جس کی نمائندہ زبان 'رِگ وید' کی سنسکرت ہے[2]۔ درحقیقت وسط ہند آریائی کی تمام تر لسانی تاریخ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تحریری مواد (بعض اوقات غیر مصدقہ) کی بنیاد پر بازتعمیر (Reconstruct) کی گئی ہے۔ اسی سبب اُس وقت سے لے کر اب تک فقط اُن تحریری الفاظ کی بازتعمیر ہو پائی ہے جو زیادہ تر بعد کے دور میں ضبطِ تحریر میں لائے گئے اور جن کا اسلوب قدیم ہے۔ جہاں تک سوال ہے اُس دور کی بولیوں کے مابین اختلافات کی نوعیت اور پھر جدید زبانوں کے ارتقا میں اُن بولیوں کے متاخرہ کردار کا تو یہ صورت اردو کے لسانی محققین کو لاعلمی کی تاریک اور اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے[3]۔ اس اعتبار سے اردو کا تاریخی مطالعہ کسی قدر دقیق اور پیچیدہ ہوجاتا ہے۔

اردو زبان کے آغاز سے قریبی عہد کی نہ تو تصنیفات دست یاب ہیں اور نہ اُن کے متعلق بعد کی کتابوں سے کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ''تحقیقی نقطہ نظر سے اردو لسانیات کا سرمایہ مخطوطات، قدیم مسوّدات اور قلمی بیاضوں کی صورت مین ملتا ہے اور اِن ہی پر ماہرینِ لسانیات کے نظریات و آرا کی اساس اُستوار نظر آتی ہے۔ اِن کے بعد کسی حد تک آثارِ قدیمہ کی کتب، سِکّے، فرامین اور اسی نوع کے دیگر تاریخی شواہد سے بھی کام لیا جاتا ہے، لیکن اِس نوع کے شواہد کی تفہیم اور اِن سے وابستہ تاریخی کوائف کی چھان پھٹک کے لیے خصوصی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے''[4]، جس سے ہمارے زیادہ تر محققینِ لسانیات بہرہ مند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مسئلے پر گزشتہ دوسو برس کے دوران میں متعدد علما، محققین اور ماہرینِ لسانیات اپنے اپنے خیالات کا اظہار اپنے اپنے علمی و تحقیقی دائرہ کار کے مطابق کرتے رہے ہیں۔

اردو کا ماخذ کون سی زبان ہے؟ اِس کی ارتقائی کڑیاں کیا ہیں؟ اِس کا مولد ومنشا ہندوستان کا کون سا خطہ ہے؟ اِن سوالات کی کھوج میں رائج ہونے والے متعدد نظریات کا تنقیدی جائزہ ازبس ضروری ہے۔ ماہرین کی علمی کاوشوں، مطالعے اور تحقیقی مہارت ودائرہ کار کے پیشِ نظر ان نظریات کو درج ذیل تین اہم زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) عمومی قیاسی نظریات

(۲) نیم سائنسی نظریات

(۳) لسانیاتی تحقیق پر مبنی جدید نظریات

عمومی قیاسی نظریات

اردو زبان کے آغاز و ارتقا کا مسئلہ خالص لسانیاتی مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں کی جانے والی تحقیق محققین سے نہ صرف جدید

علمِ لسانیات سے کماحقہٗ واقفیت کا تقاضا کرتی ہے بلکہ ہندآریائی زبانوں کے تاریخی ارتقا، صرفی ونحوی اصولوں اور صوتی تبدیلیوں سے خاطرخواہ آگاہی کی بھی متقاضی ہے۔ جن مصنفین نے اِن لسانیاتی باریکیوں کو پیشِ نظر رکھے بغیر آغازِ اردو کے مسئلے پر غور کیا انھوں نے محض قیاس آریائی سے کام لیا جس کے نتیجے میں درج ذیل نظریات سامنے آئے:

☆ اردو زبان کی آفرینش سے متعلق مباحث کے آغاز کا سلسلہ **میر محمدی مائل دہلوی** سے تصور کیا جانا چاہیے جنھوں نے اپنے ایک **قطعے (قبل ۱۷۶۲ء)** میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول کو اردو کی ابتدا کا سبب قرار دیا[۵]۔ قطعے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

گیارہ صدی شروع ہوئی جب کہ جگ منے
باہم ہوئے یہ ہندو مسلماں خلا ملا
دربارِ اکبری میں وہ ۔۔۔ تھے رات دن
ہر ہر گلی میں تھا اسی خدمت کا پرتلا

دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں مخذوف لفظ 'ملتے' یا 'باہم' ہوسکتا ہے۔ اِس کے آگے مائل شہرِ دہلی کی تاریخ بیان کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں:

شاہ جہاں کے عہد سے، خلقت کے بیچ میں
ہندوی تو نام مٹ گیا، اردو لقب ملا

اِن اشعار کے توسط سے میر محمدی مائل دہلوی کا یہ بیان سامنے آتا ہے کہ گیارھویں صدی ہجری میں ہندو اور مسلمان باہم ملتے رہتے تھے اور یہ میل جول دربارِ اکبری میں خصوصیت سے تھا۔ علاوہ ازیں شاہ جہان کے وقت سے اُس زبان کا نام 'اردو' پڑ گیا جو اس سے قبل 'ہندوی' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ ڈاکٹر گیان چند جین، میر محمدی مائل دہلوی کے سہوِ زمانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''دقت یہ ہے کہ شہنشاہِ اکبر گیارھویں صدی ہجری سے بہت پہلے ہوا ہے۔''[۶]

☆ اردو کے 'ملواں زبان' ہونے کا نظریہ **مرزا جان طپش دہلوی (وفات ۔۱۸۱۴ء)** نے اپنے دیوان **'گلزارِ مضامین' (مرتبہ ۱۷۸۵ء)** میں پیش کیا ہے[۷]۔ دیوان کے دیباچے میں اردو زبان کی ابتدا سے متعلقہ طپش کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:

> دہلی میں مسلمانوں کی فتح سے قبل جو زبان بولی جاتی تھی، وہ ہندی الاصل تھی۔ جب معزالدین سام (شہاب الدین غوری) نے رائے پتھورا کا کام تمام کیا تو اِس زبان میں اہلِ اسلام کے عربی وفارسی الفاظ گھل مل گئے۔ جب محمد شاہ تغلق اہلِ دہلی کو دولت آباد لے گیا اور واپس لایا تو دکنی الفاظ بھی دہلی والوں کی زبان میں مل گئے۔ شاہ جہاں کے شاہ جہاں آباد بنانے کے بعد دہلی کی زبان میں نمایاں فرق ہوگیا۔ پرانی ہندی متروک ہوگئی، لیکن دکنی الفاظ جوں کے توں رہے۔[۸]

مرزا جان طپش دہلوی اردو زبان کا آغاز فتحِ دہلی سے قیاس کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق دہلی میں مسلم فاتحین کے توطن اختیار کرنے سے وہاں کی ہندی الاصل بھاشا میں عربی وفارسی الفاظ کی بہ تدریج آمیزش سے ایک نئی زبان کی بنا پڑی۔ صدیوں کو محیط یہ لسانی عمل بعدازاں مزید سیاسی ومعاشرتی انقلاب کے توسط سے مہمیز ہوا۔ تا آنکہ اُس نئی زبان کا باقاعدہ ظہور عہدِ شاہ جہاں میں ہوا۔

☆ **محمد باقر آگاہ ایلوری (۱۷۳۷ء۔۱۸۰۵ء)** اردو زبان کو برج بھاشا سے ماخوذ قرار دیتے ہوئے **مثنوی 'گلزارِ عشق' (۱۷۹۶ء)** کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ۔۔۔ ہندوستان میں مدت لگی زبانِ ہندی کہ اوسے برج بھاکا کہتے ہیں، رواج رکھتی تھی، اگرچہ لغت سنسکرت اونکی اصل اصول اور مخزنِ فنون فروغ واصول ہے، پیچھے محاورۂ برج میں الفاظ عربی وفارسی بہ تدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب

خالص کو او سکے کھونے لگے، جب سے اِس آمیزش کے یہ زبان 'ریختہ' مسمّٰی ہوئی۔ [9]

برج بھاشا میں عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش سے نئی زبان 'ریختہ' کے معرضِ وجود میں آنے کا مقدّم بیان محمد باقر آگاہ ایلوری کے یہاں ملتا ہے۔ بعد ازاں اِس نظریے کی ترویج و اشاعت دیگر مصنفین کے بیانات کے ذریعے سے ہوئی۔

☆ انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں **میر امن دہلوی** [10] نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ (موجودہ کولکتہ) میں دورانِ ملازمت **'باغ و بہار' (۱۸۰۴ء)** [11] تصنیف کی اور اِس کے دیباچے میں اردو زبان کے آغاز سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اِن الفاظ میں کیا:

> حقیقت اردو زبان کی، بزرگوں کے منہ سے یوں سُنی ہے کہ دلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے، انہیں کے راجا پرجا قدیم سے رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا، چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ اُن کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار 'اردو' کہلایا۔۔۔۔۔
>
> جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سُن کر، حضور میں آ کر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہ جہان، صاحب قران نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا۔۔۔۔۔ تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا، تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا (اگر چہ دلّی جُدی ہے، وہ پُرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو 'اردوئے معلّٰی' خطاب دیا۔ امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت تک بلکہ محمد شاہ اور عالم گیر ثانی تک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یک ساں چلی آئی۔ ندان زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسی شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھا سکتی۔ [12]

میر امن دہلوی بھی فتحِ دہلی کو اردو کا دورِ آغاز مانتے ہیں اور متقدمین کی طرح اکبر و شاہ جہاں کے ادوار کو اردو کے با قاعدہ ظہور کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔

☆ **سیّد انشا اللہ خان انشا دہلوی (۱۷۵۷ء-۱۸۱۸ء)** اردو زبان کے مولد و منشا کے باب میں اپنی یادگار تصنیف **'دریائے لطافت' (۱۸۰۸ء)** [13] کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> شاہ جہاں آباد چونکہ اکثر سلاطینِ مغلیہ کا دارالخلافہ اور جائے قیام رہا ہے اور چوں کہ فریقین کے فصیح و بلیغ اور جید عالم اور فنونِ لطیفہ و فنونِ شریفہ کے ماہر اس خوب صورت شہر میں رہنے لگے اس لیے اس شہر کو امتیاز حاصل ہے۔ اگر چہ لاہور، ملتان، اکبر آباد اور الہ آباد بھی ذی شوکت بادشاہوں کا مسکن رہے ہیں لیکن ان کو دہلی کے برابر نہیں کہہ سکتے کیوں کہ یہاں اور مقاموں کے مقابلے میں بادشاہوں کا قیام زیادہ رہا ہے۔ یہاں کے خوش بیانوں نے متفق ہو کر متعدد زبانوں سے اچھے اچھے لفظ نکالے اور بعضی عبارتوں اور الفاظ میں تصرف کر کے اور زبانوں سے الگ ایک نئی زبان پیدا کی، جس کا نام 'اردو' رکھا۔ [14]

انشااللہ خان انشا کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان کی پیدائش کا سہرا شاہ جہاں آباد کے خوش بیانوں کی دانستہ لسانی مشق کے سر باندھتے ہیں۔

☆ اردو کو 'ملواں زبان' قرار دیے جانے والے نظریے کی بازگشت سر سیّد احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کے یہاں بھی صاف سُنائی دیتی ہے۔ وہ اپنی شاہ کار تصنیف 'آثار الصنادید' (۱۸۴۷ء) کی جلد اوّل کے اختتامی نوٹ بہ عنوان 'اردو زبان کے بیان میں' رقم طراز ہیں:

> ۔۔۔ جب کہ شاہ جہاں بادشاہ نے ۱۰۵۸ ہجری مطابق ۱۶۴۸ عیسوی کے شہر شاہ جہاں آباد، آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا، اُس زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بہ سبب کثرتِ استعمال کے تغیر و تبدیل ہو گئی۔ غرض کہ لشکرِ بادشاہی اور اردوئے معلیٰ میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی اور اسی سبب سے زبان کا اردو نام ہوا، پھر کثرتِ استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کو اردو کہنے لگے۔ [۱۵]

آثار الصنادید سے منقول درج بالا اقتباس میں سر سیّد احمد خان نے نہ صرف اردو زبان کی پیدائش کو فارسی و بھاشا کی آمیزش قرار دیا ہے بلکہ اس امر کی وضاحت بھی کی ہے کہ 'لشکرِ بادشاہی' اور 'اردوئے معلیٰ' میں مستعمل ملی جُلی زبان جو کہ 'اردو کی زبان' (بہ معنی لشکر کی زبان یا بازار کی زبان) یا 'زبانِ اردو' کہلاتی تھی بعد ازاں کثرتِ استعمال سے اِس ترکیب سے 'زبان' کا لفظ حذف ہو جانے سے فقط 'اردو' باقی رہا۔

☆ 'ظہیر الانشا' کے مصنف کا قول ہے:

> جس وقت عنانِ سلطنت جہاں گیر سے شاہ جہاں کو منتقل ہوا اُس وقت علمائے دین کی صحبت و معاشرت کی بہ دولت خودداری و دین داری کا رواج عام تھا۔ یہ ملی جُلی زبان 'ریختہ' بازار میں مختلف ممالک کے تاجران کی آمد و رفت اور خرید و فروخت کے معاملات نمٹانے کے لیے متعارف ہوئی تا کہ وہ ایک دوسرے کی بات کو بہ خوبی سمجھ سکیں۔ [۱۶]

☆ میر امن اور دوسرے علما کی تقلید میں مولانا امام بخش صہبائی (پیدائش۔۱۸۰۶ء) 'رسالہ قواعد صرف و نحو اردو' (۱۸۴۹ء) [۱۷] میں لکھتے ہیں:

> شاہ جہاں آباد تیمور یہ خاندان کے شاہ جہاں نے آباد کیا۔ اس وقت فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرتِ استعمال کے سبب تبدل و تغیر واقع ہوا۔ اور اس خلا ملا سے جو بولی مروّج ہوئی اُس کا نام اردو ٹھہرا۔ [۱۸]

☆ مرزا قادر بخش صابر کا تذکرہ 'گلستانِ سخن' ۱۸۵۴ء میں لکھا گیا اور پہلی مرتبہ اسی سنہ میں شائع ہوا [۱۹]۔ اردو زبان کی آفرینش کے حوالے سے مرزا صاحب لکھتے ہیں:

> دانش مندانِ فہیم پر مخفی نہ رہے کہ اوائل روزگار میں دلّی کے رہنے والوں کی زبان صرف ہندی تھی۔۔۔ اور اطراف و جوانب کے آدمیوں کی سکونت اس دیار میں اس کثرت سے وقوع میں نہ آئی تھی کہ اُن کی زبان کے لغت اِس زبان میں مخلوط ہو کر یہاں کی بولی کو اپنی اصل سے متغیر کر دیتے۔۔۔ لیکن جب نیّرِ رخشاں اسلام سے شبستانِ ہند منور ہوا۔۔۔ باشندگانِ قدیم کو ان کے ساتھ اختلاط بہم پہنچا اور ہم زبانی کثرت سے عمل میں آئی۔ ناگزیر اُن کی زبان کے الفاظ اِن کی زبان میں مخلوط ہونے لگے اور جو کہ بادشاہانِ اسلام مختلف دیار سے وارد ہوئے مثلاً سلطان محمود غزنوی اور

غوری اور لودھی اور سلاطینِ چغتائی، ہر ملک کی زبان کے لغت نوبت بہ نوبت اس زبان میں داخل ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ
زبانِ ہندی اپنی اصل پر نہ رہی اور السنہ مختلف سے مل کر لباسِ نو میں جلوہ گر ہوئی جو کہ یہ لوگ اردوئے معلیٰ سلاطین کے
متعلقین میں سے تھے اہلِ ہند ان الفاظِ مخلوط کو زبانِ اردو کہتے تھے۔ [۲۰]

مرزا صاحب نے اردو زبان کے آغاز کو زمانی اعتبار سے اگر چہ عہدِ شاہ جہاں کی تحویل میں نہیں دیا البتہ اسے مکانی اعتبار سے شہرِ دہلی کا پابند کر دیا۔

☆ **بابو شیو پرشاد** نے **۱۸۶۸**ء میں بنارس انسٹی ٹیوٹ کے ایک جلسے میں 'کچھ بیان اپنی زبان کا' کے عنوان سے اپنا ایک لیکچر لسانی موضوع پر پیش کیا بعد میں یہ لیکچر اٹھائیس (۲۸) صفحات پر مشتمل ایک کتابچے کی صورت میں **۱۸۶۹**ء میں شائع ہوا۔ بابو شیو پرشاد نے اپنے لیکچر کی ابتدا اِن الفاظ میں کی:

اِس ملک کے ابتدائی رہنے والے کون تھے، ان کی زبان کیا تھی؟ یہ بات صرف خیال و قیاس سے تعلق رکھتی ہے کہ وہ زبان
تامل اور تلگو کی جڑ تھی کہ اب تک دکن میں جاری ہیں اور سنسکرت سے کچھ بھی علاقہ نہیں رکھتی یا اِن بہت سی زبانوں میں سے
کسی کی جڑ تھی جو بندھیا چل کے آس پاس، جنگل جھاڑیوں کے رہنے والے پہاڑوں کے درمیان رائج ہیں۔ ہم کو اِس
مقام پر اس بحث سے کچھ غرض نہیں ہم کو اتنا ہی کہنا ہے کہ وہ سنسکرت ہر گز نہیں تھی۔ [۲۱]

اردو زبان کو غیر ہند آریائی قرار دیے جانے والے بابو شیو پرشاد کے اس بیان کا دبنگ اظہار بعد ازاں عین الحق فرید کوٹی، ڈاکٹر سہیل بخاری اور خالد حسن قادری کے یہاں ملتا ہے۔ بابو شیو پرشاد مزید لکھتے ہیں:

''اب اِس نئی زبان یعنی اس پراکرت کو جس میں فارسی اور عربی ملی ہندی کہو، چاہے ہندوستانی بھاکا کہو، چاہے برج بھاکا
ریختہ کہو، چاہے کھڑی بولی اردو کہو، چاہے اردوئے معلیٰ۔ اس کے تخم تبھی سے بوئے گئے جب محمود غزنوی نے چڑھائیاں
کیں اور اہلِ اسلام کی اِس ملک پر توجہ ہوئی، آٹھ سو برس سے زیادہ گزرتے ہیں۔'' [۲۲]

اِن کے خیال میں چوں کہ اوستا اور سنسکرت کا ماخذ ایک تھا اسی سبب اردو کا ظہور گو یا برِ صغیر کی دیسی بولیوں میں فارسی الفاظ کی آمیزش سے ہوا۔ اپنے قیاس کی سند میں وہ چند الفاظ بہ طور مثال پیش بھی کرتے ہیں۔

☆ قیاسی نظریات کے حامل مصنفین میں **شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد** (**۱۸۳۰ء۔۱۹۱۰ء**) نے نسبتاً لسانی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اپنی تصنیف 'آبِ حیات' (**۱۸۸۰ء**) میں اردو زبان کی تاریخ کو سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی ہے، البتہ آغازِ اردو کے مسئلے پر محمد حسین آزاد نے ہارنلے اور میر امن ، دونوں کا اثر قبول کیا اور بالخصوص ہارنلے سے متاثر ہو کر انھوں نے آبِ حیات کی ابتدا اِن جملوں سے کی:

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو، برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ
ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں اور برج کا سبزہ زار
اس کا وطن ہے۔ [۲۳]

اگر چہ یہ نظریہ آزاد کے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ ان سے پہلے ڈاکٹر ہارنلے نے اِس خیال کا اظہار کیا تھا [۲۴] لیکن اِس نظریے کو اہلِ اردو میں شہرت بخشنے کا سہرا آزاد ہی کے سر ہے۔ مزید برآں میر امن کی روایات کا سہارا لیتے ہوئے آزاد کہتے ہیں:

۔۔۔مسلمان اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید یہ نسبت

ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے۔ اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا، اتنا ہی روز بہ روز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہ جہاں کے زمانے میں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عین اوج پر تھا، شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلّی دار الخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکانِ دولت زیادہ وہاں رہنے لگے۔ اہلِ سیف، اہلِ قلم، اہلِ حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا۔[۲۵]

گویا میر امن کی تقلید میں آزاد کا بیان ہے کہ بیرونی مسلمانوں اور ہندوؤں کی زبان کے میل جول سے اردو پیدا ہوئی۔ اس کی تکمیل اگرچہ شاہ جہاں کے عہد میں ہوئی لیکن ارتقا اِس سے پیش تر عمل میں آیا۔ مولانا آزاد کے نزدیک مسلمانوں کی زبان فارسی اور ترکی تھی جب کہ ہندوؤں میں برج بھاشا رائج تھی۔

اِس کے بعد آزاد نے آبِ حیات کے صفحہ ۲۷ پر اپنی لسانی بحث کو اِس بیان پر منتج کیا کہ برِصغیر کی دیسی زبان دراوڑی اپنی ساخت کے اعتبار سے کچھ ایسی لچک دار اور وسیع الدامن ہے کہ اِس نے ہر زبان کا اثر قبول کیا جس کے نتیجے میں پراکرتیں وجود میں آئیں۔ بعد ازاں جب مسلمان برِصغیر پر حکم ران ہوئے تو اُس دور میں مروجہ پراکرتوں میں سے کسی ایک نے عربی اور فارسی الفاظ کو اپنے اندر جذب کر کے اردو کو جنم دیا اور اب اردو میں انگریزی الفاظ اِس طرح شامل ہو رہے ہیں گویا یہاں کی زبان میں کچھ خلا باقی تھا جسے انگریزی پُر کر رہی ہے۔

☆ اردو کے متنوع لسانی مباحث پر مشتمل ایک کتاب 'اردو زبان' کے عنوان سے ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔ نوّے (۹۰) صفحات کی حامل اِس کتاب کے مصنف کا نام **چرنجی لال** ہے۔ اردو زبان کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے چرنجی لال نے اِس کتاب میں لکھا ہے:

سنسکرت سے پراکرت پیدا ہوئی، پراکرت سے بھاکا اور بھاکا ہندی سے عربی فارسی الفاظ کے میل سے اردو پیدا ہوئی۔ اور یہ تمام ایک زبان سے دوسری زبان کا پیدا ہونا دو ہزار برس کے عرصے میں ہوا۔۔۔۔۔ یہ برج بھاکا شورسینی پراکرت سے نکلی ہے اور ہندی کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے جو برج اور دہلی کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ اور گیارھویں صدی کے پہلے یعنی راجا بھرت کے عہد سے یہی بھاکا چلی آتی ہے۔ اسی سے ہماری آج کی برج بھاشا جسے کھڑی بولی یا کھری بھی کہتے ہیں، نکلی ہے۔ روزمرّہ کے کاروبار اِس کے ذریعے سے ہوتے تھے۔ تصنیف و تالیف میں سنسکرت کام آتی تھی کہ دفعتاً زمانے نے ایک اور چکر کھایا یعنی ہندوستان میں اسلام کا قدم لا جمایا۔ اِس سے ملک میں پھر ایک انقلاب پیدا ہو گیا جس طرح یہاں کے ہندو مفتوح ہوتے گئے اسی طرح اِن کی زبان بھی مغلوب ہوتی گئی۔[۲۶]

☆ **مولوی عبد الغفور نساخ** اردو کو مخلوط زبان قرار دیتے ہوئے 'رسالہ در تحقیق زبانِ اردوئے معلّٰی بہ نام تاریخی زبانِ ریختہ' (۱۸۹۰ء)[۲۷] میں لکھتے ہیں:

زبانِ اردو روزمرہ شہر دہلی کو کہتے ہیں۔ اِس شہر میں قدیم الایام سے برابر زبان ہندی مروج تھی۔ ہر شخص اسی زبان میں کلام کرتا تھا۔ جب ۵۸۸ھ میں سلطان معز الدین مشہور بہ شہاب الدین محمد غوری نے ملک ہند پر چڑھائی کر کے اہلِ ہند کو شکست دی، رائے پتھورا کا کام تمام کیا، تمام ملکِ ہند سلاطین غور کے قبضۂ اختیار میں آیا۔ رفتہ رفتہ زبانِ قدیم میں لفظ فارسی، عربی، ترکی ملتا گیا۔ جب محمد شاہ بن تغلق شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو باشندگانِ دہلی پر یہ ایک تازہ ظلم کیا کہ ان

کوشہر میں رہنے نہ دیا۔ دیوگیر معروف بہ دولت آباد میں بھیج دیا اور پھر قبل اپنی سلطنت کے زوال کے ان لوگوں کو دہلی میں بلا لیا۔ اس نقل وحرکت کے باعث بہت سے الفاظ دکھنی بھی زبانِ دہلی میں مل گئے۔ یہی اندازِ گفت گو آخر عہدِ جہاں گیر بادشاہ تک رہا لیکن جب شاہ جہاں بادشاہ نے ۱۰۵۸ء میں شاہ جہاں نے 'شاہ جہاں آباد' (دہلی) کو آباد کیا تو شاہ جہاں آباد میں اطراف وجوانب سے عالم سے ہر قسم کے ذی علم اور صاحبِ استعداد اور قابل لوگ مجتمع ہوئے۔ قدیم ہندوی متروک ہونے لگی۔ محاورے میں فرق ہونے لگا۔ زبانِ اردو کی ترقی شروع ہوئی۔[۲۸]

اردو کی ابتدا کے ضمن میں چرنجی لال کے بیان میں مولانا محمد حسین آزاد کے نظریے ہی کی بازگشت سُنائی دیتی ہے۔

☆ **سیّد احمد دہلوی (۱۸۴۶ء۔۱۹۱۸ء)** نے اپنی مشہور تالیف '**فرہنگِ آصفیہ**' (**سنہ طباعت جلد اوّل۔۱۹۰۸ء**)[۲۹] کے مقدمے میں '**اردو زبان کی پیدائش اور ترقی**' کے عنوان سے اردو کے آغاز وارتقا کی بابت ایک سیر حاصل مضمون قلم بند کیا ہے۔ اردو زبان کو 'معجونِ مرکب' کا لقب عطا کرتے ہوئے سیّد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

۔۔۔۔۔اردو زبان چوں کہ ایک مخلوط زبان ہے اور اِس نے شاہ جہانی لشکر کی بولی ہو جانے کی وجہ سے ترقی پاکر اردو نام پایا اِس لحاظ سے ہمارا یہ کہنا غلط نہیں کہ اِس زبان کی بنیاد اسی وقت سے پڑی جس وقت سے مختلف قوموں، مختلف نسلوں، مختلف اولوالعزموں، مختلف المذاہب بیرونی بادشاہوں، تاجروں، سیاحوں اور خدا پرست درویشوں نے اس ملک میں آ آ کر اس کی قدیمی زبان میں اپنی مادری زبان کے الفاظ، لغات، اسماو محاورات اور اصطلاحات وغیرہ کو مخلوط کیا اور ایک مدت دراز کے بعد اس اتفاقی اختلاط سے یہ زبان ایک معجونِ مرکب بن گئی۔[۳۰]

☆ **حکیم سیّد شمس اللہ قادری** کی کتاب '**اردوئے قدیم**' پہلی بار ۱۹۲۵ء کے اوائل میں 'رسالہ تاج' حیدرآباد دکن کی ایک خصوصی اشاعت کی صورت میں منصۂ شہود پر آئی تھی[۳۱]۔ مولانا محمد حسین آزاد کے نظریے کو اگرچہ متعدد ماہرینِ لسانیات نے درست تسلیم نہیں کیا تاہم اِس نظریے کی تقلید میں حکیم سیّد شمس اللہ قادری بھی اردو زبان کا منبع ومخرج برج بھاشا ہی کو قرار دیتے ہوئے 'رسالہ تاج' کے قدیم نمبر میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اِس میں تغیر شروع ہوا جو روز بہ روز بڑھتا گیا اور ایک عرصے کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کر لی۔[۳۲]

اِس امر کی مزید وضاحت اپنی تصنیف '**اُردوئے قدیم**' میں بیان کرتے ہیں:

زمانہ حال کی تاریخی اور لسانی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ زبانِ اردو کا منبع ومخرج برج بھاشا ہے اور اِس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ تیرہ، چودہ، پندرہ اور اسی قبیل کے اور بہت سے الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں، وراوچی نے انھیں اپنی گرامر میں بہ جنسہٖ بیان کیا ہے[۳۳]۔ مسلمان فاتحوں سے جب ہندوؤں کا میل جول ہوا تو برج بھاشا میں تغیر شروع ہوا، جو روز بہ روز بڑھتا گیا اور ایک عرصے کے بعد زبان کی اصل ہیئت بدل گئی جس کے باعث ایک جدید زبان کا ظہور ہوا اور یہ جدید زبان سلاطینِ مغلیہ کے دور میں زبانِ اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔[۳۴]

تنقید اور تبصرہ:

درج بالا غلط تصورات کی بنیاد پر ایک عرصے تک اردو زبان کی اصل اور ابتدا سے متعلق اردو دان طبقہ اور متعدد دیسی و بدیسی محققین کسی بھی واضح نقطے پر پہنچنے کے بہ جائے محض قیاس آرائیوں سے کام لیتے رہے اور اِس طرح اِن میں بالعموم چار طرح کے غلط تصورات رواج پا گئے جن کی تفصیل مع تنقید و تردید ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

(۱) قیاسی نظریات کی بنا پر اکثر ماہرین میں یہ پہلا غلط تصور سامنے آیا کہ جب دو یا دو سے زیادہ زبانیں ایک دوسرے کے زیرِ اثر ہوں تو ایک تیسری زبان معرضِ وجود میں آ جاتی ہے۔ اِس تصور کے نتیجے میں بیش تر اہلِ علم اردو زبان کو ایک 'کھچڑی' یا 'ملواں' زبان قرار دیتے ہیں۔ اِن کے نزدیک اردو گویا ایک ایسی زبان ہے جس کی تشکیل مختلف زبانوں کے الفاظ کے باہم اختلاط و آمیزش کا نتیجہ ہے۔ یہ قیاس خاصا گمراہ کُن ہے۔ اِس کے حامل اہلِ علم یقیناً اِس حقیقت سے واقف نہیں کہ ہر زبان کی اپنی ایک اصل ہوتی ہے جس سے وہ متشکل ہوتی ہے، ایک اساس ہوتی ہے جس سے اُس زبان کا ارتقا عمل میں آتا ہے اور ایک بنیاد ہوتی ہے جس پر اُس زبان کا ڈھانچا تیار ہوتا ہے۔ محض دو یا دو سے زیادہ زبانوں کا باہم اختلاط، خلاملا اور ارتباط ایک نئی زبان کو جنم دینے کے لیے کافی نہیں ہوتا بلکہ ایک با قاعدہ اور مخصوص و ممیّز زبان کی بنیاد پر ہی کوئی نئی زبان متنوع سماجی، تہذیبی، سیاسی اور مذہبی عوامل کے زیرِ اثر نمو پاتی ہے۔

اردو کو 'ملواں زبان' قرار دیے جانے والے بیانات کی تردید میں ڈاکٹر شوکت سبزواری رقم طراز ہیں:

> ایک نظریہ جسے میں غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں یہ ہے کہ اردو کھچڑی ہے۔ چڑیا لائی چانول کا دانہ چڑا لایا مونگ کا دانہ، دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔ عربی فارسی الفاظ مسلمان اپنے ساتھ لائے، ہندوؤں نے ہندی افعال اور حروف فراہم کیے، ہندو مسلمان کے میل ملاپ سے اردو نے مغلوں کے زمانے میں یا اُس سے کچھ پہلے جنم لیا۔ [۳۵]

ایک دوسرے کے قریب اور زیرِ اثر ارتقا پذیر ہونے کے سبب زبانوں میں الفاظ کا لین دین معمولی امر ہے۔ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں گھل مل جانے سے زبانوں میں اشتراک کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اشتراک اِس قدر گہرا بھی ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات الفاظ کی اصل کا تعین ناممکن ہو جاتا ہے، لیکن اِس سے مراد یہ نہیں کہ زبان کی اصلیت کو یک سر نظر انداز کر دیا جائے۔ اشتراک کے اسی اصول کے پیشِ نظر ایک زندہ اور متحرک زبان کی حیثیت سے اردو نے ہر دور میں دوسری زبانوں سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں اگر چہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن اردو کا بنیادی ڈھانچا یا کینڈا اُس قدیم زبان پر قائم ہے جو اِس کی اصل و اساس ہے۔

متقدمین میں بالخصوص میر امن کا اختلاط کا نظریہ غیر معمولی حد تک مقبول ہوا اور بعد کے بیش تر اہلِ علم اِسے من و عن یا قدرے ترمیم سے پیش کرتے رہے۔ میر امن سے متاثر ہونے والے صرف اہلِ اردو نہ تھے بلکہ بعض غیر ملکی بھی اِس میں شامل رہے۔ اِس حوالے سے مسٹر بارنیکوف لکھتے ہیں:

> میر امن نے اردو کے آغاز سے متعلق جس خیال کا اظہار کیا تھا اسے متعدد مغربی علما نے قبول کر لیا جن میں سے کچھ آج بھی اردو کو ایک طرح کی بناوٹی زبان، مختلف بولیوں اور زبانوں کا مرکب سمجھتے ہیں۔ [۳۶]

(۲) دوسرے غلط تصور کی بنا پر اکثر متقدمین اردو زبان کا اصل وطن دہلی کو قرار دیتے ہوئے اِس کے آغاز کو کسی نہ کسی مخصوص زمانے سے منسوب کرتے ہیں۔ کچھ کے خیال میں اردو شہنشاہِ جلال الدین اکبر کے دور (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) میں متعدد زبانوں اور بولیوں کے اختلاط کے نتیجے میں دہلی میں پیدا ہوئی

اور کچھ اہلِ علم اسے شاہ جہاں بادشاہ کے عہد (۱۶۲۸ء۔۱۶۵۸ء) میں زبانوں کے اسی حادثاتی اختلاط کو اردو کا آغاز قیاس کرتے ہیں، لیکن یہ درست نہیں۔ ''اردو دان طبقے میں اِس غلط فہمی کے پنپنے کی وجوہ یہ تھیں کہ دہلی سلاطینِ مغلیہ کی راج دھانی رہی، اردو ادب کو اِس شہر میں بہت فروغ حاصل ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاہ جہاں نے اِس زبان کا نام بھی دہلی ہی کے ایک علاقے کی نسبت سے 'اردو' رکھا۔ بلاشبہ دہلی میں ایک بازار کا نام 'اردو بازار' تھا جو قلعے سے ملحق تھا۔[۳۷] اس طرح اردو زبان کے سلسلے میں لوگوں کو دہلی ہی کی اہمیت نظر آئی اور وہ اسی کو اردو کی مرز بوم سمجھ بیٹھے''[۳۸]۔ بیش تر مسلمان اہلِ علم نے اردو کا سنگِ بنیاد دہلی میں رکھ کر اس کی نشو نما کو غوریوں کے عہد میں دکھایا اور شاہ جہاں کے عہد میں پروان چڑھایا۔

میر امن دہلوی شہنشاہِ اکبر کے عہد کو اردو زبان کا دورِ آغاز مانتے ہیں۔ ان کے مطابق اُس عہد میں بیرونی مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کی زبان کے میل جول سے اردو بنی۔ علاوہ ازیں اردو کے فروغ و رواج کے ضمن میں عہدِ شاہ جہاں میں 'اردوئے معلیٰ' کی اہمیت ظاہر کرتے ہیں۔ میر امن کے اِس بیان کی تردید ڈاکٹر سہیل بخاری اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> میر امن دہلوی کوئی ماہرِ لسانیات نہ تھے اور نہ وہ اردو زبان کے مؤرخ ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فروغِ اردو کی جگہ آغازِ اردو کو اکبر و شاہ جہاں کے ناموں سے منسوب کر دیا۔[۳۹]

اسی طرح سر سیّد احمد خان ، امام بخش صہبائی اور مولانا محمد حسین آزاد کے نظریات کے مطابق اردو زبان عہدِ شاہ جہاں میں دہلی کے گردو نواح میں پیدا ہوئی۔ آغازِ اردو کے حوالے سے مذکورہ اہلِ علم کے بیانات میں انشا اللہ خان انشا کا بیان نسبتاً جدا گانہ سجھاؤ کا حامل ہے۔ وہ اردو کی پیدائش کو شاہ جہاں آباد کے ماہر خوش بیانوں کی ارادی تشکیل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، جب کہ حقیقت اِس سے کوسوں دور ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان کی ارادی لسانی مشقوں کی بنا پر تشکیل دی جانے والی زبانیں (Esperanto, Interlingua, Klingon, etc) تاریخ کی ایک سُرخی سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں کر سکیں۔ اِس کے برعکس دیگر فطری اور زندہ زبانوں کی طرح اردو مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر سہیل بخاری رقم طراز ہیں:

> زبان ایک نامیاتی حقیقت ہے جو از خود پیدا ہو کر بڑھتی، پھلتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ وہ شعوری کوششوں کی پیداوار نہیں ہوتی اور جو زبان شعوری کوششوں سے بنائی جاتی ہے وہ زندہ زبان نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آگے بڑھ بھی نہیں سکتی۔ اس لیے یہ خیال کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی ضرورت کے تحت ایک نئی زبان بنائی یا شاہ جہاں کی چھاؤنی میں ڈھالی، سرے سے غلط ہے۔[۴۰]

گویا متقدمین نے اردو زبان کی تاریخِ پیدائش مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد بلکہ مغلوں کے عہد میں تلاش کی ہے۔ یہ امر تو واضح ہے کہ مسلمانوں میں سے بیش تر کی زبان فارسی تھی اور کچھ کی ترکی البتہ دہلی کے نواح میں مقیم ہندوؤں کی زبان کیا تھی؟ شاہ جہاں کے دور میں، بازار میں اردو کن کن زبانوں کے میل سے بنی؟ میر امن اور اِن کے مقلدین نے اِس امر کی وضاحت پیش نہیں کی۔ ''درحقیقت یہ کوئی نظریہ نہیں، صرف ایک روایت ہے اور وہ بھی یہ کہ دارالحکومت دہلی کی زبان اس برِصغیر کے تمام شہروں سے بہتر ہے''[۴۱]۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لفظ 'اردو' کو اِس نظریے کی پیدائش کا مؤجب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اِس نظریے کی پیدائش میں لفظ (اردو) نے بھی بہت مدد پہنچائی ہے۔ کیوں کہ اردو کے معنی لشکر یا چھاؤنی کے ہیں جس میں

مختلف علاقوں کے فوجی مختلف زبانیں بولتے ہوئے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور اُن کو بھی باہمی تعلقات میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر وہی ضرورت پیش آتی ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اوّل اوّل مسلمان حملہ آوروں کو مغربی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پیش آئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ 'اردو' کا ہماری زبان کی پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ زبان تو ہندوستان میں کم از کم صدیوں پیش تر سے رائج چلی آ رہی تھی۔ شاہ جہان نے صرف یہ کیا کہ دہلی کے اُس مقام کی رعایت سے، جہاں یہ بولی جاتی تھی، اس کا نام 'اردو' رکھ دیا۔ [۴۲]

اسی طرح ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اردو زبان کے نام 'اردوئے معلّٰی' کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا ہے کہ اکثر علما اردو کو 'لشکری زبان' اس لیے قرار دیتے ہیں کیوں کہ ترکی زبان میں 'اردو' سے مراد 'لشکر' ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ زبان شاہ جہاں کے زمانے میں پیدا ہوئی اور اسی مناسبت سے شاہ جہاں کے مشہور بازار اردوئے معلّٰی کی وجہ سے اِس کا نام اردو پڑ گیا۔ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ اردو لشکری بولی نہیں نہ کسی لشکر کی کوئی خاص بولی ہوتی ہے اور نہ یہ شاہ جہاں کے دربار میں یا اِس کے عہد میں پیدا ہوئی۔ [۴۳]

اِس بیان کی وضاحت میں اپنی تصنیف 'ادب و لسانیات' میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مزید رقم طراز ہیں:

عرصے تک یہ غلط فہمی عام رہی کہ اردو لشکری زبان تھی جو مسلمان فاتحین نے اِس ملک پر مسلط کی لیکن اب اِس غلط فہمی کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔ شاہ جہاں کے بازار 'اردوئے معلّٰی' سے اس کا رشتہ بھی محض ایک فسانہ نکلا۔ حقیقت اِس کے برعکس ہے کہ اسے شہنشاہوں اور امیروں نے منہ بھی نہیں لگایا۔ وہ سب فارسی کے پرستار اور ایران کے عاشق تھے۔ جب مغلوں کا اقتدار شباب پر تھا، اُس وقت بھی دلّی کے دربار میں ایرانی شعرا فارسی قصائد کے صلے میں موتیوں اور سونے سے تولے جاتے تھے۔ اردو میں شعر کہنا مشاہیر شعرائے ہند کے بھی مرتبے سے کم کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ اِس طبقے کے لوگ اردو کی طرف مائل بھی ہوتے تھے تو محض تفنن طبع یا منہ کا مزہ بدلنے کے لیے۔ اردو کو جوان ہونے اور پروان چڑھنے کے لیے صوفیوں کی خانقاہیں، مبلغین کی مجلسیں اور اللہ والوں کی محفلیں تلاش کرنا پڑیں۔ ان کے بھی دربار تھے مگر شاہی دربار نہ تھے ۔ یہ عوام کے لیے کھلے تھے۔ یہاں شرافت کی زبان، ثقافت کی زبان اور تہذیب کی زبان کا سکّہ نہیں چلتا تھا۔ یہاں عوام کے دلوں میں اترنے کے لیے عوام کی بولی کا رواج تھا۔ چناں چہ اردو کی ابتدائی نشوونما میں سب سے زیادہ صوفیائے کرام ہی نے کام کیا ہے۔ [۴۴]

پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے بھی اکبر و شاہ جہاں کے ادوار کو اردو زبان کی پیدائش کا زمانہ قرار دیے جانے کی والے نظریات کی تردید کی ہے۔ وہ اپنی رائے کا ظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں، حقیقت سے بہت دور ہیں۔ ہمیں اِن کو صرف بزرگوں کے تبرّک کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے۔ ورنہ کیا اکبر اور شاہ جہاں سے پیش تر دلّی نہ تھی یا ہندو اور مسلمان نہ تھے۔ یا لوگ سودا سلف نہیں لیتے تھے۔ یا مختلف قومیں ایک جا رہ سہہ کر کاروبار کرنا نہیں جانتی تھیں۔ پھر اکبر یا شاہ جہاں کے عہد

کے ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اردو کی بنیاد رکھی جائے۔ [۴۵]

پروفیسر شیرانی کے درج بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دہلی کو اردو زبان کے آغاز وارتقا سے الگ تصور نہیں کرتے البتہ وہ اِس لسانی حادثے کو اکبرو شاہ جہاں کے ادوار سے منسوب نہ کرتے ہوئے اس کا سلسلہ ماقبل اُس وقت سے جوڑتے ہیں جب مسلمانوں نے پہلے پہل دہلی میں توطن اختیار کیا۔ اِس کے برعکس ڈاکٹر سہیل بخاری کسی بھی دور یا زمانے میں دہلی کو اردو زبان کے مقامِ آفرینش کی حیثیت سے قبول نہیں کرتے۔ان کی رائے ہے:

دلّی مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی راج دھانی رہی تھی۔اگر اردو دہلی یا نواحِ دہلی میں پیدا ہو کر ہمیشہ سے وہاں کی زبان چلی آ رہی تھی تو ہمیں اُس زمانے میں اِس زبان کے نمونے ملنا چاہئیں۔ [۴۶]

مزید واضح کرتے ہیں:

شاہ جہاں سے قبل دلی میں اردو کا سراغ نہیں ملتا۔اردو زبان وادب کی نشو نما میں البتہ دہلی کا بہت کچھ حصہ ہے لیکن وہ سب کا سب ۱۶۴۶ء کے بعد کا ہے۔اس لیے یہ کہنا کہ اردو دہلی میں پیدا ہوئی، تاریخی اعتبار سے بالکل غلط ہے۔اس سے قطعِ نظر نہ صرف نواحِ دہلی بلکہ خود شہر دہلی میں اردو آج بھی عوام کی زبان نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دہلی کی قدیم زبان ہریانی ہے۔جس کا سلسلہ شمال مغربی یو۔پی تک چلا گیا ہے اور جو پنجابی کی سگی بہن ہے۔ [۴۷]

اردو کی آفرینش کے ضمن میں ڈاکٹر سہیل بخاری 'دہلی' کے بجائے 'آگرہ' کی اہمیت واوّلیت کی طرف اہلِ علم وفکر کی توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں

:

اردو زبان کی تاریخ میں شہر آگرہ کو خاص اہمیت اور اوّلیت حاصل ہے۔جب تک آگرہ مغلوں کی راج دھانی رہا ہے، اِس میں اردو زبان کے چرچوں کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ۱۶۴۷ء میں پایۂ تخت دہلی کو منتقل ہوا اور وہاں پرانے شہر کے باہر آگرے سے جانے والوں کا محلّہ آباد ہوا تو اُن لوگوں کی زبان کو، جو اُس محلّے میں عام طور پر بولی جاتی تھی اور جو یقیناً آگرے کی زبان تھی اور یہیں سے اُن لوگوں کے ساتھ دہلی پہنچی تھی، دہلی کے پرانے شہر کی زبان (قدیم دہلوی) سے ممتاز و ممیّز کرنے کے لیے 'زبانِ اردوئے معلّیٰ' (زبان اردو محلّہ) کا نام دیا گیا۔ [۴۸]

دراصل ''اردو زبان کی تاریخ میں دہلی سے آگرہ کو دارالسلطنت کے منتقل ہونے اور اِس کے اثرات کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا۔حال آنکہ قدیم اردو کی اکثر گتھیاں اِس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھنے سے کھُل جائیں گی۔'' [۴۹]

ڈاکٹر سہیل بخاری کے بیانات سے اُن کا موٴقف واضح ہے کہ دہلی اور اس کے گرد ونواح کا علاقہ کبھی بھی اردو کی مرز بوم نہیں رہا، نہ اکبرو شاہ جہاں کے ادوار سے قبل اور نہ مابعد۔البتہ دہلی میں اِس زبان کا داخلہ شاہ جہاں کے ساتھ ہوا اور اِس کا نام 'اردو' عہدِ شاہ جہاں ہی میں رکھا گیا۔وہ معترف ہیں کہ اردو کے فروغ و رواج میں بلاشبہ دہلی کو بنیادی کردار حاصل رہا ہے۔یہاں تک کہ عہدِ شاہ جہاں میں راج دھانی بن جانے کے بعد دہلی میں جو لسانی انقلاب آیا اُس کے نتیجے میں قدیم زبانِ دہلوی (ہریانی) کو ترک کر کے جدید زبانِ دہلوی (اردو) کو اختیار کیا گیا۔ڈاکٹر صاحب کے اِس بیان کو سند شیخ سعداللہ گلشن کے اِس مشورے سے ملتی ہے:

دکنی زبان کو چھوڑ کر ریختہ کو شاہ جہاں آباد کی اردوئے معلّیٰ کے مطابق موزوں کیجیے۔ [۵۰]

(۳) تیسرے غلط تصور کے نتیجے میں اکثر علما اردو زبان کو برج بھاشا سے ماخوذ مانتے ہیں جو قطعاً درست نہیں۔ برج بھاشا کسی صورت بھی اردو سے مماثل نہیں۔ برج کو اردو کی اصل قرار دیے جانے والے بیانات دراصل بولیوں اور زبانوں کے صوتی و قواعدی تقابل و تجزیے سے قطع نظر سراسر قیاس کی بنیاد پر سامنے آئے یا پہلے سے موجود اسی نوع کے کسی نظریے کی تقلید کا شاخسانہ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ برج بھاشا کو اردو زبان کا ماخذ قرار دیے جانے والا نظریہ سب سے پہلے ہند آریائی لسانیات کے سب سے بڑے ماہر ہارنلے نے پیش کیا[۵۱]، البتہ اِس کی نشر و اشاعت مولانا محمد حسین آزاد نے کی۔ علمی حلقوں میں اس نظریے نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ اس کی ترویج میں زیادہ تر اُن اہلِ علم کا کردار نمایاں رہا جنھیں زبانوں کے مزاج، ان کے تغیر و تبدل اور ارتقائی تاریخ میں درک نہ تھا۔ اسی سبب مولانا آزاد کی تقلید میں وہ اردو کی ابتدا کو برج بھاشا سے منسوب کرتے رہے اور برج بھاشا کو عام طور پر اردو کی ماں سمجھا جانے لگا۔ اردو اور برج بھاشا کے اِس تعلق پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

> ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں لیکن جب اِن دونوں زبانوں کی صرف و نحو اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اِن کے راستے مختلف ہیں۔ اردو، جہاں اپنے اسما و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے، برج واؤ پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے، لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے۔ اردو میں مرکب افعال کا مع توابعات کے بہت رواج ہے۔ بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے۔ اس لیے اردو کا برج بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ اِن میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔[۵۲]

اسی طرح ڈاکٹر مسعود حسین خان کے مطابق:

> اِس میں شک نہیں کہ قدیم اردو کو جدید اردو میں تبدیل کرنے میں برج بھاشا اور آگرہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے لیکن اردو اور برج بھاشا کا رشتہ بیٹی اور ماں کا نہیں بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔[۵۳]

بلاشبہ اردو اور برج بھاشا میں اکثر لسانی مشابہتیں پائی جاتی ہیں مگر یہ مشابہتیں صرفی و نحوی اعتبار سے نہیں بلکہ سرمایۂ لغت کی بنا پر ہیں اور مشترک فرہنگِ الفاظ کو بنیاد بنا کر دنیا کی کسی بھی زبان کو کسی دوسری زبان سے ماخوذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِس لسانی نکتے کی وضاحت میں ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> اس میں شک نہیں اردو برج سے بہت قریب ہے۔ یہ قرب اِس امر کا ثبوت ہے کہ اردو اور برج اجنبی نہیں ایک دوسرے کی عزیز ہیں۔ دو زبانوں میں قرب جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی قرابت قریب کی ہوگی۔ لیکن قریب کی قرابت ماں بیٹی ہی میں نہیں دو بہنوں میں بھی ہوتی ہے۔ اس لیے دو زبانوں میں بہت زیادہ مشابہتیں دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ماں بیٹیاں ہیں، صحیح نہیں۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے رشتوں کے ٹھیک ٹھیک تعین میں مشابہتیں کام نہیں آتیں، وہ سرمایہ کام آتا ہے جو اِن زبانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا اور اِن میں اختلاف پیدا کر کے انھیں آزاد اور مستقل زبانیں بناتا ہے۔[۵۴]

'داستانِ زبانِ اردو' میں صفحہ ۵۵ تا ۶۳ ڈاکٹر شوکت سبزواری برج بھاشا اور اردو کی لسانی خصوصیات کے تقابلی جائزے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> برج اور اردو کی خصوصیات اِس امر کی گواہ ہیں کہ اردو کا لسانی سرمایہ زیادہ پیچیدہ اور بعض حیثیتوں سے زیادہ قدیم ہے، وہ برج سے کسی طرح بھی ماخوذ نہیں ہوسکتا۔[۵۵]

دراصل اردو اور برج بھاشا دونوں کا تعلق چوں کہ شورسینی اَپ بھرنش کی عوامی شکل 'مغربی ہندی' سے ہے لہٰذا دونوں میں مشابہتوں کا پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اِن مشابہتوں کی بنا پر یہ قیاس کرنا کہ ان میں سے کوئی ایک کسی دوسرے کے بطن سے پیدا ہوئی، غیر لسانی اور غیر مناسب ہے۔

پروفیسر حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر مسعود حسین خان اور دیگر محققین اردو اور ماہرینِ لسانیات نے برج بھاشا اور اردو کے تقابلی مطالعے اور لسانیاتی تجزیے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ اِن دونوں زبانوں میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں کا ہے۔ علاوہ ازیں ان دونوں زبانوں کی مشترک لسانی مماثلتوں کے ساتھ ساتھ اہلِ علم نے اُن اختلافات کی نشان دہی بھی کر دی ہے جس کی بنا پر مولانا آزاد اور اس نظریے کے تائید میں اُن کے متقدمین و مقلدین کے قیاس کو با آسانی باطل ٹھہرایا جا چکا ہے۔ اس حوالے سے حافظ محمود شیرانی رقم طراز ہیں:

> جب ہم اردو کے ڈول اُس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے، اور برج بھاشا کا رنگ اور ہے۔ دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلے میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلتِ قریبہ رکھتی ہے۔ برج سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لینا دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں برج سے اُس نے الفاظ مستعار لیے ہیں وہاں برج پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے، اور برج پر کیا موقوف ہے ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں۔ [۵۶]

حافظ محمود شیرانی کے درج بالا بیان کی تائید میں ڈاکٹر عین الحق فرید کوٹی لکھتے ہیں:

> جب ہم اردو زبان کی صرف و نحو کا پنجابی اور برج بھاشا کی صرف و نحو سے موازنہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جہاں اردو اور پنجابی کے درمیان گہرا رشتہ موجود ہے وہاں اس کے برج کے ساتھ اختلافات کی خلیج وسیع ہے۔ [۵۷]

ڈاکٹر سہیل بخاری نے بھی اپنی تصنیف 'اردو کا رُوپ' میں صفحہ ۶۱ سے ۶۵ تک برج اور اردو کے مابین لسانی اختلافات پر طویل بحث و تجزیے کے بعد مولانا آزاد کی تردید کی ہے، البتہ یہ بات سچ ہے کہ ''اردو اور برج کے اختلافات کے باوجود سکندر لودھی کے زمانے سے لے کر شاہ جہاں کی تبدیلیِ دارالسلطنت (۱۶۴۷ء) تک اردو کے ارتقا میں بلاشبہ برج بھاشا کا بڑا ہاتھ رہا ہے'' [۵۸]۔

احتشام حسین بیان کرتے ہیں:

> اردو کا برج بھاشا سے نکلنا اِس بنا پر صحیح نہیں ہے کہ دونوں زبانیں ایک ہی زمانے میں پیدا ہوئیں۔ دونوں کے مزاج میں فرق ہے، البتہ اِس قدر صحیح ضرور ہے کہ برج بھاشا نے اردو کو متاثر کیا۔ [۵۹]

اردو کے قدیم ادب پر برج بھاشا کے اثرات ثابت کرتے ہیں کہ اس نئی زبان کی تشکیل میں برج بھاشا کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ برج بھاشا نے اردو کے ارتقا میں اگر چہ بنیادی کردار ادا کیا اور اُس پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے لیکن اس کے باوجود اُس کا ساختیاتی ڈھانچا اردو سے مماثل نہیں جس کی بنا پر اردو کا برج بھاشا سے ماخوذ ہونا لسانیاتی نقطۂ نظر سے درست نہیں۔ تاہم ہارنلے، آزاد اور اس نظریے کے حامل دیگر مصنفین کے ذہنوں میں اِس خیال کا پیدا ہونا دو وجوہ کی بنا پر ہے:

☆ اوّل برج بھاشا کی امتیازی حیثیت اور غیر معمولی اہمیت و مقبولیت: بلاشبہ برج بھاشا کو نواحِ دہلی کی تمام بولیوں میں خاص مرتبہ و مقام حاصل تھا۔ اہلِ علم اس کی اہمیت و مقبولیت سے بہ خوبی واقف تھے۔ اِن کا اردو کو برج بھاشا سے منسوب کرنا فطری بات تھی اور خاص طور پر ایسی صورت میں

جب کہ انھیں علمِ لسانیات اور لسانیاتی تحقیق کا درک نہ تھا

☆ دُوم آگرے کا پایۂ تحت قرار پانا: مولانا آزاد اور اُن کے ہم خیال مصنفین کو جس چیز نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اردو برج بھاشا سے ماخوذ ہے، وہ شہر آگرہ کی تاریخی اہمیت تھی۔ برج بھاشا کے بنیادی گڑھ 'متھرا' سے آگرہ کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں اور آگرہ ہی کو مغل بادشاہوں کی 'ابتدائی راج دھانی' کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ آگرہ تقریباً دوسو برس تک ہندوستان کا دارالسلطنت رہا ہے۔ بالخصوص مغل بادشاہوں، اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں کے ابتدائی عہد میں، جب کہ ہندوستانی تہذیب کی بنیادیں استوار ہوئی تھیں، اسے خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ اِن شاہی ادوار میں آگرہ کی زبان برج بھاشا کو صحیح معنوں میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اس کے برعکس ''آزاد نے اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ زبانِ دہلوی کی اساس پر اردو کا ارتقا ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے قیام سے پہلے عمل میں آ چکا تھا اور اکبر و جہاں گیر کے عہد کے دوران میں یہ بہ ذاتِ خود آگرہ شہر میں رائج تھی۔''[۶۰]

آزاد نواحِ دہلی میں مستعمل مختلف بولیوں کے باریک لسانی وساختیاتی اختلافات سے ناواقف تھے۔ بالخصوص اردو اور برج بھاشا کے بنیادی اختلاف 'آ' اور 'او' کی تقسیم اُن کے پیشِ نظر نہیں تھی۔ اسی سبب ڈاکٹر گیان چند جین واشگاف الفاظ میں مولانا آزاد کے نظریے کی تردید میں لکھتے ہیں:

> ۔۔۔ اردو اور برج بھاشا میں متعدد اختلافات ہیں جن میں سے اہم ترین یہ ہے کہ اردو میں 'آ' کا لہجہ غالب ہے، برج میں 'او' کا۔ اردو کو تشدید سے عار نہیں جب کہ برج میں یہ شاذ ہے۔ دونوں کے اصولِ صرف، ضمائر وغیرہ میں کافی فرق ہے۔ انھیں شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' میں، ڈاکٹر مسعود حسین خان نے 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' میں اور ڈاکٹر شوکت سبز واری نے 'داستانِ زبانِ اردو' میں تفصیل سے دکھایا ہے۔[۶۱]

اسی طرح رام بابو سکسینہ اردو کے برج بھاشا سے ماخوذ ہونے کو اِن الفاظ میں ردّ کرتے ہیں:

> برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دینا، جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے، صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اِس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اِس کے جوانب میں بولی جاتی تھی، وہ اس بھاشا سے جو اطرافِ دہلی میں بولی جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی تھی مگر پھر بھی وہ پراکرت کی ایک علاحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دلّی بھاشا ہماری خیال میں اردو کی اصل سمجھی جا سکتی ہے۔ اردو کا اصل ماخذ وہ زبان ہے جو دلّی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے اور مغربی ہندی اپنی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی۔[۶۲]

برج بھاشا کے رواج اور برج کے علاقے کی حدود کے تعین کی بابت مولانا آزاد اور اُن کے مقلدین کی غلط تفہیم اور نظریے کے دیگر تسامحات کی نشان دہی کرتے ہوئے پروفیسر حبیب اللہ خان غضنفر بیان کرتے ہیں:

> ۔۔۔ اردو کے متعلق یہ کہنا کہ برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا متھرا کی زبان ہے، غلط ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک برج کا علاقہ متھرا کے ہر چہار طرف چوراسی چوراسی کوس تک ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مغربی یو۔ پی کا بڑا حصہ اور مغرب کی طرف مشرقی پنجاب اور راجپوتانہ اور جنوب میں بندیل کھنڈ تک اس کی حدود ہوں گی مگر اس کے مشہور شہر متھرا، گوکل اور برندابن کے نام لیے گئے ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ برج تھا تو متھرا اور اس کے مضافات کا علاقہ مگر مبالغہ کے طور پر اس کو چوراسی

کوس کہتے تھے ورنہ اس وسیع علاقے میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ برج بھاشا جس زبان کو سمجھا جاتا ہے وہ صرف متھرا کے محدود علاقے کی زبان ہے اور اگر آزاد کا مفہوم یہ ہو کہ اس وسیع رقبے کی ہر زبان اردو کا ماخذ ہے تو ایک حد تک درست ہے مگر آزاد کے عہد میں یہ مفہوم نہ تھا۔ [۶۳]

''یہ نظریہ دراصل اِس عقیدے پر مبنی ہے کہ قدیم زمانے میں دہلی میں برج بھاشا رائج تھی۔ حال آنکہ آج دہلی برج کے علاقے سے فاصلے پر واقع ہے۔ ممکن ہے کہ مسلم عہد سے پیش تر دہلی میں برج بھاشا مستعمل ہو لیکن اردو پر برج کے اثرات کی توجیہ اور طرح سے کی جاتی ہے۔'' [۶۴]

(۴) چوتھے غلط تصور کی بنیاد محققین کے اِس عقیدے پر ہے کہ برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد ہی اردو زبان کی پیدائش کا مؤجب بنی، یعنی مسلمانوں کے ورودِ برِصغیر سے قبل اردو کوئی زبان نہیں تھی۔ گویا ''مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے اور اُن کا ربط وضبط یہاں کے مقامی لوگوں سے ہوا تو فاتح اور مفتوح کی زبانوں نے مل کر ایک نئی زبان کا رُوپ دھارا اور اس طرح اردو وجود میں آئی'' [۶۵] ۔ یہ غلط فہمی تین وجوہ کی بنا پر ہے۔''
ایک وجہ اردو کا عربی فارسی سرمایہ ہے۔ ہندو پاک کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں اردو کا دامن عربی و فارسی الفاظ وتراکیب سے لبریز ہے اسی سبب اہلِ علم یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ اردو اسلامی دور میں اسلامی اثرات میں بنی اور وہ اردو کی ابتدا کو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور اِن کے قیام واقتدار سے منسوب کرنے لگے'' [۶۶] ۔ دُوُم ''ابتدا ہی سے اردو زبان عربی فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہے۔ اس کی صوتیات میں عربی فارسی آوازیں 'خ، ز، ف، ق، غ' داخل ہیں۔ اس پر عربی فارسی لسانی اثرات محض اتفاق نہیں جیسا کہ بنگالی، مرہٹی یا ہندی میں پائے جاتے ہیں بلکہ یہاں اِن کی نوعیت بنیادی اور ترکیبی ہے، جن سے قطعِ نظر اردو زبان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ عربی فارسی عناصر نے اِس زبان کو اِس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ انیسویں صدی کے زیادہ تر محققین نے اُس بولی کو پہچاننے میں لغزش کی ہے جو اردو کی تہ میں موجود ہے اور جس کے ذریعے اس کا رشتہ قدیم ہند آریائی تک پہنچتا ہے'' [۶۷] ۔ اس غلط فہمی کی تیسری وجہ ''مسلمانوں کا وہ سرپرستانہ اور مربّیانہ سلوک ہے جو انھوں نے اردو کے ساتھ روا رکھا۔ اردو مسلمانوں کے فتحِ دہلی سے پہلے دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی اور برج یا اودھی کا مقابلے میں گری پڑی پسماندہ اور برخاک افتادہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے اٹھا کر اسے سینے سے لگایا اور نوک پلک سے درست کر کے اس قابل بنایا کہ اس کے ذریعے شاعرانہ خیالات کا اظہار ہو سکے۔ اس میں علمی اور فنی کتابیں لکھی جا سکیں۔ مسلمان جہاں گئے اردو اِن کی ہم رکاب رہی'' [۶۸] ۔ گویا ''مسلمانوں کے عہد میں اردو کو نکھرنے اور سنورنے کے مواقع دست یاب ہوئے جس کی وجہ سے اکثر علما نے اِسے مسلمانوں کی 'ساختہ پرداختہ' قرار دیا۔'' [۶۹]

اردو زبان اور مسلمانوں کے باہمی ربط کی صریح وضاحت ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اِس بیان سے بہ خوبی ہو جاتی ہے:

اردو کا مسلمانوں سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ وہ مسلمانوں کی 'ساختہ' نہ سہی 'پرداختہ' ضرور ہے۔ عہدِ شاہ جہانی تو اس کے شباب کا زمانہ تھا۔ شہاب الدین غوری جب فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوا تو اردو مولانا آزاد مرحوم کے لفظوں میں دلّی کی گلیوں میں گھٹنوں چلتی تھی۔ مسلمانوں نے اُٹھا کر اسے سینے سے لگایا۔ پال پوس کر چونچال بنایا۔ دل فریب ادائیں سکھائیں۔ مسلمانوں سے پہلے غوں غاں کرتا یا زیادہ سے زیادہ تتلا تتلا کر باتیں کرتا بچہ مسلمانوں کی آغوشِ تربیت میں پہنچ کر زبان کے جوہر دکھانے لگا۔ یہ مسلمانوں کی نگہ داشت اور پرداخت کا اثر تھا۔ لیکن یہ سمجھنا کہ مسلمانوں کی برِصغیر ہند میں آمد سے پہلے اردو کا وجود ہی نہ تھا، ہندو اور مسلمانوں کے میل جول نے اسے جنم دیا، کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ [۷۰]

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مسلمان یہ زبان باہر سے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے اور نہ ہی برِصغیر میں مسلم اقوام کے داخل ہوتے ہی دفعتاً اسے نافذ کر دیا گیا تھا۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنے مقالے بہ عنوان 'قومی زبان: چند حقائق، چند مسائل' میں بیان کرتے ہیں:

> یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ اردو مسلمانوں کے ساتھ باہر سے نہیں آئی بلکہ یہ اسی ملک کی ایک بولی ہے جو مسلمانوں کی سر پرستی میں پروان چڑھی۔ اردو کو ہند آریائی خاندان کی ایک اہم زبان مانا جاتا ہے اور آریائی زبانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ بلکہ ہم تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آریاؤں کی آمد سے قبل بھی اس خطے میں لوگ بستے تھے اور کوئی زبان بولتے تھے جس کا اب ہمیں کوئی علم نہیں۔ ہمارا لسانی علم تو رِگ وید اور اوستا سے شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کی اِس خطے میں بسنے والی قدیم اقوام کی زبانیں اور اِن کے لہجے نئی نسلوں اور قوموں میں جذب ہو گئے اور پھر یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا تا آنکہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل اسلام اور مسلمانوں کی آمد سے یہاں پھر ایک سماجی انقلاب آیا۔ سماجی زندگی پر اِس انقلاب کے ہمہ گیر اثرات ہوئے جن کی ایک صورت زبان یا زبانوں کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ [۷۱]

اِس امر کی وضاحت میں وارث سرہندی لکھتے ہیں:

> کسی بھی زبان کی بنیاد کوئی باہر کی زبان نہیں ہو سکتی۔ جو زبان جس ملک میں پیدا ہوئی ہو، اس کی بنیاد اُس ملک کی کوئی زبان اور مقامی بولیاں ہو سکتی ہیں۔ چوں کہ اردو کا مولد و منشا برِعظیم پاک و ہند ہے اس لیے لامحالہ اردو کی بنیاد سنسکرت اور دوسری پراکرتیں ہو سکتی ہیں۔ رہا غیر زبانوں سے الفاظ کا اخذ و قبول تو یہ ثانوی بات ہے اور زندہ زبانوں میں یہ لین دین ہوتا ہی رہتا ہے۔ [۷۲]

اردو لغت کا وسیع سرمایہ عربی و فارسی الفاظ پر مبنی ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ لسانی تاریخ شاہد ہے کہ زبانیں اپنے ارتقائی مراحل میں دیگر زبانوں سے اخذ و استفادہ کرتی رہتی ہیں۔ الفاظ کا لین دین زبانوں کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی و عربی الفاظ و تراکیب بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر لینے کے باوجود اردو کا مزاج ہند آریائی ہی رہا۔ اس امر کی مزید وضاحت میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ اپنی تصنیف 'اردو زبان کی تاریخ' میں رقم طراز ہیں:

> لسانیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ زبان اپنی اصل، اپنی ساخت و بنیاد نیز اپنے اصول و قواعد سے پہچانی جاتی ہے نہ کہ اپنے سرمایۂ الفاظ (بالخصوص مفرد الفاظ) سے۔ کسی زبان میں غیر زبانوں کے الفاظ کی موجودگی سے اِس زبان کے بنیادی ڈھانچے میں کسی قسم کا فرق پیدا نہیں ہوتا۔ فرہنگِ آصفیہ (سیّد احمد دہلوی) میں مندرج تمام الفاظ کی تعداد ۵۴۰۰۹ بتائی گئی ہے۔ اِن میں عربی کے ۷۵۸۴ اور فارسی کے ۶۰۴۱ الفاظ شامل ہیں جن کی مجموعی تعداد ۱۳۶۲۵ ہے اور اِن کا تناسب ۲۳ فی صد ہے۔ اگر اردو میں ۹۰ یا ۹۵ فی صد الفاظ عربی اور فارسی زبانوں کے پائے جاتے تب بھی یہ زبان سامی یا ایرانی نہ کہلاتی بلکہ ہند آریائی ہی رہتی، کیوں کہ اردو زبان کے اصلی یا بنیادی سرمائے یا اِس کے ترکیبی اجزا، جن سے اِس زبان کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے، کا تعلق ہند آریائی سے ہے۔ نیز وہ قدیم زبان جس سے اردو نے ارتقا پایا، ہند آریائی ہے۔ [۷۳]

زندہ و متحرک زبان کی حیثیت سے اردو نے بلاشبہ دیگر متعدد دیسی و بدیسی زبانوں کے الفاظ و تراکیب سے اپنے ذخیرۂ لغت کو وسیع و وقیع بنایا مگر اِس

کے ساختیاتی نظام کی بنیاد اُسی ایک قدیم آریائی بولی پر ہے جو اس کی اصل واساس ہے۔

واضح رہے کہ اردو کی پیدائش سے متعلق قریباً تمام قیاسی نظریات در حقیقت ' قیاسی بیانات' ہیں کہ جنھیں ضبطِ تحریر میں لانے والوں کا تعلق اردو ادب سے ضرور تھا مگر نہ تو وہ علم اللسان کے ماہر تھے اور نہ ہی لسانیاتی تحقیق کی زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ لہٰذا اردو زبان کے آغاز وارتقا کے ضمن میں اِن کے مباحث کی حقیقت 'نظریات' سے کہیں زیادہ 'قیاسات' کی ہے۔

نیم سائنسی نظریات

بعض دوسرے اہم مسائل کی طرح اردو زبان کی پیدائش کا قضیہ بھی ماہرینِ لسانیات کے لیے ہنوز تصفیہ طلب ہے۔ ابتدائی لسانیاتی مصنفین میں سے بیش تر نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے تہذیبی اور لسانی اختلاط کو اردو زبان کی پیدائش کا مؤجب قرار دیتے ہوئے زیادہ تر دہلی کو اس کا مؤلد ٹھہرایا۔ بعد کے علما و محققین اپنی تحقیقی مہارت، گہرے مطالعے اور علمی تجرّ کے باوجود خود کو مخلوط نظریے کے سحر سے آزاد نہیں رکھ سکے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اردو کی پیدائش بیرونی مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کی زبان کے میل ہی سے مشروط ہے تو اس کی تخصیص دہلی اور عہدِ شاہ جہاں ہی سے کیوں کی جائے۔ اِس اصول کا اطلاق اُن دوسرے مقامات اور وہاں مستعمل زبانوں پر کیوں نہ کیا جائے جہاں مذکورہ دونوں اقوام کا تہذیبی ولسانی اختلاط ما قبل عمل میں آیا۔

اردو زبان وادب کی علاقائی تہذیب کا تنازعہ ۱۹۲۳ء میں اُس وقت شروع ہوا جب نصیرالدین ہاشمی کی تصنیف 'دکن میں اردو' منظرِ عام پر آئی[۴۷] اور اِس طرح قریباً تمام علاقوں میں اردو زبان وادب کی تحقیق وتنقید کا آغاز ہو گیا۔ گویا سب سے پہلے نصیرالدین ہاشمی نے ایک مخصوص علاقے (دکن) سے متعلق لسانی مواد یک جا کر کے اپنی تصنیف کو اِس نوع کی لسانی تصنیفات کا پیش رو مقرر کر دیا۔ بعد ازاں اِس کی تقلید میں ایسی تخلیقات کا سلسلہ شروع ہوا جس میں اردو زبان کا تعلق کسی نہ کسی علاقے سے ظاہر کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ نصیرالدین ہاشمی نے 'دکن میں اردو' کے تحت جنوبی ہند میں اردو ادب کی روایت اور مباحث کو سمیٹا ہے اور یہ سچ ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقات میں کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ دکن اردو کی جنم بھومی ہے یا برِصغیر میں پہلے پہل اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ البتہ اِس غلط فہمی میں مبتلا برِصغیر کے دیگر محققین مختلف مقامات کو پورے استدلال کے ساتھ اردو زبان کے مؤلد قرار دینے کا دعویٰ کرنے لگے۔ ان دعوؤں کے پسِ پشت ایسے ایسے محققین کے چہرے نظر آتے ہیں جن کی شخصیتیں ہر نہج واعتبار سے مسلّم ہیں اور ان کے دلائل وبراہین سے کسی طرح صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اردو لسانیات میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کو کسی خاص خطے سے منسوب کرنے کی باقاعدہ روایت موجود ہے۔ اِس روایت کے پیش رو تین اہم نظریات کی تفصیل مع تنقید ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

دکن میں اردو زبان کی ابتدا:

عام تاثر یہ ہے کہ دکن میں اردو زبان وادب کے ارتقائی مدارج پر مبنی مباحث کا آغاز نصیرالدین ہاشمی نے کیا، لیکن یہ درست نہیں۔

☆ سب سے پہلے نواب نصیر حسین خان خیال کی تصنیف 'داستانِ اردو' (۱۹۱۶ء) میں یہ مباحث ملتے ہیں[۴۵]۔ نصیر حسین خان خیال دکن میں اردو زبان و ادب کے آغاز وارتقا پر اپنے خیالات کو اس بیان پر منتج کرتے ہیں:

> اردو کی ہزار سالہ تاریخ اب آپ کے پیشِ نظر ہے اور اس کے ملاحظہ کے بعد خیال کیا جاتا ہوگا کہ جس زبان کو بابر نے منہ نہ لگایا اور جو شاہ جہاں کی چہیتی کہلائی، اُس کا جوڑ ادہلی کے لال قلعہ میں قطع ہوا ہوگا۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا، لیکن ایسا ہوا نہیں اور اس کے برخلاف اس کا جامہ دکن اور وہاں کے معمولی گھر میں تیار ہوا۔ فارسی وہاں مٹ چکی تھی اور ملکی زبان (دکھنی) اُس کی جگہ لے چکی تھی۔ اظہارِ جذبات کی ضرورت جس وقت عام اور ناگزیر ہوئی اُس وقت اسی نئی اعلیٰ دکھنی اردو سے وہ

ضرورت پوری کی گئی اور اس طرح اس ایجاد نے جنوب کو شمال پر فوقیت دے کر افضلیت کا تاج دکھنی اور دکن کے سر پر رکھ دیا۔[76]

درج بالا بیان میں نصیر حسین خان خیال نے دکن میں اردو کے ادبی روپ کے ارتقا پر اپنے مؤقف کی وضاحت کی ہے۔ بیان سے ایسا واضح تاثر نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ دکن میں 'اردو زبان کی ابتدا' کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔

برِ صغیر کی تاریخی لسانیات اس حقیقت پر دال ہے کہ اردو زبان کا خمیر جنوبی ہند سے بہت پہلے شمالی ہند میں، جہاں فارسی کا دور دورہ تھا اور سرکاری و درباری سرپرستی فقط فارسی ہی کو حاصل تھی، تیار ہوا۔ بعد ازاں بازار ہاٹ میں بولی اور سمجھی جانے والی یہ عوامی زبان ترک نژاد مسلم فاتحین اور امیرانِ صدہ کے ہم راہ جنوبی ہند میں داخل ہوئی۔ گجرات و دکن نے اِسے مقامی بولیوں اور حکم ران طبقے کی ترک زبان کے مقابلے میں 'رابطے کی زبان' کی حیثیت سے قبول و منظور کیا۔ ''یہ فاتح جو زبان دکن میں لے کر آئے تھے وہ یہاں آزادانہ نشوونما حاصل کرنے لگی کیوں کہ اس کے مقابل کوئی اور زبان، جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے، یہاں نہیں تھی۔''[77]

☆ اردو ماہرینِ لسانیات میں یہ غلط قیاس عام ہے کہ **مولوی نصیر الدین ہاشمی (۱۸۹۵ء۔۱۹۶۴ء)** نے دکن کو اردو کا مؤلد قرار دیتے ہوئے جنوبی ہند میں اردو زبان کی ابتدا کا نظریہ پیش کیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطالعے کی رو سے '**دکن میں اردو**' کے پہلے ایڈیشن، مطبوعہ **۱۹۲۳**ء میں اردو زبان کے آغاز سے متعلق نصیر الدین ہاشمی نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ البتہ اِس تصنیف کے تیسرے ایڈیشن، مطبوعہ **۱۹۳۶**ء میں انھوں نے حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تحقیقات کے پیشِ نظر اردو پر لسانی بحث کو مختصراً قلم بند کیا ہے۔[78]

نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف میں 'دکنی نثر کی ابتدا' کے عنوان کے تحت رقم طراز ہیں:

> اس امر کا بھی کوئی قطعی ثبوت نہیں ملا کہ شمالی ہند میں اردو احاطۂ تحریر میں کب آئی مگر بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتدا پہلے ہوئی اور یہاں ہی وہ بول چال کے ابتدائی مدارج سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آئی۔[79]

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تصنیف 'لسانی رشتے' کے صفحہ نمبر ۸۰ پر اس قول کو نقل کر کے دکن میں اردو کی پیدائش کے قضیے کو ایک طرح سے زبردستی نصیر الدین ہاشمی کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے جب کہ ہاشمی کے منقولہ قول سے اس امر کا اظہار نہیں ہوتا۔ انھوں نے دکن میں اردو کے تحریری آغاز کا دعویٰ ضرور کیا ہے جو بلاشبہ درست ہے۔ ان کے بیان کا آخری حصہ، جس سے ڈاکٹر گیان چند جین غلط فہمی کا شکار ہوئے، یہ ہے:

> ۔۔۔اور یہاں ہی وہ بول چال کے ابتدائی مدارج سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آئی۔

ظاہر ہے دکن میں منتر پڑھ کر ایک دم ہی سے اردو کا آغاز تو ہوا نہیں ہوگا۔ یقیناً اِک عرصہ وہ بول چال کی سطح پر رائج رہنے کے بعد ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہو گی، جیسا کہ زبان کے ارتقائی مراحل میں ہوتا ہے۔ 'دکن میں اردو بول چال کے ابتدائی مدارج' سے ڈاکٹر گیان چند جین نے غالباً 'برِ صغیر میں اردو کی ابتدا' مراد لی جو اس غلط فہمی کا سبب بنی۔ حال آنکہ بعد میں ڈاکٹر گیان چند جین نے اس حقیقت کو قبول کیا ہے کہ ''شاید وہ یہاں اردو کے تحریری روپ ہی کر ذکر کر رہے ہیں''[80] مگر یقین سے نہیں بلکہ شک کی بنیاد پر۔ اس وضاحت کے بعد اُن ناقدین اور ماہرین کے بیانات کی وقعت باقی نہیں رہ جاتی جو نصیر الدین ہاشمی اور 'دکن میں اردو' کی پیدائش کی تردید میں سامنے آئے۔

نصیر الدین ہاشمی کی لسانی فکر کے ارتقا کا مطالعہ '**دکن میں اردو**'، مطبوعہ **۱۹۳۶**ء میں مندرج بیانات کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ اپنی تصنیف میں وہ ابتداً

اردو کی پیدائش کے مدعی مقامات اور اِس ضمن میں اُس دور کے مروجہ لسانی نظریات کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر اپنے مطالعے کی روشنی میں انھیں فرداً فرداً رد کرتے چلے جاتے ہیں۔ 'پنجاب میں اردو' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> پنجاب کے مولد ہونے کے متعلق مؤلف 'پنجاب میں اردو' مولانا محمود شیرانی نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے مگر جب تک مسعود کا ہندی دیوان دست یاب نہ ہو ان کی تحقیقات کو صحیح نہیں کہا جا سکتا اور جیسا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری کی رائے ہے 'پنجابی زبان اردو کی ماں نہیں ہو سکتی، بلکہ بہن ہو سکتی ہے'۔ [۸۱]

نصیر الدین ہاشمی چوں کہ ماہرِ لسانیات نہیں تھے اور نہ ہی لسانی مبادیات کا درک رکھتے تھے اسی سبب اُس دور کے ماہرین کی آرا و بیانات کے پیشِ نظر وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اردو زبان کی پیدائش ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی و لسانی اختلاط کا نتیجہ ہے اور اگر ایسا ہے تو پنجاب میں ورود سے بہت پہلے مسلمان فاتحین و تجار سندھ اور دکن کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

> یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا دکن اور سندھ سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا، کیوں کہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی۔ [۸۲]

مسلمانوں اور ہندوؤں کے لسانی اختلاط کے پیشِ نظر نئی زبان کے معرضِ وجود میں آنے کے حوالے سے نصیر الدین ہاشمی سندھ اور دکن کے تقدّم کی بات تو کرتے ہیں مگر ان کا ذہن اور مطالعہ اِس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ سندھ میں اردو کی ابتدا پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> سندھ کی اسلامی حکومت کا آغاز ۷۱۲ء سے ہو چکا تھا اور صدیوں تک وہ یہاں حکومت کرتے رہے۔ حکومت کی رواداری اور ہندو مسلمانوں کے عام طور سے ملنے جلنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع پیدا ہو گئے۔ ان حالات کے مدِنظر اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتزاج سے جو زبان بنی اس کا آغاز اسی مقام سے ہوا ہے تو غلط نہیں ہو سکتا، لیکن جو تحقیقات ہوئی ہیں اس کے لحاظ سے یہ صحیح نہیں ہو سکتا کیوں کہ ان فاتحوں کی اصلی زبان عربی تھی اس لحاظ سے جو زبان عالمِ وجود میں آئی وہ عربی اور سوراسینی (شورسینی) سے مشترک ہوتی، مگر چوں کہ اس میں فارسی کا حصہ زیادہ ہے اس لیے ہم یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اردو کی ابتدا سندھ سے نہیں ہوئی۔ [۸۳]

درج بالا بیان سے ظاہر ہے کہ نصیر الدین ہاشمی کو سرزمینِ سندھ میں بیرونی مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کے مابین تبادلۂ خیالات اور دیگر معاملات نمٹانے کی غرض سے اِک 'نئی زبان' کا وجود تسلیم ہے، لیکن وہ یہ قبول نہیں کرتے کہ عرب فاتحین کی زبان، عربی اور مقامی دیسی پراکرت کے اختلاط سے جو نئی زبان وضع ہوئی وہ 'اردو' تھی۔ چناں چہ سندھ میں اردو کی ابتدا کو رد کرتے ہیں اور دکن کو رخ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> جب مسلمانوں نے مدتوں دکن میں بود و باش کی اور حکومت قائم کی، تجارت کی، مذہب کی اشاعت کی، تعلیم دی۔ ان کا اُٹھنا بیٹھنا یہاں کے ملکی اور دیسی باشندوں کے ساتھ تھا تو ظاہر ہے کہ ایک خاص زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا، جو دونوں غیر قوموں کے لیے تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہوتی۔ اس لحاظ سے جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے وہ بہت بڑی حد تک صحیح ہو سکتا ہے مگر جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے ہیں۔ اس

لیے سرِ دست ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔[84]

گویا نصیرالدین ہاشمی سندھ میں اردو کی ابتدا کے حوالے سے جن تحفظات کا اظہار کرتے ہیں انھیں کے پیشِ نظر وہ دکن کو بھی اردو کی جائے پیدائش کی حیثیت سے قبول کرنے سے قاصر ہیں۔ ''درحقیقت اردو کا دکن میں پیدا ہونا کسی بھی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کیوں کہ جنوبی ہند کے بحری راستوں سے جو عرب یا عرب مسلمان دکن میں آئے تھے ان کا زیادہ تر سابقہ دراوڑی خاندان کی زبانوں، مثلاً ملیالم، تامل، کنٹریا ان کی قدیم شکلوں سے پڑا۔ دراوڑی زبانوں اور عربی (جو ایک بالکل علاحدہ سامی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے) کے میل سے ایک ایسی زبان کا معرضِ وجود میں آنے کی بات سوچنا جو ایک تیسرے لسانی خاندان ہند آریائی سے تعلق رکھتی ہو محض قیاس آرائی ہی ہوسکتی ہے۔''[85]

پنجاب، سندھ اور دکن کو اردو کا مولد ہونے کے دعوے سے خارج کرتے ہوئے نصیرالدین ہاشمی اس ضمن کی چوتھی دعوے دار وادی 'دوآبہ گنگ وجمن' کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس کے صحیح یا غلط کا فیصلہ آئندہ ماہرین کی لسانی تحقیقات کے کاندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔[86]

نصیرالدین ہاشمی کو بہ خوبی یہ احساس ہے کہ شمال اور پھر بعدازاں دہلی سے آنے والے مسلم فاتحین اپنے ساتھ ایک زبان (جو یقیناً اردو کی کوئی ابتدائی صورت تھی) لے کر آئے تھے۔ چناں چہ اس امر کے اعتراف میں وہ شمال تا جنوب 'نئی زبان' (اردو) کے ارتقائی سفر کا مختصر حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مسلمان فاتحین شمال کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو اوّل مسلمانوں نے پنجاب میں قیام کیا مگر اس کے بعد دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ مسلمانوں کے صدہا خاندان جو ترک، مغل اور افغان تھے، جن کی زبان عام طور پر فارسی تھی، پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہو گئے۔ اُس زمانے میں یہاں 'جدید ہند آریائی دور کی پراکرت' زبان بولی جاتی تھی۔ اس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور اس امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی۔ شمال کے فاتحین نے جب ۱۱۹۲ء میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کر لی تو یہ نئی زبان بھی اپنے ساتھ لائے۔ اس سرزمینِ برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رخ کیا۔۔۔ یہ فاتح جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشوونما حاصل کرنے لگی، کیوں کہ اس کے مقابل کوئی اور زبان، جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے، یہاں نہیں تھی۔۔۔ اس طرح یہ زبان دیسی اور بدیسی دونوں نے استعمال کی۔ ۔۔ اس طرح جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا۔ عام طور سے ہر شخص اس کو بولنے لگا اور وہ کام کاج میں بھی آنے لگی۔[87]

نصیرالدین ہاشمی کے دکھائے گئے اردو زبان کے اس ارتقائی سفر سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کچھ تحفظات کی بنا پر حافظ محمود شیرانی کی طرح اگرچہ واشگاف الفاظ میں پنجاب کو اردو کا مولد قرار دینے سے گریزپا ضرور ہیں مگر بین السطور ان کی مراد یہی ہے۔ اُن کے بیانات کے تجزیے سے یہ بھی روشن ہے کہ وہ سرزمینِ دکن کو اردو کے مقامِ پیدائش کی حیثیت سے نہیں دیکھتے۔ ''نصیرالدین ہاشمی چوں کہ شیرانی کی طرح نظریہ ساز نہیں تھے اس لیے انھوں نے ایک سچے محقق کے مانند شواہد کی عدم دست یابی کی بنا پر کوئی غلط دعویٰ نہیں کیا، لیکن حیرت کا مقام ہے کہ لسانیات کی سبھی کتب میں 'دکن میں اردو' کا اس انداز میں تذکرہ کیا جاتا ہے گویا ہاشمی نے قطعی طور پر دکن کے اردو کا مولد ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا۔''[88]

☆ ۱۹۷۰ء میں 'دکنی کی ابتدا' کے عنوان سے دکن سے تعلق رکھنے والی محقق، ڈاکٹر آمنہ خاتون کا مقالہ شائع ہوا جس میں انھوں نے اردو کو دکنی سے علاحدہ

زبان قرار دیا ہے۔ آمنہ خاتون کی تحقیقات کے مطابق مسلمانوں کے دہلی پہنچنے سے کم از کم ساڑھے پانچ سو سال قبل دکن میں مرہٹی (مراٹھی) زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے دکنی کی داغ بیل پڑنا شروع ہوگئی تھی [۸۹]۔ دکنی کی ابتدا سے متعلق ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

> تاریخ شاہد ہے کہ بندرگاہ تھانہ پر قبضے (۶۳۶ء) کے زمانے سے دولت آباد کے پایۂ تخت قرار پانے (۱۳۲۷ء) کے زمانے تک مہاراشٹر کے مسلمانوں کی زبان پہلے بلاشبہ اس کی مقامی پیداوار مراٹھی تھی اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ شورسینی اَپ بھرنش اور مرہٹی میں عربی اور فارسی کی سات سو سال کے عرصے میں بہ تدریج آمیزش اور پڑوس کی جدید آریائی زبانوں سے لین دین اور راہ و رسم کی وجہ سے مرہٹی کے دوش بہ دوش دکنی کی نشو و نما ہوئی۔ [۹۰]

ڈاکٹر آمنہ خاتون بنیادی طور پر اردوئے قدیم (دکنی) اور اردو میں کوئی لسانی ربط نہیں دیکھتیں۔ انھوں نے واضح طور پر دکنی کو اردو سے ایک علاحدہ زبان قرار دیا ہے جو ابتدا ہی سے اپنے ارتقائی سفر میں مراٹھی (جو مقامی اَپ بھرنش کے بطن سے پیدا ہوئی) سے متاثر رہی۔ اِن کے اِس بیان کی تائید بعد ازاں ڈاکٹر سہیل بخاری کے ہاں بھی ملتی ہے۔ وہ اپنی کتاب 'اردو کا روپ' (۱۹۷۱ء) میں لکھتے ہیں کہ ''اصلیت یہ ہے کہ اردو دکنی بولی سے الگ تھلگ بولی ہے۔ ان دونوں (اردو اور دکن) میں بہت سے بہت وہی ناتا ہوسکتا ہے جو اردو کا ہندوستان کی کسی دوسری بولی سے ہوسکتا ہے'' [۹۱]۔ اپنی تصنیف 'دکنی کی ابتدا' میں ایک جگہ وہ اردو زبان کی ابتدا سے متعلق ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی، حافظ محمود شیرانی، سیّد محی الدین قادری زور، مسعود حسین خان اور دیگر ماہرین کے تحقیقی نظریات پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> یہ فرض کرنا کہ دکن میں ان پورے پونے سات سو سال کے عرصے میں مرہٹی میں عربی اور فارسی کے شمول اور راجستھانی، گجراتی اور برج بھاکا کے ماحول کے اثر سے دکنی وجود میں نہیں آئی بلکہ دفعتاً ۱۳۲۷ء میں دلّی کی آبادی کے دولت آباد میں منتقل ہو جانے سے موجود ہوگئی، کسی زبان کے وجود میں آنے اور اس کے نشو و نما پانے کے کل مسلمہ لسانیاتی اصولوں کے سرا سر خلاف ہے، اور اس حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ دولت آباد، گلبرگہ اور بیدر جو سلطنتِ دہلی کے مرکزِ حکومت تھے مرہٹواڑی میں واقع تھے اور یہاں کے باشندوں کی زبان مرہٹی تھی۔ [۹۲]

ڈاکٹر آمنہ خاتون کے درج بالا بیان کے رد میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ رقم طراز ہیں:

> آمنہ خاتون نے 'مرہٹی کے دوش بہ دوش دکنی کی نشو و نما' کی بات کہی ہے، لیکن ان کی سب سے حیران کن بات 'مرہٹی میں عربی اور فارسی کے شمول' سے 'دکنی' کے 'وجود' میں آنے کی بات ہے۔ آمنہ خاتون نے اگر دہلی و نواحِ دہلی کی دو بولیوں، کھڑی بولی اور ہریانی کا لسانیاتی تجزیہ اور دکنی سے اس کا تقابل کر لیا ہوتا تو انھیں اندازہ ہو جاتا کہ دکنی کی اصل و اساس یہی دونوں بولیاں ہیں نہ کہ مرہٹی (مراٹھی)۔ دکنی پر مراٹھی کے اثرات محض چند عناصر تک ہی محدود ہیں، مثلاً 'نکو'، اور 'چ' تاکیدی وغیرہ، یا مراٹھی کے چند الفاظ جو دکنی میں در آئے۔ [۹۳]

درحقیقت ڈاکٹر آمنہ خاتون کی یہ تحقیق محض علاقائی تعصب ہے جس کا حقائق سے کوئی واسطہ نہیں۔

پنجاب میں اردو زبان کی ابتدا:

برِصغیر کی دیگر زبانوں کی نسبت اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات ہے جن کی بنیاد پر اہلِ علم اردو کی ابتدا کا محرک ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور

یہاں ان کے قیام واقتدار کو قرار دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے میں سرگشتہ ہیں کہ اردو اسلامی دور میں اسلامی اثرات کے تحت بنی۔ درحقیقت اردو الفاظ کا دیگر زبانوں، بالخصوص عربی فارسی الفاظ پر مشتمل ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ''تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی اور ترقی یافتہ زبان نے دیگر زبانوں اور بالخصوص فاتح اقوام کی زبان سے استفادہ کیا۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان نے فرانسیسی زبان کی وساطت سے لاطینی سے الفاظ، سابقے، لاحقے، جمع کے قاعدے اور تذکیرو تانیث کے اصول بڑی بے تکلفی سے قبول کیے جو آج انگریزی زبان کے مزاج میں دخیل ہیں۔ اس کے برعکس اردو نے عربی فارسی عناصر کے ساتھ اتنی بے تکلفی نہیں برتی''[94]۔ پھر بھی ان زبانوں کے دخیل الفاظ کی بنا پر محققین کا ایک گروہ اردو کی پیدائش کے اس لسانی حادثے کے لیے سرزمینِ پنجاب کی اوّلیت واہمیت کا قائل ہے جہاں مسلمان دسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں غزنی کے بادشاہ امیر سبکتگین[95] کی سرکردگی میں درۂ خیبر سے ہوتے ہوئے داخل ہوئے۔ ۹۹۷ء میں امیر سبکتگین کی وفات کے بعد اس کے فرزند و جانشین سلطان محمود غزنوی (۹۷۱ء۔۱۰۳۰ء) نے ۱۰۰۱ء سے ۱۰۲۷ء تک پے در پے حملے کر کے پنجاب اور ہندوستان کے دیگر متعدد علاقوں کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ اِس ترکی النسل بادشاہ کے ہم راہ آنے والے مسلمانوں کی زبان وادیِ سندھ میں داخل ہونے والے عرب مسلمانوں کے برعکس فارسی اور ترکی تھی۔ غزنوی سلطنت کے قیام کے بعد مسلمان رفتہ رفتہ پورے پنجاب میں پھیل گئے۔ پنجاب پر ان کی حکومت قریباً ایک سو ستر (۱۷۰) سال تک قائم رہی۔ اس مدت میں دیسی (ہندو) اور بدیسی (مسلمان) اقوام کے درمیان مضبوط سماجی روابط قائم ہو گئے۔ دو مختلف تہذیبوں کے اختلاط کے نتیجے میں بلاشبہ ان کی زبانیں بھی شیر وشکر ہو گئیں۔

تاریخ کے فراہم کردہ ان شواہد نے محققین کی ایک اہم جماعت کو اس قیاس پر قائل کیا کہ پنجاب کے مسلم فاتحین کی مادری زبان فارسی اور مقامی زبان پنجابی کی ملاوٹ سے اُس نئی زبان کا ہیولیٰ تیار ہوا جسے ہم 'اردو' کہتے ہیں۔ اس لسانی نظریے کو پیش کرنے میں سب سے پہلے تو نہیں البتہ سرِ فہرست حافظ محمود شیرانی ہیں اور وہ اِس بات کو خود تسلیم کرتے ہوئے اپنی تصنیف 'پنجاب میں اردو' کے عرضِ حال میں لکھتے ہیں:

> اردو زبان کے آغاز کا سرزمینِ پنجاب سے منسوب ہونا، کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے پیش تر۔۔۔ شیر علی خان صاحب سرخوش اپنے پُر لطف تذکرے 'اعجازِ سخن' میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں مگر اس کتاب میں اُس موضوع پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔[96]

'پنجاب اردو کا مولد' کا دعویٰ کرنے والے ماہرین میں پروفیسر شیرانی گو پہلے نہیں، البتہ انھوں نے اردو کے قدیم لسانیاتی مواد کا جس طرح سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کیا اور جس تفصیل وتصریح اور لسانی چھان بین کے بعد پنجابی اور اردو کے تقابلی جائزے کو ایک اہم لسانی نظریے پر منتج کیا، وہ انھی کا حصہ ہے۔ پنجاب کو اردو کا مقامِ پیدائش ماننے والے مصنفین کے بیانات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

☆ **شیر علی خان سرخوش کا تذکرہ 'اعجازِ سخن' غالباً ۱۹۲۳ء/۱۹۲۴ء**[97] میں طبع ہوا جس کے مفصل مقدمے میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کا مولد پنجاب ہے۔ لکھتے ہیں:

> صوبہ پنجاب، جہاں سب سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتصال ہوا اور جہاں فاتح مسلمانوں نے دہلی یا ہندوستان کی طرف قدم بڑھانے سے قریباً دوسو برس پیش تر مستقل سکونت اختیار کی تھی، اس کی اہمیت اور اردو زبان سے اس کے ابتدائی تعلق کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔[98]

اسی مقدمے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> اردو زبان کی نہایت ابتدائی شکل وصورت پنجابی ہی ہے۔[99]

شیر علی خان سرخوش نے اپنے بیانات کی کوئی لسانی توجیح پیش نہیں کی۔

☆ نصیر الدین ہاشمی کی کتاب 'دکن میں اردو' پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اس خیال کا اظہار کیا تھا:

غالباً پنجاب میں بھی کچھ پُرانا مسالہ موجود ہے۔ اگر اس کو جمع کرنے میں کام یابی ہوگی تو مؤرخِ اردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے۔[100] (مرقومہ ۷مئی ۱۹۲۵ء)

علامہ اقبال شاید نہیں جانتے تھے کہ ایک محقق پنجاب میں اُس 'پُرانا مسالہ' کی جمع آوری میں منہمک ہے۔ امکان یہی ہے کہ علامہ اقبال نے اِس خیال کا اظہا رمحمود شیرانی سے سُن کر کیا ہوگا اور وہ جانتے ہوں گے کہ یہ پُرانا مسالہ کون جمع کر رہا ہے۔ بہ ہر حال اس خط کے قریباً تین برس بعد یعنی **۱۹۲۸**ء میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر کی جانے والی تحقیقات میں سنگِ میل کی حیثیت رکھنے والی حافظ **محمود شیرانی (۱۸۸۰ء۔۱۹۴۶ء)** کی گراں مایہ تصنیف **'پنجاب میں اردو'** منظرِ عام پر آئی۔ پروفیسر شیرانی نے اپنا نظریہ کتاب کے مقدمے میں بیان کر دیا ہے۔ انھوں نے پنجاب اور اردو سے متعلق اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے اور اپنے ہر دعوے کو دلیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مقدمے میں مندرج پروفیسر شیرانی کے بیانات میں تضاد بھی ہے جن سے ان کی لسانی فکر کے ارتقا میں تبدیلیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ذیل میں ان کے بیانات درج کیے جاتے ہیں:

☆ ہم اردو کے آغاز کو شاہ جہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہ زبان اُس زمانے سے بہت زیادہ قدیم ہے۔ میرے خیال میں اس کا وجود انھی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔ اردو کی قدامت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ گجرات و دکن میں اس زبان میں دسویں صدی ہجری کی ابتدا، یعنی بابر کی آمد سے قبل ادبیات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔[101]

☆ کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی، جس کی برج بھاشا، ہریانی، راجستھانی، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں، قدیم پراکرت سوراسینی (شورسینی) کی یادگار ہیں۔ لیکن جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ ہمیں بہ تحقیق معلوم نہیں کہ جب مسلمان دہلی میں آباد ہوئے، اُس وقت اُس علاقے میں کیا زبان بولی جاتی تھی۔[102]

☆ ہریانی کوئی علاحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ بلکہ وہ پرانی اردو ہے یعنی وہی اردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بھی بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔ اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہیے۔ بہ ہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔
۔۔۔۔ ہریانی زبان دراصل ایک قسم کی اردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں شاید اردو سے اس قدر مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دیکھی جاتی ہے، کیوں کہ زمانۂ مابعد میں جب کہ ہریانی اپنی اصل حالت پر قائم رہی، اردو میں دہلی کے محاورے اور شعرا کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوئے اور موجودہ اردو اُس اصلاح شدہ شکل کا نام ہے۔[103]

☆ اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔۔۔۔ غوریوں کے عہد میں جب دارالسلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے، اسلامی فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اسے اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں۔ دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔۔۔۔ جب مسلمانوں کا کثیر گروہ قطب الدین ایبک کے ساتھ شمال سے ہجرت کر کے دہلی آیا تو اپنے ساتھ پنجاب سے کوئی نہ کوئی زبان ضرور لے کر گیا ہے۔ آیا یہ زبان موجودہ پنجابی کے مماثل تھی یا اس کی کوئی شاخ تھی جواب معدوم ہے۔ بہ ہر حال یہ زبان برج اردو اور اس کی ہم سایگی میں ایک عرصہ دراز تک رہتے سہتے کے

باعث بدلنی شروع ہوئی ہے۔[104]

☆ جب ہم اردو کے ڈول، اُس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشا کا رنگ اور ہے۔ دونوں کے قواعد وضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلے میں پنجابی، بالخصوص ملتانی سے مماثلتِ قریبہ رکھتی ہے۔[105]

☆ یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ اردو اور پنجابی کی صَرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبے کے زیرِ اثر تیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری راہ نمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی دونوں کی ولادت گاہ ایک ہی ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی اور جب سیانی ہو گئیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی۔[106]

پنجاب میں اردو کی پیدائش کو ثابت کرنے کے حوالے سے علمی و تحقیقی دلائل پر مبنی اپنا مطالعہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسر شیرانی یہ اعتراف بھی کرتے ہیں:

اس نظریے کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں، لیکن سیاسی واقعات، اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدے کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔[107]

مابعد اہلِ نقد و نظر کی طرف سے پنجاب کو اردو کا مَولد اور پنجابی کو اِس کا ماخذ قرار دینے والے پروفیسر شیرانی کے نظریے کو رد کیے جانے کے باوجود 'پنجاب میں اردو' کے دیگر مندرجات اور مباحث کی قدر و قیمت اور اہمیت ہرگز کم نہیں ہوئی۔ اِس کتاب کو محمد اکرام چغتائی کی ترتیب، تدوین اور اضافات کے ساتھ لاہور سے سنگِ میل نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔

☆ **سیّد محی الدین قادری زور** (۱۹۰۴ء-۱۹۶۲ء) نے بھی اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی جزوی حمایت کی ہے۔ 'پنجاب میں اردو' کی اشاعت کے ایک سال قبل ڈاکٹر زور اردو کے آغاز و ارتقا کے موضوع پر لندن یونی ورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھے۔ دورانِ تحقیق مطالعہ و جُستجُو سے سامنے آنے والے بعض حقائق کی بنا پر ان کا ذہن اردو اور پنجابی کے باہمی ربط کی طرف مائل ہوا[108]۔ انھوں نے اپنی انگریزی تصنیف **'Hindustani Phonetics'** (۱۹۳۰ء) میں اور بعد ازاں 'ہندوستانی لسانیات' (۱۹۳۲ء) میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا سے متعلق اپنی تحقیقات رقم کی ہیں۔ موَخر الذکر کتاب میں لکھتے ہیں:

اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت نہ بنالیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم 'نئے ہند آریائی دور' میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہدِ حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الٰہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی مگر اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی۔ کیوں کی ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔۔۔ ابتدا میں وہ ایک تدریجی تغیر ہوگا، مگر آخر کار ان دونوں مقامات کی بولیوں کے درمیان ایک ایسا خلیج حائل ہوتا گیا کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی۔ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان

سے جو اِن دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔ لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں اس لیے اردو زیادہ کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔۔۔ یہاں ایک اور بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگڑو یا ہریانی زبان کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہے۔[۱۰۹]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق اردو اور پنجابی کے مابین گویا ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہن بہن کا ہے۔ یعنی اردو زبان کا اصل سرچشمہ پنجابی یا کھڑی بولی نہیں بلکہ وہ قدیم زبان ہے جس سے خود پنجابی اور کھڑی بولی نکلی ہیں اور جو کسی وقت سارے شمال مغربی سرحدی علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ پنجابی اور کھڑی بولی سے اردو کے لسانی تعلق کی وضاحت میں مزید لکھتے ہیں:

Urdu is derived from neither Punjabi nor Kharhi Boli but from the language which was the common source of both ..... They may infact be called sister languages.[110]

☆ ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی (۱۸۹۰ء۔۱۹۷۷ء) نے بھی اپنی تصنیف **'Indo-Aryan and Hindi'**[111] (۱۹۴۲ء) میں پنجاب کے اردو کا مؤلد ہونے کے حوالے سے ڈاکٹر محی الدین قادری کی طرح جزوی حمایت کا اظہار کیا۔ بیان کرتے ہیں:

وہ زبان جو انھوں نے سب سے پہلے اختیار کی قدرتی طور پر پنجاب کی مروج زبان تھی۔ آج بھی پنجاب کی بولیوں میں خاص طور پر مشرقی پنجاب اور اتر پردیش کے انتہائی مغربی علاقوں کی بولیوں میں زیادہ فرق نہیں۔ یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ آٹھ نو سال پیشتر یہ فرق اور بھی کم ہوگا۔ یہ بھی امکان ہے کہ وسطی اور مغربی پنجاب (اگر مغربی پنجاب اور ہندوافغانستان کو الگ بھی کر دیا جائے) نیز مغربی اتر پردیش میں تقریباً یک ساں بولی رائج ہوگی۔[۱۱۲]

اس بیان کے بعد ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی نے دہلی میں پنجابی مسلمانوں کے ہم راہ پنجاب سے اپنی لائی ہوئی بولی کے آنے کا ذکر کیا ہے اور اپنی تحقیقات کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ پنجاب سے آئی بولی یو پی کے شمال اور شمال مغربی اضلاع کی بولیوں سے مخلوط ہو کر ایک نئی کاروباری زبان کی تشکیل کا مؤجب بنی۔ لکھتے ہیں:

وہ پنجابی مسلمان جو ترکی اور ایرانی فاتحین کے جلو میں دہلی وارد ہوئے تھے۔ نئے دارالسلطنت کے تمام ہندوستانی گروہوں میں سب سے زیادہ اہمیت کے مالک ہوگئے۔ وہ اپنی بولی بھی دلّی لے کر آئے اور ان کی بولی جو دلّی کے شمال اور شمال مغربی اضلاع کی بولیوں سے بہت سی اہم چیزوں میں مطابقت رکھتی تھی، نمونہ بن گئی اور اسی سے اس نئی کاروباری زبان کی ممتاز خصوصیات فراہم ہوئیں جو اس نئے دارالسلطنت میں وجود پذیر ہوئی تھی اور جس کو وسطی علاقہ (ہندوستان) کے لوگ، ہندیائے ہوئے ترکی، ایرانی اور مسلم پنجابی (جن کی نئے آنے والوں میں بڑی تعداد تھی) سبھی بولتے تھے۔[۱۱۳]

اس بیان کے آخری حصے سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے چیٹر جی نے دانستہ یا شاید غیر دانستہ دہلی کی عظمت قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے پنجاب میں اردو کی جزوی حمایت ضرور کی مگر ان دونوں کا بنیادی مؤقف یہ ہے کہ اردو کی بنا اس زبان پر قائم ہے جو مسلمانوں کے داخلۂ دہلی (۱۱۹۳ء) کے وقت شمالی ہند میں لاہور (زور کے مطابق راول پنڈی) تا الہٰ آباد رائج تھی۔[۱۱۴]

☆ **پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی (۱۸۶۶ء۔۱۹۵۵ء)** نے اپنی تصنیف 'کیفیہ' (۱۹۴۲ء) میں اردو اور پنجابی کے لسانی اشتراک پر زور دیتے ہوئے

پنجاب کے بارے میں لکھا ہے:

غیر ملکی الفاظ سے مہمان نوازی کا برتاؤ سب سے پہلے اس کے حصے میں آیا۔[115]

کیفی نے ہیر وارث شاہ (۱۱۸۰ھ) کے لسانی مطالعے سے اخذ کردہ اپنے استدلال کی بنا پر غیر مشروط الفاظ میں یہ دعویٰ کیا:

اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی۔[116]

انھوں نے 'کیفیہ' میں شیرانی اور زور کے نظریے سے اختلاف نہیں کیا لیکن شاید دہلوی ہونے کی وجہ سے پنجاب میں اردو کی ابتدا کے نظریے کی واضح تائید بھی نہیں کی بلکہ ذرا دامن بچاتے ہوئے لکھا ہے:

یہ امر اچھی طرح واضح کر دینا مقصود ہے کہ راقم کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطے کو اردو کا مولد ہونے کے امتیاز سے محروم کیا جائے یا یہ طرّہ ایک سے چھین کر دوسرے کی دستار میں لٹکا دیا جائے۔[117]

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس محتاط بیان کے باوجود انھوں نے پنجاب میں اردو کی مخالفت بھی نہیں کی بلکہ اپنے مباحث میں ایسے اسما، افعال اور ضمائر پیش کیے ہیں جن سے اردو اور پنجابی کے مابین نہایت گہرا اور قریبی ربط ظاہر ہوتا ہے۔

تنقید اور تبصرہ:

ہمارے اکثر اہلِ علم کا خیال ہے کہ اردو مسلمانوں کی آمد سے قبل برِصغیر میں کوئی زبان نہ تھی۔ وہ مسلمانوں کے اثر سے وجود میں آئی۔ گویا برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے قبل پنجاب میں پنجابی تھی، سندھ میں سندھی تھی اور مغربی یوپی میں اَپ بھرنش کی شاخ مغربی ہندی تھی۔ مسلمانوں کے اثرات سے ان میں اس نہج پر تغیرات ہوئے کہ یہ بدل کر بالترتیب جدید پنجابی، جدید سندھی اور اردو کے روپ میں سامنے آئیں۔ اردو البتہ سیاسی و مذہبی اثرات کے تحت تمام ملک مین رواج پا گئی۔ حافظ محمود شیرانی اگرچہ اردو کو متقدمین کی طرح فارسی اور ہندی الفاظ کے خلا ملا کا نتیجہ نہیں سمجھتے لیکن وہ اس سے پوری طرح متفق ہیں کہ اردو کا آغاز مغلیہ دورِ حکومت سے بہت پہلے اُس وقت عمل میں آیا جب مسلمان ہندوستان آئے۔ ''سابقہ مسلمان اہلِ علم نے اردو کا سنگِ بنیاد دہلی میں رکھ کر اس کا نشو ونما غوریوں کے عہد میں دکھایا اور شاہ جہاں کے عہد میں پروان چڑھایا جب کہ پروفیسر شیرانی پنجاب کو اردو کا مولد بتاتے ہوئے غزنویوں کے عہد میں اسے پھلتا پھولتا دکھاتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پروفیسر شیرانی دیگر مسلمان مصنفین کے برعکس اردو کی قدامت کے قائل ہیں۔ وہ اس کے آغاز کو مغلوں یا خلجیوں سے پیچھے ہٹا کر غزنویوں کے عہد تک لے گئے۔''[118]

پروفیسر شیرانی کی تحقیق کے مطابق اردو اگر پنجاب میں مسلمانوں کے زیرِ اثر وجود میں آئی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج بھی پنجاب کی زبان پنجابی ہے، اردو کیوں نہیں؟ بلکہ اب تو جنوبی پنجاب میں پنجابی کے ساتھ ساتھ سرائیکی زبان بولی جاتی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر شیرانی کا استدلال یہ ہے کہ پنجاب میں مسلم فاتحین کی آمد اور اقتدار و توطن کے سبب یہاں متعدد تہذیبی و لسانی تغیرات رونما ہوئے۔ غزنویوں کے عہد میں ابتداً اردو پنجابی سے مختلف زبان نہیں تھی بلکہ وہ پنجابی ہی تھی۔ پنجاب میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک مسلمانوں کی حکومت و اقامت سے رفتہ رفتہ پنجابی زبان متغیر ہوگئی۔ اسی متغیر زبان کو پروفیسر شیرانی جدید پنجابی کے مماثل یا اس کی کوئی شاخ بتاتے ہیں[119]۔ مسلمان اسی زبان کو ساتھ لیے بالآخر دہلی کا رخ کرتے ہیں جہاں برج بھاشا کے زیرِ اثر صدیوں کو محیط لسانی عمل کے نتیجے

میں اس زبان میں صرفی و نحوی سطح پر کچھ تبدیلیاں ہوئیں جس سے موجودہ اردو کا خاکہ تیار ہوا اور اس نے وہ شکل اختیار کی جو آج اسے پنجابی سے ممتاز کرتی ہے۔ پروفیسر شیرانی کے اس استدلال کی بنیاد وہی خیال ہے، جس کی رو سے اردو کی پیدائش برِصغیر میں مسلم فاتحین کی آمد سے مشروط ہے۔

تاریخ سے اس امر پر شہادت ملتی ہے کہ فتح دہلی سے قبل مسلمان قریباً ایک سو ستر سال پنجاب میں رہے اور پھر بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں وہ دہلی چلے گئے۔ البتہ اس امر پر کہ مسلمانوں نے پنجاب میں دورانِ اقامت پنجابی سیکھی اور اسی کے کسی متغیر روپ کے ساتھ وہ دہلی چلے آئے، تاریخ خاموش ہے۔ لہٰذا یہ

بیان سراسر قیاس پر مبنی ہے۔ ''اگر یہ قیاس مان بھی لیا جائے تو اُس کا اطلاق اُسی صورت ممکن ہے کہ دہلی میں اُس وقت کوئی زبان رائج نہ ہوتی جسے وہاں کے باشندے (جن کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہوگی) بولتے ہوں۔ یہ امر تاریخ اور اصولِ لسانیات دونوں کے خلاف ہے''[۱۲۰]۔ دہلی میں اس وقت بلاشبہ پنجابی اور برج بھاشا سے جدا ایک زبان بولی جاتی تھی جس سے متعلق خود پر پروفیسر شیرانی بیان کرتے ہیں کہ ''امیر خسرو، ابوالفضل اور شیخ باجن اُس زبان کو 'دہلوی' کے نام سے یاد کرتے ہیں''[۱۲۱]۔

اگر بالفرض برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد ہی کو اردو زبان کے ظہور کا سبب مان لیا جائے تو بلاتردد اردو کا مولد پنجاب کے بجائے وادیِ سندھ کو ماننا ہوگا، کیوں کہ پنجاب سے کئی سو سال قبل مسلم فاتحین سندھ میں داخل ہوئے اور مدتوں وہاں خیمہ زن رہے۔ صدیوں تک بود و باش رکھنے کی وجہ سے انھوں نے سندھی زبان سیکھی۔ گویا تہذیبوں اور زبانوں کی بغل گیری سے پیدا تمدنی و لسانی تغیرات کے مؤجب عوامل کی پہلے پہل کارروائی میں وادیِ سندھ کو تقدم حاصل ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو اگر پنجابی کی شکل میں دہلی جا سکتی ہے تو سندھی یا ملتانی کی شکل میں بہ راستہ ملتان اور لاہور، دہلی کیوں نہیں جا سکتی؟ دراصل زبان پر تحقیق 'لسانی شہادت' طلب کرتی ہے جب کہ پروفیسر شیرانی نے 'تاریخی استدلال' سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اس اہم تحقیقی نکتے کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> دو یا دو سے زیادہ زبانوں کی قرابت داری کا فیصلہ زبان کے سرمائے کو دیکھ کر اور اس کے گہرے تقابلی مطالعے کے بعد کیا جاتا ہے۔ لسانی دلائل کی تائید میں تاریخی شہادت پیش کی جاتی ہے لیکن یہ شہادت تائیدی ہوگی۔ اعتماد صرف لسانی شہادت پر کیا جائے گا۔ مولانا شیرانی نے ترتیب بدل کر تاریخ کو اساس قرار دے دیا اور اس کی حمایت میں لسانی دلائل پیش کر دیے۔ یہ طریقہ اصولِ لسانیات کے خلاف ہے۔ اسے برت کر ہر شخص غلط سے غلط نتائج اخذ کر سکتا ہے۔۔۔ تاریخ لسانیات کا ماخذ نہیں، لسانیات تاریخ کا ماخذ ہے۔ علمائے تاریخ نے تاریخی واقعات اور نتائج لسانیات سے اخذ کیے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ لسانی فیصلے تاریخ کی مدد سے کیے گئے ہوں۔[۱۲۲]

علاوہ ازیں پروفیسر شیرانی اور بعض دیگر اہلِ علم کا یہ ماننا ہے کہ مسلمانوں نے لاہور سے دہلی کی طرف بہت بڑے پیمانے پر نقل مکانی کی جس سے نہ صرف دہلی بلکہ تقریباً سو سو میل تک نواحِ دہلی کی زبان تغیر و تبدل کا شکار ہوئی[۱۲۳]۔ اپنی بات کے ثبوت میں یہ محققین کسی بھی تاریخی شہادت کو پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ تاریخ سے اس قسم کی نقل مکانی کی شہادت نہیں ملتی۔ مزید یہ کہ دہلی کے نواح کا علاقہ لاہور اور اس کے نواحی علاقے سے ہمیشہ زیادہ گنجان آباد رہا ہے اور ہند آریائی زبان کے تیسرے دور کی تاریخ سے یہ برعکس حقیقت ثابت ہے کہ لسانی و تہذیبی لہروں کا بہاؤ ہمیشہ دہلی سے پنجاب کی جانب رہا ہے نہ کہ پنجاب سے دہلی کی جانب۔ یہ تاریخی صداقت قریباً آج بھی درست ہے''[۱۲۴]۔ گویا فتوحات کا رخ اگرچہ مغرب سے مشرق کی طرف تھا مگر سیاسی اقتدار ہمیشہ دوآبہ گنگ و جمن میں رہا اور اس طرح اس علاقے کی زبانیں ہمیشہ دوسری زبانوں کو متاثر کرتی رہی ہیں۔

پروفیسر شیرانی کے بعض بیانات کھلے تضاد کا شکار ہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اردو اُس زبان کی ارتقائی شکل ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے[۱۲۵]۔ اسی طرح ایک طرف شیرانی برج بھاشا کو اردو کی ساخت سے بالکل بے دخل کر دیتے ہیں اور دوسری طرف اردو کو پنجاب سے آئی ہوئی زبان اور برج کے آمیزے تیار کرتے ہیں[۱۲۶]۔ ''درحقیقت وہ اردو کی بنیادی زبان دہلی اور میرٹھ کی بولی کو نہیں جانتے۔ انھیں اُس کے خط و خال کا اندازہ ہی نہیں۔ وہ صرف یہ مانتے ہیں کہ اردو قدیم پنجابی سے ماخوذ ہے۔ چناں چہ وہ اپنا پورا زور قدیم اردو اور پنجابی کی مماثلت دکھانے میں صرف کرتے ہیں''[۱۲۷]۔ اردو کے دہلی اور نواحِ دہلی سے ربط کی وضاحت میں ڈاکٹر شوکت سبزواری رقم طراز ہیں:

> اردو میرٹھ اور دہلی کی زبان ہے۔ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ مولانا محمود خان شیرانی کو بھی ماننا پڑا کہ اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے وہ دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ زبان کا مؤلد وہی ہوتا ہے جہاں وہ بلاشرکتِ غیر بولی جائے۔ پنجاب،

اودھ، دکن، بہار، گجرات، بمبئی، وسط ہند جہاں کہیں اردو کا سکّہ چلتا ہے، اردو کے پہلو بہ پہلو دوسری زبانیں بھی ہیں۔ کہیں اردو تہذیبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، بول چال کی زبانیں اور ہیں۔ کہیں اردو کے ساتھ دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ کہیں شہر کی زبان اردو ہے، دیہات کے باشندے مقامی زبان بولتے ہیں۔ لیکن یو پی کے مغربی اضلاع میں اردو کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں۔ صرف اردو ہے جو شہروں اور دیہاتوں میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔ یو پی کے مغربی اضلاع میں ہندو اور مسلمان سب اردو بولتے ہیں۔
۔۔دوسرے مقامات میں وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ مسلمان اردو بولتے ہیں۔ ہندو مقامی زبان استعمال کرتے ہیں۔ [۱۲۸]
پنجابی کا اطلاق عام طور سے اُن تمام بولیوں پر کیا جاتا ہے جو دریائے سندھ سے ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہیں، فقط پنجاب کی زبان نہیں [۱۲۹] ۔تاریخی

لسانیات سے پروفیسر شیرانی کی بے خبری کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ وہ مغربی ہندی میں راجستھانی اور پنجابی کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ''انھوں نے اپنی تحقیق کے دوران اس لسانی حقیقت کو قطعاً نظر انداز کر دیا کہ راجستھانی اور گجراتی کی طرح پنجابی کا تعلق بھی زمانۂ قدیم میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا جس کے اثرات کی نشان دہی آج بھی کی جا سکتی ہے۔ بعد ازاں یہ اندرونی زبان، مدھیہ دیشہ (جس کی نمائندہ بولیاں برج بھاشا اور کھڑی بولی ہیں) سے متاثر ہو کر بہت کچھ بدل گئی'' [۱۳۰] ۔اسی طرح وہ ہریانی کو بہ حیثیت علاحدہ زبان قبول نہیں کرتے بلکہ اُسے پرانی اردو سے تعبیر کرتے ہیں، جو درست نہیں۔ علاوہ ازیں ''شیرانی کا یہ دعویٰ کہ

دہلی اور نواحِ دہلی میں ہریانی اور کھڑی بولی نام کی کوئی چیز نہیں تھی بلکہ پورا علاقہ برج بھاشا کی لپیٹ میں تھا۔ یہ دونوں بولیاں اس وقت ظہور میں آئیں جب لاہوری (پنجابی) نے ان علاقوں میں برج کو شکست دی۔ یہ نظریہ نہ تو لسانیاتی اور نہ ہی تاریخی اعتبار سے قرینِ عقل ہے''۔ [۱۳۱]

جس طرح عربی زبان کے اثرات سے سندھی متاثر ہوئی اسی طرح کم و بیش دو صدیوں تک عربی، فارسی اور ترکی اثرات اُس زبان پر بھی پڑے جو پنجاب میں رائج تھی۔ پروفیسر شیرانی نے ان اثرات کے صرفی و نحوی تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اردو اور پنجابی کی ولادت گاہ ایک ہی ہے [۱۳۲] ۔واضح رہے کہ پروفیسر

شیرانی نے اپنے اس تقابلی تجزیے کی بنیاد قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی صرف و نحو کی مشترک لسانی خصوصیات پر رکھی ''اور اردو اور پنجابی کے میل جول میں دکنی اردو کے ادب سے بہت سی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ پہلے اردو پنجابی سے بہت ملتی جلتی تھی۔ بعد ازاں وہ بدل گئی اور موجودہ پنجابی کے کتنے ہی لسانی اصول اردو سے بہ تدریج نکلتے چلے گئے یا دانستہ نکال دیے گئے۔ موجودہ اردو میں غیر حاضر پنجابی زبان کے ان قواعدی اصولوں کے لیے، جو دکنی ادب میں موجود ہیں، شیرانی پرانے دکنی ادب ہی کی گواہی دلواتے ہیں'' [۱۳۳] جب کہ صوتیاتی اور صرفی و نحوی لحاظ سے دکنی کے 'پنجابی پن' کی توجیہ نواحِ دہلی کی دو بولیوں، کھڑی اور ہریانوی، سے

بھی ہو سکتی ہے۔ پنجابی بھی چوں کہ شورسینی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اسی سبب پنجابی قواعد کا وہ حصہ جسے پروفیسر شیرانی پنجابی کا اپنا بتاتے ہیں وہ دراصل براہِ راست مغربی ہندی کی قدیم شکل (شورسینی اَپ بھرنش) سے ماخوذ ہے اور قریباً اس کی ہر شاخ میں ان قواعدی اصولوں پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں:

امر کا قاعدہ اردو اور پنجابی میں بالکل ایک ہے، یعنی علامتِ مصدر گرا دی جائے تو امر باقی رہ جاتا ہے، مثلاً چلنا سے چل، کرنا سے کر۔ [۱۳۴]

شیرانی کا یہ بیان بالکل درست ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ قاعدہ اردو، بنگالی، گجراتی اور مرہٹی میں یک ساں ہے۔ دراصل ہندوستان کی تمام جدید ہند آریائی زبانوں میں امر اسی طرح بنتا ہے۔ قریباً اسی طرزِ استدلال پر انھوں نے پنجابی اور اردو کی دیگر صرفی و نحوی مماثلتیں بیان کی ہیں۔ ان کے طریقِ استدلال کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ نہ تو انھوں نے ہند آریائی خاندان السنہ میں پنجابی کے مقام کا تعین کیا اور نہ اُن لسانی اختلافات پر نظر رکھی جو پنجابی اور قدیم و جدید اردو میں پائے جاتے ہیں [۱۳۵] ۔ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی تصنیف 'اردو کا روپ' کے صفحہ ۶۶ سے ۷۶ تک نہ صرف اردو اور پنجابی کے مابین پروفیسر شیرانی کی

وضع کردہ خصوصیات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا بلکہ ان دو زبانوں کے اختلافات گنواتے ہوئے پروفیسر شیرانی کے نظریے کی تردید ان الفاظ میں کی:

میرے نزدیک جو اندازِ فکر اشتقاقِ اردو کے متعلق مولانا آزاد نے اختیار کیا ہے وہی حافظ محمود شیرانی نے بھی اپنا لیا ہے۔ مولانا آزاد کو

اردو اور برج بھاشا کی بعض مشترک خصوصیات کی بنا پر یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ ان دونوں زبانوں میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے لیکن دونوں کے اختلافات پر اُن کی نظر نہ گئی۔ شیرانی نے بھی اردو اور پنجابی کی مشابہت پر یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے اور اختلافات کو کبھی قدیم دکنی ادب سے مثالیں دے کر اور کبھی یہ اعتراض کر کے کہ اردو والوں نے پنجابی کی بعض خصوصیات کو اردو سے نکال دیا ہے، ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اردو اور پنجابی کے اختلافات اتنی آسانی سے نہیں ٹالے جا سکتے اور نہ اُن کی مشترکہ خصوصیات پر ہی انھیں متحد الاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ شیرانی نے جو باتیں مشترک بتائی ہیں ان میں سے کچھ تو دوسری معاصر زبانوں میں بھی ملتی ہیں اور کچھ قدیم پراکرتوں میں ملتی تھیں، جن سے دونوں نے میراث پائی ہے۔ [۱۳۶]

اسی طرح ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی اپنی تصنیف 'داستانِ زبانِ اردو' میں اردو اور پنجابی کی صوتی، صرفی و نحوی خصوصیات اور لفظی سرمایہ پیش کر کے دکھایا ہے کہ خلقت و فطرت اور مزاج و منہاج کے لحاظ سے اردو پنجابی سے مختلف زبان ہے۔ لکھتے ہیں:

اردو اور پنجابی ان تمام لسانی مشابہتوں کے باوجود، جن کا ذکر مولانا محمود شیرانی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں کرتے ہیں، مزاج اور ساخت کے اعتبار سے مختلف زبانیں ہیں۔ ان میں اصلی اور نسلی امتیازات ہیں جو ان کے مختلف الاصل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور صاف صاف چغلی کھاتے ہیں کہ یہ زبانیں ایک گھرانے کی نہیں، دو گھرانوں کی ہیں۔ ایک نسل کی نہیں، دو نسل کی ہیں۔ [۱۳۷]

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اِس بیان کے پہلے حصّے سے تو اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ اردو اور پنجابی میں بہت کچھ لسانی افتراق ہے جس کی بنا پر انھیں ماں بیٹی تسلیم نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ بھی سچ ہے کہ مماثلت ماں بیٹی کے علاوہ بہن بہن میں بھی ہوتی ہے۔ اِن دونوں زبانوں میں بعض مشترک لسانی عناصر موجود ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کبھی یہ دونوں زبانیں ایک ہی تھیں، بعد میں الگ الگ ہوئیں۔ قدیم پنجابی میں وہ افعال، حروفِ جار وغیرہ موجود ہیں جو آج بھی اردو میں بہ دستور پائے جاتے ہیں لیکن پنجابی میں اب نہیں رہے، مثلاً کا، کے، کی، کو وغیرہ۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ لسانیاتی تحقیق کے دوران تقابلی لسانیات کے ساتھ ساتھ تاریخی لسانیات کو بھی ملحوظِ نظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ لیا جائے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان کے خیال میں شیرانی ہند آریائی خاندان کے بارے میں بہت محدود علم رکھتے تھے۔ تقابلی مطالعے کے وقت اُن کی نظر ہند آریائی السنہ کی مکمل تصویر پر نہیں تھی۔ جزوی مماثلتیں، جو اس خاندان السنہ کی ہر دو زبانوں میں مل جائیں گی، اس بات کو ثابت نہیں کرتیں کہ ایک زبان دوسری سے ماخوذ ہے۔ [۱۳۸] ڈاکٹر شوکت سبزواری جدید ہند آریائی زبانوں کے مشترک لسانی سرمایے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

شمالی ہند کی جدید آریائی زبانوں کا صرفی و نحوی سرمایہ بڑی حد تک مشترک ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان زبانوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا اور یہ سرمایہ ایک سے دوسرے کے پاس اور دوسرے سے تیسرے کے پاس منتقل ہوتا چلا گیا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبانین متحد الماخذ یا قریب الماخذ ہیں۔ کسی قدیم زمانے میں یہ ایک زبان سے متفرع ہوئیں اور ایک جیسی کئی زبانوں سے نکل کر یہ ملک میں پھیلیں۔ انھیں ایک دوسرے سے الگ ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ اس لیے ان کا اختلاف جو شروع میں کچھ زیادہ نہ تھا، بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مختلف آزاد زبانیں بن گئیں۔ [۱۳۹]

اکثر ماہرین اِس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی پنجابی زبان کو معیاری اردو کی اساس بتاتے ہیں۔ اسی سبب علمی حلقے میں یہ تاثر عام ملتا ہے کہ اردو اور پنجابی کو متحد الماخذ ثابت کرنے کی کاوش میں تو پروفیسر شیرانی سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، مگر پنجابی کو اردو کی اساس بتانا غلطی ہے، لہٰذا پروفیسر شیرانی سے تسامحات مؤخر الذکر ہی کو ثابت کرنے میں سرزد ہوئے۔ جب کہ اس حوالے سے اختر اور ینوی صاحب پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے نظریے کا جائزہ لیتے ہوئے واضح کرتے ہیں:

میرا مطالعہ یہ ہے کہ پروفیسر شیرانی نے کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ اردو کا معیاری سانچہ پنجابی بھاشا کے سانچے سے لیا گیا ہے لیکن اردوئے قدیم کے سلسلے میں وہ پنجابی بھاشا کو بنیاد ضرور قرار دیتے ہیں۔ شیرانی کے نزدیک نہ صرف مسرقی پنجاب کے اثرات اردوئے قدیم پر ہیں بلکہ ملتانی (مغربی پنجابی) کے بھی۔ لیکن وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وسطی اور معیاری اردو میں پنجابی اثر کم ہوتا گیا۔ [۱۴۰]

دراصل ''اس کتاب کو لکھتے وقت پروفیسر شیرانی کے سامنے ایک متعین مقصد تھا۔ اس تعین نے تحقیقی نقطہ نظر سے نقصان پہنچایا ورنہ ان جیسے باصلاحیت محقق کے واسطے حقیقت تک رسائی حاصل کر لینا اس قدر مشکل نہ ہوتا۔ مقالاتِ شیرانی کی جلدوں کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ 'پنجاب میں اردو' کی تالیف کے بعد جیسے جیسے نیا مواد سامنے آتا گیا، وہ حقیقت کی طرف بڑھتے گئے، ان کی رائے میں تبدیلی آتی گئی۔ یہاں تک کہ آخر زمانے میں اردو کے مولد کی جستجو میں وہ پنجاب سے بہت آگے تک آ چکے تھے۔'' [۱۴۱]

پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے علاوہ اردو اور پنجابی کے باہمی لسانی رشتے کے حوالے سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی کے بنیادی نظریے (شمالی ہند میں مروج جزوی مقامی اختلافات کی حامل ایک ہی زبان) کو ڈاکٹر گیان چند جین ان ماہرین کی ماضی کے لسانی نقشے سے چشم پوشی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سنسکرت عہد ہی میں مغرب اور وسطی ہند میں مختلف بولیاں تھیں جنھیں اُدیچیہ اور مدھیہ دیشہ کہا جاتا تھا۔ اشوکی پراکرتوں سے بھی بولیوں کے نزع کا پتہ چلتا ہے۔ اِس وسیع ولاتے کی پراکرتیں اور اَپ بھرنشیں بھی مختلف تھیں۔ صوبہ سرحد کا علاقہ ہند آریائی ہے ہی نہیں، یہ ایرانی ہے۔ اِس کے مشرق میں کیکئی اَپ بھرنش (مغربی پنجاب)، ٹکی اَپ بھرنش (مشرقی پنجاب)، شورسینی اَپ بھرنش (ہریانی اور مغربی یوپی) اور اردھ ماگدھی اَپ بھرنش (کان پور، الہ آباد وغیرہ) رائج تھیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اِن سب اَپ بھرنشوں پر بُل ڈوزر (Bull Dozer) چل کر گیارھویں بارھویں صدی عیسوی میں ایک ہی زبان بن گئی ہو۔ اَپ بھرنشوں کے پیشِ نظر تو جدید ہند آریائی دور میں اِن علاقوں کی زبانوں کا فرق اور نمایاں ہو گیا ہوگا۔ [۱۴۲]

اردو کی تشکیل میں پنجابی زبان کے لسانی اثرات کے حوالے سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی کی جزوی حمایت کا سبب بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خان بیان کرتے ہیں:

> چوں کہ شیرانی کے نقطہ نظر کو ڈاکٹر گراہم بیلی نے اپنی مختصر تصنیف 'A History of Urdu Literature' میں، جو ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی، قبول کیا ہے۔ اس لیے اِن دونوں حضرات کے بولیوں کے تقابلی مطالعے میں گئے بغیر ایک عمومی کلیہ قائم کر لیا ہے۔ گراہم بیلی کی تردید اس لیے بھی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ پنجابی زبان کے مستند عالم تھے اور چیٹر جی اور زور دونوں پنجابی سے ناواقف تھے۔ [۱۴۳]

ہند آریائی زبانوں کے لسانی نقشے کو پیشِ نظر رکھے بغیر مغربی ماہرین کی آرا پر آنکھ بند کیے تکیہ کرنے والے اہلِ علم پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> اہلِ اردو کی کم زوری ہے کہ جدید زبانوں سے قبل کے لسانی نقشے کے بارے میں انھیں کوئی براہِ راست معلومات نہیں ہوتیں۔ وہ یورپی مستشرقین یا ہندی کے ماہرینِ لسانیات کی آرا پر تکیہ کرتے ہیں۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ وسطی ہند آریائی دور میں اس علاقے میں مختلف اَپ بھرنشیں اور اس سے قبل مختلف پراکرتیں رائج تھیں اور بہت پیچھے جایئے تو سنسکرت دور میں بھی شمال مغربی ہندوستان کی سنسکرت بولی کو اُدیچیہ اور مغربی ہند کے علاقے کی سنسکرت بولی کو مدھیہ دیشہ کہا جاتا تھا۔ جب سنسکرت دور میں بھی صوبہ سرحد اور دہلی کی بولی مختلف تھی تو ڈاکٹر زور کا یہ کہنا کہ گیارھویں یا بارھویں صدی میں پشاور تا الٰہ آباد ایک زبان رائج تھی، قیاس آرائی کو تحقیق کے نام سے گزارنے کی

کوشش ہے۔[۱۴۴]

علاقائی بولیوں کے اختلافات کونظرانداز کر کے ہندآریائی کی تاریخ کا مطالعہ کلی حیثیت سے ممکن نہیں۔ جب کے بیش تر محققین کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ کسی علاقے میں بولیوں کی پھوٹ کے شواہد کو یک سرنظرانداز کیے کلی منظرنامے سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔

درحقیقت اردواور پنجابی کوواضح صوتیاتی اورصرفی ونحوی اختلافات کے باوجود اکثر ماہرین کا دونوں زبانوں کوایک دوسرے سے مشتق بتانا پوری طرح سے قابلِ قبول نہیں۔

سندھ میں اردوزبان کی ابتدا:

برِصغیر میں نووارد مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کی زبانوں کے میل سے ایک نئی زبان کے ظہور کواساس بنا کر ہندومسلم تہذیبی میل جول کے اوّلین مقامات کی کھوج میں سرگرداں محققین میں سے اکثر کی نظر وادیِ سندھ کی طرف بھی اُٹھی۔ ان محققین کا مؤقف یہ ہے کہ اگر اردو ہندومسلم تہذیبی ولسانی اختلاط ہی کا نتیجہ ہے تو یہ اعزاز دہلی یالاہور کو کیوں حاصل ہوا اور سندھ کو کیوں نہیں؟ ان مقامات پر آمد سے بہت پہلے مسلمان فاتحین اور تجار وادیِ سندھ میں داخل ہوئے تھے۔

درحقیقت ۷۱۱ء محمد بن قاسم کی قیادت میں مسلمان بڑی تعداد میں بری وبحری راستوں کو عبور کرتے ہوئے سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے۔ اُس وقت وہاں کا حکم ران راجہ داہر تھا۔ عربوں نے پہلے دیول (سندھ کی بندرگاہ) کو فتح کیا پھر آگے بڑھے۔ آہستہ آہستہ پورے سندھ کو فتح کر کے اسلامی حکومت کا ایک صوبہ بنالیا۔ یہ مسلمان عربی زبان بولتے ہوئے سندھ میں داخل ہوئے تھے۔ چندوجوہ کی بنا پر وہ پورے ملک میں نہ پھیل سکے اور قریباً تین سوسال تک (۷۱۱ء-۱۰۱۰ء) وادیِ سندھ اور مغربی پنجاب ہی میں مقیم رہے۔ آخری عرب حکم ران خاندان 'خاندانِ ہباری' تھا جس کی سندھ پر حکومت ۱۰۱۰ء تک قائم رہی۔[۱۴۵]

یورپی حکم رانوں کے برعکس مسلم فاتحین کی یہ خوبی رہی ہے کہ وہ جس خطے میں بھی بہ طور فاتح داخل ہوئے، وہاں کی تہذیب وتمدن اور زبان و مذہب کو نابود کرنے کے بہ جائے نہ صرف انھیں فروغ دینے کی غرض سے اہم اقدامات کیے بلکہ ان میں اپنی تہذیب وتمدن کے بہترین عناصر کے امتزاج اور عربی زبان کی آمیزش سے مشترک تہذیب و تمدن اور زبان کی اساس تیار کرتے جس میں دونوں تہذیبوں اور زبانوں کے خصائص نمایاں تر نظر آتے۔ چناں چہ سندھ میں بھی مسلمانوں کے زیرِ اثر امتزاجی عمل کا آغاز ہوا۔ یہاں تک کہ ان دونوں قوموں (ہندواور مسلمان) کے لباس، تمدن ومعاشرت اور ان کی رفتار گفتار میں فرق وامتیاز مشکل ہو گیا۔ دونوں ایک ہی زبان بولنے لگیں۔ سندھ اور دیگر اضلاع میں عربی اور ہندی بولی جاتی اور ملتان میں ملتانی اور فارسی عام ہوگئی۔[۱۴۶]

یہی وہ شواہد ہیں جن کی بنیاد پر مولانا سیّد سلیمان ندوی اور بعدازاں ان کی تقلید میں بالخصوص پیرحسام الدین راشدی اور دیگر اہلِ علم نے اپنے مطالعے اور تحقیقات کے نتیجے میں وادیِ سندھ کو اردو کا مؤلد قرار دیا۔ ان مصنفین کے بیانات درج ذیل ہیں:

☆ **مولانا سیّد سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء)** نے اپنی تصنیف '**نقوشِ سلیمانی**'[۱۴۷] (۱۹۳۹ء) میں عرب وہند ملاپ کی وجوہات گنواتے ہوئے اُن تاریخی شواہد کو جمع کیا ہے جن سے دونوں کے لسانی روابط اور پھر عربی، فارسی اور سندھی زبان کے امتزاج کا آغاز ہوا۔ نقوشِ سلیمانی میں مولانا سیّد سلیمان ندوی کا وہ صدارتی خطبہ بھی شامل ہے جو ۱۹۱۵ء میں بہ مقام پونا آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ ترقیِ اردو کے اجلاس میں پیش کیا گیا تھا۔ اِس خطبے میں انھوں نے اپنے متضاد بیانات میں یکے بعد دیگرے دہلی، گجرات، سندھ، پنجاب اور دکن کو اردو کا مؤلد قرار دیا ہے۔ اسی سبب ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے بہ قول ''اُن کا یہ خطبہ تضادات کا شاہ کار کہا جاسکتا ہے''[۱۴۸]۔ بعدازاں اسی تصنیف میں شامل ۱۹۳۳ء کے ایک مقالے میں مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وادیِ سندھ ہی درحقیقت اردوزبان کا مقامِ پیدائش ہے اور اسی خطے میں مقامی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے اردو وجود میں آئی۔ اس سلسلے میں وہ اپنی طویل بحث کو اس بیان پر منتج کرتے ہیں:

مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے اس لیے قرینِ قیاس یہ ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیِ

سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔۔۔اسلامی لشکر شیراز اور عراق سے مرتب ہو کر آیا تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے۔اس کے بعد جو سوداگر اور تاجر یہاں آ کر بود و باش اختیار کرنے لگے تھے وہ بھی عربی اور فارسی بولتے تھے۔جہاز رانوں کی زبان بھی عربی اور فارسی سے مرکب تھی۔۔۔۔۔اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ اور ملتان میں دیسی بولیوں کے ساتھ عربی اور فارسی کا میل جول بڑھتا رہا اور ایک نئی مرکب بولی کا ہیولیٰ تیار ہوا۔[۱۴۹]

اپنے بیان کی سند میں سیّد سلیمان ندوی نے اصطخری، ابنِ حوقل اور بشاری مقدسی کے سفر ناموں سے بعض فقرے بھی نقل کیے ہیں جن کی بنا پر اقوام کے ساتھ ساتھ ان کی زبانوں کے اختلاط کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔مزید لکھتے ہیں:

اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی، وہ سندھی اور ملتانی ہے۔پھر پنجابی اور بعد ازاں دہلوی۔سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے۔چناں چہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گراں بار ہے۔۔۔سندھی، ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں۔تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے۔تینوں میں عربی و فارسی کا میل ہے۔۔۔یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضرور ہے جس کی رو سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو انہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنت دہلی کی بولی سے، جس کو دہلوی کہتے ہیں، مل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دارالسلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی۔[۱۵۰]

سیّد سلیمان ندوی نے اپنے ایک مقالے بہ عنوان 'اردو کیوں کر پیدا ہوئی؟' میں اپنے نظریے 'سندھ اردو کا مَولد' کی تغلیط خود پیش کر دی۔لکھتے ہیں:

موجودہ معیاری اردو دہلوی زبان، دوسری زبانوں سے مل کر بنی ہے۔آج کل بعض فاضلوں نے 'پنجاب میں اردو' اور بعض اہلِ دکن نے 'دکن میں اردو' اور بعض عزیزوں نے 'گجرات میں اردو' کا نعرہ بلند کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ممتاز صوبے کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے، ان سب کا نام 'اردو' رکھ دیا گیا۔حال آنکہ ان کا نام پنجابی، دکنی، گجراتی یا گجری وغیرہ رکھنا چاہیے تھا، جیسا کہ اس عہد کے لوگوں نے کیا ہے۔یہ تغیرات جب ممتاز صوبوں میں ہو رہے تھے تو خود پایۂ تخت دہلی میں تو اور زیادہ ہوتے۔[۱۵۱]

☆ **پیر حسام الدین راشدی (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۲ء)** کا مضمون بہ عنوان **'اردو زبان کا اصلی مَولد سندھ'** **۱۹۵۱ء** میں انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی کے سہ ماہی رسالے 'اردو' میں طبع ہوا۔اردو کی جائے پیدائش کے حوالے سے پیر حسام الدین راشدی کا مؤقف ان کے مضمون کے عنوان ہی سے ظاہر ہے۔لکھتے ہیں:

اردو ہندو مسلمانوں کی وہ مشترک زبان ہے جو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور حکومت اور تمدنی روابط کی بہ دولت اس طرح وجود میں آئی کہ اسلامی زبانوں کے ہزارہا الفاظ ہندی زبانوں میں شامل ہو گئے اور اہلِ ہند، ہندو ہوں یا مسلمان، انھیں سمجھنے اور بولنے لگے۔بے شبہ اردو کو اپنی موجودہ معیاری شکل اختیار کرنے میں بہت مدت صرف ہوئی اور مختلف مدارج و مراحل سے گزرنا پڑا لیکن اگر اس کے وجود میں آنے کا وہ سبب، جو اوپر بیان ہوا، مسلّم ہے تو یہ بھی مسلّمہ حقیقت

ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے اور یہیں ان کی زبان عربی واور پھر فارسی کا ہندی زبانوں سے ارتباط واختلاط
شروع ہوا۔لہٰذا یہ ایک واضح اور یقینی امر ہے کہ اردو کا اصلی مؤلد سندھ ہے۔ [۱۵۲]

سیّد سلیمان ندوی کی تقلید میں موجودہ اردو کو پنجابی، سرائیکی اور سندھی زبانوں کی ترقی یافتہ شکل قرار دیتے ہوئے پیر حسام الدین راشدی دوٹوک الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

قدیم سندھی اور مغربی ہند کی بولیوں نے اسلامی زبانوں کا سب سے پہلے اثر قبول کیا اور کچھ شک نہیں کہ سندھی اور ملتانی
ہی میں اردو زبان کا بیج پڑا۔ [۱۵۳]

☆ 'سندھ میں اردو' کی جزوی حمایت **بابائے اردو، مولوی عبدالحق (۱۸۷۲ء۔۱۹۶۱ء)** کے یہاں بھی ملتی ہے۔اگرچہ وہ سندھ کو اردو کا مؤلد تسلیم نہیں کرتے پھر بھی دبے لفظوں میں دیسی و بدیسی زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان کا ظہور اسی دھرتی سے مانتے ہیں۔**سندھ پراونشل اردو کانفرنس (Sindh Provincial Urdu Conference)** ۱۹۳۷ء کے خطبے میں فرماتے ہیں:

اے اہلِ سندھ! اگرچہ اردو کی ابتدا آپ کے ملک سے نہیں ہوئی مگر سب سے پہلے مسلم ہندو تہذیبوں کی یک جائی آپ ہی
کے ہاں شروع ہوئی اور آپ ہی نے یک جہتی میں وہ رنگ بھرا کہ جس کے نمونے کچھ دنوں پہلے تک دونوں قوموں کی رفتار
وگفتار، خوراک و پوشاک وغیرہ میں نظر آتے تھے۔اب بھی آپ کی زبان میں ہزاروں عربی فارسی کے لفظ بے تکلف بول
چال اور تحریر میں آتے ہیں۔گویا آپ نے وہ زمین تیار کی جس پر آگے چل کر اردو کے چمن نے رونق اور سرسبزی حاصل
کی۔۔۔آپ کے صوبے کی زبان، یو پی، پنجاب اور بہار کو چھوڑ کر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں اردو سے قریب تر
ہے۔۔۔ہزار ہا فارسی، عربی کے لفظ آپ کی زبان میں رچ بس گئے ہیں۔۔۔جملے کی ترکیب وترتیب وہی ہے جو اردو
زبان کی ہے۔ [۱۵۴]

قریباً اسی نوع کے خیالات کو انھوں نے بہ الفاظِ دیگر **۱۹۵۹ء** میں میر پور خاص کے کنونشن میں بھی دہرایا ہے:

ہمیں سندھ اس لیے بھی عزیز ہے کہ یہیں حجازی تہذیب اور عربی ثقافت ہند کی قدیم تعلیم وروحانیت سے ہم کنار ہوئی اور
پھر اس اتحاد واشتراک سے ایک نئی تہذیب وثقافت وجود میں آئی اور ہماری یہ قومی زبان اردو اسی تہذیب وثقافت کا شاہ
کار اور اس کی زندہ جاوید یادگار ہے۔۔۔بعض محققین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اردو زبان کا مؤلد ومنبع بھی آپ کی وادیِ
مہران ہے۔ان کے دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ اردو مسلمان اور ہندوؤں کے میل جول اور اُن کے تہذیبی وادبی اختلاط سے
پیدا ہوئی اور چوں کہ پہلے پہل یہیں عربوں کی حکومت قائم ہوئی اس لیے لامحالہ اردو نے بھی یہیں جنم لیا ہوگا۔اردو سندھ
مین پیدا ہوئی یا گجرات اور دکن میں۔۔لیکن بہ ہر حال یہ حقیقت ہے کہ صدیوں پہلے بھی یہاں اردو کے استعمال کا سراغ ملتا
ہے۔ [۱۵۵]

☆ **'سندھ میں اردو'** کے عنوان سے **ڈاکٹر شاہدہ بیگم** کا مقالہ **۱۹۸۰ء** میں منظرِ عام پر آیا۔مقالے کی تکمیل پر جامعہ کراچی نے مصنفہ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ڈاکٹر شاہدہ بیگم نے مقالے کے ایک ذیلی عنوان 'سندھ میں اردو کے ابتدائی نقوش وآثار' کے تحت اردو زبان کے آغاز سے متعلق قریباً تمام مروجہ

قیاسی و مدلل نظریات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جائزے کا ماحاصل اُن کے اس بیان کی صورت سامنے آیا:

عقلی اور قیاسی دلائل کی اس روشنی میں اردو کے تدریجی ارتقا کا پس منظر سینکڑوں سال کا احاطہ کرتا ہے جو تعیّنِ زماں اور تقیّدِ مکاں، کسی کا بھی پابند نہیں۔ ہاں الفاظ کے ابتدائی استعمال کا وقت متعین ہوسکتا ہے اور وہ وقت وہی ہے جب عرب مجاہدین کی اذانیں پہلے پہل سندھ کے ریگ زاروں میں گونجیں اور دو اجنبی قوموں کا باہمی اختلاط عمل میں آیا۔ [۱۵۶]

ڈاکٹر شاہدہ بیگم کا یہ بیان درحقیقت مولوی عبدالحق کے مندرجہ بالا بیان (خطبہ۔۱۹۵۹ء) ہی کی بازگشت ہے۔

تنقید اور تبصرہ:

مولانا سیّد سلیمان ندوی اور پیر حسام الدین راشدی کے نظریات کی بنیاد اس استدلال پر ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ربط ضبط سب سے پہلے اہلِ سندھ سے ہوا۔ لہٰذا سرزمینِ سندھ پر دو ثقافتیں اور دو زبانیں آپس میں بغل گیر ہوئیں جس سے بدیہی اور لازمی طور پر متعدد مشترک تمدنی اور لسانی اقدار وجود میں آئیں اور آہستہ آہستہ کچھ ایسے الفاظ صورت پذیر ہوئے جو دونوں اقوام کی مغائرت کے خاتمے کا سبب بنے۔ اسی استدلال پر اِن علما نے سندھ میں اردو زبان کی ابتدا کا نعرہ بلند کیا۔

اس کے برخلاف علمی و لسانی نقطۂ نظر سندھ میں اردو زبان کی ابتدا کا قطعاً موید نہیں۔ اردو میں عربی فارسی عناصر کے پیشِ نظر اس کی داغ بیل اُس وقت سے ڈالنا جب عربی زبان کے سکّے پہلی بار ساحلِ مالابار اور سندھ مین رائج ہوئے، درست نہیں۔ اس لیے کہ عربی فارسی الفاظ کا ہندوستان کی کسی بھی زبان میں داخلہ اردو زبان کی تشکیل کا ضامن نہیں۔ ''تاریخی لسانیات کا ہر واقف کار جانتا ہے کہ سندھی زبان ہندآریائی ہوتے ہوئے بھی اردو یا ہندی سے مختلف ہے۔ اس لیے قدیم سندھی میں عربی الفاظ کے نفوذ سے جدید سندھی وجود میں آتی ہے نہ کہ اردو۔ اس جدید سندھی اور اردو کے درمیان اشتراک صرف عربی رسم الخط، بعض اسما اور روایاتِ شعر کا ہے اور بس۔'' [۱۵۷]

اسی نوع کے خیالات کا اظہار ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے ہاں ان الفاظ میں ملتا ہے:

یہ واقعہ کہ مسلمان سندھ میں قریب چار صدیوں تک نشو و نما حاصل کرتے رہے، بعض حضرات کو یہ خیال کرنے کی طرف مائل کرتا رہا کہ وہاں انھوں نے فطرتاً ایک زبان کی نیو ڈالی جو اردو کی ابتدائی شکل تھی۔ مگر یہ خیال بھی انھیں اسباب کی بنا پر قبول نہیں ہے جو پہلے دبستانِ خیال (دکن میں اردو) کی مخالفت میں پیش کیے گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ میں ایک زبان یقیناً ارتقا پاتی رہی۔ مگر وہ اردو نہ تھی۔ وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی جو آج سندھی کہلاتی ہے۔ [۱۵۸]

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ اس حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے سندھ کی تہذیب و معاشرت کے علاوہ وہاں کی زبان کو بھی متاثر کیا، لیکن وہ زبان اردو نہ تھی، بلکہ وہ اُس زبان کی قدیم شکل تھی جو آج سندھی کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی زبان میں ہمیں عربی کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔ اس زبان پر عربی کا اثر یہیں تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس نے عربی زبان کے رسمِ خط کو بھی اپنا لیا۔ علمی اعتبار سے ہم بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عربوں نے وادیِ سندھ میں اپنے قیام کے دوران کسی نئی زبان کو جنم نہیں دیا، ہاں اس خطۂ ارض میں بولی جانے والی زبان کو متاثر ضرور کیا۔ [۱۵۹]

ڈاکٹر سہیل بخاری ایک اہم لسانی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سندھ میں اردو کی پیدائش کا نظریہ ان الفاظ میں رد کرتے ہیں:

اگر عربی (کیوں کہ محمد بن قاسم اور اس کے ہم راہیوں کی زبان عربی تھی) اور سندھی کی اس وقت کی مقامی بولی سے اردو بن گئی تو پھر

موجودہ سندھی کا ماخذ کیا ہوگا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ موجودہ سندھی بھی اس زبان کی بیٹی ہے جو اس وقت رائج تھی یا موجودہ سندھی ہی اس زمانے میں رائج تھی۔ تو پھر عربی اور سندھی ہی اردو کے دو عناصرِ ترکیبی قرار پاتے ہیں، لیکن جب ہم اردو زبان کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس پر عربی کا اثر صرف چند مستعار الفاظ اور اس کی لپّی تک محدود ہے اور موجودہ سندھی اردو سے اس قدر مختلف ہے کہ دونوں میں کسی قریبی رشتے (بہناپے) کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔[۱۶۰]

دل چسپ بات یہ ہے کہ سیّد سلیمان ندوی نے اپنے ایک مندرجہ بالا بیان میں اردو کی پیدائش سے متعلق نعرہ بلند کرنے والے مختلف دبستانِ خیال کی تردید تو پیش کی مگر اُس نعرے کو نظر انداز کر دیا جو انھوں نے سندھ میں اردو کے آغاز کی بابت خود بلند کیا۔ جس طرح پنجاب، دکن اور گجرات میں ہندو مسلم اختلاط یا مقامی بولی کے ساتھ عربی فارسی کے میل سے جو زبانیں وجود میں آئیں وہ اردو نہیں پنجابی، دکنی، گجراتی یا گجری تھیں۔ اسی طرح سندھ میں جس زبان کا ہیولیٰ تیار ہوا وہ اردو نہیں، سندھی تھی[۱۶۱]۔ اس بیان کی پُر زور تائید ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے اس بیان سے ملتی ہے:

It is agreed that a language was certainly developing in Sindh, but it was not Urdu.Itwastheearlierformoflanguagewhichisnowcalled Sindhi.[162]

سندھ میں اردو زبان کی پیدائش کے موید اہلِ علم نہ تو اُس دھرتی پر اردو زبان کی روایت ثابت کر سکے اور نہ ہی اس حوالے سے تحقیق سامنے لا سکے کہ اردو کیوں، کب اور کس طرح سندھ کی حدود سے باہر نکلی؟ کن کن ارتقائی مدارج سے گزری؟

اردو کی آفرینش کے حوالے سے وادیِ سندھ کے دعوے پر تنقید اور سندھ کے اُس دور کے لسانی منظر نامے کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت سندھ میں جو زبان مقامی سطح پر رائج تھی، وہ کیا تھی؟ اس حوالے سے ڈاکٹر مہر عبدالحق کی رائے ہے کہ ''ایسی اَپ بھرنش ہے جو پشاچا کی یا تو شاخ ہے یا اس سے متاثر ہوئی ہے۔ کشمیری، سندھی اور کوہستانی سب دردی زبانیں ہیں۔ ملتانی اور سندھی، جسے لہندا کہا جاتا ہے، دردی بنیادوں پر استوار ہیں''[۱۶۳]۔ زیادہ تر ماہرین ڈاکٹر مسعود حسین خان کی اس تحقیق سے متفق ہیں کہ ''سندھ کو پرانے زمانے میں براچڈ دیس کہا جاتا تھا''[۱۶۴] اسی مناسبت سے ''براچڈ اَپ بھرنش سندھ میں رائج تھی۔ موجودہ سندھی اسی سے نکلی ہے''[۱۶۵]۔ مزید وضاحت میں لکھتے ہیں:

لہندا اور سندھی دونوں دوآبہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں، اس لیے اردو کے آغاز کا سلسلہ ان زبانوں سے نہیں ملایا جا سکتا گو مسلمان اوّل اوّل انھیں زبانوں کے علاقوں میں داخل ہوئے۔[۱۶۶]

اردو اور سندھی کے زبردستی میل پر ڈاکٹر گیان چند جین دل چسپ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہندو مسلمان کے میل کا نسخہ ایسا ہے کہ کہیں بھی، کسی بھی زمانے میں ہوا ہو، اس ملاوٹ کا نتیجہ اردو رہا ہوگا۔ سیّد صاحب کو اس سے غرض نہیں کہ سندھ میں آنے والے مسلمانوں کی زبان عربی تھی اور سندھ کے ہندوؤں کی زبان براچڈ اَپ بھرنش۔ ان کے میل سے سندھی زبان بن سکتی تھی، اردو نہیں۔[۱۶۷]

مولوی عبدالحق کی تقلید میں ڈاکٹر شاہدہ بیگم اپنے مذکورہ بالا بیان کے توسط سے اردو زبان کے ابتدائی الفاظ کی مقدم گونج وادیِ سندھ میں سنتی ہیں، لیکن تاریخی لسانیات اسے تسلیم نہیں کرتی۔ ہند آریائی زبانوں کے قریباً سبھی ماہرین متفق ہیں کہ اردو بلاشبہ مدھیہ دیش کی زبان 'مدھیہ دیشہ' کی ارتقائی صورت ہے۔ 'سنسکرتی عہد کے جغرافیے میں جس علاقے کا نام بار بار آیا ہے اور جسے خالص آریاؤں کا تہذیبی مرکز ہونے کا فخر حاصل ہے وہ یہی مدھیہ دیش ہے۔ مدھیہ دیش کو قدیم زمانے میں آریائی ہند کا قلب سمجھا جاتا رہا ہے''[۱۶۸]۔ لہٰذا اردو کے ابتدائی الفاظ اور بولوں کی گونج پہلے پہل مدھیہ دیش ہی میں کہیں سُنائی دی گئی ہوگی نہ کہ

'وراچڈ دیش' (وادیِ سندھ) میں۔ ہاں البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ''جن عوامل نے ہندوستان کی ایک آریائی زبان کو ہماری اردو کا قالب عطا کیا، وہ سب سے پہلے سندھ میں کارفرما ہوئے، جس کا نتیجہ موجودہ سندھی زبان ہے۔ سندھی اور اردو کے اشتراک وتشابہ کا ایک پہلو ایسا ہے جو صرف انھی عوامل کا مرہونِ منت ہے۔ ہماری مراد عربی فارسی اثرات سے ہے جو انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد قبول کیے۔''[۱۶۹]

یہ نظریہ ٹھوس لسانی شواہد ودلائل کے بہ جائے قیاسات پر استوار ہونے کی بنا پر لسانی ماہرین وناقدین کی طرف سے یک جنبشِ قلم رد کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے اسے 'سندھ کا قضیہ' قرار دیتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں اس کی تردید کر دی:

اگرچہ مسلمانوں کا دخل وعمل پنجاب اور اٹک پار سے داخلے سے پہلے سندھ میں ہوا، لیکن سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی۔[۱۷۰]

یہ ہیں وہ تین اہم نظریات جن کی رو سے اردو کا آغاز کسی خاص علاقے سے مشروط قرار پاتا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی کی تصنیف 'دکن میں اردو' اور بالخصوص پروفیسر شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اردو' کے منظرِ عام پر آتے ہی اردو کی ابتدا سے متعلق تحقیقات کا لامتناہی سلسلہ علاقہ درعلاقہ، شہر درشہر اور زبان درزبان چل نکلا اور اردو کی لسانی تحقیق پر مبنی ایسی بے شمار کتب، مقالات اور آرٹیکل سامنے آنے لگے جن میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کا تعلق کسی نہ کسی خاص علاقے یا زبان سے جوڑ کر تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا۔ اس نوح کی تحقیقات کا اندراج ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی تصنیف 'اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ' کے صفحہ نمبر ۱۱۷ تا ۱۱۹ کیا ہے[۱۷۱]۔ ان تمام نظریات کی تہہ میں ایک ہی خیال کارفرما نظر آتا ہے کہ اردو زبان کی پیدائش برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد پراکرتوں میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اردو کے مخلوط زبان ہونے کا خیال صرف اس حد تک درست ہے کہ اس کا گنجینۂ لغت مختلف زبانوں کے الفاظ سے بھرپور ہے، البتہ اپنی ساخت اور بنیادی ڈھانچے کے حوالے سے وہ دیگر ہند آریائی زبانوں کی طرح باقاعدہ اپنا شجرۂ نسب رکھتی ہے اور قدیم ہند آریائی زبان سے اسے وہی نسبت ہے جو اس کی دیگر ہم عصر بولیوں کو ہے۔ اردو کے مخلوط زبان ہونے کا یہی غلط تصور متعدد پُرتعصب علاقائی نسبت کے حامل نظریات کا سبب بنا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری علما ومحققین کے لیے کچھ منطقی سوالات اُٹھاتے ہوئے اس خیال کے رد میں لکھتے ہیں:

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ متعدد زبانوں میں تبدیلیِ ہیئت کا عمل ایک ہی وقت میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ وقت وہی ہے جب کہ مسلمان ہندوستان کی سرحد پار کرتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ کب نکلتا ہے کہ مسلمانوں کا ورود کسی زبان کی پیدائش کا سبب بھی ہے اور وہ زبان بھی صرف اردو ہی تھی۔ اگر مسلمان ایک مقام پر ایک زبان کو جنم دے سکتے تھے تو انھوں نے دوسرے مقامات پر دوسری زبانوں کو جنم کیوں نہیں دیا۔ آخر جس اصول پر مغربی ہندوستان کے کسی ایک علاقے میں اردو زبان کی پیدائش ہو سکتی تھی۔ اسی اصول پر بنگال اور آسام میں بھی کسی ایسی ہی کھچڑی زبان کا وجود میں آنا ضروری تھا اس لیے کہ مسلمان تو ایک دن وہاں بھی پہنچے تھے اور بہ حیثیت حکمران پہنچے تھے۔ انھیں دیسی باشندوں کے ساتھ تعلقات قائم کرتے وقت ضرور ایسی ہی دقت پیش آئی ہوگی جیسی مغربی ہندوستان میں لاحق ہوئی تھی۔[۱۷۲]

ڈاکٹر سہیل بخاری کے اس استدلال سے قطعاً بے خبر زیادہ تر دیسی علما نے اپنی اپنی فہم وفراست کے مطابق اردو کے آغاز کو برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور زبانوں کے باہم اختلاط سے مشروط کرتے ہوئے تعینِ زمانی کی بھی سعی کی ہے اور اس طرح پہلے پہل سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے (۷۱۱ء) سے لے کر عہد شاہ جہاں (۱۶۲۸ء۔۱۶۵۸ء) تک قریباً ہزار سال کے عرصے میں مختلف ادوار کو اردو زبان کی پیدائش سے منسوب کر دیا۔ البتہ مغربی محققین نے اس حوالے سے محتاط روی سے کام لیتے ہوئے تعینِ زمانی کی کوشش نہیں کی۔

یہ سچ ہے کہ نہ صرف اردو بلکہ جدید ہند آریائی زبانوں کا برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے گہرا تعلق ہے۔ پیدائش کے حوالے سے نہیں بلکہ ارتقا وترویج کے حوالے سے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی آمد نے انھیں ابھرنے اور نکھرنے کے مواقع فراہم کیے، جیسا کہ ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی بھی لکھتے ہیں:

اگر ترکی اسلامی فتوحات نہ ہوتیں تو بھی جدید ہند آریائی زبانیں وجود میں آتیں، لیکن اس کا احساس بہت دیر میں ہوتا کہ وہ سنجیدہ ادبی

مقاصد کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہیں۔[۱۷۳]

گویا اردو کے وجود میں آنے سے قبل ہی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جدید زبانوں کی پیدائش کے اسباب پیدا ہو چکے تھے۔اسی سبب ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی نے کہا تھا کہ اگر مسلمان اس ملک میں نہ بھی آئے ہوتے تو لسانی تغیرات کے اس عمل کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔مسلمانوں کی آمد سے یہ عمل مہمیز ہوا اور بس۔درحقیقت برِصغیر کے مختلف خطّوں سے اردو زبان کے انسلاک کے حوالے سے محققین کے اختلافی بیانات کی روشنی میں کوئی بھی حتمی فیصلہ بہت دشوار ہے۔

ملتان میں اردو زبان کی ابتدا:

سرائیکی وسیب مختلف دریاؤں کا سنگم ہے جسے اب سرائیکی دھرتی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔اِس کے بعض محققین کا دعویٰ ہے کہ اگلے وقتوں میں یہ خطّہ ایک وسیع وعریض مملکت کی حیثیت رکھتا تھا۔شمال کی طرف اِس کی حدود کشمیر کی ریاست سے ملتی تھیں اور شمال مشرق میں صوبہ پنجاب سے، جب کہ مغرب میں اِس کی سرحدیں افغانستان اور ایران کے ساتھ ساتھ تھیں اور جنوب میں دیبل (کراچی) اور مشرق میں راجستھان کی ریاست اِس کی حدیں تھیں۔پورے صوبے میں مختلف زبانیں اور بولیاں تھیں، مثلاً سندھی، بلوچی اور سرائیکی (ملتانی)[۱۷۴]۔مرکزیت صرف ملتان اور سرائیکی (ملتانی) زبان ہی کو حاصل تھی۔ملتان ہزاروں برس پہلے کا 'ملوہہ' پوری وادیِ سندھ کا ایک اہم ترین شہر تھا۔اس لیے مختلف علاقائی بولیاں سرائیکی زبان ہی کی شاخیں تھیں جب کہ صوبائی زبانیں (لاہوری، سندھی، بلوچی) سرائیکی سے متاثر تھیں[۱۷۵]۔زمانۂ قدیم ہی سے قدرتی دولت سے مالا مال یہ سرزمین مختلف اقوام کا پسندیدہ مسکن اور مختلف حملہ آوروں کی لُوٹ مار کا نشانہ بنتی رہی ہے۔اسی سبب اِس علاقے میں سماجی، ثقافتی اور لسانی اختلاط کا عمل بھی جاری رہا۔سرائیکی وسیب میں بسنے والے قدیم باشندے مُنڈا قبائل تھے اور یہاں کی قدیم زبان مُنڈاری تھی۔اِس زبان کے اردو اور سرائیکی میں بہت سے الفاظ آج بھی موجود ہیں۔مُنڈا قبائل کے بعد دراوڑ اِس خطے کی قدیم قوم ہے۔مُنڈا اور دراوڑ اقوام کے اِس خطے میں اکٹھے ہونے کے بعد دو تہذیبوں کا لسانی اشتراک شروع ہوا[۱۷۶]۔سرائیکی وسیب کی یہ قدیم تہذیب 'وادیِ سندھ کی تہذیب' (Indus Civilization) کہلاتی ہے۔اِس تہذیب کی نمائندہ زبان وہ تھی جو بعد ازاں پنجابی، ملتانی، بہاول پوری اور اردو کی شکل میں ارتقا پذیر ہوئی۔مُنڈا اور دراوڑ کے بعد سرائیکی وسیب میں آنے والا ایک بڑا گروہ آریا قبائل تھے جو چار ہزار سال قبل مسیح وارد ہوئے۔آریاؤں نے یہاں کی تہذیب کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا اور یہاں کے قدیم باشندوں پر اپنا تسلط قائم کر کے حکم رانی کرنے لگے۔لیکن قدیم تہذیب کی زبانوں کو آریا یک سر ختم نہ کر سکے۔رفتہ رفتہ آریائی بولیوں اور مقامی زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان کی تشکیل عمل میں آئی۔اِس کے بعد افغانستان سے ابھیر قوم اِس خطے میں وارد ہوئی۔انھوں نے چھٹی صدی عیسوی میں اپنی زبان اَپ بھرنش کو اِس خطے میں رائج کیا[۱۷۷]۔مسلمانوں کی سندھ اور ملتان آمد سے قبل اہلِ ملتان کی زبان ایک ملی جُلی زبان تھی جس میں پشاچی اور وراچڑ اَپ بھرنش کے اثرات موجود تھے۔آٹھویں صدی عیسوی میں فتح سندھ کے بعد یہاں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔اُس وقت بھی ملتان مملکتِ سندھ کا دارالخلافہ تھا۔مسلمانوں اور مقامی آبادی کے درمیان اظہار و ابلاغ کے لیے ایک مشترکہ نئی زبان کی تشکیل عمل میں آئی۔اِس طرح سرائیکی وسیب میں اردو زبان کی لسانی تشکیل کا عمل گویا وادیِ سندھ میں عربوں کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا لہٰذا نئی زبان 'اردو' کا مولد یہی علاقہ تھا۔[۱۷۸]

یہ تاریخی و لسانی پس منظر اردو کے آغاز و ارتقا کے سلسلے میں بعض مصنفین کے لیے ایک نئے نظریے کا محرک ثابت ہوا جس کی رو سے ملتان اردو زبان کی جائے پیدائش قرار پایا اور سرائیکی (ملتانی) اِس کا اصل سرچشمہ۔

☆ اردو اور ملتانی کی مماثلت کے حوالے سے پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا بیان ہے:

> اردو اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔دونوں میں اسما و افعال کے خاتمے میں الف آتا ہے۔دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ اُن کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں۔[۱۷۹]

اِس بیان سے اشارہ پا کر ڈاکٹر مہر عبدالحق (۱۹۱۵ء۔۱۹۹۶ء) نے اردو کی ابتدا کے حوالے سے ایک نئے نظریے کی بنیاد رکھی جس کا اظہار اُن کی تصنیف 'ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق' مطبوعہ ۱۹۶۷ء میں ہوا ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اس کتاب میں تاریخی، جغرافیائی اور لسانی خصوصیات کی بنا پر نہ صرف سرائیکی (ملتانی) کا مقام متعین کیا ہے بلکہ سرائیکی زبان کے لسانی گروہ، اس کے تاریخی پس منظر، جغرافیائی حالات اور اِس پر ہم سایہ زبانوں کے اثرات کا تنقیدی جائزہ بھی محنت سے لیا ہے۔ وہ سرائیکی کو بہت قدیم یہاں تک کہ ویدوں کی زبان سے بھی قدیم مانتے ہیں اور اُسے غیر سنسکرت زبان قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> قدیم بولیاں یا پراکرتیں نہ سنسکرت سے نکلی ہیں اور نہ اِس کی بگڑی ہوئی صورت ہیں بلکہ یہ ایک ایسی قدیم زبان کا پتہ دیتی ہیں جو سنسکرت بلکہ ویدوں کی زبان سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ [۱۸۰]

انھوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ملتانی زبان جسے اب سرائیکی کا نام دیا گیا ہے زمانہ قدیم سے اسی علاقے میں رائج تھی۔ وہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے اِس بیان سے تو متفق ہیں کہ اردو نحوی لحاظ سے سرائیکی زبان کے قریب ہے مگر لاہور کو اردو زبان کے مولد کی حیثیت سے قبول نہیں کرتے۔ اُن کا ماننا ہے کہ اردو کی ابتدا لاہور کے بہ جائے ملتان سے ہوئی اور اصل میں اِس نئی زبان کا خمیر اور بنیادی ہیولیٰ ملتان ہی میں مسلمانوں کے قیام کے دوران میں وجود میں آیا تھا۔ لکھتے ہیں:

> وادیِ سندھ میں عربی، فارسی، بلوچی، ترکی وغیرہ زبانوں کے اختلاط سے جو نئی زبان پیدا ہوئی وہ یہی زبان تھی جسے آج ہم ملتانی کہتے ہیں۔۔۔۔۔ملتانی زبان ہندو مسلم اتحاد کی اوّلین یادگار ہے۔ اپنے وطن سے چل کر لاہور اور پھر دہلی پہنچی، مگر نواح کی زبانوں کے سانچے میں ڈھل کر 'اردو' کہلائی۔ [۱۸۱]

انھوں نے ملتانی زبان کا اردو سے تعلق ثابت کرنے کے لیے تقابل السنہ کے اصولوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ملتانی زبان کے الفاظ کا اشتقاق اور ماخذ تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کی صرف و نحو کو بھی کھنگالا ہے اور مختلف لسانی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ 'سرائیکی وسیب' اور اردو زبان کا تعلق پہلا اور بہت پُرانا ہے۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے گریرسن کے اِس نظریے کی بھی تردید کی ہے کہ لہندا اور ملتانی (بلکہ سندھی بھی) ایک ہی زبان ہے۔ اُن کے مطابق، ''لہندا اور ملتانی میں جو اشتراک ہے وہ صرف چند اسما اور افعال تک محدود ہے۔ پنجابی اور لہندا میں کوئی ایسی فاضل بولی واضح طور پر کہیں نہیں ملتی جسے بیچ کی درمیانی کڑی کہا جائے'' [۱۸۲]۔ لہندا، پنجابی زبان تو ہوسکتی ہے مگر ملتانی ہرگز نہیں۔ ملتانی الگ زبان ہے۔ انھوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا ہے:

> لہندا اور پنجابی دو مختلف چیزیں ہیں، کیوں کہ کوئی کامل چیز اپنے جزو میں ضم نہیں ہوسکتی۔ نہ کوئی بڑا حصہ یا کُل اپنے چھوٹے حصے یا جزو میں مدغم ہوسکتا ہے۔ [۱۸۳]

دراصل پنجابی اور سرائیکی کا جغرافیائی تعلق اِن کی سرحد کا ساتھ ساتھ ہونا ہے اور ایک ہی خطے میں بولی جانے والی زبان کا اپنی ہم سایہ زبان کے ساتھ لسانی اشتراک ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے اردو اور پنجابی لسانیات کے اکثر ماہرین اور مؤرخینِ ادب نے پنجابی اور سرائیکی کے لسانی اختلاف کو سامنے نہ رکھا بلکہ اشتراک کے نظریے کے تحت سرائیکی (ملتانی) کو پنجابی زبان ہی کی ایک شاخ یا بولی ر لہجہ تصور کر لیا۔ [۱۸۴]

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے ملتانی زبان کے وہ پانچ حروفِ تہجی (ب، ج، ڈ، گ، ن) بھی درج کیے ہیں جن کی وجہ سے ملتانی زبان کو پنجابی زبان کے مقابلے

میں وسعت نصیب ہوئی۔ یہ حروف جو آوازیں دیتے ہیں وہ کسی دوسری زبان کے بولنے والے ادا نہیں کر سکتے۔ یہ آوازیں سندھی زبان میں اگرچہ ملتی ہیں، مگر اِن کی ادائیگی میں فرق ہے۔ اِن میں ب، ج، ڈ، گ تالوی (تالو سے ادا ہونے والی) آوازیں ہیں جنھیں 'Cerebral Voices' کہتے ہیں جب کہ باقی زبانوں کے لیے یہی حروفِ تہجی دندانی آوازیں (Dental Voices) رکھتے ہیں۔

سرائیکی (ملتانی) کو اردو زبان کی اصل اور ملتان کو اس کا مولد قرار دینے کے حوالے سے ڈاکٹر مہر عبدالحق کی آواز پر بعد ازاں مزید محققین نے لبیک کہا۔ اِس سلسلے میں ڈاکٹر روبینہ ترین کا مقالہ **'ملتان میں لسانی تشکیلات کا عمل اور دوسرے مضامین'** کے عنوان سے **۲۰۰۴**ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے شائع ہوا۔ علاوہ ازیں **'تاریخِ ادبیاتِ ملتان'** کے عنوان سے اُن کی تصنیف بھی **۲۰۰۱۲**ء میں مقتدرہ قومی زبان کے توسط ہی سے منظرِ عام پر آئی۔ **'ملتان اردو کی جنم بھومی'** کے عنوان سے **شبیر حسین اختر** کی کتاب بزمِ ثقافت ملتان نے **۲۰۰۵**ء میں شائع کی۔ انھی مباحث پر مشتمل **اجمل مہار ابنِ اکبر** کا مقالہ، بہ عنوان **'حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مہر عبد الحق: لسانی نظریات۔ تقابلی مطالعہ' ۲۰۱۲**ء میں مقتدرہ قومی زبان سے شائع ہوا۔ مذکورہ تمام کتب ڈاکٹر مہر عبدالحق کے نظریے پر توسیع کی صورت میں سامنے آئیں۔ سرائیکی وسیب کی قدیم زبان کو اردو کا ماخذ قرار دینے والے ماہرین دراصل اِس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی نشو و نما اور ارتقا کا عمل اُس وقت شروع ہوا جب مسلمان برِ صغیر پاک و ہند (سرزمینِ سندھ و ملتان) میں داخل ہوئے۔ اِس دوران سرائیکی (ملتانی) زبان مختلف لسانی اختلاط سے گزرتی رہی اور کئی صدیوں تک ایک نئی مخلوط زبان لسانی تشکیل کے عمل سے گزرتی ہوئی عربی و فارسی اور سندھ و ملتان کی مقامی زبانوں سے ملاپ کر کے سندھ سے ملتان اور ملتان سے لاہور اور پھر لاہور سے دہلی پہنچی۔ اردو، جسے پاکستان کی زبان کہتے ہیں، کا ہیولیٰ سندھ اور ملتان میں تیار ہوا اور پھر پنجاب سے ہوتا ہوا دہلی اور اُس کے گرد و نواح سے متاثر ہو کر ارتقا پذیر ہوا۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق کی لسانی تحقیقات اگرچہ اِن کی جُست جُو کی مظہر ہیں لیکن علاقوں کے تعلق سے اردو کی پیدائش کا قضیہ اِس لحاظ سے عجیب لگتا ہے کہ کئی علاقے اردو کی جنم بھومی ہونے کے دعوے دار ہیں۔ اِس نظریے پر بھی اُن تمام اعتراضات کا اطلاق ہوتا ہے جو 'پنجاب میں اردو' اور 'سندھ میں اردو' وغیرہ پر اُٹھائے گئے ہیں۔ البتہ اس نظریے کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے قطع نظر یہ کتاب لسانیات، قواعد اور لفظیات سے متعلق اہم مباحث کی حامل ہے۔

لسانیاتی تحقیق پر مبنی جدید نظریات

کسی بھی زبان کی اصل اور بنیاد پر تحقیق کے حوالے سے جدید لسانیات کے مسلمہ اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس زبان کے بنیادی لسانی سرمائے میں سے سرمایۂ الفاظ کے بہ جائے اُس کے صرفی و نحوی قاعدوں اور صوتیات کو زیرِ بحث لایا جائے۔[185] لسانی تحقیق میں زبان کے ڈھانچے میں اوپر سے منڈھی ہوئی کھال یا جھلّی کی حیثیت رکھنے والے عام مفرد یا مرکب 'الفاظِ مانعہ'[186] (جیسے گھوڑا، پلنگ، پنسل، کتاب وغیرہ) کی اہمیت 'تجارتی لین دین' سے زیادہ نہیں ہوتی، لہٰذا انھیں نظر انداز کر کے اس سلسلے میں زبان کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھنے والے 'الفاظِ عامہ'[187] (اسما، افعال، ضمائر، حروفِ ربط وغیرہ)، زبان کی بنیادی آوازوں/مادوں اور صرفی و نحوی قاعدوں کو دیکھنا چاہیے کہ کس زبان کے ہیں اور اُن کا ارتقائی سلسلہ آس پاس کی کس قدیم اصلی زبان سے جا ملتا ہے۔ 'لسانی رشتے' کے صفحہ نمبر ۷۰ پر ڈاکٹر گیان چند جین نے اردو زبان کے 'الفاظِ عامہ' کی فہرست درج کی ہے۔

زبان کی اصل اور اساس پر تحقیق کے ضمن میں زبان کے سرمایۂ الفاظ کے برعکس صرفی و نحوی قاعدوں اور صوتیات کی اہمیت واضح کرتے ہوئے میکس مُلر (Max Muller) اپنی تصنیف 'Lectures On The Science Of Language' میں لکھتے ہیں:

> .... languages can be analysed and classified on their own evidence,
> particularly on the strength of their grammatical articulation, without any
> refrence to the individuals, families, clans, tribes, nations, or races by whom

> they are or have been spoken .... grammar is made the criterion of the relationship and the base of the classification in almost all languages; and it follows, therefore, as a matter of course, that in the classification and in the Science of Language, it is impossible to admit the existence of a mixed idiom.[188]

اسی نوع کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تھامس جارج ٹکر (Thomas George Tucker) اپنی تصنیف 'Introduction To The Natural History Of Language' میں رقم طراز ہیں:

> .... it is almost unanimously admitted by philologists that, however large a borrowing of foreign vocables may take place, there is no satisfactory evidence that foreign grammar is ever borrowed to any appreciable extent by a truly live spoken language. The utmost that can be effected grammatically by the influence of one language upon another is to assist in breaking down the unessential elements of an old system.[189]

گویا کسی زبان کے ماخذ کی تلاش میں ازبس ضروری ہے کہ اُس کے صرفی ونحوی قاعدوں اور صوتی تبدیلیوں کی ارتقائی وتقابلی تاریخ کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اُس زبان کا تجزیہ کیا جائے۔

قواعدی ساخت کے اعتبار سے دنیا کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زبانوں کے رشتے ان کے ساختیاتی تجزیے سے معلوم اور متعین کیے جاتے ہیں۔ بنیادی اور تعمیری الفاظ میں مماثلت، حروفِ ربط کی مشابہت اور صرفی ونحوی قاعدوں میں یک سانی کی نوعیت کی بنا پر ایک زبان دوسری زبان کی قریبی یا دور کی رشتے دار قرار دی جاسکتی ہے۔ زبان دراصل اِنھی بنیادی لسانی خصوصیات کا نام ہے۔ اِنھی سے زبان کی بنیادی انفرادی ساخت مترشح ہوتی ہے جس سے وہ دوسری زبانوں سے ممتاز ہو کر ایک مستقل، منفرد اور آزاد زبان کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ ایک ہی خاندان کے افراد ہونے کی بنا پر کچھ قریبی زبانوں میں ان بنیادی لسانی خصوصیات میں سے چند ایکمشترک مل سکتی ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ خصوصیات ایک ہی زبان کی تشکیل کرتی ہیں۔ ان بنیادی لسانی خصوصیات کے تجزیے کے بغیر زبان کی ساخت متعین کرنا، اُس کے ماخذ تک رسائی کی کوشش کرنا اور اُس میں واقع ہونے والی تاریخی تبدیلیوں کا پتا لگانا گُم راہ کن نتائج کا ذمے دار ہوسکتا ہے۔ دخیل الفاظ زبان کی ساخت پر اثر انداز نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کی مدد سے زبان کے تعمیری دور معلوم کیے جاسکتے ہیں۔

بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کے محققین نے تاریخی حالات کے تناظر میں اردو کو کسی نہ کسی خاص خطّے کی پیداوار قرار دیا۔ اِن سے قبل اہلِ علم نے اردو کو ایک مخلوط زبان قرار دے کر اَن گنت قیاسی نظریات کا پرچار کیا، مگر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اُن تمام اہلِ علم ونظر نے اردو زبان کی آفرینش اور نشو ونما کے حوالے سے نظریات قائم کرتے وقت نہ صرف اردو کے لسانی سرمائے کے مختلف عناصر ہی کو یک سر نظر انداز کر دیا بلکہ اُس کی صرف ونحو اور صوتی خصوصیات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ حال آنکہ اردو زبان کے ماخذ کی تلاش میں اسی پہلو کو باقی سب امور پر فوقیت حاصل ہونا چاہیے تھی۔ بعد میں آنے والے محققین نے صرفی نحوی قواعد، صوتی خصوصیات، لفظوں کی ساخت اور لسانی اشتراک کی راہ نمائی میں اردو زبان کے منبع تک رسائی میں اپنے تحقیقی سفر کی بنیاد رکھی۔ اِس ضمن میں ایسے متعدد نظریات سامنے آئے جن کے توسط سے قدیم ویدک بولی، ہریانی، مہاراشٹری، دراوڑی اور منڈا زبانیں اردو کے ماخذ کی حیثیت سے نہ صرف زیرِ بحث لائی جاتی رہی ہیں بلکہ مباحث کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جس طرح قدیم نظریہ سازوں کے نظریات ایک دوسرے سے متصادم رہے ہیں اسی طرح اردو کی لسانی تشکیل اور اِس کے آغاز سے متعلق جدید نظریات میں بھی ہم آہنگی اور اتفاقِ رائے کا فقدان ہے۔ اِس پر اِزدیاد یہ کہ اکثر محققین کے ہاں انفرادی طور پر زمانہ وار اختلافی نظریات و بیانات بھی موجود ہیں جن سے اُن کی لسانی فکر میں بہ تدریج تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس حوالے سے بعد ازاں سامنے آنے والے حقائق پر مبنی اُن محققین کا آخری

بیان ہی سند واہمیت کا حامل قرار دیا جائے گا۔

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے جدید لسانیاتی بنیادوں پر قائم نظریات کو نوعیت کے اعتبار سے دو اہم زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اردو آریائی الاصل زبان

۲۔ اردو دراوڑی الاصل زبان

اردو آریائی الاصل زبان:

اس حقیقت سے قطع نظر کہ محققینِ اردو کے نظریات و بیانات زبانِ اردو کے عہدِ آفرینش کے تعین میں نہ صرف متضاد ہیں بلکہ ایک دوسرے کے رد میں مدلّل تاریخی ولسانی شواہد بھی پیش کرتے ہیں، تاہم محققین و ماہرین کا ایک بڑا گروہ اردو کو بلاشبہ آریائی الاصل زبان تسلیم کرتا ہے۔ اِن علما کی تحقیق اردو زبان کے آغاز کو ظہورِ اسلام سے بہت پہلے آریا اقوام کے ورودِ ہندوستان کے وقت تک لے جاتی ہے۔ ''اِن کے مطابق اردو ایک آریائی زبان ہے جو ہندوستان کی ایک قدیم پراکرت سے نکلی ہے اور پراکرت یا تو سنسکرت سے اُبھری ہے یا اِس کی کسی ایسی معاصر بولی سے مشتق ہے جو سنسکرت ہی کی طرح خالص آریائی تھی''۔[۱۹۰]

اردو کو آریائی الاصل زبان تسلیم کرنے والے اہلِ علم کے لسانی افکار کا تدریجی جائزہ ذیل میں پیش کرنے سے قبل اِس امر کا ذکر ضروری ہے کہ اِس قبیل کے محققین میں سے اکثر کا ذکر 'عمومی قیاسی نظریات' اور 'نیم سائنسی نظریات' کے عنوانات کے تحت کیا جا چکا ہے۔ ذیل میں فقط اُن ماہرینِ لسانیات کے نظریات اور لسانی بیانات کا درج کیا جانا مقصود ہے جو اردو زبان کو آریائی النسل تسلیم کرتے ہوئے اُس کی ابتدا کو مختلف ادوار اور دیگر آریائی زبانوں اور بولیوں سے منسوب کرتے کرتے کہیں بالواسطہ تو کہیں براہِ راست 'کھڑی بولی' تک پہنچتے ہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان:

اردو کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے خالص لسانیاتی نقطہ نظر سے وسیع تناظر میں مطالعہ وتحقیق کرنے والے ماہرین میں **ڈاکٹر مسعود حسین خان (۱۹۱۹ء-۲۰۱۰ء)** سرِ فہرست ہیں۔ انھوں نے امیر خسرو کے فقرے 'زبانِ دہلی و پیرامنش' (دہلی اور اِس کے نواح کی بولیاں) سے اشارہ پا کر نواحِ دہلی کی بولیوں (کھڑی بولی، برج بھاشا، ہریانی، قنوجی، میواتی) کے جدید روپ اور دست یاب قدیم نمونوں کے تقابلی تجزیے اور مطالعے کی بنیاد پر دکنی زبان (اردوئے قدیم) کی خصوصیات کو پنجابی کے بہ جائے مذکورہ بولیوں میں پہچاننے کی کوشش کی۔ اُن کے مطابق تمام مذکورہ بولیوں نے مختلف ادوار میں اردو کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ میواتی اور بالخصوص ہریانی نے قدیم اردو کی تشکیل میں حصّہ لیا۔ کھڑی بولی نے جدید اردو کا ڈول تیار کیا۔ برج بھاشا نے اردو کا معیاری لب ولہجہ متعین کرنے میں مدد دی۔ اِس حوالے سے اِن کی پہلی لسانیاتی تصنیف **'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو'** مطبوعہ **۱۹۴۸**ء سے اِن کے بیانات درج ذیل ہیں:

☆ قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اِس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں اور جب پندرھویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا مقبولِ عام ہو جاتی ہے تو سلاطینِ دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے۔[۱۹۱]

☆ قدیم اردو جمنا پار کی ہریانی بولی سے قریب تر ہے۔ جدید اردو اپنی صرف ونحو کے اعتبار سے مراد آباد اور بجنور کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے۔ برج بھاشا نے بعد کو اردو کا معیاری لب ولہجہ متعین کرنے میں ضرور مدد دی ہے۔ اِس سلسلے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سکندر لودھی کے عہد سے لے کر شاہ جہاں کے زمانے تک آگرہ ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے۔[۱۹۲]

☆ جدید اردو کا معیاری لب ولہجہ برج بھاشا کا تتبع کرتا ہے۔[۱۹۳]

☆ راجپوتوں کی دلّی، ڈلّی یا اَپ بھرنش ادبیات کی 'ڈھلی' ہریانے کے علاقے میں تھی جس سے کھڑی بولی کی نسبت میواتی زیادہ قریب تھی۔۔۔ بعد کو مغلوں کے عہد میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات اِس پر غالب آجاتے ہیں۔[۱۹۴]

دست یاب قدیم تحریری مواد اور نواحِ دہلی کی مذکورہ بولیوں کے تقابلی مطالعے اور تجزیے سے ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اردو کی ابتدا و ارتقا کے حوالے سے اپنے لسانی نظریے کی تشکیل اس طرح کی کہ دوآبہ (مغربی یوپی) اور جمنا پار کا علاقہ یعنی دہلی اردو زبان کا مولد و منشا اور زبانِ دہلی و پیرا منش اِس کی ماخذ قرار پائی۔ انھوں نے گویا 'دہلی اور نواحِ دہلی' کو اردو زبان کی جائے پیدائش کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔

لکھتے ہیں:

اِس لیے 'زبانِ دہلی و پیرا منش' اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے اور حضرتِ دہلی اُس کا حقیقی مولد و منشا۔[195]

مزید لکھتے ہیں:

اِس زبان کا مولد و منشا امیر خسرو کی 'حضرتِ دہلی' اور اِس کے نواح کی بولیاں ہیں۔ قدیم اردو کی وہ تمام خصوصیات جنھیں مرہٹی، پنجابی یا برج بھاشا سے منسوب کیا جاتا رہا ہے، اِس تجزیے کے بعد یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اِن کا تعلق دہلی کے نواح کی دو بولیوں؛ کھڑی بولی اور ہریانی سے ہے۔ قدیم اردو کی بعض شکلوں کا تعلق مشرقی راجستھان کی بولی میواتی سے بھی ہے جو مہرولی اور قطب تک پھیلی ہوئی ہے۔[196]

درج بالا قول سے بلاشبہ اِس امر کی وضاحت ملتی ہے کہ اردو کے آغاز کے سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے دہلی اور نواحِ دہلی کی تمام بولیوں میں ہریانی اور کھڑی بولی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ یہاں دل چسپ اور قابلِ توجہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کی لسانی فکر کا وہ تدریجی تغیر ہے جو اردو زبان کے آغاز و ارتقا میں ہریانی اور کھڑی بولی کی زمانہ وار پُراثر لسانی اہمیت جتانے میں اجاگر ہوا ہے۔

ابتداءً انھوں نے اپنی تصنیف 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' میں قدیم اردو کو براہِ راست ہریانی سے تشکیل پذیر بتایا ہے جس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں۔ 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' کے چوتھے ایڈیشن، مطبوعہ ۱۹۷۰ء کے مطابق:

☆ قدیم اردو جمنا پار کی ہریانی بولی سے قریب تر ہے۔[197]

☆ قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اِس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں۔[198]

متعدد دلائل اور مثالوں کی مدد سے ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اردو زبان کے ہریانی سے تشکیل پذیر ہونے کے نظریے کی بھرپور تائید کی ہے اور اپنے مضامین میں بھی وقتاً فوقتاً اپنے اِس مؤقف کا اعادہ کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اِن کا ایک مضمون، رسالہ "Current Trends in Linguistics" کی جلد پنجم میں بہ عنوان "Urdu" شائع ہوا، جس میں لکھتے ہیں:

Old Urdu is based on the Haryani dialect of Dehli, whereas Modern Urdu is standardisedonanotherDelhidialect,i.e.KhadiBoli.[199]

'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' ایسے تنقیدی و تجزیاتی مباحث کا مجموعہ ہے جن کے تحت بالخصوص پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے لسانی نظریے، 'پنجاب اردو زبان کا مولد' کی دلائل کے ساتھ تردید کی گئی ہے اور متعدد مثالوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قدیم اردو اور دکنی کی جو خصوصیات پروفیسر حافظ محمود شیرانی پنجابی سے منسوب کرتے ہیں وہ ہریانی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اِن کے مطابق ''قدیم اردو اور دکنی کا 'پنجابی پن' اس کا 'ہریانی پن' ہے۔''[200]

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اپنی تصنیف 'حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)' میں اپنے علمی تبحر اور تجزیاتی مہارت کے بل پر پنجابی، دکنی، ہریانی، برج بھاشا اور نواحِ دہلی کی دیگر مقامی بھاشاؤں کے ساتھ اردو کے تعلق کے حوالے سے ڈاکٹر مسعود حسین خان کی اِس تحقیق کا رَد اِن الفاظ میں کیا ہے:

مسلمان مغربی پنجاب سے جو بولی لے کر آگے بڑھتے ہیں وہ راجستھانی اور پہاڑی بولیوں کا یہ تعلق منقطع کر دیتی ہے اور اس نئی بولی کے ہریانی کی مروجہ راجستھانی پر اثر انداز ہونے کے نتیجے میں جو بولی ظہور میں آتی ہے وہ ہریانی ہے۔ اِس بنا پر ہریانی کو مسلمانوں سے پہلے

کو دور میں تلاش کرنا من قبیل محالات ہے۔ لہٰذا مسعود صاحب کو قدیم اردو (دکنی) میں جو ہریانی پن نظر آتا ہے وہ درحقیقت اِس کا پنجابی پن ہے۔۔۔۔۔ ہریانی بولی جب دہلی میں رائج ہو جاتی ہے تو دارالحکومت کے شمال مشرقی علاقوں (دوآبہ اور مغربی یوپی) میں برج کے ساتھ اِس کی طویل کشمکش کا آغاز ہوتا ہے جس کا حتمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گو برج آنے والی صدیوں میں ادبی حیثیت سے فائق رہتی ہے ۔۔۔ تاہم بول چال کی حیثیت سے مسلمانوں کی آوردہ 'الف' بولی کامیاب ہوتی ہے اور کھڑی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ گویا اِس طرح ہم یہ کلیات اخذ کرتے ہیں:

(۱) قدیم پنجابی + مسلمان فاتحین کی زبانیں = مسلمان پنجابی (گیارھویں بارھویں صدی عیسوی)۔

(۲) مسلمان پنجابی + راجستھانی = ہریانی (تیرھویں چودھویں صدی عیسوی)۔

(۳) ہریانی + برج بھاشا = کھڑی (اردو) (پندرھویں صدی عیسوی اور مابعد)۔

یعنی اردو کی بنیاد قدیم پنجابی پر ہے۔ اِس کے ارتقا کی پہلی منزل ہریانی ہے اور دوسری منزل کھڑی۔ نئی زبان کی تعمیر میں جو دیسی زبانیں کام آئیں وہ بہ ترتیبِ زمانی پنجابی، راجستھانی اور برج ہیں کیوں کہ ہریانی اور کھڑی تو خود اردو کی مختلف شکلیں ہیں۔ [۲۰۱]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' میں ڈاکٹر مسعود حسین خان سے اہم فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کیے ہیں۔ حال آنکہ جس وقت پنجاب میں اردو کا ارتقا عمل میں آیا اُس وقت ہریانی اور کھڑی بولی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالمِ وجود میں نہیں آئی تھی۔ گویا اردو کے وجود پانے کے بعد ہی ہریانی زبان کی پیدائش عمل میں آئی۔ لہٰذا قدیم دکنی اردو اور ہریانی زبان میں بعض لسانی اشتراک سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ہریانی سے بنی۔ بلکہ اِس کا سبب یہ ہے کہ اردو اور ہریانی، دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا [۲۰۲]۔ مزید برآں پوری کتاب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ پنجابی سے توجہ ہٹا کر ہریانی کو آگے بڑھایا جائے اور کچھ اس انداز میں کتاب لکھی گئی ہے کہ پنجابی واقعی پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اپنے مضمون 'اردو کی ابتدا' میں 'مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو' کی بابت ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر مسعود حسین کی پوری کتاب ایسے گنجلک اور مبہم و متضاد بیانات سے معمور ہو گئی ہے کہ اِن پر ایک سرسری تبصرے کے لیے بھی کافی وقت اور فرصت درکار ہے۔۔۔۔۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب محنت اور تلاش و جُست جُو سے لکھی گئی ہے لیکن محض ژول بلاک کی سند پر ایک پورا نظریہ قائم کرنے اور پنجاب میں آغازِ اردو کے نظریے کو غلط ثابت کرنے میں اپنی ساری قابلیت وقف کر دی ہے۔ [۲۰۳]

یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کا ہریانی کو اردو کا اصل سرچشمہ قرار دینا اِن کا اپنا خیال نہیں بلکہ پندرہ سال ماقبل یعنی ۱۹۳۰ء میں ژول بلاک (Jules Bloch) اپنی تحاریر میں اور بعد ازاں خود ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی تصنیف 'ہندوستانی لسانیات' (۱۹۳۲ء) میں [۲۰۴] اردو پر ہریانی اثرات کا ذکر اشارتاً کر چکے ہیں، البتہ ہریانی مواد کے لسانیاتی تجزیوں کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے اور اطرافِ دہلی کی بولیوں کا غائر مطالعہ کر کے دہلی ہی کو اردو کا اصل وطن ثابت کرنے کا کام سب سے پہلے ڈاکٹر مسعود حسین خان ہی نے انجام دیا۔

ہریانی کو اردو زبان کا ماخذ و منبع قرار دینے سے متعلق ڈاکٹر مسعود حسین خان کے خیالات ۱۹۸۷ء سے پہلے کے ہیں۔ **'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' کے ساتویں ایڈیشن (۱۹۸۷ء)** میں انھوں نے نئی معلومات کی بنا پر اپنے نظریے میں بعض اضافے اور ترمیمات کی ہیں اور کتاب کا تیسرا باب از سرِ نو لکھا ہے۔ اِس نئے ایڈیشن میں انھوں نے میواتی اور برج بھاشا کو اردو کے آغاز و ارتقا کے عمل سے قطعاً خارج کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخری باب میں وہ ہریانی اور کھڑی بولی تک محدود رہے ہیں۔ اِس طرح اُن کے نئے اور نظرِ ثانی شدہ نظریے کی رو سے اردو کے آغاز کے سلسلے میں مقدم اہمیت ہریانی کے بہ جائے کھڑی بولی کو حاصل ہو گئی۔ 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' کے ساتویں ایڈیشن کے مطابق:

☆ قدیم اردو کھڑی بولی اور جمنا پار کی ہریانی سے قریب تر ہے۔ [۲۰۵]

☆ قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے اور جب سولھویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول زبان ہو جاتی ہے تو سلاطینِ دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برج محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے۔ [۲۰۶]

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اردو کے آغاز و ارتقا کے سلسلے میں بجا طور پر کھڑی بولی اور ہریانی کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ قدیم و جدید اردو اور دکنی اردو کے لسانیاتی تجزیے کی بنیاد پر انھوں نے کھڑی بولی کو اردو کا سرچشمہ تسلیم کرتے ہوئے اِس کی تشکیل میں دہلی کے شمال مغرب کی ہریانی بولی کو بھی 'برابر کی حصے دار' بتایا ہے۔ لکھتے ہیں:

امیر خسرو کی 'نہ سپہر' میں دی ہوئی بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست سے 'زبانِ دہلی و پیرامنش' (دہلی اور اس کے نواح کی بولیاں) کو اردو کا سرچشمہ ثابت کیا گیا ہے، اِس طرح کھڑی بولی کے ساتھ ہریانی بھی اِس میں برابر کی شریک ہو گئی ہے۔ [۲۰۷]

اردو کی تشکیل میں کھڑی بولی اور ہریانی کو برابر کی حصے دار ٹھہرانے کے باوجود ڈاکٹر مسعود حسین خان کھڑی بولی ہی کو اردو کی 'اساس' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اردو کے ڈانڈے آج بھی گیت تا غزل پھیلے ہوئے ہیں، لیکن کھڑی بولی پر اس کی اساس کا ہونا شرط ہے۔ [۲۰۸]

اردو زبان کی تشکیل میں کھڑی بولی کے بنیادی کردار اور اسے اردو کی 'اساس' کی حیثیت سے تسلیم کر لینے کے باوجود ڈاکٹر مسعود حسین خان اردو اور کھڑی بولی کے تعلق کے بارے میں زیادہ واضح نہیں۔ وہ کھڑی بولی کو اردو کے دیہاتی روپ کے معنی میں لیتے ہیں۔ گویا اردو، کھڑی بولی سے جدا کوئی زبان ہو' مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو' کے باب پنجم کے حصّہ دُوم 'اردو اور کھڑی بولی' میں رقم طراز ہیں:

کوئی بھی تربیت یافتہ زبان کسی بھی عوامی بولی سے مکمل طور پر لسانی مماثلت نہیں رکھتی۔ یہی صورتِ حال اردو اور کھڑی بولی کے باہمی رشتے کی ہے۔ [۲۰۹]

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زبان کے ادبی روپ کو اُس کے بول چال کے روپ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایسا کرنا لسانیات کے اصولوں کے منافی ہے۔ اِس امر کی مزید وضاحت اور ڈاکٹر مسعود حسین خان کے رَد میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

ہر زندہ اور فعال زبان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف خواص بلکہ عوام، نہ صرف شہروں اور قصبوں بلکہ کسی نہ کسی علاقے کے دیہاتوں میں بھی بولی جاتی ہو۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اِس پہلو پر غور نہیں کیا کہ وہ اردو کو کھڑی بولی سے جدا کر کے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اردو محض شہروں اور قصبوں، یعنی محض اشراف کی زبان ہے، جب کہ دیہاتی عوام کی زبان کھڑی بولی ہے۔۔۔ اگر ڈاکٹر مسعود حسین خان کھڑی بولی کو اردو کا تقریری روپ مانتے تو کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اردو، کھڑی بولی اور ہریانی سے مل کر بنی ہے۔۔۔۔ میری رائے میں اردو محض کھڑی بولی کا شستہ روپ ہے، اِس سے جدا نہیں۔ [۲۱۰]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

عام طور سے سٹینڈرڈ ہندی اور ہندوستانی، کھڑی بولی سے جدا نہیں۔ دیہاتی بول چال اِس کا مخصوص اور محدود روپ ہے۔ نہ جانے کیوں ڈاکٹر مسعود حسین خان کھڑی بولی کو محض اس کے دیہاتی روپ ہی کے معنی میں لیتے ہیں۔ اگر وہ اِسے بول چال کی ہندوستانی کے معنی میں لیں تو اردو اس کی ایک فصیح ادبی شکل ٹھہرتی ہے۔ کسی زبان کے مہذّب روپ اور اِس کے تقریری روپ کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ [۲۱۱]

درج بالا طویل بحث سے اردو زبان کی ابتدا کے حوالے سے ڈاکٹر مسعود حسین خان کی لسانی فکر کے ارتقائی سفر کا یہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو 'دہلی و پیرامنش' کی بولیوں کے تجزیاتی مطالعے کے نتیجے میں ابتداءً ہریانی میں اور بعد ازاں کھڑی بولی اور ہریانی میں اردو کے ابتدائی نقوش کو کھوجتا ہوا اختتام پذیر ہوا۔ اگر

ڈاکٹر مسعود حسین خان کچھ عرصہ مزید بہ قیدِ حیات رہتے تو بہت ممکن تھا کہ وہ ابتدائے زبانِ اردو پر اپنی تحقیقات کی بنیاد کھڑی بولی کے لسانی تجزیے پر اُستوار کرتے۔ کیوں کہ درج بالا بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ 'ہریانی' سے زیادہ 'کھڑی بولی' کو اردو کے ماخذ کی حیثیت سے تسلیم کرنے لگے تھے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان کے نظریے کے مطابق اردو کے آغاز کی تاریخ دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی (۱۱۹۳ء) کی تاریخ ہے کیوں کہ اس تاریخ سے عربی وفارسی کے لسانی اثرات 'زبانِ دہلی و پیرامنش' میں نفوذ کرتے ہیں۔ البتہ اِس سے قبل دیسی بولیوں سے عربی وفارسی کا لسانی اختلاط اردو کی پیدائش کا موجب نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ہندوستان کی زبانوں میں عربی وفارسی سے الفاظ کا داخلہ ہی اردو کی تخلیق کی ضمانت نہیں کرتا، بلکہ جب یہ لسانی اثرات 'زبانِ دہلی و پیرامنش' میں نفوذ کرتے ہیں تب اردو کا پہلا ہیولی تیار ہوتا ہے اور یہ ہوتا ہے مسلمانوں کی فتح دہلی (۱۱۹۳ء) کے بعد۔[۲۱۲]

چناں چہ بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اردو کا خمیر عربی و فارسی کے عناصر سے مل کر کھڑی بولی سے تیار ہوتا ہے اور امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) کے ہاں پہلی بار اس کا ادبی اظہار ملتا ہے۔ بعدازاں یہی زبان ہریانی عناصر کی شمولیت کے ساتھ علاؤالدین خلجی اور اس کے لشکر کے ہم راہ ۱۲۹۴ء میں دکن پہنچتی ہے اور ۱۳۲۷ء میں جب محمد تغلق اپنا پایۂ تخت دہلی سے دولت آباد (دیوگری) منتقل کرتا ہے تو دکن میں اِس کے پاؤں پوری طرح جم جاتے ہیں۔

پروفیسر سیّد احتشام حسین:

پروفیسر سیّد احتشام حسین (۱۹۱۲ء۔۱۹۷۲ء) نے ابتدا و ارتقائے اردو پر اپنے خیالات کا اظہار کسی علاحدہ کتاب کی شکل میں نہیں کیا بلکہ **جان بیمز (John Beames)** کی کتاب، **"An Outline Of Indian Philology"** کے اردو ترجمے پر لکھے گئے مقدمے پر کیا ہے۔ یہ ترجمہ **'ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'** کے عنوان سے پہلی بار **مارچ ۱۹۴۸ء** میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

مقدمے میں درج پروفیسر سیّد احتشام حسین کے بیانات کی دورنگی اُن کی لسانی فکر کے الجھاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ اردو کی بنیاد اُس 'مخلوط زبان' کو قرار دیتے ہیں جس کا خمیر پہلے پہل سرزمینِ پنجاب میں تیار ہوا، لیکن اردو کے باقاعدہ آغاز کے حوالے سے دہلی اور نواحِ دہلی کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> فارسی بولنے والے مسلمانوں نے پہلے پہل پنجاب میں سکونت اختیار کی اور یقیناً انھوں نے پنجابی بولی اختیار کی ہوگی جسے امیر خسرو نے لاہوری اور ابوالفضل نے ملتانی کہا ہے اور جب وہ دہلی کی طرف بڑھے تو انھیں پنجابی سے کسی قدر ملتی جلتی نئی نئی بولیوں سے سابقہ پڑا۔۔۔دو سال کی مدت زبان بننے کے لیے کافی نہیں ہوتی لیکن ایک مخلوط زبان کے خط وخال ضرور اُبھر سکتے ہیں۔ چناں چہ اِس ابتدائی اردو (یا مخلوط زبان) میں پنجابی کی آمیزش نظر آتی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ خود پنجابی اور بالخصوص مشرقی پنجابی اُسی اَپ بھرنش سے تعلق رکھتی ہے جس سے مغربی یوپی بولیاں۔ اس لیے اِن میں فرق ہونے کے باوجود بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ دہلی ایک ایسی مرکزی جگہ تھی جہاں کئی زبانیں ملتی تھیں۔ پنجابی، ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا۔ سب اسی علاقے سے قریب تھیں۔ برج بھاشا عام طور سے ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔۔۔۔۔شروع میں مسلمان اِس ادبی زبان کے بہ جائے بولیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ تھیں پنجابی، ہریانی یا بانگڑو اور کھڑی بولی۔ چیٹر جی نے صاف لکھا ہے کہ اِن زبانوں کی قواعدی ساخت میں بہت معمولی فرق ہے اور آج سے آٹھ نو سال پہلے تو اور کم فرق رہا ہوگا۔ اِس لیے جس نئی زبان کا ڈھانچہ عربی فارسی الفاظ اور آوازوں کے اختلاط سے بن رہا تھا، اس میں پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی ہر ایک کو شریک سمجھنا چاہیے۔[۲۱۳]

اِس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ پروفیسر سیّد احتشام حسین مغربی یوپی کی بولیوں اور پنجابی، بالخصوص مشرقی پنجابی کا ماخذ ایک ہی اَپ بھرنش کو قرار دے کر اردو کے مولد کی حیثیت سے دہلی کی اہمیت اس انداز سے اجاگر کرتے ہیں کہ مغربی پنجاب اور خصوصاً ملتان کہیں پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ جس اَپ

بھرنش کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے ظاہر ہے وہ شورسینی اَپ بھرنش ہے جس کی جانشین برج بھاشا ہے۔ جب کہ درحقیقت پنجابی زبان کا شورسینی اَپ بھرنش سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ اقتباس کے اختتام پر پروفیسر سیّد احتشام حسین پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی کو اردو زبان کی تشکیل کے حوالے سے برابر کی ذمے دار ٹھہراتے ہیں مگر فقط چند سطور آگے بڑھ کر وہ اِس لسانی عمل میں پنجابی کے کردار کو گھٹا کر کھڑی بولی کو اردو زبان کے ماخذ کی حیثیت سے زیرِ بحث لاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا۔ بعد میں ایک بولی پنجابی بن گئی، دوسری کھڑی بولی۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے، بلکہ اُس زبان سے جو ان دونوں کا مشترک سرچشمہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں دونوں کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ لیکن چوں کہ دہلی مدتوں صدر مقام رہا اس لیے اردو کا تعلق کھڑی بولی سے زیادہ ہے۔۔۔۔۔ اردو کی ابتدائی ہیئتِ ترکیبی میں پنجابی کا زبردست ہاتھ ہے۔ اردو کی صوتی خصوصیات اِسے برج بھاشا سے دور رکھتی ہیں لیکن پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی کی صوتی خصوصیات ابتدائی اردو میں پائی جاتی ہیں۔ بعد میں ایسی تبدیلیاں ہوتی گئیں جنھوں نے اُسے پنجابی سے اور دور کر دیا اور کھڑی بولی نکھرتی گئی۔ یہاں تک کہ محض بول چال کے دائرے سے نکل کر وہ ایک ادبی زبان بن گئی۔[۲۱۴]

پروفیسر سیّد احتشام حسین کے درج بالا بیان سے اُن کے فکری الجھاؤ کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ابتدا و ارتقائے اردو کے حوالے سے وہ واضح نہیں بلکہ اِس سلسلے میں وہ پہلے سے موجود نظریات پر مزید قیاس آرائی سے کام لے رہے ہیں۔ اگر چہ ان کا دماغ اردو کی ابتدائی ہیئتِ ترکیبی میں پنجابی کے کردار کو تسلیم کرتا ہے لیکن اِن کا دل نہیں مانتا۔ گویا وہ ڈھکے چھپے انداز سے 'پنجاب میں اردو' کی تردید کرتے ہیں مگر خاطر خواہ لسانی و تاریخی دلائل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مزید برآں وہ ایک طرف اردو کو 'نئی بولی' کی حیثیت سے قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کی دہلی آمد سے قبل اِس کے وجود کے بھی قائل ہیں۔ بہ ہر حال درج بالا بیانات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر سیّد احتشام حسین دراصل کھڑی بولی کی قدامت کے قائل ہیں اور اردو کو اسی کھڑی بولی کا 'تسلسل یا روپ یا نتیجہ' قرار دیتے ہیں۔ بیان کرتے ہیں:

دشواری یہ ہے کہ اوّل تو خود پنجابی کے تشکیل پانے کا وہی زمانہ ہے۔ دوسرے یہ دہلی میں خود لاہوری سے مختلف ایک بول چال کی زبان تھی جسے امیر خسرو نے دہلوی کہا ہے۔ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دہلی کے نواح کی بولیوں میں جس نئی زبان کا نشو و نما ہوا، وہ اپنی الگ حیثیت رکھتی تھی اور پنجابی سے بہت سی مماثلتیں رکھنے کے باوجود محض اس کا تسلسل یا روپ یا نتیجہ نہیں تھی اور نہ اس کی ابتدا غلاموں کے عہد میں پنجابی مسلمانوں کے دہلی آنے کے بعد ہوئی۔۔۔۔۔ کھڑی بولی دلّی اور مغربی یوپی کے عوام کی بولی تھی۔۔۔ کھڑی بولی میں عربی فارسی آوازوں کے داخل ہونے سے ایک ایسا صوتی نظام بن رہا تھا جس میں فارسی لہجہ اور تلفظ کی کھپت بھی ہو سکے۔ اس طرح کھڑی بولی جو ادبی حیثیت سے بالکل تہی دامن تھی اور صرف بول چال کی زبان ہونے کے لحاظ سے ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود تھی، نئے لسانی عناصر جذب کر کے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔[۲۱۵]

کھڑی بولی کی قدامت کے حوالے سے پروفیسر سیّد احتشام حسین کے خیال کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی رقم طراز ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دہلی میں قدم جمانے سے قبل کے دور میں دہلی یا مغربی یوپی کے علاقوں میں کسی کھڑی بولی کو ڈھونڈ نا عنقا کی تلاش کے مترادف ہے۔ اس کا کوئی ثبوت موجود نہ ہونے کے سبب ہی سے احتشام صاحب کبھی اِسے 'عوام کی بولی' کہہ کر بچاتے ہیں اور کبھی 'چھوٹے سے علاقے میں محدود' بتاتے ہیں۔ خود جان بیمز جیسا فاضل، جس کی کتاب کے اردو ترجمے کے مقدمے میں احتشام صاحب یہ دعوی کر رہے ہیں، کسی کھڑی بولی کا وجود تسلیم نہیں کرتا۔۔۔۔۔ یہ ترکیب تو پنڈت حضرات نے ایک علاحدہ زبان کے معنوں میں ابتدائی انیسویں صدی عیسوی میں رائج کی تھی۔۔۔ اردو کی عام مقبولیت سے متاثر ہو کر سادل مصرا اور للولال نے ہندوؤں کے لیے

ایک مصنوعی زبان اختیار کی بلکہ ایجاد کی، جو اردو کے مانند 'الف' بولی تھی اور اسے کھڑی بولی کا نام دیا۔[۲۱۶]

مغربی یو۔ پی کے علاقوں میں اردو رہندوستانی کا ارتقا بلاشبہ مسلمانوں کی آمد سے مشروط ہے۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے اِس بیان کی تائید جارج ابراہام گریرسن کے درج ذیل قول سے ملتی ہے:

> The language of the state of Rampur and of the districts of Moradabad and Bijnaur, east of the Ganges and in western Rohailkhand possesses the strongest resemblance to literary Hindostani. This is no doubt due to the influence of Islam, which has always been strong in these parts.[217]

واضح رہے کہ گریرسن 'لٹریری ہندوستانی' کی بنیاد اگر چہ 'ورنیکلر ہندوستانی' کو قرار دیتا ہے تاہم مؤخرالذکر کے لیے کسی قدامت کا مدعی نہیں بلکہ تسلیم کرتا ہے کہ مغربی یو۔ پی کے علاقوں میں 'ورنیکلر ہندوستانی' کا نفوذ مسلمانوں کا رہینِ منت ہے۔[۲۱۸]

ڈاکٹر شوکت سبزواری:

اردو لسانیات پر **ڈاکٹر شوکت سبزواری (۱۹۰۵ء۔۱۹۷۳ء)** کی پہلی تصنیف '**اردو زبان کا ارتقا**' **۱۹۵۶ء** میں منظرِ عام پر آئی۔ اِس کتاب میں اردو زبان کے آغاز وارتقا سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> اردو، ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ ادلتے بدلتے، پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ اُن سے لیتے اس حالت کو پہنچی جسے ہم آج دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اِس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی ادب، فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔ پالی اعلیٰ درجے کو پاکر ٹھہر گئی لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے جانے کے باعث برابر ترشتی تر شاتی اور چھلتی چھلاتی رہی۔[۲۱۹]

درج بالا بیان سے اہلِ فکر ونظر اور لسانی ماہرین کے حلقے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری سے متعلق یہ خیال عام ہوا کہ وہ پالی کو اردو زبان کی اصل قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'ہندوستانی لسانیات کا خاکہ' کے مقدمے میں پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> پروفیسر شوکت سبزواری نے اپنی کتاب 'اردو زبان کا ارتقا' میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ اردو کی ابتدا کا سراغ پالی میں تلاش کرنا چاہیے کیوں کہ قواعدی ساخت کے اعتبار سے اردو سب سے زیادہ اسی سے مماثلت رکھتی ہے۔[۲۲۰]

حقیقت اِس بیان کے برعکس ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نہ تو اردو کو پالی کا ماخذ تسلیم کرتے ہیں اور نہ اردو کی ابتدا کا سراغ پالی میں تلاش کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں انھوں نے اپنی تصنیف '**داستانِ زبانِ اردو**' **(۱۹۶۰ء)** کے پیش لفظ میں تردید پیش کی ہے۔ علاوہ ازیں زبانِ اردو کی ابتدا کے حوالے سے اپنا کوئی نیا نظریہ قائم نہ کرنے بلکہ مغربی محققین کے نظریات کے تناظر میں اپنی لسانی تحقیقات کی بنیاد رکھنے کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> اپنی طرف سے میں نے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا اور نہ اِس کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ میں پالی کو اردو زبان کی اصل قرار دیتا ہوں، یہ درست نہیں۔ میں وہی کہتا ہوں جو ژول بلاک، گریرسن، چیٹر جی اور دوسرے ائمۂ فن نے کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے وہ کبھی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی۔ سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت، مغربی اَپ بھرنش بالائی دوآبے کی اُس بول چال کی زبان کے مختلف العہد ادبی روپ ہیں۔ کھڑی یا ہندوستانی (اردو) اس کی فطری ترقی یافتہ

(یا بدلی ہوئی) صورت ہے۔ یہ زبانیں اردو کے راست سلسلۂ نسب میں نہیں آتیں۔ [۲۲۱]

بلکہ اِس حوالے سے دراصل ڈاکٹر شوکت سبزواری کا مؤقف یہ ہے:

نئی تحقیقات کے مطابق سنسکرت، پالی، شورسینی، مہاراشٹری، مغربی اَپ بھرنش ایک زبان کے متعدد ادبی روپ ہیں۔ یہ زبان مدھیہ دیش (وسط ملک) یعنی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی جس سے نکھر کر یہ زبانیں بنیں۔ بول چال کی زبان بدلتی رہی۔ یہ زبانیں، جو علم وادب کے اظہار و بیان کا آلہ بن چکی تھیں، رُکی رہیں۔ قواعد واصول کی پابندیوں میں جکڑے ہونے کی وجہ سے یہ وہیں رہیں جہاں تھیں۔ بول چال کی زبان ترقی کر کے بڑھ گئی۔۔۔۔۔ ہر چند یہ زبانیں ارتقا کے ایک سلسلے میں واقع ہیں اور ایک ہی بولی کے پانچ مختلف دوروں کو پیش کرتی ہیں لیکن ان کو ایک دوسرے سے ماخوذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پالی مثلاً سنسکرت سے ترقی پا کر بنی، یا شورسینی پالی کا بدلا ہوا روپ ہے، یا مہاراشٹری نے شورسینی سے ارتقا پایا، یا اَپ بھرنش نے مہاراشٹری سے جنم لیا۔ ایک تیسری زبان سے اِن زبانوں کو وضع کیا گیا۔ اگر یہ تیسری زبان ہمارے سامنے ہوتی تو ہم اِس کے ارتقائی دوروں کا تعین کرتے۔ یہ زبانیں اُس زبان کے ادبی روپ کو پیش کرتی ہیں جو اِن کے اصلی بول چال کے روپ سے مختلف ہے۔ [۲۲۲]

گویا وہ پالی اور اردو میں موجود بعض لسانی مماثلتوں کی بنا پر اِن دونوں کے تعلق اور رشتے پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اِس خیال کی تائید ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے اِس بیان سے بھی ملتی ہے:

پالی بھی اردو کی طرح تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور ان دونوں میں ایک ایسی مشابہت نظر آتی ہے جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ [۲۲۳]

حیرت ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی تصنیف 'اردو کا روپ' میں، صفحہ نمبر ۵۷ تا ۶۱، پالی اور اردو کے لسانی اختلافات گنوا کر ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اردو کو پالی سے ماخوذ بتانے کے اُس دعوے کی تردید کی ہے جو درحقیقت انھوں نے کیا ہی نہیں۔

ابتدا اور ارتقائے اردو کی بابت مقدم نظریات پر ڈاکٹر شوکت سبزواری کی مدلّل اور تفصیلی بحث کے بعد اُن کے لسانی بیانات سے آگاہی کے لیے 'داستان زبانِ اردو' (۱۹۶۰ء) نسبتاً زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں مندرج تحقیقی مباحث کی رو سے ڈاکٹر شوکت سبزواری کھڑی بولی اور ہندوستانی کو ایک ہی زبان قرار دیتے ہوئے اردو کو اِس کا ادبی روپ مانتے ہیں۔ جب کہ اکثر مقامات پر وہ اردو، ہندوستانی اور کھڑی، تینوں کو ایک ہی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق اردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی اور میرٹھ کے نواح میں گیارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ کھڑی بولی / ہندوستانی / اردو کو مسلمانوں کی آمد سے قبل دہلی کے بازاروں میں مستعمل زبان بتاتے ہیں۔ اِس حوالے سے اِن کے بیانات درج ذیل ہیں:

- ☆ ہندوستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب متفقہ طور سے اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں۔ اردو اِس کی ادبی شکل ہے۔ اس زبان کو یہ نام بعد میں اُس وقت دیا گیا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں بول چال کی زبان سے ترقی کر کے اِس نے ادب وشعر کی زبان کا درجہ پایا۔ مسلمانوں کے ہم رکاب یہ زبان دہلی سے نکل کر ملک کے دُور دراز حصّوں تک پہنچی۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اس کا اقتدار بڑھا اور اِس کی حدیں وسیع ہوئیں۔ [۲۲۴]

- ☆ اردو ہندوستانی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو 'ہندوستانی' دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔ امیر خسرو، ابوالفضل، شیخ بہاء الدین باجن نے اسے دہلوی کہا۔ ہندو اہلِ علم عام طور سے برج، قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز کے لیے، جو اُس وقت 'بڑی' کہلاتی تھیں، کھڑی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جب یہ زبان ترقی پا کر آگے بڑھی، مسلمانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی، ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تو ہندوستانی کہلائی۔ زبان بنیادی طور سے وہی رہی

جو آج ہے۔ اِس کے نام ایک سے زیادہ تجویز ہوئے۔ [۲۲۵]

☆ اردو، کھڑی سے ترقی پا کر بنی جس کی بابت عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ دہلی اور میرٹھ کی زبان کسی ایسی زبان سے کیوں کر ماخوذ ہو سکتی ہے جو کبھی وہاں نہ تھی۔ [۲۲۶]

یہاں اِس امر کی وضاحت از حد ضروری ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری 'مغربی ہندی' (برج بھاشا، ہریانی، قنوجی، بندیلی، کھڑی بولی) کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اِسے ایک طرح کی 'ذہنی تجرید' یا 'منطقی اُپج' بتاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں مغربی ہندی ایک فرضی یا خیالی زبان ہے [۲۲۷]۔ اسی سبب مغربی ہندی کو درمیان سے نکال کر وہ اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی 'اَپ بھرنش' کو قرار دیتے ہیں اور اردو کو کھڑی بولی سے ماخوذ بتانے کے علاوہ اس کا ارتقا براہِ راست اَپ بھرنش سے بھی دکھاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اردو زبان کی ماخذ اَپ بھرنش گیارھویں صدی عیسوی میں دہلی اور میرٹھ میں بول چال کی سطح پر رائج تھی۔ بیان کرتے ہیں:

☆ اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اَپ بھرنش ہے۔ اِس لیے مغربی ہندی کو درمیان سے نکال کر یہ کہنا کہ اردو اَپ بھرنش سے ارتقا پا کر وجود میں آئی، زیادہ صحیح ہے۔ لیکن اَپ بھرنش کسی ایک بولی کا نام نہیں۔ پراکرت دور کے بعد کی سبھی بولیاں جو بدل بدلا کر کچھ سے کچھ ہوئیں اور درمیانی عہد کی پراکرتوں سے مختلف اور نئی زبانیں بنیں، اَپ بھرنش یا اَپ بھرشٹ یعنی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ کہلائیں۔ [۲۲۸]

☆ اردو یا ہندوستانی اَپ بھرنش کے اُس روپ سے ماخوذ ہے جو گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں مدھیہ دیش میں رائج تھا۔ مغربی اَپ بھرنش اِس کی ادبی شکل ہے۔ اور، جیسا کہ میں نے عرض کیا، وہ بول چال کی اَپ بھرنش سے مختلف ہے۔ ۔۔ بول چال کی زبان کے نمونے عام طور سے محفوظ نہیں رہتے۔ ہر زمانے میں لوگ ادبی زبان کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ بول چال کی اَپ بھرنش دہلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی۔ چیٹر جی اور گریرسن اِسے مغربی اَپ بھرنش کا نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ اَپ بھرنش وہ نہیں جس کے قواعد ہیم چندر نے اپنی کتاب میں بیان کیے۔ مغربی اَپ بھرنش کہنے سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ ہیم چندر کی اَپ بھرنش ہے۔ اگر یہ اشتباہ نہ ہو تو دہلی اور میرٹھ کی اس قدیم زبان کو اَپ بھرنش کے نام سے یاد کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اِس زبان میں پورے پورے نمونے دست یاب نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ [۲۲۹]

☆ اردو نے جس قدیم اَپ بھرنش سے ارتقا پایا، گیارھویں صدی میں اس کی شکل موجودہ اردو سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ وہ اُس زمانے میں بھی برج، ہریانی، مشرقی پنجابی وغیرہ پاس پڑوس کی زبانوں سے مختلف اور آزاد زبان تھی۔ اس نے شورسینی اَپ بھرنش اور پراکرت سے، جس کے قواعد ہیم چندر اور مارکنڈے بیان کرتے ہیں، ارتقا نہیں پایا۔ وہ دہلی اور میرٹھ میں بولی جانے والی اَپ بھرنش سے ترقی پا کر بنی۔ ہر چند اس اَپ بھرنش کے خط و خال واضح نہیں لیکن اردو کی موجودہ خصوصیات کو دیکھ کر اس کے نقش و نگار کا تعین نہ سہی اس کا دھندلا سا خاکہ، جو کسی قدر غبار آلود بھی ہے، مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں ضرور آ جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شورسینی اور ماگدھی اَپ بھرنش کی طرح یہ آزاد اور مستقل اَپ بھرنش ہے لیکن ڈاکٹر گریرسن کی ہم نوائی میں کہا جا سکتا ہے، ''ہندی نحویوں کی اَپ بھرنش ہوتے ہوئے بھی بعض اہم لحاظ میں یہ ان سے مختلف ہے''۔ [۲۳۰]

درج بالا بیانات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی اور سر جارج ابراہام گریرسن گیارھویں صدی عیسوی میں مدھیہ دیش (انبالہ تا الہٰ آباد اور دہرہ دون تا اجین کا علاقہ) میں رائج بول چال کی اَپ بھرنش کو 'مغربی اَپ بھرنش' کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اسی کو اردو زبان کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق اردو زبان کا ارتقا بول چال کی سطح پر رائج اُس اَپ بھرنش سے عمل میں آیا جو اپنے ہی ادبی روپ، 'مغربی اَپ بھرنش' (شورسینی اَپ

بھرنش)[۲۳۱] سے مختلف تھی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اِس نظریے سے تو اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ کھڑی بولی اُس اَپ بھرنش سے ماخوذ ہے جو دہلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی، البتہ اُن کا یہ خیال کہ اُس علاقے کی زبانوں کے عہد بہ عہد (سنسکرت سے شورسینی اَپ بھرنش تک) جو تحریری نمونے ملتے ہیں وہ مصنوعی ادبی زبانوں کو پیش کرتے ہیں جب کہ بول چال کی زبان مختلف تھی، نا قابلِ تسلیم ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کی سرچشمہ بول چال کی اَپ بھرنش کو اپنے ہی ادبی روپ، مغربی اَپ بھرنش، سے مختلف مانتے ہیں اور اپنی تصنیف، 'داستانِ زبانِ اردو' میں 'مولد ومنشا' کے عنوان کے تحت اردو اور شورسینی اَپ بھرنش اور شورسینی پراکرت کے اختلافات گنوا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ 'ہندوستانی' (اردو) اِن سے ماخوذ نہیں۔ اِس حوالے سے ان کا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ مغربی اَپ بھرنش کے اسما 'وُ' پر ختم ہوتے ہیں جب کہ اردو کے 'ا' پر۔ لکھتے ہیں:

> اردو کی صرفی ونحوی خصوصیات پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کا ماخذ 'شورسینی' پراکرت یا اَپ بھرنش نہیں۔ 'شورسینی' پراکرت میں جو اسما وصفات 'وُ' پر منتہی ہوتے ہیں، اردو میں اِن کا آخری حرف 'ا' ہے۔[۲۳۲]

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اِس اعتراض پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین رقم طراز ہیں:

> اِن کی اس دلیل میں وزن ہے لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ شورسینی کے موجودہ نمونے ادبی زبان کے ہیں، بول چال کا روپ مختلف رہا ہوگا اور اردو بول چال کی زبان سے ماخوذ ہے تو اِن کی بات محلِ نظر ہو جاتی ہے۔ ادبی زبان اور تقریری زبان میں فعل واسم کی تصریف اور اصوات زیادہ مختلف نہیں ہوتیں۔ انھوں نے دہلی اور میرٹھ کی بول چال کی زبان کا ذکر کیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ یہ مؤقف لیتے کہ شورسینی اَپ بھرنش دہلی اور میرٹھ کی بولی سے مختلف تھی۔[۲۳۳]

ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیقات کے مطابق ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تائید میں الٰہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ ہندی کے ریڈر، ڈاکٹر ماتابدل جیسوال نے اپنی تحقیقی مقالے 'معیاری ہندی کی تاریخی قواعد' کی جلد اوّل میں ہندی اور کھڑی بولی کے ماخذ پر غور کرتے ہوئے کھڑی بولی کی 'ا' کی خصوصیت کی بنا پر اِسے شورسینی کی اولاد ماننے سے انکار کیا ہے۔ اُن کے مطابق کھڑی بولی نے 'ٹاکی' یا 'ٹکی' اَپ بھرنش سے ارتقا پایا اور یہ اَپ بھرنش مشرقی پنجاب، دہلی اور میرٹھ تک کے علاقے میں مستعمل تھی۔ دسویں صدی کے مصنف راج شیکھر نے 'کاویہ میمانسا' میں لکھا ہے کہ ٹکی اَپ بھرنش دراصل 'بھاد انک دیش' اور 'ٹک' کی بولی تھی۔ ڈاکٹر جیسوال بھادانک دیش سے دہلی اور میرٹھ مراد لیتے ہیں۔ ٹکی اَپ بھرنش کا تحریری نمونہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین ٹکی اَپ بھرنش سے اردو زبان کے ارتقا کے خیال کو یہ دلیل رَد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> آخر میں صرف ایک بات یقینی دکھائی دیتی ہے کہ کھڑی بولی نے اَپ بھرنش عہد کے دہلی، میرٹھ اور غالبًا بجنور، مراد آباد کے علاقے کی بولی سے ارتقا پایا۔ وہ بولی شورسینی اَپ بھرنش ہی کا ایک واضح روپ تھی یا علاحدہ سے کوئی اَپ بھرنش، یہ نہیں کہا جاسکتا۔[۲۳۴]

ڈاکٹر ماتابدل جیسوال کے برعکس اکثر ماہرین (گریرسن اور سُنیتی کمار چیٹر جی) مغربی ہندی کو شورسینی اَپ بھرنش سے ماخوذ مانتے ہیں، جس سے مراد یہ ہے کہ 'ا' اور 'وُ' دونوں پر ختم ہونے والی بولیاں شورسینی اَپ بھرنش سے ماخوذ ہیں ۔ شورسینی کی تشکیلِ نو کی رو سے یہ وہ اَپ بھرنش ہے جس کے دائرہ کار میں فقط 'وُ' بولیاں ہی آتی ہیں۔ اسی سبب اکثر علما کھڑی بولی کا ارتقا شورسینی اَپ بھرنش سے نہیں بلکہ کسی اور اَپ بھرنش سے مانتے ہیں۔ البتہ یہ اَپ بھرنش کون سی ہے اور کن علاقوں میں مستعمل رہی؟ یہ معاملہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔[۲۳۵]

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کی پیش رو پراکرت کو شورسینی اور مغربی اَپ بھرنش سے قدیم تصور کرتے ہیں۔ تاہم اِس کا کوئی نمونہ اِن کو دست یاب نہیں ہو سکا۔ بیان کرتے ہیں:

> میں نے موجودہ اردو اور قدیم مغربی ہندی کے سرسری تقابلی مطالعے کے بعد اس کی لسانی خصوصیات متعین کرنے کی ایک نا تمام اور تشنہ سی

کوشش کی ہے۔لیکن اِس میں شبہ نہیں کہ یہ پراکرت جسے میں اردو کی اصل قرار دے رہا ہوں سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت، مغربی اَپ بھرنش کے سلسلۃ الذہب کی ایک گُم شدہ کڑی ہے۔[۲۳۶]

جس زبان کے محض خط وخال کو اجاگر کرنا بھی ناممکن ہو تو اِس کی قدامت بلکہ وجود ہی کو آخر کس برتے پر تسلیم کیا جا سکتا ہے[۲۳۷]۔ جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز کی تاریخ ۱۰۰۰ء ہے۔ اِسی زمانے سے دہلی اور نواحِ دہلی میں شورسینی اَپ بھرنش یا مغربی اَپ بھرنش سے جدید بولیوں کے بیج پھوٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ماہرین کے مطابق اردو کے آغاز کا سُراغ اور اِس کے ماخذ کا پتہ انھیں بولیوں میں لگانا چاہیے۔[۲۳۸]

ڈاکٹر گیان چند جین:

اردو لسانیات کے ماہرین میں بالخصوص ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر گیان چند جین (۱۹۲۳ء۔۲۰۰۷ء) نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے سلسلے میں تاریخی لسانیات، اردو صوتیات ، صرفیات ، نحویات بنیادی الفاظ وغیرہ کے مطالعے پر اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر گیان چند جین اپنے مقالے، 'اردو کے آغاز کے نظریے' مطبوعہ ۱۹۷۷ء میں کھڑی بولی کو اردو زبان کی اصل اور اساس قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔ کھڑی بولی دہلی اور مغربی یوپی کی بولی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ یہ کہہ سکے کہ یہ پنجاب کی زبان پنجابی کی اولاد ہے۔ اگر کھڑی بولی پنجابی سے نہیں نکلی تو اردو بھی پنجابی سے نہیں نکلی۔[۲۳۹]

مزید لکھتے ہیں:

لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو، ہندی، کھڑی بولی ایک ہیں۔ اردو کھڑی بولی کا وہ روپ ہے جس میں عربی فارسی الفاظ کسی قدر زیادہ اور تت سم سنسکرت الفاظ تقریباً نہیں کے برابر ہوتے ہیں۔ لیکن اِس خصوصیت کی باعث اردو کھڑی بولی سے علاحدہ زبان نہیں ہو جاتی۔[۲۴۰]

ڈاکٹر گیان چند جین علمِ لسانیات کے بنیادی اصولوں کے پیشِ نظر کسی بھی زبان کے تعین اور اُس کے مآخذ کی کھوج میں مستعار الفاظ کے بجائے زبان کے بنیادی الفاظ[۲۴۱] کو اہمیت دیتے ہیں۔ لہٰذا اُن کے مطابق زبان کے غیر بنیادی الفاظ کی بنا پر اُسے کسی دوسری زبان سے ماخوذ قرار دینا قطعاً غیر لسانی طرزِ تحقیق و فکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مشترک الفاظ کے باوجود وہ اردو زبان کو پنجابی سے ماخوذ تسلیم نہ کرتے ہوئے 'پنجاب میں اردو' کے نظریے کی تردید کرتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

زبان کے تعین میں غیر بنیادی ذخیرۂ الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ کہیں سے مستعار لیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بنیادی اور اصل ذخیرے سے کہیں زیادہ بڑھ جائے۔ اس کے باوجود بنیادی الفاظ اور بنیادی اصولِ تصریف کی بنا پر ہی زبان کا شجرۂ نسب طے کیا جاتا ہے۔ دخیل الفاظ کو لے کر کسی زبان کو کئی زبانوں کا ملغوبہ نہیں کہہ سکتے۔۔۔ انہی بنیادی الفاظ کی بنا پر کھڑی بولی، اردو اور ہندی کو ایک قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بولیاں دوسری تمام بولیوں سے مختلف ہیں۔[۲۴۲]

مزید برآں اسی اصول کے پیشِ نظر ڈاکٹر گیان چند جین دیگر ملتی جلتی بولیوں کو بھی اردو زبان کی اساس کی حیثیت سے رَد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اردو کھڑی بولی ہی کا ایک رُوپ ہے۔ ہریانی یا برج کی کچھ خصوصیات کے شمول کے باوجود یہ بولیاں اِس کے شجرۂ نسب میں نہیں آتیں۔ یہ اردو کے پاس یا دور کی رشتہ دار ہیں، آبا و اجداد نہیں۔[۲۴۳]

کھڑی بولی کو اردو زبان کا سرچشمہ قرار دینا اگر چہ نیا نظریہ نہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے قبل کئی ماہرینِ لسانیات کے ہاں اِس نظریے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس امر کا اعتراف انھوں نے اپنی تصنیف 'لسانی جائزے (۱۹۹۷ء)' کے مضمون بہ عنوان 'ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ: اردو زبان کی تاریخ' میں کیا ہے:

میں نے جو کچھ کہا ہے وہ مجھ سے پہلے دوسرے بھی کہہ چکے ہیں۔ ہاں اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں تلاش کرنے کی بات نئی ہے۔ میں نے

اِسے مسئلے کی وضاحت کی خاطر کہا ہے۔[۲۴۴]

گویا اردو کے آغاز کے مسئلے کی وضاحت کے لیے ڈاکٹر گیان چند جین نے اِسے دو منزلوں میں تلاش کرنے کی بات کی ہے، جو نئی ہے۔ وہ اردو کو کھڑی بولی سے علاحدہ کوئی زبان ہر گز تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا اُن کے مطابق اردو کے مآخذ کی تلاش دراصل کھڑی بولی کے مآخذ کی تلاش ہے اور اِسے وہ اس سلسلے کی پہلی منزل قرار دیتے ہیں۔ بعد ازاں دوسری منزل کی حیثیت وہ اُس مخصوص طویل دور کو دیتے ہیں جب عربی و فارسی لفظوں کی شمولیت سے کھڑی بولی کا 'اردو روپ' ابھرا۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔۔۔ اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ کھڑی بولی کا آغاز اور کھڑی بولی کے اردو روپ دھارنے کا زمانہ۔ ڈاکٹر زور، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے بنیادی زبان کھڑی بولی کے آغاز کی جُست جُو کی ہے، جب کہ میر امن، محمد حسین آزاد، محمود شیرانی، سیّد سلیمان ندوی اور ڈاکٹر مسعود حسین خان نے کھڑی بولی کا اردو روپ کی تشکیل پر توجہ مرکوز کی ہے۔۔۔ اردو کا آغاز، کھڑی بولی کا آغاز ہے۔ کھڑی بولی گیارھویں بارھویں صدی میں اُس اَپ بھرنش سے ابھری جو دلّی، میرٹھ اور مراد آباد وغیرہ کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا نام کیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ شورسینی اَپ بھرنش سے مختلف ہو۔۔۔ کھڑی بولی میں عربی فارسی الفاظ کے شامل ہونے سے اردو روپ متشکل ہوا۔ یہ عمل اوّل اوّل مدھیہ دیش یعنی دلّی اور مغربی یو پی میں ہوا ہوگا لیکن اردو رسم الخط میں اس کے نمونے محفوظ نہیں۔ دیوناگری کھڑی بولی سے اس کا پتہ چلتا ہے، لیکن شمال میں یہ روایت ضعیف رہتی ہے۔ جب شاہ جہاں اپنا پایۂ تخت آگرے سے دلّی لے آیا تو کھڑی بولی برج پر غالب آ گئی اور اردو روپ شمال میں بالیدہ ہونے لگا۔۔۔ اردو ادب پہلے دکن میں ظاہر ہوا۔ شمال کے ابتدائی نمونے مشکوک ہیں۔[۲۴۵]

برِ صغیر میں مسلمانوں کی آمد اور اردو زبان سے اُن کے تعلق کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین بیان کرتے ہیں:

> بیرونی مسلمان اپنے ساتھ نہ اردو لائے تھے، نہ کھڑی بولی۔۔۔ ہندوؤں نے کھڑی بولی کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ مسلمانوں نے اِسے پسند کر کے اس میں عربی فارسی الفاظ بڑھانے شروع کیے اور وہی کھڑی بولی کا اردو ادب کہلایا۔[۲۴۶]

اس بیان سے اُن کے اس خیال کی وضاحت ملتی ہے کہ کھڑی بولی ایک ایسی پس ماندہ بولی کی حیثیت سے ابتدا ہی سے دہلی اور اُس کے نواحی علاقوں میں موجود تھی کہ جسے ہندو لائقِ اعتنا تصور نہ کرتے تھے۔ بعد ازاں فتح دہلی (۱۱۹۳ء) کے بعد مسلمانوں نے کھڑی بولی کو نہ صرف اپنایا بلکہ سنوارا اور نکھار کر ایک مستقل زبان کی حیثیت دی اور ادبی مرتبے تک پہنچایا۔ بلاشبہ کھڑی بولی پر مسلمانوں کی عنایات سے 'اردو زبان' متشکل ہوئی۔ البتہ جب کھڑی بولی عربی و فارسی آمیز ہو کر فارسی رسم الخط کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھل کر نکھرنے لگی تو ہندو بھی اِس کی ترقی میں حصہ لینے لگے۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ:

اردو لسانیات کے عہدِ جدید میں کھڑی بولی اور اردو کو ایک ہی زبان ماننے والی سب سے دبنگ آواز ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ (پیدائش۔ ۱۹۴۵ء) کی ہے۔ ''ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بعد کی نسل میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ اردو کے سب سے ممتاز ماہرِ لسانیات ہیں''[۲۴۷]۔ لسانیات سے اِن کی دل چسپی ضمنی یا سرسری نہیں بلکہ وہ لسانیات کے طالب علم، استاد اور مصنف ہیں۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے کھڑی بولی سے اردو کا ارتقا تسلیم کیا۔ اگر چہ یہ نئی بات نہیں۔ اِس سے قبل ماہرین اِن دو زبانوں کے مابین تعلق کی وضاحت اور ثبوت میں خاطر خواہ لسانی تحقیقات و مباحث پیش کر چکے ہیں۔ اردو لسانیات پر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کی اہم تصنیف 'اردو کی لسانی تشکیل' ۱۹۸۵ء میں منظرِ عام پر آئی جس میں اردو زبان کی ابتدا سے متعلق تمام قدیم و جدید نظریات کے حوالے سے اُن کا تنقیدی مطالعہ اِس بیان پر منتج ہوا:

۔۔۔لسانیات کی روشنی میں اِس امر کا بہ خوبی پتا لگایا جاسکتا ہے کہ اِن میں سے کون سا نظریہ اردو کے آغاز کا سب سے قابلِ قبول نظریہ (Most acceptable theory) ہے اور کن کن نظریوں سے صرفِ نظر کیا جاسکتا ہے کہ وہ لسانیات کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور محض قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔۔۔اردو کے آغاز وارتقا کا سب سے قابلِ قبول نظریہ وہ ہے جسے ہمارے عہد کے نام ور ماہرِ لسانیات اور ممتاز محقق پروفیسر مسعود حسین خان نے پیش کیا ہے۔۔۔جس کی رو سے اردو کے آغاز کے سلسلے میں کھڑی بولی کو اولیت حاصل ہوگئی ہے۔۔۔۔۔اردو کا کھڑی بولی سے پیدا ہونا ایک ایسی لسانی حقیقت ہے جسے کسی بھی طرح جھٹلایا نہیں جاسکتا۔۔۔لہٰذا مسعود حسین خان کا دہلی ونواحِ دہلی کو اردو کی ولادت گاہ اور مولد ومنشا قرار دینا تاریخی ولسانی اعتبار سے عین مناسب اور قابلِ قبول ہے۔[۲۴۸]

درج بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے اردو کے آغاز وارتقا کے حوالے سے اب تک کے تمام نظریات میں ڈاکٹر مسعود حسین خان کے نظریے اور لسانی تحقیقات کو معتبر ترین تسلیم کیا ہے۔اِس حوالے سے انھوں نے ڈاکٹر مسعود حسین خان کی تحقیقات کو علمِ لسانیات کے اُن بنیادی اصولوں پر مبنی قرار دیا ہے کہ جن کا مطالعہ کسی بھی زبان کی اصل اور اساس کی تلاش میں از بس ضروری ہے۔لکھتے ہیں:

کسی زبان کی پیدائش یا اِس کے آغاز کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے تین باتوں پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ زبان کب پیدا ہوئی، کہاں پیدا ہوئی، اور کیسے پیدا ہوئی؟ مسعود حسین خان ان ماہرینِ لسانیات میں ہیں جنھوں نے اِن تینوں باتوں پر نہایت عالمانہ اور محققانہ انداز سے غور کیا ہے اور لسانیاتی حقائق کی روشنی میں بے شمار دلیلوں اور مثالوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو دہلی اور نواحِ دہلی میں ۱۱۹۳ء میں مسلمانوں کی فتحِ دہلی کے بعد کھڑی بولی کے بطن سے پیدا ہوئی جس پر ابتداً ہریانوی کے بہت گہرے اثرات پڑے لیکن جیسے جیسے اردو ترقی کرتی گئی ہریانوی کے اثرات زائل ہوتے گئے۔[۲۴۹]

اِس بیان سے یہ حقیقت واضح ہے کہ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے ہاں بلاشبہ کھڑی بولی کو اردو زبان کی اساس کی حیثیت سے قبول کر لینے کے سلسلے میں نہ صرف ڈاکٹر مسعود حسین خان کے لسانی افکار و بیانات کی بھرپور تائید ملتی ہے بلکہ انھوں نے اپنے تنقیدی لسانی مطالعے کی بنا پر ڈاکٹر مسعود حسین خان کی تحقیقات و مباحث کو لسانیات کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ثابت کر کے اعتبار بخشا ہے۔

ابتدا و ارتقائے اردو کی بابت ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے افکار کا خلاصہ یہ ہے:

شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور دہلی میں اِن کی حکومت سازی (۱۱۹۳ء) کے بعد یہاں کے ہندوؤں اور نو وارد مسلمانوں میں میل جول پیدا ہوا۔اس باہمی میل جول اور اختلاط کی وجہ سے یہاں ایک نئی تہذیب پروان چڑھنے لگی اور دہلی کے آس پاس ایک نئی زبان کا خمیر تیار ہونے لگا۔مسلمانوں کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔عربی ان کی مذہبی زبان تھی۔جو مسلمان پنجاب سے آئے تھے ان کی زبان قدیم پنجابی تھی۔ان تمام زبانوں کا دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں پر گہرا اثر پڑا اور نہایت تیزی کے ساتھ ان بولیوں میں عربی، فارسی، ترکی اور پنجابی زبانوں کے الفاظ داخل ہونے لگے۔دہلی اور نواحِ دہلی کی یہ بولیاں ۱۰۰۰ سنہِ عیسوی کے بعد شورسینی اَپ بھرنش سے پیدا ہوئی تھیں۔ان بولیوں میں ایک بولی 'کھڑی بولی' تھی جو دہلی کے شمال مشرق اور مغربی اتر پردیش کے علاقوں (بالائی دوآبے) میں سر اٹھا رہی تھی۔یہ اگر چہ ایک کم زور بولی تھی اور صرف اپنے ہی علاقے تک محدود تھی لیکن بعض وجوہ سے اسے نو وارد مسلمانوں کی سر پرستی حاصل ہوگئی، چناں چہ یہ چمک اُٹھی اور رفتہ رفتہ اس میں نکھار پیدا ہونے لگا۔یہی کھڑی بولی ہماری آج کی اردو کی بنیاد اور اصل و

اساس ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کھڑی بولی ہی بن سنور کر'اردو' کہلائی۔ [۲۵۰]

درج بالا مطالعے کی رو سے محققین کی ایک بڑی جماعت سامنے آتی ہے جو اردو کے آغاز کو ظہورِ اسلام سے بہت پہلے برِصغیر میں ورودِ آریا تک لے جاتی ہے۔ اِن ماہرین کے خیال میں اردو ایک آریائی زبان ہے جو ہندوستان کی ایک قدیم پراکرت سے ماخوذ ہے اور پراکرت یا تو سنسکرت سے مشتق ہے یا اِس کی کسی ایسی معاصر بولی سے ابھری ہے جو سنسکرت ہی کی طرح خالص آریائی النسل تھی۔ دیگر قدیم آریائی بولیوں کی طرح اردو کی ماخذ قدیم پراکرت بولی بھی ایرانی زبان کی بیٹی تھی جو عہد بہ عہد ارتقائی مراحل طے کرتے کرتے بالآخر'اردو' کے رُوپ میں سامنے آئی۔

اردو دراوڑی الاصل زبان:

جدید لسانیاتی اصولوں کے تحت اردو کے ساختیاتی مطالعے کی بنا پر اِس زبان کے آریائی الاصل ہونے میں اگرچہ کوئی شبہ نہیں لیکن اس کے باوجود چند ماہرینِ لسانیات اردو کو خالص آریائی زبان تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کے مطابق اردو زبان کو آریائی الاصل اُسی صورت مانا جاسکتا ہے جب یہ بھی مان لیا جائے کہ آریاؤں کی آمد کے وقت برِصغیر کے باشندوں کی کوئی اپنی زبان نہ تھی، جو کہ ممکن نہیں۔ بلکہ اردو زبان اُس قدیم پراکرت کی ترقی یافتہ صورت ہے کہ جس کا ہیولیٰ آریاؤں کی آمد سے قبل برِصغیر میں موجود تھا اور برِصغیر کی قدیم ترین زبان دراوڑی بولنے والے افراد شمالی اور جنوبی ہندوستان میں سبقت رکھتے تھے۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ قدیم عہد میں دراوڑی سارے ہندوستان کی زبان تھی۔ اِن علما [۲۵۱] کے نزدیک اردو گویا دراوڑی الاصل زبان ہے۔ اِس نظریے کے پس منظر میں دراصل

ماہرین کا یہ خیال کارفرما ہے کہ برِصغیر میں آریائی اقوام کی گروہ در گروہ آمد سے قبل دراوڑی تہذیب پوری شان وشوکت سے موجود تھی۔ بلاشبہ اُن کی زبان بھی اُن کے تمدّن کی ترجمان اور خاصی جان دار ہوگی۔ بعدازاں برِصغیر پر آریاؤں کے پے در پے حملوں سے دراوڑ قوم پسپا ہوئی اور اسی سبب دریاؤں کے کنارے کی پروردہ دراوڑی تہذیب آریائی یورش کا نشانہ بنی۔ دراوڑ پیچھے ہٹے اور دور جا کر آباد ہوگئے جو باقی رہے وہ غلام بن گئے۔ اُن کی زبان بھی آہستہ آہستہ آریائی زبان میں ضم ہو کر اپنی اصل سے بے گانہ ہوگئی۔ لیکن اِس کے باوجود سنسکرت کا دراوڑی عنصر اِس امر کی دلیل ہے کہ دراوڑی بولیاں قطعی طور پر ختم نہیں ہوئی تھیں بلکہ دبے سروں میں اپنا راگ الاپتی رہیں جو الہامی اور دیوبانی سُروں میں مل کر اپنی انفرادیت کھو بیٹھا۔ محمد مجیب نے بھی سنسکرت پر دراوڑی اثرات تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

> سنسکرت ابجد کے دندانی حروف اور کسی ہند جرمانی زبان میں نہیں ملتے، دراوڑی زبانوں میں البتہ پائے جاتے ہیں اور یہ سنسکرت میں دراوڑی اثرات کی بہ دولت شامل ہوئے ہوں گے۔ سنسکرت کے بہت سے الفاظ کا مادہ آریائی معلوم نہیں ہوتا۔ اِن کا ماخذ دراوڑی زبانیں ہوں گی۔ [۲۵۲]

'Cambridge History Of India' میں اِس موضوع کو بڑے عالمانہ انداز میں زیرِ بحث لایا گیا ہے:

> Dravidian characteristics have been traced alike in Ved and classical Sanskrit, in the Prakrits or early popular dialects and in the modern vernaculars derived from them. There is a good ground therefore supposing that before the coming of the Indo-Aryan speakers, the Dravidian language pre-dominated both in northern and southern India. [253]

ایک قوم کی زبان دوسری کسی زبان سے متاثر ہوسکتی ہے، ختم نہیں۔ ختم ہونے کی صورت میں اِس کی ایک یا متعدد ارتقائی شکلیں ضرور ہوں گی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قتل وغارت گری سے دراوڑی اقوام مکمل طور پر تباہ نہیں کردی گئی تھیں، بلکہ آریاؤں کو اپنی ضرورت کے تحت غیر آریاؤں کا دست نگر رہنا پڑا ہوگا اور بنیادی معاشرتی مسائل کو نمٹانے کی غرض سے مقامی بولیوں کو اپنانے پر مجبور ہوئے ہوں گے جس سے غیر آریائی زبان پر آریائی چھاپ پڑنے سے اُس زبان کا رنگ رُوپ متغیر ہوا ہوگا۔ مابعد یہی مخلوط زبان، جو فریقین کی ضرورتوں کی کفیل تھی، عہد بہ عہد ارتقائی مراحل سے گزر کر اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ اِس نظریے کو مزید تقویت دراوڑی اور براہوی کے تعلق پر لغوی تحقیق سے ملی۔ ماہرینِ لسانیات کا اِس پر اتفاق ہے کہ بلوچستان کے ایک حصّے میں بولی جانے والی براہوی زبان دراصل دراوڑی

زبان کی باقیات میں سے ہے، بلکہ رشید اختر ندوی کے مطابق:

سندھ میں بولی جانے والی موجودہ سندھی اور اِس سے ملحقہ پنجابی زبان بھی ڈراویڈن یا تورانی الاصل ہے اور وہ زبان ہے جو ہنٹر نے موہنجوداڑو، وادیِ ژوب اور بعض دوسرے مقامات سے برآمد ہونے والی مہروں پر کندہ پائی ہے، اِن سب کی اصل الاصل تھی۔ یہ ساری زبانیں بھی اس زبان سے نکلی ہیں جسے بولنے والے تورانی الاصل یا ڈراویڈن کم از کم پانچ ہزار سال قبل مسیح میں، راوی، سندھ اور بلوچستان میں داخل ہوئے اور جنھیں بعد میں آنے والے آرین نے اپنا رقیب بنالیا تھا۔ [۲۵۴]

یہ وہ لسانی تناظر ہے جس میں اکثر ماہرین نے اردو زبان کی ابتدا پر اپنی تحقیق کی بنیاد اِس مفروضے پر رکھی کہ اردو دراوڑی الاصل زبان ہے۔ اردو زبان کو دراوڑی الاصل تسلیم کرنے والے ماہرین کی لسانی فکر کا تدریجی جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری:

ڈاکٹر سہیل بخاری (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۰ء) نے اردو زبان کے آغاز وارتقا اور جنم بھومی کے حوالے سے بڑے متضاد بیانات پیش کیے ہیں۔ کبھی تو وہ اردو کو ہندآریائی زبان تسلیم ہی نہیں کرتے۔ کبھی وہ اردو کی جنم بھومی 'اڑیسہ' بتاتے ہیں۔ کبھی اردو کو دراوڑی زبان قرار دیتے ہیں اور کبھی اِس کا رشتہ 'کھڑی بولی' سے جوڑتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے مطبوعہ اپنے ایک مضمون، بہ عنوان 'اردو کا قدیم ترین ادب' میں اردو اور کھڑی بولی کے باہمی ربط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

دراصل اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو رُوپ ہیں جسے ماہرینِ علمِ زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ اِن کے موجودہ رُوپوں میں دو فرق واضح ہیں۔ ایک لپی اور دوسرا دخیل الفاظ۔۔۔ علمِ زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابلِ التفات نہیں کیوں کہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصّہ ہے جیسا ہندی زبان کا۔ [۲۵۵]

ایک اور جگہ بیان کرتے ہیں:

ہماری زبان ہمیشہ سے اسی ملک میں بولی جاتی رہی ہے۔ البتہ اِس کا نام 'اردو' عہدِ شاہ جہانی میں رکھا گیا ہے۔ اِس سے قبل اِس زبان کا کیا نام تھا؟ اِس سے متعلق مجھے اِس وقت تک علم نہیں لیکن علمائے زبان برج بھاشا سے اِسے ممیّز کرنے کے لیے کھڑی بولی کہتے ہیں۔ [۲۵۶]

اِس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کھڑی بولی کو اردو زبان کا فقط ایک نام قرار دے رہے ہیں۔ اپنے اِس مؤقف کی وضاحت میں مزید رقم طراز ہیں:

دوسری بات یہ ہے کہ اردو کے بہت سے ناموں میں سے ایک نام 'کھڑی' ایسا ہے جو بتاتا ہے کہ اِس بولی کی جنم بھومی 'کھڑ دیس' ہے، کیوں کہ ہر بولی کا نام اِس کے دیس پر رکھا گیا ہے۔ 'کھڑی' کا مطلب ہے 'کھڑ دیس' کی بولی اور کھڑ دیس بھی ہندوستان کے اسی حصّے میں ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس حصّے کی بولیوں میں ایک بولی 'کھڑیا' نام کی بولی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہی اردو ہو۔ یہ باتیں مل کر میری اِس سوچ کو پکا کرتی ہیں۔ اردو، جسے کھڑی بولی کہتے ہیں، کھڑ دیس میں سدا سے بولی جارہی ہے۔ جہاں سے نکل کر یہ پہلے اُتری ہندوستان پہنچی اور پھر وہاں سے پورے ہندوستان کی لمبائی چوڑائی میں پھیل گئی۔ [۲۵۷]

معلوم نہیں انھوں نے کہاں سے یہ کھوج لگائی کہ مشرقی اُتر پردیش کو کھڑ دیس کہتے ہیں۔ اِس علاقے کے مشرق میں اڑیسہ، شمال میں چھتیس گڑھ اور جنوب میں تلنگانہ ہے۔ گویا یہ موجودہ مدھیہ دیش کا قبائلی جنوبی ضلع 'جگدل پور' ہوا [۲۵۸]۔ کھڑی بولی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اِن کا یہ قیاس اس لیے بھی بے بنیاد ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں گلکرسٹ اور للّو لال نے زبان کے لیے یہ نام 'کھڑی بولی' ایجاد کیا۔ اِن کے ذہنوں میں نہ 'کھڑ دیس' ہوگا اور نہ وہاں کی 'کھڑیا بولی'۔

اردو کو اِس سے ماخوذ کرنا اور بھی دور از کار ہے۔ جگدل پور غیر متمدّن قبائل کا ضلع ہے وہاں کی بولی اور اردو میں کوئی مشابہت نہیں[259]۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کے بیانات پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> اِس تمام لسانی مجذوبیت کے بیچ کام کی بات صرف ایک کہی گئی ہے کہ کھڑی بولی کا ارتقا اردو اور ہندی، دونوں لکھاوٹوں میں تلاش کیا جائے تو شمالی ہند میں اِس کی مسلسل روایت مل جاتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کھڑی بولی، اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے نام ہیں۔[260]

ڈاکٹر سہیل بخاری کا درج بالا نظریہ اردو کی ابتدا کے حوالے سے اِن کا قدیم نظریہ ہے۔ بعد ازاں اپنی تصنیف 'اردو کا رُوپ' (۱۹۷۱ء) میں انھوں نے اردو کے ماخذ، اِس کی ابتدا اور نشو و نما کے تمام مسلمہ اصول و نظریات اور حقائق کو باطل قرار دے کر ایک بالکل نئے اور انوکھے نظریے کی تشکیل کی ہے، جسے عقلِ سلیم تسلیم نہیں کر سکتی۔ انھوں نے اردو زبان پر اپنے تحقیقی مقالات میں جو طرزِ استدلال روا رکھا ہے اس کی رو سے اردو زبان کا نہ تو مخصوص خطّوں سے تعلق بنتا ہے اور نہ ہی برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے نئی زبان کا کینڈا تیار ہوتا ہے۔ اُن کی دانست میں اردو کے آغاز اور تشکیل کا اِن سے کوئی تعلق نہیں۔ اُن کے بہ قول اردو زبان کی ابتدا پر قریباً تمام تحقیقات کی جانچ پرکھ اور چھان پھٹک کر کے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے:

> اردو سنسکرت سے الگ تھلگ اور آزاد ٹھیٹھ ہندوستانی یا دراوڑی بولی ہے جو جنم جنم سے اس دیس میں بولی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ اردو ہی نہیں ہندوستان کی سبھی بولیاں جو آج کل بولی جا رہی ہیں، آریاؤں کے ہندوستان آنے سے پہلے بھی بولی جاتی تھیں۔ آریاؤں کے آتے وقت بھی بولی جاتی تھیں اور جب سے اب تک برابر بولی جا رہی ہیں۔ اِن میں سے کوئی سی بھی بولی کبھی گھڑی دو گھڑی کے لیے بھی نہیں رُکی ہے۔ نہ جب سے اب تک اِن کی آوازوں، اصولوں اور ڈھانچوں میں کوئی بل آیا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی لپیاں بدلتی رہی ہوں یا لپیوں کی ریت میں بل پڑ گیا ہو اور یہ بات اِن کا کھوج لگانے سے ہی کھُل سکتی ہے۔ میں اردو بولی کے لیے ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ بولی بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی ہندوستان کی دوسری بولیاں۔[261]

اپنے استدلال کو اس کی منطقی انتہا تک لے جاتے ہوئے اردو کی قدامت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> رِگ وید ہندوستان کی قدیم ترین اور آریاؤں کی وہ پہلی کتھا ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ چناں چہ اِس میں اردو الفاظ کی موجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ ہماری زبان ویدک کال سے بھی پہلے اس علاقے میں بھاشا کے طور پر کام آ رہی ہے۔ ان الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہماری بول چال کی آوازوں سے ہزاروں سال سے آج تک زیر، زبر اور پیش کا بھی فرق نہیں آیا ہے اور اسی طرح کے ماخذ اور اشتقاق سے متعلق اب تک کی تمام غلط فہمیاں اور تمام نظریات از خود باطل ہو جاتے ہیں۔[262]

کوئی بھی تحقیق اُس وقت تک معنی نہیں رکھتی جب تک کہ اپنے حق میں کوئی دلیل پیش نہ کر سکے اور افسوس یہ ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنے بیان کی صداقت کے ثبوت میں رِگ وید میں سے اردو کے ایک لفظ کی مثال بھی درج نہیں کی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے دیگر ماہرین کے مروجہ لسانی تصورات کو رد کرتے ہوئے اپنا جو تصور پیش کیا اُس کی رو سے اردو 'مہاراشٹری' جتھے کی بولی قرار پاتی ہے۔ اپنی کتاب 'اردو کا رُوپ' میں (صفحہ نمبر ۵۴ تا ۵۵) زبانوں کے شورسینی گروہ اور اردو کی لسانی خصوصیات کا تقابل پیش کر کے واضح کیا ہے کہ اردو شورسینی گروہ سے متعلق نہیں بلکہ وہ زبانوں کے مہاراشٹری گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> میں پراکرتوں کو، جو ہماری جدید زبانوں کی مائیں تھیں، ہندوستان کی قدیم دراوڑی زبانیں سمجھتا ہوں اور ویدک و سنسکرت کو ایرانی اور دراوڑی زبانوں کا مرکب مانتا ہوں جن میں ہمارے الفاظ کے رُوپ کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ اردو زبان نہ شورسینی سے نکلی ہے نہ پالی سے بلکہ اِس کا ماخذ مہاراشٹری پراکرت ہے۔ اَل، اِن، اُن کے لاحقے، مجھ تجھ کی ضمیریں، تشدید کے مقابلے میں تسہیل کا رجحان،

دندانی حروف کے مقابلے میں مخفی حروف کا زیادہ استعمال اور حروفِ علت کا حرکات میں بدل جانا۔ یہ اور اِن کے علاوہ اور بہت سی خصوصیات جو آج اردو میں ملتی ہیں اسے مہاراشٹری پراکرت ہی سے ورثے میں ملی ہیں اور اس پراکرت کے نقوش رگ وید میں بھی دیکھے ہیں۔ [۲۶۳]

ایک اور مقام پر بیان کرتے ہیں:

اردو بولی نہ پشاچی جتھے میں گنی جاسکتی ہے نہ شورسینی میں نہ ماگدھی میں نہ اردھ ماگدھی میں۔ یہ مہاراشٹری جتھے کی بولی ہے۔ [۲۶۴]

اپنے اِس خیال کی ثبوت میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ علمائے لسانیات میں صرف ڈاکٹر شوکت سبزواری ہیں جو شورسینی سے اردو کا نکاس نہیں مانتے۔ جب کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ہاں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار ملتا ہے:

اردو میں پراکرتی عناصر سنسکرت عناصر سے بھی زیادہ نمایاں ہیں، کیوں کہ درحقیقت یہ پراکرتیں برِصغیر کے مختلف علاقوں میں عوامی بولیاں تھیں اور انہی عوامی بولیوں نے ارتقائی منزلیں طے کر کے جدید ہندوستانی زبانوں کا رُوپ پایا ہے اور اردو بھی ایسی ہی ایک عوامی پراکرت کی ترقی یافتہ شکل ہے جسے مہاراشٹری اَپ بھرنش کہتے ہیں۔ پراکرت کی سب سے بڑی روایت اِس کا عوامی عنصر ہے اور یہی عنصر اردو نے اپنے ورثے میں پایا ہے۔ [۲۶۵]

علاوہ ازیں ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنے نظریے کی سند میں 'اردو کا رُوپ' میں (صفحہ نمبر ۷۸ تا ۸۰) مدلّل لسانی بحث پیش کی ہے۔ اردو زبان کے مولد کے حوالے سے مروج سابقہ لسانی نظریات مسترد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

اردو کی اصل مرزبوم کے متعلق اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، وہ بھی یک سر غلط ہے۔ مہاراشٹری پراکرت ملک مہاراشٹر میں بولی جاتی تھی اور اُسی ملک مہاراشٹر کے مشرقی علاقے میں پیدا ہوئی اور مرہٹی کی سگی بہن ہے۔ [۲۶۶]

ڈاکٹر سہیل بخاری اردو کو مہاراشٹری پراکرت سے ماخوذ بتا کر ملک مہاراشٹر کے مشرقی علاقے کو اردو کی اصل مرزبوم قرار دیتے ہیں۔ اردو اور مرہٹی کی مشترک علامتِ فاعلی 'نے' کی وجہ سے انھیں سگی بہنیں ثابت کرتے ہوئے اسی خصوصیت کی بنا پر وہ اردو کو چھتیس گڑھی اور تلگو کے بھی مشابہ قرار دیتے ہیں۔ ملک مہاراشٹر کی اِن زبانوں کے علاوہ وہ یہاں کے دیگر اضلاع کی بولیوں، 'کیٹائی' اور 'ہلبی' کی اردو زبان سے بعض مماثل لسانی خصوصیات کی بنا پر لکھتے ہیں:

اردو کی جنم بھومی مشرق میں اڑیسہ ہے اور جنوب میں تلنگانہ سے محدود ہے۔ یہاں کی زبان کے متعلق گریرسن کا تو یہ خیال ہے کہ اِس پر ہندی کا اثر ہے لیکن میرے نزدیک اردو کا گھر یہی ہے۔ [۲۶۷]

الغرض اردو اور کھڑی بولی کے رشتے کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری نے جو خیال پیش کیا اِس سے قطع نظر اُن کے دیگر تمام نظریات کو 'ایجادِ بندہ' سمجھ کر نظرانداز کیا جاسکتا ہے [۲۶۸]۔ فی الحال یہی نظریہ سب سے زیادہ قرینِ قیاس اور درست معلوم ہوتا ہے کہ بارھویں صدی کے لگ بھگ دہلی، میرٹھ اور بعض ملحقہ علاقوں میں بولی جانے والے زبان کھڑی بولی نے ارتقا پا کر اردو کی شکل اختیار کر لی اور آس پاس کی باقی بولیوں، مثلاً برج بھاشا، قنوجی، میواتی اور بندیلی وغیرہ سے پہلے اِس کا ارتقا ہو گیا۔

عین الحق فریدکوٹی:

تاریخ شاہد ہے کہ سب سے پہلے مسلمان علما نے سنسکرت کے مطالعے کی علمی روایت قائم کرتے ہوئے برِصغیر کی زبانوں کے تاریخی و لسانیاتی مطالعے کی طرف توجہ کی۔ اِن علما نے پہلے سندھی کو سیکھا اور پھر مزید تحقیق کے لیے سنسکرت کا مطالعہ شروع کیا اور سنسکرت کے علمی ذخیروں سے بیرونِ ہند ممالک کو روشناس کرایا۔ اِن کے اِس علمی مطالعے کی تاریخ آٹھویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر سترھویں صدی کے آخر تک پہنچتی ہے [۲۶۹]۔ دنیائے اسلام کے علمی کارناموں کے بعد جب

علوم وفنون کی نشاۃِ ثانیہ کا بیڑا اہلِ مغرب نے اُٹھایا تو علوم السنہ بھی رفتہ رفتہ ترقی پذیر ہوئے۔ ابتدائی توجہ الفاظ اور اشتقاق پر رہی۔ بعد ازاں مغرب اور مشرق کی زبانوں کے مشترک ذخیرۂ الفاظ نے تقابلی لسانیات کی بنا ڈالی۔ رشید اختر ندوی لکھتے ہیں:

مسٹر راؤنسن نے مشہور پروفیسر وان اکسڈٹ کا یہ خیال بڑے وثوق کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ارضِ پاکستان کے سب سے پہلے آباد کار وہ سیاہ فام لوگ تھے جو برفانی عہد میں افریقہ ملنیشیا سے یہاں پہنچے اور پاکستان کی سب سے پہلی آبادیاں ان لوگوں کی تھیں جو کول سیری یا مُنڈا زبانیں بولتے تھے۔[۲۷۰]

دراوڑی اور براہوی کے تعلق پر بھی خصوصی تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج کی بنا پر ماہرین متفق ہیں کہ بلوچستان کے ایک حصے میں بولی جانے والی براہوی زبان دراصل دراوڑی الاصل ہے۔ ''غالباً ۱۸۴۴ء میں ایک جرمن عالم لیسن نے اِس نظریے کا اظہار کیا تھا کہ براہوی دراوڑ السنہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ لیسن کے بعد کم و بیش بیس (۲۰) یورپی فضلا اسی زبان پر کام کر چکے ہیں جن میں سے آٹھ علما نے تو اس زبان کی ماہیت اور ساخت کو بھی موضوعِ مطالعہ بنایا ہے۔ اِن علما کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ براہوی دراوڑ السنہ سے مشابہت ہی نہیں رکھتی بلکہ یہ ان ہی کی ہم اصل ہے۔ اِس لیے کہ بہ لحاظِ گرامر و روزمرّہ براہوی زبان اپنی کم و بیش دو تہائی دخیل لغت کے باوجود خالص دراوڑی زبان ہے''۔[۲۷۱]

درج بالا مغربی مفکرین سے لسانی شواہد حاصل کر کے **عین الحق فرید کوٹی** (۱۹۱۹ء۔۱۹۹۵ء) نے دراوڑی اور اردو زبان کے مشترک الفاظ کی فہرست مرتب کی اور اپنی تصنیف '**اردو زبان کی قدیم تاریخ**' **مطبوعہ ۱۹۷۲ء** میں اردو کی اصل اور ابتدا کے حوالے سے درج ذیل خیالات کا اظہار کیا:

☆ جب تحقیق و تدقیق کے بعد یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ صحیح معنوں میں سنسکرت اور دراوڑی زبانوں میں سے کوئی بھی اردو کی جدِّ امجد قرار نہیں دی جا سکتی تو ہمارے لیے یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں کہ اردو زبان کا حقیقی سرچشمہ خود وادیِ سندھ کی وہ قدیم زبان ہے جو آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں رائج تھی۔[۲۷۲]

☆ آریاؤں کی آمد کے وقت وادیِ سندھ میں دراوڑی قبائل کو بالادستی حاصل تھی۔ منڈا قبائل برِصغیر کے قدیم ترین باشندے ہیں اور دراوڑوں کی آمد سے قبل یہاں آباد تھے۔۔۔۔۔ اور ہڑپا اور موہنجوداڑو کی گلیوں اور بازاروں میں انہی گروہوں سے تعلق رکھنے والی زبانیں بولی جاتی تھیں۔[۲۷۳]

☆ وادیِ سندھ کی ہڑپائی تہذیب کی پیش رو آمری نال تہذیب منڈا قبائل کی مرہونِ منت تھی اور آج سے کوئی چھ ہزار برس قبل یا اس سے بھی پہلے یہاں منڈا گروہ کی زبانوں کا چلن تھا۔[۲۷۴]

☆ جب ہم اردو زبان کے لغوی سرمائے اور صرف و نحو کا موازنہ برِصغیر کی موجودہ زبانوں سے کرتے ہیں تو جو زبان اس کے سب سے زیادہ نزدیک نظر آتی ہے وہ پنجابی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ صرف و نحو کے لحاظ سے پنجابی کے علاوہ کوئی دوسری زبان اردو سے گہری مطابقت نہیں رکھتی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیادیں وادیِ سندھ ہی میں استوار ہوئیں اور اس کا سلسلۂ نسب پنجابی اَپ بھرنش اور مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا قدیمی ہڑپائی عہد سے جا ملتا ہے جو کہ آریاؤں کی آمد سے قبل وادیِ سندھ میں مروج تھی۔[۲۷۵]

☆ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اور سنسکرت میں کافی حد تک لغوی اشتراک موجود ہے لیکن اِس سے یہ یک طرفہ فیصلہ دینا کسی طرح جائز نہیں کہ یہ تمام کا تمام سرمایہ الفاظ سنسکرت ہی نے اردو کو دیا ہے۔ بلکہ معاملہ اِس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے یعنی خود سنسکرت نے یہ الفاظ اردو ہی کی پیش رو زبان سے اخذ کیے ہوں۔[۲۷۶]

☆ واضح رہے کہ اردو زبان کا صرف و نحو کے لحاظ سے فارسی اور سنسکرت سے نہ صرف فروعی بلکہ اصولی اور بنیادی اختلاف

ہے۔ یہ بات کسی طرح ذہین میں نہیں آتی کہ ایک زبان کی شاخ اس سے اتنی مختلف ہو۔ دنیا کی زبانوں کی تاریخوں میں ہمیں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ [۲۷۷]

☆ جب یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ اردو زبان کا سرچشمہ نہ تو سنسکرت ہے نہ فارسی تو صدیوں پرانے مفروضے کا فلک بوس محل آن واحد میں زمین پر آ رہتا ہے۔ [۲۷۸]

عین الحق فرید کوٹی کے استدلال کی رو سے دراوڑی زبان ہی اردو اور اِس کے ساتھ پنجابی کی بھی ماخذ ہے۔ اپنے استدلال کی سند میں انھوں نے سنسکرت کے مقابلے میں پنجابی اور پالی کے مشترک الفاظ بھی پیش کیے ہیں [۲۷۹] لیکن محض مشترک الفاظ سے یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ایک زبان دوسری سے ماخوذ ہے۔

ڈاکٹر خالد حسن قادری:

اردو کی پیدائش سے متعلق تازہ ترین نظریہ ڈاکٹر خالد حسن قادری (وفات۔ ۲۰۱۱ء) نے پیش کیا جو دراصل ڈاکٹر سہیل بخاری اور عین الحق فرید کوٹی کے نظریات ہی کی بازگشت ہے اور 'پراچین اردو' کے مصنف سیّد شبیر علی کاظمی کے خیالات کی بھرپور تائید کرتا ہے۔

اردو کو آریائی الاصل زبان کا درجہ دینے والی تمام تحقیقات کو باطل ٹھہراتے ہوئے ڈاکٹر خالد حسن قادری نے تاریخی اور لسانی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کا تعلق آریائی زبانوں کے خاندان سے نہیں اور نہ ہی پراکرت کا تعلق سنسکرت سے ہے، بلکہ پراکرت وہ بولیاں ہیں جو آریاؤں کی ہندوستان آمد سے صدیوں پہلے پاکستان کی سرزمین میں رائج تھیں۔ انھوں نے اِن خیالات کا اظہار اپنے ایک انگریزی مقالے، بہ عنوان **'Rough Notes On Urdu'** میں کیا جو پہلے 'المعارف' (لاہور) میں اور پھر 'اخبارِ اردو' کے مارچ ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ عمر حمید ہاشمی کا ترجمہ شدہ یہ مقالہ بعد ازاں کراچی یونی ورسٹی کے رسالے 'جریدہ' کے شمارہ نمبر ۲۱ (۲۰۰۳ء) میں شائع ہوا۔ اسی ترجمے کو 'اخبارِ اردو' نے بھی اپنے شمارے ستمبر ۲۰۰۳ء میں نقل کیا۔

نہ صرف اردو بلکہ برِصغیر کی دیگر تمام زبانوں کے ماخذ، آغاز اور ابتدائی نشو و نما کے بارے میں ڈاکٹر خالد حسن قادری مروجہ لسانی نظریات کو بڑی حد تک کالعدم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> .....All Indian languages do not emanate from Sanskrit, and Urdu, and by that spoken Hindi, does not owe its existance to Sanskrit. In a sense it can not be called an Indo-Aryan language in the generally accepted connotation of the term. And the same argument could be applied to many other Indian languages that have been uptil now, without question, grouped with the other Indo-Aryan languages. [280]

ڈاکٹر خالد حسن قادری کا مؤقف ہے کہ گرامر کے اعتبار سے پراکرت عربی زبان کے زیادہ قریب ہے۔ اس سلسلے میں وہ بنی اسرائیل کے اُن گم شدہ دس قبائل کا ذکر بھی کرتے ہیں جو ارضِ فلسطین سے ہجرت کر کے ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف آباد ہو گئے تھے [۲۸۱]۔ علاوہ ازیں وہ قواعد کے اعتبار سے اردو زبان کو سنسکرت سے مختلف جب کہ پراکرت سے مماثل قرار دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> We have proved that Sanskritic philosophy of grammar is almost alien to the philosophy of Urdu grammar. Now, when Urdu and Hindi did not borrow their basic grammatical structure from Sanskrit, where did they get it from?

Obviously from Prakrits and so did the other modern Indian languages from their respective Prakrits. Thus Prakrits, and in case of Urdu Shorseni of Apbhransas , were not influenced by Sanskrit at all as far as their basic grammar is concerned. Thus a discussion on Prakrits, at this stage , and on the assumption that they owe their grammar to Sanskrit is not meaningful.[282]

ڈاکٹر خالد حسن قادری کے اِس نظریے پر محمد پرویش شاہین نے بہت متوان بحث کی جو'ڈاکٹر خالد حسن قادری کا نظریہ' کے عنوان سے 'اخبارِ اردو' کے فروری ۲۰۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ انھوں نے بڑی فراخ دلی سے اِس نظریے کو اقلیمِ لسانیات میں ایک طرف تو خوش آمدید کہا اور ساتھ ہی ساتھ اِس کی خامیوں کی طرف علمی انداز میں اشارہ کر کے کوئی بھی حتمی بات کہنے سے قبل ڈاکٹر خالد حسن قادری سے اِس امر پر مزید تحقیق کی درخواست کی[۲۸۳] اور اُن کی توجہ اُس تحقیقی الجھاؤ کی طرف دلائی جس میں ڈاکٹر خالد حسن قادری بری طرح سے جکڑے معلوم ہوتے ہیں۔ محمد پرویش شاہین لکھتے ہیں:

دا کٹر خالد حسن قادری کا موجودہ مضمون دوشاخہ ہے۔ ایک طرف وہ اردو کو منڈا اور دراوڑی کی طرف لے جاتے ہیں جو کہ غیر سامی زبانیں ہیں، لیکن دوسری طرف وہ اِن زبانوں کے بولنے والوں کو سامی لوگ ثابت کر رہے ہیں اور اُن کا رشتہ بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کے دس قبائل کے ساتھ جوڑتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ باتیں محض اِس غرض و غایت سے لکھی گئی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی بات ادھوری نہ چھوڑیں بلکہ اپنے وسیع علم کی روشنی میں بات آگے بڑھائیں تا کہ ہم کسی درست نظریے پر پہنچ سکیں۔[۲۸۴]

ڈاکٹر خالد حسن قادری کے اِس نظریے کو تاریخی، جغرافیائی اور لسانیاتی اعتبار سے ثابت کرنا مشکل ہے مگر تحقیق مزید کے دروازے کھلے ہیں۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری کے اِس نظریے کی اہمیت بلاشبہ اِس واسطے بھی ہے کہ یہ کہنہ مشق ماہرینِ لسانیات کے ساتھ ساتھ علم و تحقیق کے اِس شعبے میں نو واردوں کے لیے بھی تحریک کا موجب ہے۔ اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کے دیگر چند ماہرین اور اہلِ فکر و نظر کے ہاں بھی اردو کو دراوڑی الاصل زبان تسلیم کیے جانے کے خیالات ملتے ہیں، مثلاً۔۔

☆ جارج ابراہام گریرسن:

The pure Hindostani words form the back bone of the language. They are derived from the ancient Indian dialect which I have already mentioned as akin to classical Sanskrit.....After the ancient Indian dialect had lost its pristine form, and before it finally became Hindostani, it passed through what is known as the Prakrit stage...We may say that the ancient Indian dialect and classical Sanskrit were brothers; that Prakrit was the son of the ancient Indian dialect, and the nephew of Sanskrit; and that Hindostani is the grandson of the ancient Indian dialect, and the grand nephew of Sanskrit.[285]

☆ شبیر علی کاظمی:

اردو کو خالص آریائی زبان ٹھہرانا ایک قسم کا تعصب ہے۔۔۔ آریاؤں کی آمد سے پہلے کول اور دراوڑ بولیاں ہندو پاک تمدّن کی پروردہ تھیں اور یہاں کے باشندوں کی ضرورتوں کی کفیل۔ زبانوں کی آمیزش نے سنسکرت کو جنم دیا۔ عوامی بولیاں اپنی من مانی کرتی رہیں۔ انھیں کی ایک ترقی یافتہ شکل اردو ہے۔ لہٰذا آریا بھی اردو کے جنم داتا نہیں انھوں نے اِس کو سنوارا ہے، ورنہ زبان کا ہیولیٰ پہلے سے موجود

تھا۔ جس طرح ہندو پاک تمدّن کو خالص آریائی نہیں کہا جا سکتا اسی طرح اردو کو بھی خالص آریائی زبان نہیں کہا جا سکتا۔ [۲۸۶]

☆ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

اردو ایک غیر آریائی زبان ہے جس کی شاخیں آج بھی تامل، تلگو، کناڑی اور ملیالم موجود ہیں اور یہ زبانیں آج بھی بولی جاتی ہیں۔ اِس زبانوں میں ترکی، فارسی، عربی الفاظ داخل ہو کر اردو زبان بنی۔ [۲۸۷]

☆ ڈاکٹر وزیر آغا:

یہ کہنا کہ نو وارد زبان نے دیسی بھاشا کو ختم کر کے خود ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لی حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ یہ طے ہے کہ ہندوستان میں بولی جانے والی دیسی بھاشائیں سنسکرت کی بگڑی ہوئی صورتیں نہیں تھیں، بلکہ یہ وہ زبانیں تھیں جو کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی یہاں بولی جاتی تھیں۔ [۲۸۸]

☆ ڈاکٹر سلیم اختر:

ہم بڑے وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ وہ قدیم زبان ہڑپا اور موہنجوداڑو کے باشندوں کی زبان تھی جس سے کہ آنے والے آریائی قبائل کو دوچار ہونا پڑا اور اِن کی آمیزش سے کئی بولیوں نے جنم لیا اور موجودہ زبانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ یہاں یہ امر بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ سنسکرت نے یہاں کی مقامی زبانوں کو محض متاثر کیا ہے لیکن اِس نیست و نابود زبان نے کسی نئی بولی کی طرح نہیں ڈالی۔ [۲۸۹]

اردو زبان کی ابتدا و ارتقا سے متعلق اہلِ فکر و نظر کے درج بالا خیالات عین الحق فرید کوٹی کی اِس اُمید کی ثمر آوری کا ثبوت ہیں:

مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ یہ نئی لہر میرے ہی پیش کردہ نظریے کی صدائے بازگشت ہے۔ ہاں میرے لیے یہ امر باعثِ مسرت ضرور ہے کہ اب میں اِس نئی ڈگر پر اکیلا ہی گامزن نہیں ہوں بلکہ کچھ اور دوست بھی میرے ہم رکاب ہیں۔ مجھے امید واثق ہے کہ ایک دن یہی پگڈنڈی ایک عظیم شاہراہ کی صورت اختیار کر لے گی۔ [۲۹۰]

مختلف ماہرینِ لسانیات نے اردو زبان کے ماخذ، ابتدا اور ارتقا سے متعلق جو نظریات پیش کیے ہیں ان میں کسی نظریے کو بھی حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا، جس کا سبب یہ ہے کہ ہر نظریے سے متعلق دلائل کو سو فی صد تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی انھیں سو فی صد باطل ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات اکثر ماہرین اپنے ہی متفرق و متضاد بیانات میں الجھے پائے گئے ہیں اور یہی متضاد بیانات اردو کے آغاز کی کھوج میں سرگرداں نو وارد محققین کو مزید الجھا دیتے ہیں۔ اِن متضاد بیانات سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کے بادل اِس قدر گھنے ہیں کہ حقیقت کا سورج اِن میں کہیں چھپ کر رہ گیا ہے۔ اِس سلسلے میں زیادہ تر ماہرین مذہبی اور بالخصوص علاقائی عصبیت کا شکار بھی ملے۔ اکثر ہندوستانی علما اُتر پردیش اور دہلی کے سوا کسی اور مقام کو اردو اور ہندی کا مرکز و منبع ماننے کے لیے تیار نہیں اور نہیں چاہتے کہ برج کی مقدس سرزمین اور اِس کے نواحی علاقے اِس عظمت سے محروم ہو جائیں اور اردو کے آغاز کا سہرا کسی اور خطّے کے سر جا بندھے۔ اسی طرح پاکستانی علما کے ہاں اردو کو دراوڑی الاصل زبان تسلیم کیے جانے کا رجحان زیادہ اس وجہ سے ہے کہ اِس نظریے کے مطابق اردو زبان کا تعلق پاکستان سے بن جاتا ہے اور اردو اسی سرزمین کی قدیم زبان ہے۔ عین الحق فرید کوٹی کا بیان ہے:

...Pakistani languages have not only inherited the whole of the phonetic structure of the mixed language (i.e the mixture of the Dravidian and the Munda languages) as spoken by the common man in Harappan period but at the same time almost all the grammatical forms of the Dravidian languages are found in the main Pakistani languages especially Punjabi in one or the

other way.[291]

بہ قول ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ”فتح محمد ملک نے اخبارِاردو میں ڈاکٹر خالد حسن قادری کے نظریے کی تائید اِس بنیاد پر کی کہ اردو کا تعلق پاکستان سے ہے“[۲۹۲]۔ حال آنکہ علم وتحقیق میں ماہرین کا یہ رویہ ایک ایسی غلطی ہے جس سے نت نئی غلطیوں کے ایک ایسے لامتناہی سلسلے کا آغاز ہوتا ہے جو بلند پایہ صاحبانِ فضل و کمال کو گم راہ کر دیتا ہے۔ بہ ہر حال اردو کی ابتدا کے حوالے سے اہلِ علم کے بیانات خواہ قیاسی ہوں یا جدید لسانیاتی تحقیق پر مبنی، اردو زبان کے تاریخی اور لسانی مطالعے میں اِن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اردو اس زبان کا عرفی نام ہے جو ذات میں ہند آریائی ہے تو صفات میں ہند اسلامی زبان ہے، جو اپنے منبع ومخرج کے اعتبار سے ابتداءً ایک محدود علاقے کی زبان تھی مگر بعد میں پھیلتے پھیلتے اِس نے پورے برِصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہندوستان کی سرحد سے نکل کر بیرونِ ہند تک جا پہنچی۔ ”اردو ایک وسیع الدامن زبان ہے۔ دنیا کی کوئی زبان خواہ مغرب میں بولی جاتی ہو یا مشرق میں، شمال میں مستعمل ہو یا جنوب میں، ایسی نہ ملے گی جو دیگر زبانوں اور بولیوں کے نہ صرف الفاظ کو اپنا لے بلکہ مختلف لہجوں پر قدرت رکھتی ہو۔ عجم (ایران) ٹ، ڑ، ڈ، ص، ض، ط، ظ اور مخلوط ہائے ہوز (ھ) کے بولنے میں گونگا ہے۔ عرب، پ، چ، ژ، گ پر زبان نہیں ہلا سکتا۔ انگلستان بھی غ، ڑ نہیں بول سکتا۔ اسی طرح ہندوستان میں اردو کے سوا تمام پراکرتیں اپنا شین (ش) قاف (ق) درست نہیں رکھتیں۔ یہ بات اردو ہی کے لیے مخصوص ہے کہ اجنبی سے اجنبی لہجے کی نقل کا اصل اتار لیتی ہے۔“[۲۹۳]

اردو کا آغاز کب ہوا؟ بہ ظاہر یہ سوال بے معنی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان تاریخ کے کسی نقطے سے شروع نہیں ہوتی، بلکہ رفتہ رفتہ ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی ایک زبان ہے جو غیر معلوم زمانے سے ترقی کرتی اور رنگ بدلتی آئی ہے۔ سوال یہ پوچھے جا سکتے ہیں کہ اردو کو موجودہ رنگ کب ملا؟ اِس سے قبل اِس کی شکل کیا تھی؟ موجودہ رنگ عبارت ہے اِس کے لفظی، صوتی، صرفی ونحوی سرمائے سے جس میں اردو کی خصوصیات بھی شامل ہیں اور مشترک صفات بھی۔ یعنی اردو زبان کے وہ الفاظ، آوازیں (مادے) اور صرفی ونحوی قاعدے بھی ہیں جو اردو کے ہیں اور صرف اردو کے ہیں اور اِس کے پاس پڑوس کی زبانوں کے مابین مشترک ہیں[۲۹۴]۔ اردو کے آغاز کا مسئلہ دراصل اردو کی خصوصیات اور اِس کے خط وخال کے نمایاں ہونے کا مسئلہ ہے۔ جب تک اردو کے خط و خال نہیں اُبھرے، اردو وجود میں نہیں آئی اور اِس میں اپنی ہم رشتہ اور قریبی بولیوں سے الگ، منفرد اور مستقل بولی کا رنگ نہیں جھلکا۔ اردو کا ماخذ ومولد متعین کرنے اور دیگر ہم سر بولیوں سے اِس کا رشتہ دریافت کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اِس کی تاریخی گرامر واضح ہو اور مکمل لسانی تجزیہ کر کے اِس کا عہد بہ عہد ارتقا دکھایا جائے۔“ اردو کے منبع کی تلاش دراصل معلوم سے نامعلوم تک کا سفر ہے۔ ماہرین کی تحقیقی دوڑ ماضی بعید میں دور تک ایک ایسی سرحد کے پاس پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے جہاں تاریخ دھندلکوں میں گڈمڈ ہو جاتی ہے اور ماضی تاریکیوں میں غرق ہو جاتا ہے۔ حقیقت کیا ہے؟ شاید کلّی حقیقت کہیں بھی دست یاب نہ ہو لیکن جزوی صداقت سب کے پاس ہے اور بادی النظر دلائل سب کے درست معلوم ہوتے ہیں۔“[۲۹۵]

اردو ہی کیا کسی بھی زبان کی ابتدا کے حوالے سے لسانیاتی تناظر میں قطعی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔ زبان کی پیدائش کب؟ کہاں؟ اور کس طرح؟ پر بحث سے تسلّی بخش نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ یہ کوئی ریاضی کا کلیہ نہیں کہ اخذ کر لیا جائے۔ اِس سلسلے میں تحقیق وتنقید کا عمل جاری رہتا ہے۔ ماہرِ بشریات، ڈاکٹر آر۔ جی لیتھم کے مطابق:

> درخت کی عمر کا اندازہ اِس کے تنے کے غیر مرکزی دائروں سے لگایا جا سکتا ہے لیکن زبان ایک ایسی شے ہے کہ نہ تو اِس میں درختوں کی طرح غیر مرکزی دائرے ہیں، نہ گھوڑوں کی طرح دانت اور نہ کسی روزنامچے میں اِس کی تاریخ پیدائش درج ہے کہ جس سے اِس کی عمر کا صحیح تعین کیا جا سکے۔ اِس کا سُراغ لگانے کا فقط ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے تحقیق۔۔۔! اور تحقیق۔۔۔! اور زیادہ تحقیق۔۔۔![۲۹۶]

حواشی

۱۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا: اردو کی لسانی تشکیل، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۰۸ء)، ص ۳۷۔

۲۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر : ' اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ ' مشمولہ : اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ) ، ڈاکٹر خلیل احمد بیگ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۰۷ء)، ص ۸۴۔

۳۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو زبان کی ابتدا سے متعلق چند مشاہدات' مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص ۱۳۱۔

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۲۰۰۸ء)، ۹۴۔

۵۔ پورے قطعے کے مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے : اکرام چغتائی، محمد: 'مائل دہلوی کا ایک اہم تاریخی قطعہ'، مشمولہ :فنون ، لاہور : اکتوبر (۱۹۶۶ء)۔

۶۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: لسانی رشتے، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (۲۰۰۳ء)، ص ۶۸۔

۷۔ اپنی تصنیف 'لسانی رشتے' کے صفحہ ۶۸ پر ڈاکٹر گیان چند جین بیان کرتے ہیں:

ان کا دیوان 'گلزارِ مضامین' ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) میں مرتب ہوا اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی ابتدا میں فارسی اور اردو زبان کی ابتدا اور ابتدائی اردو شاعروں کے بارے میں ایک تحریر ہے جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے رسالہ اردو، کراچی بابت اکتوبر (۱۹۴۹ء) میں شائع کر دیا۔

۸۔ رسالہ اردو، اکتوبر (۱۹۴۶ء)، ص ۱۲۱ تا ۱۲۲، بہ حوالہ ڈاکٹر گیان چند جین: لسانی رشتے، ص ۶۸۔

۹۔ بہ حوالہ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادبِ اردو، جلد اوّل (آغاز سے ۱۷۵۰ء تک)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۲۰۰۸ء)، ص ۵۲۳۔

۱۰۔ رشید حسن خان (مرتب): باغ و بہار (میر امن دہلوی)، لاہور: نقوش، (۱۹۹۲ء)، ص ۲۴۔

۱۱۔ 'باغ و بہار' کے سنہ اشاعت کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اردو (جلد سوم) کے صفحہ ۴۳۰ پر رقم طراز ہیں:

میر امن کی اس تصنیف کا پہلا نام 'چہار درویش' تھا جس کا سالِ تکمیل ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء ہے۔۔۔۱۸۰۳ء میں جب 'ہندوستانی پریس' سے یہ دوبارہ چھپنی شروع ہوئی اور ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی تو میر امن نے طباعت سے پہلے مسوّدے پر نظرِ ثانی کی۔ شیر علی افسوس نے بھی جہاں اس کے جملے بے ربط تھے انھیں مربوط کیا۔ نظرِ ثانی کیا ہوا یہی مسوّدہ پہلی بار ۱۸۰۴ء میں 'باغ و بہار' کے نام سے ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔

۱۲۔ امن، میر دہلوی: باغ و بہار (قصہ چہار درویش)، لاہور: پاپولر پبلشنگ ہاؤس، (۱۹۹۲ء)، ص ۳۰ تا ۳۱۔

۱۳۔ سیّد انشا کی 'دریائے لطافت' ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں تصنیف ہوئی اور تخمیناً ۴۳ برس بعد ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں مولوی مسیح الدین خان بہادر نے اپنے نستعلیق ٹائپ کے مطبع آفتاب عالمِ تاب واقع مرشد آباد میں طبع ہوئی۔ تقریباً ستر سال تک یہ کتاب گم نامی میں پڑی رہی۔ ۱۹۱۶ء میں انجمنِ ترقیِ اردو نے اسے دوبارہ طبع کرایا۔

۱۴۔ انشا، میر انشا اللہ خان: دریائے لطافت (مترجم: پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی)، نئی دہلی: انجمنِ ترقیِ اردو (ہند)، (۱۹۸۸ء)، ص ۲۷ تا ۲۸۔

۱۵۔ احمد خان، سیّد: آثار الصنادید، جلد اوّل (مرتب: خلیق انجم)، دلّی: اردو اکادمی، (۱۹۹۲ء)، ص ۳۷۰ تا ۳۷۱۔

۱۶۔ منقول از ' جلوۂ خضر' بہ حوالہ محمود شیرانی، پروفیسر حافظ : پنجاب میں اردو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۲۰۰۵ء)، ص ۴۲۔ اصل فارسی عبارت ہے:

ہر گاہ سریر سلطنت از جہاں گیر متجاوز شدہ نوبت شاہ جہاں بادشاہ رسید۔ اینجا کہ بہ سبب مصاحب و معاشرتِ علمائے دین فی الجملہ خودداری و تشریح غالب بود۔ ایں زبان ریختہ معجون مرکب بہ سبب آمد و رفت تاجران ہر دیار دربازار بہ ضرورت خرید و فروخت و معاملات داد و ستد ضروری الاستعمال شد تا زبان یکے بہ فہم دیگرے در آید۔

۱۷۔ مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر: حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل) ، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۹۳ء) کے صفحہ نمبر ۱۷۲ پر گریرسن کے حوالے سے درج ہے کہ صہبائی کا 'رسالہ قواعد صرف ونحو اردو' پہلی بار دہلی سے ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا۔

۱۸۔ بہ حوالہ پنجاب میں اردو، ص ۴۲۔

۱۹۔ حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)، ص ۱۸۲۔

۲۰۔ قادر بخش صابر، مرزا: تذکرہ گلستانِ سخن (مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی)، لاہور، (۱۹۶۶ء)، ص ۱۱۲ تا ۱۱۳۔

۲۱۔ بہ حوالہ حسن اختر ، ڈاکٹر : 'اردو میں لسانی مباحث کا آغاز'، مشمولہ: قومی زبان، جلد ۵۵، شمارہ ۳، کراچی : انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، مارچ (۱۹۸۵ء)، ص ۲۳۔

۲۲۔ بہ حوالہ اردو میں لسانی مباحث کا آغاز، مشمولہ: قومی زبان، ص ۲۳۔

۲۳۔ آزاد، محمد حسین: آبِ حیات، لاہور: خزینہ علم وادب، (۲۰۰۱ء)، ص ۱۶۔

۲۴۔ ہارنلے کے اِس نظریے کی تفصیل بابِ دُوم کی فصل چہارم میں ملاحظہ کیجیے۔

۲۵۔ آبِ حیات، ص ۲۷۔

۲۶۔ بہ حوالہ اردو میں لسانی مباحث کا آغاز، مشمولہ: قومی زبان، ص ۲۴ تا ۲۵۔

۲۷۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی اپنی تصنیف 'حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)' کے صفحہ نمبر ۱۸۸ پر لکھتے ہیں کہ نساخ کے 'رسالہ تحقیق زبانِ ریختہ' کی تاریخ تالیف ۱۲۷۵ھ (بہ مطابق ۱۸۵۹ء) ہے البتہ اِس کی اشاعت ۱۸۹۰ء میں لکھنؤ سے ہوئی۔

۲۸۔ عبد الغفور نساخ، مولوی: رسالہ تحقیق زبانِ ریختہ ، لکھنؤ، (۱۸۹۰ء)، ص ۳ تا ۴، بہ حوالہ' حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)' از ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ص ۱۸۸۔

۲۹۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند : اردو ادب (جلد چہارم)، مدیرِ عمومی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ، لاہور : پنجاب یونی ورسٹی ، (طبعِ دوّم ۔ ۲۰۱۰ء) کے صفحہ ۲۶۸ پر درج ہے کہ اِس لغت کو سیّد احمد دہلوی نے ۱۸۶۸ء میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۱۸۷۸ء میں 'ارمغانِ دہلی' کے نام سے بہ طور نمونہ بعض اجزا شائع کیے ۔ رات دن کی محنتِ شاقہ کے بعد ۱۸۹۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

۳۰۔ احمد دہلوی، سیّد: فرہنگِ آصفیہ (جلد اوّل، مقدمہ طبعِ اوّل)، لاہور: رفاہ عام پریس، (طبعِ اوّل ۔ ۱۹۰۸ء)، ص ۹۔

۳۱۔ حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)، ص ۱۹۵۔

۳۲۔ شمس اللہ قادری، سیّد: رسالہ 'تاج اردو' (قدیم نمبر)، بہ حوالہ مرزا خلیل احمد بیگ: اردو زبان کی تاریخ، ص ۶۵۔

۳۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے:

وراوَ چی کی گرامر ' پراکرت پرکاش' (Prakrta Prakasa) جسے ۱۸۶۸ء میں بہ مقام لندن، مسٹر ایڈرڈ بائلز کاویل

(Edward Byles Cowell) نے شائع کروایا۔

۳۴۔ شمس اللہ قادری، سیّد: اردوئے قدیم، کراچی: جنرل پبلشنگ ہاؤس، (۱۹۶۳ء)، ص ۱۹۔

۳۵۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر: داستانِ زبانِ اردو، کراچی: اردو اکیڈمی (سندھ)، (۱۹۶۰ء)، ص ۳۷۔

۳۶۔ بارنیکوف: بلیٹن سکول آف اورینٹل سٹڈیز، ص ۳۷۷، بہ حوالہ ڈاکٹر شوکت سبزواری: داستانِ زبانِ اردو، ص ۴۷ تا ۴۸۔

۳۷۔ 'اردو بازار' کے حوالے سے 'آثار الصنادید' کے صفحہ نمبر ۲۸۹ پر سرسیّد احمد خان کا یہ قول درج ہے:

قلعے کے لاہوری دروازے کے آگے چالیس گز چوڑا اور ایک ہزار پانسو بیس گز لمبا بازار ہے۔ اگلی تاریخ کی کتابوں میں اِس بازار کو

'لاہوری بازار' لکھا ہے۔ اِس بازار کو ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) میں جہاں آرا بیگم بنتِ شاہ جہاں بادشاہ نے بنایا تھا۔

۳۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: لسانی مقالات (حصہ سوم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۱ء)، ص ۳۳۸۔

۳۹۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص ۳۵۲۔

۴۰۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص ۳۳۰۔

۴۱۔ حبیب اللہ خان غضنفر، پروفیسر: زبان و ادب، لاہور: بک ٹاک، (۲۰۰۳ء)، ص ۱۴۔

۴۲۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص ۳۳۰۔

۴۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: تاریخ زبانِ اردو، کراچی: مکتبہ دانش، (۱۹۷۱)، ص ۱۰۔

۴۴۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: ادب و لسانیات، کراچی: اردو اکیڈمی (سندھ)، (۱۹۷۰)، ص ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۰۷۔

۴۵۔ پنجاب میں اردو، ص ۴۲ ت ۴۳۔

۴۶۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص ۳۳۸۔

۴۷۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص ۳۴۰۔

۴۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: 'اردو اور مسلمان'، مشمولہ: صحیفہ، شمارہ ۶۰، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، جولائی (۱۹۷۲ء)، ص ۲۸۔

۴۹۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۱۱ء)، ص ۱۹۸۔

۵۰۔ لسانی مقالات (حصہ سوم) از ڈاکٹر سہیل بخاری کے صفحہ نمبر ۳۴۲ پر درج شیخ سعد اللہ گلشن کا اصل فارسی بیان یہ ہے:

زبان دکھنی را گذاشته ریخته را موافق اردوئے معلی شاه جہاں آباد موزوں بکنید۔

۵۱۔ تفصیل باب دُوُم کی فصل چہارم میں ملاحظہ کیجیے۔

۵۲۔ پنجاب میں اردو، ص ۱۱۔

۵۳۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص ۹۱۔

۵۴۔ داستانِ زبانِ اردو، ص ۵۵۔

۵۵۔ داستانِ زبانِ اردو، ص ۶۴۔

۵۶۔ پنجاب میں اردو، ص ۴۴۔

۵۷۔ عین الحق فرید کوٹی: اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، (۱۹۹۶ء)، ص ۸۰۔

۵۸۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص ۱۹۸۔

۵۹۔ احتشام حسین: اردو لسانیات کا مختصر خاکہ (مرتب۔ آغا سہیل)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۱۹۷۷ء)، ص ۵۸۔

۶۰۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو زبان کی ابتدا سے متعلق چند مشاہدات'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص ۳۵ تا ۳۶۔

۶۱۔ لسانی رشتے، ۲۷ تا ۳۷۔

۶۲۔ رام بابو سکسینہ: تاریخِ ادبِ اردو (مترجم۔مرزا محمد عسکری)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۱۹۲۷ء)، ص۲۔
۶۳۔ زبان و ادب، ص۱۹۔
۶۴۔ زبان و ادب، ص۴۴۔
۶۵۔ شرف الدین اصلاحی: اردو سندھی کے لسانی روابط، لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، (۱۹۷۶ء)، ص۳۸۔
۶۶۔ داستانِ زبانِ اردو، ص۳۹۔
۶۷۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص۸۴۔
۶۸۔ داستانِ زبانِ اردو، ص۴۴۔
۶۹۔ نذیر آزاد: کشمیری پر اردو کے اثرات (ایک لسانی تجزیہ)، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (۲۰۱۲ء)، ص۴۴۔
۷۰۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر: اردو زبان کا ارتقا، ڈھاکہ: پاک کتاب گھر، (۱۹۵۶ء)، حرفِ اوّل۔
۷۱۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: 'قومی زبان۔ چند حقائق، چند مسائل'، مشمولہ: صحیفہ، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، مارچ۔اپریل (۱۹۷۶ء)، ص۴۱۔
۷۲۔ وارث سرہندی: زبان و بیان، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۹ء)، ص۹۶۔
۷۳۔ اردو زبان کی تاریخ، ص۷۴ تا ۷۵۔
۷۴۔ اجمل مہار ابنِ اکبر: حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق (لسانی نظریات۔تقابلی مطالعہ)، اسلام آباد: ادارۂ فروغِ قومی زبان، (۲۰۱۲ء)، ص۱۴۷۔
۷۵۔ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ص۱۰۹۔
۷۶۔ نصیر حسین خان خیال، نواب: داستانِ اردو، حیدرآباد (دکن): ادارہ اشاعتِ اردو، (۱۹۱۶ء)، ص۴۹۔
۷۷۔ نصیر الدین ہاشمی: دکن میں اردو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۲۰۱۱ء)۔ص۳۷۔
۷۸۔ لسانی رشتے، ص۷۹ تا ۸۰۔
۷۹۔ دکن میں اردو، ص۴۱۔
۸۰۔ لسانی رشتے، ص۸۰۔
۸۱۔ دکن میں اردو، ص۳۶۔
۸۲۔ دکن میں اردو، ص۳۲ تا ۳۳۔
۸۳۔ دکن میں اردو، ص۳۳۔
۸۴۔ دکن میں اردو، ۳۵ تا ۳۶۔
۸۵۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص۴۹۔
۸۶۔ دکن میں اردو، ص۳۶۔
۸۷۔ دکن میں اردو، ص۳۶ تا ۳۷۔
۸۸۔ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ص۱۱۰۔
۸۹۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص۴۸۔
۹۰۔ آمنہ خاتون، ڈاکٹر: دکنی کی ابتدا، بنگلور: ہم درد پریس، (۱۹۷۰ء)، ص۳۴۔
۹۱۔ اردو کا روپ، ص۷۱۔
۹۲۔ دکنی کی ابتدا، ص۱۵ تا ۱۶۔

۹۳۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا: لسانی تناظر، نئی دہلی: باہری پبلی کیشنز، (۱۹۹۷ء)، ص ۱۵۳ تا ۱۵۷۔
۹۴۔ داستان زبانِ اردو، ص ۳۹۔
۹۵۔ 'اردو کی لسانی تشکیل' از ڈاکٹر خلیل احمد بیگ کے صفحہ ۳۹ تا ۴۰ پر درج تفصیلات کے مطابق:

امیر سبکتگین غزنی کے ترک بادشاہ امیر الپ تگین کا بیٹا تھا۔ وہ الپ تگین کی وفات (۹۷۷ء) کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا تھا۔ اس نے بیس سال تک (۹۷۷ء۔۹۹۷ء) حکومت کی۔ ان دنوں ہندوستان میں دہلی سے لے کر کابل کے نزدیک تک راجا جے پال کی حکومت تھی جس کا دارالخلافہ لاہور تھا۔ امیر سبکتگین نے راجا جے پال کی فوجوں کو شکست دے کر پشاور اور پنجاب کے دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ ۹۹۷ء میں جب امیر سبکتگین کا انتقال ہوا تو نہ صرف زمانہ حال کا پورا افغانستان بلکہ تقریباً پورا پنجاب بھی اس کے زیرِ نگیں تھا۔

۹۶۔ پنجاب میں اردو، عرضِ حال۔
۹۷۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کی تصنیف ' حافظ محمود شیرانی: اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل) ' کے صفحہ نمبر ۲۷۳ پر درج حوالہ نمبر ۸۴ کے مطابق 'تذکرہ اعجازِ سخن' پر سنہِ اشاعت درج نہیں۔
۹۸۔ شیر علی خان سرخوش: تذکرہ اعجازِ سخن (دیباچہ)، ص ا۔ب، بہ حوالہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی: حافظ محمود شیرانی: اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)، ص ۱۹۴۔
۹۹۔ شیر علی خان سرخوش: تذکرہ اعجازِ سخن (دیباچہ)، ص ز، بہ حوالہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی: حافظ محمود شیرانی: اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)، ص ۱۹۴۔
۱۰۰۔ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ص ۹۷۔
۱۰۱۔ پنجاب میں اردو، ص ۱۱۔
۱۰۲۔ پنجاب میں اردو، ص ۱۲۔
۱۰۳۔ پنجاب میں اردو، ص ۱۲، ۱۷۔
۱۰۴۔ پنجاب میں اردو، ۱۳، ۱۴، ۱۰۱۔
۱۰۵۔ پنجاب میں اردو، ص ۴۴۔
۱۰۶۔ پنجاب میں اردو، ص ۹۷۔
۱۰۷۔ پنجاب میں اردو، ص ۱۳۔
۱۰۸۔ زور، سیّد محی الدین قادری: 'اردو کی ابتدا' مشمولہ: اردو لسانیات، مرتبہ فضل الحق، دہلی: دہلی یونی ورسٹی، (۱۹۸۱ء)، ص ۴۱۔
۱۰۹۔ زور، سیّد محی الدین قادری: ہندوستانی لسانیات، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۰۹ء)، ص ۹۷ تا ۹۸۔
10. Zor, Mohi-Ud-Din Qadri: *Hidustani Phonetics*, Paris: Saint Geoorge, (1930), p.21.
۱۱۱۔ ' اردو زبان کی تاریخ' از ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ میں شامل اپنے ایک مضمون ' اردو کی ابتدا' میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور صفحہ نمبر ۲۱ پر لکھتے ہیں:

گجرات کی ورنا کولر ریسرچ سوسائٹی (Vernacular Research Society) نے ۱۹۴۰ء میں ان (ڈاکٹر سُنیتی کمار چیٹر جی) کو ہندی، ہندوستانی کی نشو ونما پر تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا تھا اور یہ تقریر اس سوسائٹی کی طرف سے ۱۹۴۲ء میں 'ہند آریائی اور ہندی'

(Indo-Aryan and Hindi) کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی تھی۔

۱۱۲۔ سُنیتی کمار چیٹر جی: ہند آریائی اور ہندی(مترجم۔عتیق احمد صدیقی)،نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۱۹۷۷ء)، ص۱۶۰۔

۱۱۳۔ ہندآریائی اور ہندی،ص۱۶۲۔

۱۱۴۔ مسعودحسین خان،ڈاکٹر:'اردو کی ابتدا سے متعلق چندمشاہدات'،مشمولہ:اردوزبان کی تاریخ(مرتبہ)،ص۳۲۔

۱۱۵۔ کیفی، پنڈت برجموہن دتاتریہ: کیفیہ، بہ حوالہ ڈاکٹرعطش درّانی: اردو (جدید تقاضے، نئی جہتیں) ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۶ء)،ص۵۲۔

۱۱۶۔ کیفی، پنڈت برجموہن دتاتریہ: کیفیہ ، بہ حوالہ ڈاکٹرعطش درّانی:اردو(جدیدتقاضے،نئی جہتیں)،ص۵۲۔

۱۱۷۔ کیفی، پنڈت برجموہن دتاتریہ: کیفیہ ،کراچی:انجمنِ ترقیِ اردو،(۱۹۵۰ء)،ص۲۸ تا۲۹۔

۱۱۸۔ داستان زبانِ اردو،ص۳۸۔

۱۱۹۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اپنی تصنیف ' لسانی مقالات(حصہ سوم)' کے صفحہ نمبر۳۳۴ پر پنجابی مسلمانوں کے ساتھ پنجاب سے دہلی جانے والی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> میرے نزدیک وہ پنجابی تھی اور یہ بالکل فطری بات ہے جس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔جب شیرانی اس کواردو بتاتے ہیں تو انھیں جانے والوں کی فہرست پیش کر کے نام بہ نام یہ ثابت کرنا تھا کہ ان کی مادری زبان اردو تھی۔۔۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسعودسعد سلمان نے ہندی میں بھی شاعری کی تھی اور ایک دیوانِ ہندی مرتب کیا تھا۔۔۔چوں کہ اُس زمانے کے مسلمان ہندوستان کی ہرزبان کو ہندی(ہندوستان کی) کہتے تھے اس لیے شیرانی اس دیوانِ ہندی کو دیوانِ اردوفرض کر بیٹھے۔حال آنکہ اسی اصول کی رو سے اسے دیوانِ پنجابی بھی کہا جاسکتا ہے اور میرے نزدیک یہی حقیقت بھی تھی۔

۱۲۰۔ داستان زبانِ اردو،ص۴۴۔

۱۲۱۔ پنجاب میں اردو،ص۱۲۔

۱۲۲۔ داستان زبانِ اردو،ص۴۵ تا۴۶۔

۱۲۳۔ پنجاب میں اردو،ص۱۰۱۔

۱۲۴۔ مسعودحسین خان،ڈاکٹر:'اردوزبان کی ابتدااورارتقا کا مسئلہ'،مشمولہ:اردوزبان کی تاریخ(مرتبہ)،ص۸۶۔

۱۲۵۔ پنجاب میں اردو،ص۱۲تا۱۳۔

۱۲۶۔ پنجاب میں اردو،ص۴۴،۱۰۱۔

۱۲۷۔ لسانی رشتے،ص۷۶۔

۱۲۸۔ داستان زبانِ اردو،ص۹۴۔

۱۲۹۔ زبان وادب،ص۶۵۔

۱۳۰۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو،ص۲۰۲۔

۱۳۱۔ مسعودحسین خان،ڈاکٹر:'اردو کی ابتدا سے متعلق چندمشاہدات'،مشمولہ:اردوزبان کی تاریخ(مرتبہ)،ص۳۵۔

۱۳۲۔ پنجاب میں اردو،ص۹۷۔

۱۳۳۔ سہیل بخاری،ڈاکٹر:اردوکاروپ،لاہور:آزادبک ڈپو،(۱۹۷۱ء)،ص۱۷۔

۱۳۴۔ پنجاب میں اردو،ص

۱۳۵۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو کی ابتدا سے متعلق چند مشاہدات'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص۳۶۔

۱۳۶۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص۳۳۵۔

۱۳۷۔ داستانِ زبانِ اردو، ص۴۷۔

۱۳۸۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص۸۷۔

۱۳۹۔ داستانِ زبانِ اردو، ص۵۲۔

۱۴۰۔ اختر اورینوی: بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، پٹنہ، (۱۹۵۷ء)، ص۵۸۔

۱۴۱۔ انصار اللہ، محمد: تاریخِ ارتقا زبان و ادب (پہلا حصہ۔ابراہیم لودھی کے عہد تک)، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (۲۰۰۶ء)، ص۱۰۔

۱۴۲۔ لسانی رشتے، ص۹۷۔

۱۴۳۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص۹۳۔

۱۴۴۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: 'اردو کے آغاز کے نظریے'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص۴۶ تا ۴۷۔

۱۴۵۔ ابوظفر ندوی، مولانا سیّد: مختصر تاریخ ہند، اعظم گڑھ: مطبع معارف اعظم، (۱۹۴۸ء)، ص۳۲ تا ۴۰۔

۱۴۶۔ داستانِ اردو، ص۳۷۔

۱۴۷۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کی مرتبہ کتاب ' اردو زبان کی تاریخ' میں شامل ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مضمون ' اردو کی ابتدا' کے صفحہ ۱۹ پر درج ہے کہ ' نقوشِ سلیمانی' مولانا سیّد سلیمان ندوی کے مختلف مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے۔ اِن میں سے بعض بہت قدیم یعنی ۱۹۱۵ء کے لکھے ہوئے ہیں۔

۱۴۸۔ حافظ محمود شیرانی: اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)، ص۱۹۰۔

۱۴۹۔ سلیمان ندوی، سیّد: نقوشِ سلیمانی، کراچی: مکتبہ الشرق، (۱۹۵۱ء)، ص۳۱۔

۱۵۰۔ نقوشِ سلیمانی، ص۳۴ تا ۳۵۔

۱۵۱۔ نقوشِ سلیمانی، ص۲۶۱۔

۱۵۲۔ حسام الدین راشدی، پیر: 'اردو زبان کا اصلی مؤلد سندھ'، مشمولہ: رسالہ اردو، جلد ۳۰، نمبر ۴، کراچی : انجمنِ ترقیِ اردو، اپریل (۱۹۵۱)، ص۱۶۔

۱۵۳۔ حسام الدین راشدی، پیر: 'اردو زبان کا اصلی مؤلد سندھ'، مشمولہ: رسالہ اردو، ص۱۱۔

۱۵۴۔ عبدالحق، مولوی: خطباتِ عبدالحق (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی)، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۶۴ء)، ص۱۵۵۔

۱۵۵۔ خطباتِ عبدالحق (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی)، ص۶۰۱ تا ۶۰۴۔

۱۵۶۔ شاہدہ بیگم، ڈاکٹر: سندھ میں اردو، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، (۱۹۸۰ء)، ص۶۷۔

۱۵۷۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص۸۴ تا ۸۵۔

۱۵۸۔ ہندوستانی لسانیات، ص۹۵۔

۱۵۹۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص۳۸ تا ۳۹۔

۱۶۰۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص۳۳۳۔

۱۶۱۔ اردو سندھی کے لسانی روابط، ص۴۰۔

162. Zor, Mohiuddin Qadri: *Hindustani Phonetics*, p.17.

۱۶۳۔ مہر عبدالحق، ڈاکٹر: ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق، بہاول پور: اردو اکادمی، (۱۹۶۷ء)، ص ۸۶۔
۱۶۴۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۴۵۔
۱۶۵۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۴۸۔
۱۶۶۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، ص ۴۵۔
۱۶۷۔ لسانی رشتے، ص ۹۷۔
۱۶۸۔ خورشید حمرا صدیقی، ڈاکٹر: اردو زبان کا آغاز (مختلف نظریات اور حقائق)، جموں و کشمیر: شیخ پبلی کیشنز، (۱۹۹۳ء)، ص ۱۰۔
۱۶۹۔ اردو سندھی کے لسانی روابط، ص ۴۰ تا ۴۱۔
۱۷۰۔ کیفیہ، ص ۲۹۔
۱۷۱۔ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ص ۱۱۷ تا ۱۱۹۔
۱۷۲۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص ۳۲۸۔
۱۷۳۔ ہندآریائی اور ہندی، (۱۹۷۷ء)، ص ۹۵۔
۱۷۴۔ 'ملتانی زبان اور اِس کا اردو سے تعلق' کے صفحہ نمبر ۱۲۹ پر ڈاکٹر مہر عبدالحق لکھتے ہیں:

برِ صغیر پاک و ہند کی دوسری زبانوں کی طرح ملتانی زبان کے بھی بہت سے مختلف علاقائی نام تھے، مثلاً ملتانی، بہاول پوری، اُچوی، جگدالی، جٹکی، ڈیروالی اور سرائیکی۔ اِس کے علاوہ پوٹھوہاری، ہندکو اور ہزاروی بھی ملتانی زبان کے قریب تر لہجے ہیں۔ مختلف وجوہات کی بنا پر اسے کئی نام دیے گئے ہیں اگر چہ یہ اپنے علاقے میں ایک ہی طرح بولی اور سمجھی جاتی رہی۔ تحریر میں اِس کا نام ملتانی ہی آیا۔

۱۷۵۔ حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق (لسانی نظریات۔ تقابلی مطالعہ)، ص ۱۔
۱۷۶۔ حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق (لسانی نظریات۔ تقابلی مطالعہ)، ص ۹۱۔
۱۷۷۔ حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق (لسانی نظریات۔ تقابلی مطالعہ)، ص ۹۴ تا ۹۵۔
۱۷۸۔ حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق (لسانی نظریات۔ تقابلی مطالعہ)، ص ۹۷ تا ۹۸۔
۱۷۹۔ پنجاب میں اردو، ص ۱۳۔
۱۸۰۔ ملتانی زبان اور اِس کا اردو سے تعلق، ص ۱۲۶۔
۱۸۱۔ ملتانی زبان اور اِس کا اردو سے تعلق، ص ۲۸۶ تا ۴۸۸۔
۱۸۲۔ ملتانی زبان اور اِس کا اردو سے تعلق، ص ۶۱۔
۱۸۳۔ مہر عبدالحق، ڈاکٹر: سرائیکی زبان اور اِس کی ہم سایہ علاقائی زبانیں، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، (۱۹۷۷ء)، ص ۲۸۔
۱۸۴۔ حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق (لسانی نظریات۔ تقابلی مطالعہ)، ص ۱۶۴۔
۱۸۵۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے 'داستانِ زبانِ اردو' کے صفحہ ۲۴ تا ۱۲۶ اردو کے بنیادی لسانی سرمائے کی فہرست درج کی ہے۔
۱۸۶۔ 'الفاظِ مانعہ' مخصوص معنی رکھتے ہیں۔ جیسے گاڑی، بچہ، پتنگ، محبت وغیرہ۔ الفاظِ مانعہ تجارتی سامان کی طرح ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ الفاظ کسی بھی زبان کا بنیادی سرمایہ نہیں گردانے جاتے۔ زبان کے ماخذ کے سلسلے میں خاص طور سے ان الفاظ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔
۱۸۷۔ 'الفاظِ عامہ' کو الفاظِ مطلقہ بھی کہتے ہیں۔ یہ الفاظ کسی خاص مفہوم و معنی کے لیے وضع نہیں ہوئے۔ ہر موجود پر بہ طریق متبادل ان کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہ، وہ، کیا، کیوں، جب، تب، کب وغیرہ الفاظِ عامہ ہیں۔ سنسکرت میں انھیں سَرو (سب) کہتے ہیں اور عربی گرامر میں یہ 'مبہات' کہلاتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے 'اردو لسانیات' کے صفحہ ۸ پر الفاظِ عامہ کی ۶ اقسام درج کی

ہیں۔

188. Muller, Friedrich Max: *Lectures on the Science of Language,* London: Longmans, Green and Co, (1885), pp.86 & 90.

189. Tucker, Thomas George: *Introduction to the natural history of language,* London: Blackie & Son limited, (1908), p.102.

۱۹۰۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص۳۶۱۔

۱۹۱۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، ص۲۴۱۔

۱۹۲۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، ص۱۹۳۔

۱۹۳۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، ص۱۹۳۔

۱۹۴۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، ص۱۲۶۔

۱۹۵۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، ص۲۶۲۔

۱۹۶۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: 'اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص۱۰۰۔

۱۹۷۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، ص۱۹۳۔

۱۹۸۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، ص۲۴۱۔

199. Masood Hussain Khan , Dr: *Urdu, Current Trends in Linguistics,* (1970), pp.79-80.

۲۰۰۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، پیش لفظ۔

۲۰۱۔ حافظ محمود شیرانی: اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)، ص۲۵۶۔

۲۰۲۔ زور، ڈاکٹر محی الدین قادری: 'اردو کی ابتدا'، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ)، ص۲۷۔

۲۰۳۔ 'نقوش'، جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۷، ۹۷، بہ حوالہ 'حافظ محمود شیرانی: اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)' از ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ص۲۵۷۔

۲۰۴۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی اردو پر ہریانی کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ اپنی تصنیف، 'ہندوستانی لسانیات' (۱۹۳۲ء) کے صفحہ نمبر ۹۸ پر لکھتے ہیں:

> یہاں ایک اور بات مدِّنظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگڑو یا ہریانی زبان کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف اس علاقے میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستے میں واقع ہے۔۔۔۔۔ فاتح اور مفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آ رہی تھی اس مین ہریانی عنصر بھی شامل ہو گیا۔

۲۰۵۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، ص۱۸۹۔

۲۰۶۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۷۰ء)، ص۲۳۶۔

۲۰۷۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۸۷ء)، پیش لفظ۔

۲۰۸۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر: اردو زبان : تاریخ، تشکیل، تقدیر (خطبہ پروفیسر ایمریٹس) ، (۱۹۸۸ء)، ص ۱۱، بہ حوالہ ، 'اردو کی لسانی تشکیل' از ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ص۷۵۔

۲۰۹۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (۱۹۸۷ء)، ص۲۴۶ تا ۲۴۷۔

۲۱۰۔ لسانی رشتے،ص۸۴۔

۲۱۱۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: تاریخِ ادبِ اردو (جلد اوّل)، دہلی، (۱۹۹۸ء) ،ص ۹۴، بہ حوالہ، ڈاکٹر فیروز احمد : راجستھانی اور اردو ،علی گڑھ:ایجوکیشنل بُک ہاؤس،(۲۰۱۰ء)،ص۲۳۔

۲۱۲۔ مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو(۱۹۸۷ء)،ص۷۶۔

۲۱۳۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ،ص۵۵تا۵۶۔

۲۱۴۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ،ص۵۶تا۵۷۔

۲۱۵۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ،ص۵۵تا۵۷۔

۲۱۶۔ حافظ محمود شیرانی:اور اُن کی علمی وادبی خدمات(جلد اوّل)،ص۲۴۲تا۲۴۳۔

217. Grierson, G.A.: *Linguistic Survey Of India, vol.ix(Part.1)*, Delhi: Motilal Banarsidass, (1916), p.63.

۲۱۸۔ حافظ محمود شیرانی:اور اُن کی علمی وادبی خدمات(جلد اوّل)،ص۲۴۳۔

۲۱۹۔ اردو زبان کا ارتقا،ص۸۷۔

۲۲۰۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ،ص۵۷۔

۲۲۱۔ داستانِ زبانِ اردو(پیش لفظ)،ص۴۔

۲۲۲۔ داستانِ زبانِ اردو،ص۱۰۰تا۱۰۱۔

۲۲۳۔ زور،سیّد محی الدین قادری:'اردو کی ابتدا'،مشمولہ:اردو لسانیات،ص۱۵۴۔

۲۲۴۔ داستانِ زبانِ اردو،ص۹۳۔

۲۲۵۔ داستانِ زبانِ اردو،ص۹۲۔

۲۲۶۔ داستانِ زبانِ اردو،ص۹۷۔

۲۲۷۔ اردو زبان کا ارتقا،ص۸۳۔

۲۲۸۔ داستانِ زبانِ اردو،ص۹۷۔

۲۲۹۔ داستانِ زبانِ اردو،ص۱۰۱تا۱۰۲۔

۲۳۰۔ داستانِ زبانِ اردو،ص۱۱۱۔

۲۳۱۔ 'اردو کی لسانی تشکیل' کے صفحہ نمبر ۵۵ پر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

مغربی اَپ بھرنش،شور سینی اَپ بھرنش ہی کا دوسرا نام ہے جس کا ارتقا پراکرتوں کے آخری دور میں ہوا۔اسی لیے اِسے تیسری پراکرت بھی کہتے ہیں۔۱۰۰۰ سنہ عیسوی میں جب اِس کا ارتقا رک گیا تو اِس کے بطن سے مشرقی پنجابی کے علاوہ دہلی اور اِس کے آس پاس کے علاقوں میں پانچ بولیاں پیدا ہوئیں۔کھڑی بولی اِن میں سے ایک ہے۔یہ پانچوں بولیاں (کھڑی بولی،ہریانی،برج بھاشا،بندیلی،قنوجی) 'مغربی ہندی' کہلاتی ہیں۔

۲۳۲۔ اردو زبان کا ارتقا،ص۸۴۔

۲۳۳۔ جین،ڈاکٹر گیان چند:'اردو کے آغاز کے نظریے'،مشمولہ:اردو زبان کی تاریخ(مرتبہ)،ص۵۰۔

۲۳۴۔ جین،ڈاکٹر گیان چند:'اردو کے آغاز کے نظریے'،مشمولہ:اردو زبان کی تاریخ(مرتبہ)،ص۵۳۔

۲۳۵۔ اَپ بھرنش بولیوں اور زبانوں کے تعدد کی بھول بھلیّوں کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین اپنے مقالے،'اردو کے آغاز کے

نظریے، مشمولہ: اردو زبان کی تاریخ (مرتبہ) کے صفحہ نمبر ۱۵ پر لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ اَپ بھرنشوں کے ناموں، قسموں اور علاقوں کے بارے میں قدیم قواعد نویسوں میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان کے بیچ حقیقت کیا ہے؟ یہ معلوم نہیں ہو پاتا۔ کوئی ۲۷ اَپ بھرنشیں قرار دیتا ہے تو کوئی تین۔ ان میں سے کئی نام محض نام ہیں۔ ان کا کوئی نمونہ نہیں۔ یہ تک طے نہیں کہ شورسینی اَپ بھرنش، پشچمی (مغربی) اَپ بھرنش اور ناگر اَپ بھرنش ایک ہی ہیں یا اِن میں کچھ فرق ہے۔ اِن کے علاقے کے بارے میں بھی اتفاق نہیں۔ شورسینی کا مرکز متھرا اور ناگر کا گجرات کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود دونوں کو یکساں کہہ دیا جاتا ہے۔ قدما کے بیانات میں جو اختلافات ملتے تھے کم از کم اتنے ہی ہندی کے موجودہ علمائے لسانیات کی تحریروں میں ہیں۔۔۔ اگر سنسکرت اور ہندی لسانیات کے عالم یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس علاقے میں کون سی اَپ بھرنش بولی جاتی تھی تو کوئی اردو والا اِس میدان میں کیوں کر لب کشائی کر سکتا ہے۔

۲۳۶۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر: اردو لسانیات، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۱۰ء)، ص ۱۱۔

۲۳۷۔ حافظ محمود شیرانی: اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)، ص ۲۶۱ تا ۲۶۲۔

۲۳۸۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۵۷۔

۲۳۹۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: 'اردو کے آغاز کے نظریے'، مشمولہ: ہندوستانی زبان (ممبئی)، شمارہ نمبر ۴،۳، (جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۷ء)، بہ حوالہ 'اردو زبان کی تاریخ' از ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ص ۴۵۔

۲۴۰۔ 'اردو کے آغاز کے نظریے'، مشمولہ: ہندوستانی زبان (ممبئی)، بہ حوالہ 'اردو زبان کی تاریخ' از ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ص ۵۱۔

۲۴۱۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تصنیف 'لسانی رشتے' کے صفحہ نمبر ۷۰ پر اردو کے بنیادی الفاظ کی فہرست درج کی ہے۔

۲۴۲۔ 'اردو کے آغاز کے نظریے'، مشمولہ: ہندوستانی زبان (ممبئی)، بہ حوالہ 'اردو زبان کی تاریخ' از ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ص ۵۱۔

۲۴۳۔ لسانی رشتے، ص ۸۴۔

۲۴۴۔ لسانی مطالعے، ص ۲۴۳۔

۲۴۵۔ لسانی رشتے، ص ۹۲۔

۲۴۶۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: ایک بھاشا (دولکھاوٹ۔ دوادب)، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (۲۰۰۷ء)، ص ۱۵۸۔

۲۴۷۔ جین، ڈاکٹر گیان چند: لسانی جائزے، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (۲۰۰۵ء)، ص ۲۴۰۔

۲۴۸۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۶۶ تا ۷۰۔

۲۴۹۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۶۸۔

۲۵۰۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۳۱ تا ۳۲۔

۲۵۱۔ رشید اختر ندوی: پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق وثقافت، (۱۹۹۵ء)، ص ۱۹۷۔

۲۵۲۔ مجیب، محمد: تاریخ تمدّنِ ہند، لاہور: پروگریسو بکس، (۱۹۸۶ء)، ص ۴۵۔

253. Dodwell. H.H.: *Cambridge History of India, Vol-5*, London, (1922), p.37.

۲۵۴۔ رشید اختر ندوی: ارضِ پاکستان کی تاریخ، اسلام آباد، (۱۹۸۶ء)، ص ۹۹۔

۲۵۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: 'اردو کا قدیم ترین ادب'، مشمولہ: نقوش، شمارہ ۱۰۲، مئی (۱۹۶۵ء)، ص ۸۳۔

۲۵۶۔ لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص ۳۴۳۔

۲۵۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: اردو کی کہانی، لاہور: مکتبہ عالیہ، (۱۹۷۵ء)، ص ۱۵۶۔

۲۵۸۔ لسانی رشتے، ص۸۹۔

۲۵۹۔ لسانی مطالعے، ص۱۱۱۔

۲۶۰۔ لسانی رشتے، ص۹۰۔

۲۶۱۔ اردو کا رُوپ، ص۵۳، ۷۷۔

۲۶۲۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: 'اردو کی زبان کا آغاز'، مشمولہ: نقوش، سال نامہ، (۱۹۶۲ء)۔

۲۶۳۔ لسانی مقالات، ص۳۴۹۔

۲۶۴۔ اردو کا رُوپ، ص۷۸۔

۲۶۵۔ ادب اور لسانیات، ص۲۰۳۔

۲۶۶۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: 'مسئلہ آغازِ زبانِ اردو'، مشمولہ: تنقیدی مقالات، جلد اوّل (مرتب ۔میرزا ادیب)، لاہور: لاہور اکیڈمی، (۱۹۶۰ء)۔

۲۶۷۔ لسانی مقالات، ص۳۵۰۔

۲۶۸۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا: 'اردو میں لسانی تحقیق'، مشمولہ: نقوش، شمارہ نمبر ۱۴۲، سال نامہ، (۹۴ء۔۱۹۹۳ء)۔

۲۶۹۔ نبی بخش بلوچ، بہ حوالہ اردو زبان کی قدیم تاریخ (تعارف)، ص۱۱۔

۲۷۰۔ ارضِ پاکستان کی تاریخ، ص۱۷۔

۲۷۱۔ انور رومان: 'براہوی کا ایک گیت'، مشمولہ: صحیفہ، لاہور، اپریل (۱۹۶۸ء)۔

۲۷۲۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص۵۸۔

۲۷۳۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص۹۶، ۱۷۰تا۱۷۱۔

۲۷۴۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص۱۲۵۔

۲۷۵۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص۹۳۔

۲۷۶۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص۲۳۲۔

۲۷۷۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص۹۱۔

۲۷۸۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص۹۳۔

۲۷۹۔ بہ حوالہ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ص۱۷۱۔

۲۸۰۔ خالد حسن قادری، ڈاکٹر: 'Rough Notes on Urdu'، مشمولہ: اخبارِ اردو، جلد۵، شمارہ۳، مارچ (۲۰۰۲ء)، ص۱۵۔

۲۸۱۔ 'Rough Notes on Urdu'، ص۱۷۔

۲۸۲۔ 'Rough Notes on Urdu'، ص۱۸۔

۲۸۳۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری طویل علالت کے بعد ۲۰۱۱ء میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ قدرت کی طرف سے انھیں اس ضمن میں مزید تحقیقات کا موقع نہ ملا۔

۲۸۴۔ پرویش شاہین، محمد: 'ڈاکٹر خالد حسن قادری کا نظریہ'، مشمولہ: اخبارِ اردو، جلد۲۰، شمارہ۲، فروری (۲۰۰۴ء)، ص۳۰ تا ۳۱۔

285. Linguistic Survey Of India, vol.ix(Part.1), pp.53-54.

۲۸۶۔ شبیر علی کاظمی، پروفیسر: 'اساسِ زبان'، مشمولہ: قومی زبان، جلد۳۰، شمارہ۵، مئی (۱۹۶۷ء)، ص۹۔

۲۸۷۔ ڈاکٹر: تاریخِ زبانِ اردو، ص۱۰۔

۲۸۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: 'اردو زبان کا پس منظر' مشمولہ: سیپ، شمارہ ۴، (۱۹۶۵ء)۔

۲۸۹۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۸۸۔

۲۹۰۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۶۷۔

291. Faridkoti, Ainul Haq: *Pre-Aryan Origins of the Pakistan Languages,* lahore: Orient Research Centre, (1992), p.37.

۲۹۲۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر: اردو میں لسانی تحقیق و تدوین (گزشتہ چند عشروں میں)، کراچی: اکادمی بازیافت، (۲۰۱۳ء)، ص ۱۲۱۔

۲۹۳۔ عبد الغفور ساہی: مقالہ، 'اردو میں لسانیات کے مباحث'، برائے پی۔ایچ۔ڈی اردو، مملوکہ: گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور، ص ۴۹۔

۲۹۴۔ داستانِ زبانِ اردو، ص ۲۲۔

۲۹۵۔ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ص ۱۲۹۔

۲۹۶۔ بہ حوالہ اردو زبان کی قدیم تاریخ، ص ۲۷۔

محاکمہ

اِس بحث سے قطع نظر کہ دنیائے علوم میں 'لسانیات' کا شعبہ نیا ہے یا پرانا، یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ آج لسانیات کو اِس کی افادیت کے پیشِ نظر ترقی یافتہ ممالک میں خاطر خواہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں علمِ لسانیات اپنے ارتقا کی اُس منزل پر پہنچ گیا تھا، جسے آج 'تجزیاتی لسانیات' (Descriptive Linguistic) کہا جاتا ہے۔ 'صوتیات' (Phonetics)، 'نحویات' (Syntax) اور 'صرفیات' (Morphology) کے نئے تصورات نے اِس علم کو انقلاب آفریں بنا دیا ہے، جس کی بہ دولت گزشتہ چند برسوں سے 'نحو' اور 'معانی' کے حوالے سے مطالعات کا سلسلہ جدید خطوط پر استوار کیا جا رہا ہے۔ نئے نقاطِ نظر کی موجودگی میں لسانی و ساختیاتی مسائل نئے انداز سے دیکھے اور پرکھے جا رہے ہیں۔ اِس شعبۂ علم کی مدد سے تاریخ، تہذیب، سماج اور معاشرت کے بہت سے مسائل حل کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

زبان کا آغاز، ارتقا اور ساختیاتی مطالعہ لسانیات کا بنیادی موضوع ہے، جس پر نظر رکھے بغیر ادب اور سماج کا مطالعہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا 'تقابلی لسانیات' (Comparative Linguistics) جیسے طرزِ مطالعہ کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف انسانی نسلوں اور زبانوں کا باہمی اشتراک و اختلاف معلوم کیا جا رہا ہے۔ مغرب میں لسانیات کو ریاضی کے انداز پر ڈھالا جا رہا ہے۔ 'لسانی زمانیات' Glotto Chromology نسبتاً نیا شعبہ ہے جس کی مدد سے قوموں اور زبانوں کی عمر کے ساتھ ساتھ اِن کی ابتدا کے حوالے سے معلومات فراہم کی جا رہی ہیں۔ زبانوں کے ایک مقام سے کسی دوسرے مقام تک کے سفر کی ارتقائی داستان اور اِس دوران دیگر زبانوں اور تہذیبوں سے اختلاط کے نتیجے میں زبان کی اثر اندازی اور اثر پذیری کے معاملات کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ ایک زبان کی عبارت کو کسی دوسری زبان میں لکھنے کی غرض سے لسانیات نے ایسے نشانات وضع کر دیے ہیں جن کی مدد سے کسی عبارت کو دوسری زبان میں آسانی سے لکھا جا سکتا ہے۔ کئی مغربی ممالک میں لسانیات کو کمپیوٹر کی حیثیت دے کر ترجمہ کرنے والی ایک ایسی مشین بنانے میں کامیابی حاصل کی جا چکی ہے جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اگر چہ یہ کاوش ابھی مکمل طور پر کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوئی، اِس کے باوجود بہت کچھ پیش رفت ضرور ہوئی ہے۔

درج بالا تمام سماجی امور کی بنیاد میں بلا شبہ زبان کارفرما ہے۔ زبان کے بغیر ثقافت، سماج اور تہذیب کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زبان کی طرح تہذیب بھی خالص نہیں ہوتی۔ زبانیں اور تہذیبیں جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں۔ ایک دوسرے سے متاثر ہونے کے باوجود زبانوں کی اپنی انفرادی ساخت بھی کچھ نہ کچھ برقرار رہتی ہے۔ لسانیاتی تحلیل و تجزیے میں زبان کی اسی انفرادی ساخت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ساخت سے مراد دراصل وہ ڈھانچہ ہوتا ہے جو اضداد کے ایسے منظم مجموعوں پر مشتمل ہو جنھیں زبان میں دریافت کیا جا سکے۔ مذکورہ منظم مجموعوں کا تعلق صوتی اکائیوں سے ہو سکتا ہے، گرامر کے تصرفات اور مشتقات سے اور بعض حالتوں میں زبان کی مختلف صورتوں اور ہیئتوں کے معانی سے بھی۔

علمِ لسانیات کے تحت دراصل زبان کی تخلیق و تشکیل، اِس کے تدریجی ارتقا، اِس کی ساخت، الفاظ کی بناوٹ اور اِس کی اشتقاقی نوعیت، اجزائے کلام اور اِن کی ابتدا، تغیرات اور اُن کے اسباب وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ متعلقہ حقائق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں دقیق مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ عمومی قواعد و ضوابط اور کلیے وضع کیے جاتے ہیں، باقاعدہ گروہ بندی اور ترتیب و تبویب کی جاتی ہے اور پھر نئے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں اِن کی تصحیح بھی ہوتی رہتی ہے۔ زبان سے متعلق تمام حقائق کو بہ طریقِ احسن سمجھنے اور اِس ضمن میں سائنسی روّیہ اختیار کرنے کے لیے بعض اوقات دیگر متعلقہ علوم، مثلاً نفسیات وغیرہ کے اصول و قواعد سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ اسی سبب لسانیات کو زبان کی سائنس یا سائنسی مطالعہ قرار دیا گیا ہے۔ زبان کے حوالے سے لسانیات کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اِس نے زبان کی ماہیت کے شعور کو عام کیا ہے، اور زبان کو اُس کے افسانوی تصور سے نکال کر سائنس کی معروضی روشنی میں پیش کیا ہے۔ گویا لسانیات کا انسان، انسانی زندگی اور زبان و ادب سے گہرا تعلق ہے۔

ترقی یافتہ ممالک لسانیات کی اہمیت و ضرورت کے پیشِ نظر اِس کے فروغ و ترویج کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کر رہے ہیں، مگر اِن کے مقابلے میں وطنِ عزیز کی حیثیت اِس حد تک غیر تسلی بخش ہے کہ لسانیات کی روز افزوں ترقی سے استفادہ تو درکنار، اہلِ اردو اِس کی اہمیت اور افادیت ہی کا ٹھیک سے اندازہ نہیں کر پا رہے۔ جدید لسانیاتی طرز پر چند ایک کاوشوں کو چھوڑ کر اِس شعبۂ علم سے متعلق عام رویّہ اب بھی پہلے جیسی بے اعتنائی برت رہا ہے۔

اردو میں لسانی تحقیق ابھی تک پہلے تاریخی مرحلے پر ہے، اور بہت کم تقابلی اور جدید لسانیاتی مسائل کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے۔ جدید لسانیاتی مباحث پر جو مواد انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور دیگر ترقی یافتہ مغربی زبانوں میں دست یاب ہے، اس کے مقابلے میں اردو میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ قریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ اردو میں لسانیات کے مطالعے کی ابتدا ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب 'ہندوستانی لسانیات' سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اردو لسانیات پر خاموشی چھائی رہی۔ البتہ قیامِ پاکستان کے بعد پاک و ہند میں لسانیات کے موضوع پر چند کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور اس حوالے سے کچھ مضامین بھی رسائل و جرائد میں دکھائی دیے گئے۔ تاہم اردو لسانیات پر جو چند قابلِ قدر تصانیف و تالیفات موجود ہیں، انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اردو کے ماہرینِ لسانیات اور سکالرز اِس ضمن میں بساط بھر تحقیق و تالیف کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں، اور یہ انھی ماہرین کی سعیِ پیہم کا نتیجہ ہے کہ اردو لسانیات کا تحقیقی کام کم از کم جمود کا شکار نہیں ہوا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔

وطنِ عزیز کی دانش گاہوں میں لسانیات کی تدریس ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔ اردو لسانیات نام کا کوئی مضمون باقاعدگی سے کسی پبلک یونی ورسٹی میں نہیں پڑھایا جا رہا۔ مختلف یونی ورسٹیوں میں ایم اے اردو کے نصاب میں لسانیات کا پرچہ شامل ضرور ہے مگر ایک رسمی سی کارروائی کے طور پر۔ اردو لسانیات کو اردو کے آغاز کے نظریوں اور سرگزشتِ الفاظ جیسے موضوعات تک ہی محدود کر دیا گیا ہے، حال آں کہ اِس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ جب تک تجزیاتی لسانیات نہ پڑھائی جائے، زبان کی ساخت کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اردو کے لسانی پہلوؤں پر تحقیق بنیادی طور پر دو بڑے مسائل سے دوچار ہے۔ اوّل تو یہ کہ جامعات میں اردو لسانیات کا الگ سے کوئی شعبہ مقرر نہیں کیا گیا۔ لسانیات کو ضمنی طور پر فقط ایک پرچے کی صورت میں ادب کی ذیل ہی میں پڑھایا جاتا ہے۔ تنقید اور ادب کے مقابلے میں اِسے جامعات میں زیادہ پذیرائی بھی حاصل نہیں۔ دُوم یہ کہ اردو لسانیات کے اکثر ماہرین قدیم 'علمِ زبان' (Philology) اور جدید طرزِ مطالعہ 'لسانیات' (Linguistics) کے درمیان بنیادی فرق کو آج تک ٹھیک سے محسوس نہیں کر پائے۔ انھیں عموماً ایک ہی نوع کا علم گردانتے ہوئے 'لسانیات' ہی کی اصطلاح کے تحت برتا جاتا ہے۔ اردو کی لسانی ترقی و ترویج کے لیے 'علمِ زبان' اور 'لسانیات' کے بنیادی فرق کو سمجھنا اردو دانوں کے لیے ناگزیر ہے۔

دورِ جدید میں زبانوں کا مطالعہ سائنسی خطوط پر کیا جاتا ہے۔ اِس میں زبان کی ساخت کی توضیح شامل ہے۔ لسانیات کی رو سے زبان ایک ایسے خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اظہارِ خیال کے لیے استعمال کرتا ہے۔ زبان دراصل اصوات کے مجموعے اور ترتیب کو کہتے ہیں۔ لسانیات میں انسان کے اعضائے تکلم سے ادا کی جانے والی آوازیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اشاروں کی زبان اور تحریر لسانیات میں اہمیت نہیں رکھتیں۔ زبان کی بنیاد چوں کہ مختلف آوازیں ہیں، اور تجزیاتی لسانیات کا اہم ترین شعبہ 'صوتیات' (Phonetics) ہے، اسی لیے صوتیات کے مطالعے کے بغیر لسانیات کا علم محض خام اور ناقص ہے۔ زبان میں تلفظ کی جانے والی آوازیں عام صوتیات کا موضوع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لسانیات میں زیادہ تر آوازوں کے مطالعے کو مقدم حیثیت حاصل ہے۔ زبان کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ معروضیت اور قطعیت سے کرنے کے لیے جدید لسانیات میں حتی الامکان زبان کا شخصی اور معنوی عنصر نظر انداز کر کے اِس کی ہیئت ہی کو موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے، یعنی اصوات، صرف اور نحو کو معنوی اور نفسیاتی قدروں سے الگ کر کے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اردو میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے 'اردو کا صوتی نظام' اور ڈاکٹر محبوب عالم نے 'اردو کا صوتیاتی نظام' جیسی کتابیں پیش کیں ہیں، لیکن یہ مطالعے بھی زیادہ سے زیادہ دوسرے درجے تک کی کوشش قرار پاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بھی جدید لسانی مطالعے کے پیشِ نظر کچھ مقالے تصنیف کیے جو اپنی جگہ منفرد اور قابلِ قدر ہیں، مثلاً 'لسانی مطالعے میں شماریاتی امدادی طریقوں کا استعمال'، 'صوتی تغیرات' اور 'اردو کا صوتی تکلم' وغیرہ۔ یہ مقالات اردو میں اپنے موضوع کے تعارف اور جائزے میں اوّلین کوشش ہیں۔

مغرب میں زبان کے مطالعے کی یہ سائنسی روش بلاشبہ پہلے ہی سے اختیار کی جا چکی ہے۔ وہاں زبان کا تجزیاتی مطالعہ صوتیات (Phonetics)، مارفیمیات (Morphology) اور فونیمیات (Phonemics) کے تحت کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اردو میں لسانی مطالعہ اب بھی روایتی انداز سے جاری ہے۔ صوت کا جدید تصور کیا ہے؟ لفظ کسے کہتے ہیں؟ معنی سے کیا مراد ہے؟ اِن سب جدید خطوط پر ابھی اردو دانوں نے ٹھیک سے سوچنا شروع نہیں کیا۔ ایسے بہت سے لسانی مسائل و معاملات ہیں جو ہنوز تحقیق و مطالعہ کے منتظر ہیں۔ مثال کے طور پر بعض اوقات ایک سے زائد الفاظ لکھ کر ہم ایک ہی لفظ یا فعل کیوں مراد لے لیتے ہیں؟ یعنی چلتے چلتے، آہستہ آہستہ، فرفر، اڑتے چلے جا رہے ہو، وغیرہ۔ ایسے مرکبات وضاحت طلب ہیں۔

لسانیات اگرچہ نئی اصطلاح ہے، مگر زبان سے متعلق بحثیں ہرگز نئی نہیں۔ درحقیقت زبان کے مطالعے میں جدید لسانی و سائنسی روش سے بہت مدت پہلے زبانوں کی اندرونی ساخت، تالیف و ترتیب کے قاعدوں یا گرامر و صوتیات کے مبہم تصور کی پرچھائیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے زبان کی ساخت اور قواعد سے متعلق یہ پرچھائیاں زیادہ تر مذہبی محرکات کی رہینِ منت تھیں۔ لسانی مطالعے کی مشرقی روایت کے سرسری جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندوستانی

لسانیات اور عربی لسانیات کی بنیاد مذہبی محرکات پر تھی۔ ہندوستانی لسانیات کی قدیم ترین روایت قبل مسیح سے ملتی ہے۔ اگر چہ یہ روایت مکمل صورت میں دست یاب نہیں ہو سکی البتہ معلوم مواد کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لسانی مطالعے کے ابتدائی مرحلے میں تدوینِ لغت اور ترتیبِ فرہنگ کی طرف پہلے توجہ دی گئی۔ اس دور کی مؤلفہ قواعد ولغت کا مقصد ایک طرف تو ویدک زبان، جسے برہمن 'دیوبانی' مانتے تھے، کی صحت ومعیار کو یقینی بنانا تھا۔ دوسری طرف وید کے مطالعے اور تفہیم میں سہولت پیدا کرنا تھا۔ ویدوں کے متن کی غلط خواندگی گناہ تصور کی جاتی تھی۔ اسی لیے پانِنی، یاسک، کاتیاین، پتن جلی اور دیگر متعدد مؤلفین نے ویدک سنسکرت کی صحت وسند کے پیشِ نظر قواعدی کتب مرتب کیں، جو مختلف قسم کے مادّوں، مشتقات، سابقوں، لاحقوں، صحتِ تلفظ اور اسی نوع کے متعدد لسانی مباحث پر مشتمل ہیں۔ اِن سب کے مجموعی اور غائر مطالعے سے سنسکرت صوتیات کا ایسا نقشہ تیار ہو جاتا ہے جس سے سنسکرت فونیمیات کو سمجھنے میں اچھی مدد مل سکتی ہے۔

مذکورہ قواعد نویسوں سے ایک طویل مدت بعد ہندوستانی لسانیات میں قابلِ ذکر کام سراج الدین علی خان آرزو کا ہے، جنھوں نے اپنی تصانیف و تالیفات میں کچھ لسانی مباحث اُٹھائے ہیں۔ خانِ آرزو کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طور پر ہند آریائی اور ایرانی زبانوں کے باہمی رشتے کا سراغ لگایا، مگر لسانی باریکیوں سے لاعلمی کی وجہ سے ہندوستانی صاحبانِ علم اِس دقیق لسانی مسئلے پر غور نہ کر سکے، بلکہ اِسے یک سر نظر انداز کر دیا گیا، حال آں کہ زبانوں کے لسانی اشتراک کا یہی وہ تصور ہے جس پر بعد ازاں تقابلی لسانیات کی بنیاد قائم ہوئی۔

ہندوستانی لسانیات کی طرح عربی لسانیات کی روایت کا بنیادی محرک بھی مذہب ہی تھا۔ چناں چہ ابتدائی عربی قواعد قرانِ حکیم کی آیات کے صحیح تلفظ اور دیگر صرف ونحوی مسائل کے پیشِ نظر تالیف کی گئی۔ عربی قواعد دانوں کی اُس دور کی قابلِ قدر لسانی تحقیقات کو آج کے اِس جدید دور میں بھی اعتبار اور سند حاصل ہے۔ مثال کے طور پر سیبویہ نے عربی کی تکلمی آوازوں کا تجزیہ کر کے اِن کے مخارج اور کیفیتِ ادا کی بنیادوں پر جو تقسیم اور درجہ بندی کی ہے، جدید مغربی ماہرینِ صوتیات اس سے کم وبیش متفق ہیں۔

لسانیات کی مشرقی روایت کے برعکس مغربی روایت میں لسانی مطالعے کا محرک مذہب سے زیادہ کلاسیکی ادب تھا۔ بلاشبہ دنیائے مغرب میں قواعد اور لسانیات کی ابتدائی روایتوں کی داغ بیل قدیم یونانیوں نے ڈالی۔ یونانی فلسفی ارسطو نے پہلی بار لسانی ساخت کے باقاعدہ تجزیے کی کوشش کی۔ اِس ضمن میں لسانی تجزیے کا جو طریقِ کار اور جو لسانی اصطلاحات ارسطو اور اُس کے مقلدین نے وضع کیں، انھیں آج بھی سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح یونانی لسانیات کا سکندریائی دور ہدایتی قواعد، معنیاتی تشریح اور یونانی حروف کے تلفظ کے دھندلے سے تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس دور میں قواعد کو منطق سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاتا تھا اور قواعدی مباحث میں 'صرف' اور 'تشکیلیات' کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اٹھارھویں صدی کے مغربی علما میں لائبنیز (Leibniz)، روسو (Rousseau) اور ہرڈر (Herder) نمایاں ہیں۔

اُس زمانے تک لسانیات کی جولاں گاہ مدرسانہ، معیاری اور ہدایتی قواعد، آغازِ زبان کے الٰہیاتی نقطہ ہوئے نظر کی بحث وتمحیص، کلمے اور معنی کی فطری اور مفاہمانہ رشتوں کے متنازعہ تصورات، زبان اور لسانی گروہ کی ذہنی ونفسیاتی ہم آہنگی کے خیال، سطحی لغوی تقابل اور قیاسی اشتقاقیات پر مشتمل رہی۔ اگر چہ سولھویں اور سترھویں صدی میں سنسکرت اور اس کی قواعد کے حوالے سے معلومات فراہم ہو چکیں تھیں مگر زبانوں کے تقابلی مطالعے کا خیال پیدا نہیں ہوا تھا۔

یورپ کو سنسکرت سے روشناس کرانے کا سہرا در حقیقت برطانوی مستشرق ولیم جونز (William Jones) کے سر بندھتا ہے۔ اِس نے ۱۷۸۶ء میں اپنے مشہور خطبے میں سنسکرت اور فارسی کی ہم نسبی سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ اسی سبب اس کے خطبے کو جدید تقابلی اور تاریخی لسانیات کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ البتہ ہند یورپی زبانوں کے باقاعدہ عملی تقابل کی ابتدا فرانز بوپ (Franz Bopp) سے ہوتی ہے۔ بوپ کے بعد لسانیات کے اماموں میں جیکب گرم (Jacob Grimm)، شلیخر (Shliecher) اور میکس مُلر (Max Muller) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اُس دور تک لسانیات کے شعبے میں جرمن ماہرین کو فوقیت حاصل تھی۔ وھٹنے (Whitney) پہلا بڑا امریکی ماہرِ لسانیات ہے۔ جرمن دبستانِ لسانیات کے قائم کردہ اصولوں پر بیسویں صدی کے علمِ لسانیات کی بنیادیں قائم ہیں۔ بیسویں صدی کے چوٹی کے ماہرین میں آٹو یسپرسن (Otto Jespersen)، ساپر (Sapir) اور بلوم فیلڈ (Bloomfield) کے نام درخشاں نظر آتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام پر ہی پہلی بار زبانوں کے مطالعے اور تقسیم کے حوالے سے ماہرین کے ہاں سائنسی رویہ دیکھنے میں آیا۔ چناں چہ ماہرین نے زبانوں کے متعدد گروہوں کا بڑا منظّم، تفصیلی اور تقابلی جائزہ لینا شروع کیا تاکہ مختلف زبانوں میں مشترک لسانی ونسلی مماثلتوں کی بنا پر ان کی درجہ بندی کی جا سکے۔ اِس غرض سے تقسیم کے دو بڑے زمرے بنائے گئے: اوّل زبانوں کی صوری یا نوعی تقسیم، دُوم زبانوں کی نسلی تقسیم۔ اِس میں شک نہیں کہ زبانوں کے سائنسی مطالعے کے لیے ان کی نسلی تقسیم افادیت سے خالی نہیں اور اس ضمن میں ماہرین نے تقابلی مطالعے کو بروئے کار لاتے ہوئے زبانوں کو مختلف خاندانوں اور ذیلی گروہوں میں

منقسم کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی مگر اِس کے باوجود یہ علوم کرنا کہ کون سی زبانیں نسلی اعتبار سے مماثل ہیں اور کون سے نہیں، بہت مشکل ہے۔ لہٰذا زبانوں کی یہ تقسیم فقط ایک کوشش ہی قرار دی جا سکتی ہے مگر تقسیم کے اس عمل کو قطعی اور جامع ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

زبانوں کے تقابلی مطالعے میں سنسکرت کو لسانی اعتبار سے اتنی اہمیت دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پراکرتیں پسِ پشت چلی گئیں۔ البتہ بعد میں آنے والے اکثر علما نے پراکرتوں پر قابلِ قدر تحقیقات کیں۔ جدید ہند آریائی زبانوں پر سب سے زیادہ قابلِ قدر تحقیق، سر جارج ابراہام گریرسن کی تالیف 'Linguistic Survey of India' ہے۔ گریرسن نے اپنی زندگی کے تیس سال اس کی تالیف پر صرف کیے اور چالیس جلدوں میں انھوں نے ہندوستان کی ایک سو اناسی (۱۷۹) زبانوں اور پانچ سو چوالیس (۵۴۴) بولیوں کا جائزہ لیا۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ کام بعض تسامحات کے باوجود نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے لسانیاتی مطالعے میں اپنی مثال آپ ہے۔

'Linguistic Survey of India' جیسی تصنیف اور دیگر مستشرق اور مقامی علما کی تحقیقات کی بہ دولت ہند آریائی زبانوں کے تقابلی مطالعے سے ہندوستان کی قدیم اقوام اور زبانوں کے اکثر مسائل حل کرنے میں مدد ملی ہے، البتہ برِصغیر میں داخل ہونے والے آریائی قبائل کی اصل زبان کا تعین تا حال نہیں ہو سکا۔ ماہرین کے نزدیک اِس کی بنیادی وجہ آریائی قوام کی مختلف گروہوں اور مختلف اوقات میں برِصغیر آمد ہے۔ یہ گروہ اپنے ساتھ متعدد و متفرق بولیاں لیے وارد ہوئے۔ اِس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ قدیم آریائی زبان برِصغیر میں واحد معیاری زبان کی حیثیت سے ہرگز داخل نہیں ہوئی۔ اِس امر کی شہادت رِگ وید کے سوتروں، اشلوکوں اور منتروں سے ملتی ہے جن کی زبان اکثر متفرق محسوس ہوتی ہے۔

ہند آریائی زبانوں کے ارتقائی جائزے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قدیم ہند آریائی زبان کا ڈھانچہ اگرچہ ایک تھا لیکن اِس کے رُوپ ایک سے زیادہ تھے۔ زبان کے یہ متنوع رُوپ متفرق بولیوں کی شکل میں ویدک زمانے میں بول چال کی سطح پر رائج تھے۔ ان مقامی بولیوں کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق انھوں نے ارتقا کے بے شمار مراحل طے کیے۔ انھی بولیوں کی ترکیب و تالیف سے ادب اور فلسفے کی شائستہ اور مہذب زبان 'سنسکرت' وجود میں آئی۔ اُس زمانے میں سنسکرت کو ممتاز بنانے کے لیے یہ مقامی بولیاں اوّلاً پراکرت کہلائیں اور اپنے اپنے مروّجہ علاقوں کے ناموں سے موسوم ہوئیں۔ بعد ازاں جب ان میں سے چند بولیاں ترقی کر کے ادبی پراکرتیں بنیں اور سنسکرت کے پہلو میں جا بیٹھیں تو بول چال کی سطح پر 'اَپ بھرنشوں' کا اظہار ہوا۔ پراکرت کے مقابلے میں اَپ بھرنشوں کے الفاظ پست اور گرے ہوئے تصور کیے جاتے تھے۔ بعد میں انھیں اَپ بھرنشوں سے جدید ہند آریائی بولیوں کا ارتقا عمل میں آیا۔ ان میں سے ایک بولی، 'کھڑی بولی'، اب عموماً اردو زبان کا ماخذ تسلیم کی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ اختلافی ہے مگر زیادہ تر ماہرین کھڑی بولی سے اردو کے ارتقا پر متفق ہیں۔

اردو کا ماخذ کون سی زبان ہے؟ اس کی ارتقائی کڑیاں کیا ہیں؟ اِس کا مولد و منشا ہندوستان کا کون سا علاقہ ہے؟ ان سوالات کی تلاش میں متعدد و متفرق نظریات سامنے آئے، جنھیں اِن کی تحقیقاتی نوعیت کے اعتبار سے تین زمروں؛ عمومی قیاسی نظریات، نیم سائنسی و مدلّل نظریات اور لسانیاتی تحقیق پر مبنی جدید نظریات میں تقسیم کر کے جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے قریباً تمام عمومی قیاسی نظریات کے تحت اردو کو برج بھاشا سے ماخوذ بتا کر اِس کا مولد دہلی اور شاہ جہاں آباد قرار دیا گیا ہے، اور بعض صورتوں میں اِسے مسلمانوں کی اپنے ساتھ برِصغیر لائی ہوئی زبان بھی کہا گیا ہے۔ عمومی قیاسی نظریات دراصل 'قیاسی بیانات' کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں ضبطِ تحریر میں لانے والے زیادہ تر اہلِ علم تذکرہ نویس تھے اور ان کا تعلق اردو ادب سے ضرور تھا مگر نہ تو وہ علم اللسان کے ماہر تھے اور نہ ہی لسانیاتی تحقیق کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ لہٰذا اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے ان کے مباحث کی حقیقت 'نظریات' سے کہیں زیادہ 'قیاسات' کی ہے۔

نیم سائنسی نظریات کے حامل ماہرین نے اردو زبان کو کسی نہ کسی مخصوص خطے سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے، اور اپنی بات کی سند میں ان مخصوص علاقوں میں مروّج معیاری زبان سے اردو کا لسانیاتی تقابل کر کے مدلّل مباحث قلم بند کیے ہیں، جس کی بنا پر 'پنجاب میں اردو'، 'سندھ میں اردو'، 'ملتان میں اردو' جیسے اور کئی نظریات منظرِ عام پر آئے۔ یہاں 'دکن میں اردو' کا ذکر اِس لیے نہیں کیا کیوں کہ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تالیف میں کہیں بھی دکن کو اردو کی جنم بھومی قرار نہیں دیا، بلکہ اُن کی یہ تالیف دکن میں اردو زبان و ادبیات کے ارتقائی ادوار کا تفصیلی احاطہ کرتی ہے۔

علاقوں سے متعلق اِن نظریات کی تہہ میں ایک ہی خیال کار فرما نظر آتا ہے کہ اردو زبان کی پیدائش برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد پراکرتوں میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اِن نظریات کے مجموعی جائزے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اِن کی بنیاد میں خالص لسانی تحقیق سے کہیں زیادہ سیاسی، مذہبی اور علاقائی تعصب کار فرما ہے۔ ہر کسی نے اردو کا رشتہ اپنے علاقے سے جوڑنے کی بھرپور کوشش کی ہے، البتہ اِس میں شک نہیں کہ اِس کوشش میں قابلِ

لحاظ مدلّل لسانی تحقیقات سامنے آئیں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

اِن نظریات کی تقلید میں بعدازاں اردو زبان کی ابتدا سے متعلق تحقیقات کا لامتناہی سلسلہ علاقہ درعلاقہ، شہردرشہر اور زبان درزبان چل نکلا اور اردو کی لسانی تحقیق پر مبنی ایسے بے شمار کتب، مقالات اور آرٹیکل سامنے آنے لگے جن میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کا تعلق کسی نہ کسی علاقے یا زبان سے جوڑ کر تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا۔ اسی میں ایسی تحقیقات بھی سامنے آئیں جو اردو سے کسی علاقائی زبان کے تقابلی جائزے کا نتیجہ ہیں، بلکہ اس نوع کے مطالعات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اردو کی آفرینش کے نظریات کے تیسرے زمرے کا تعلق اُن ماہرین سے ہے جنھوں نے اردو زبان کی انفرادی لسانی خصوصیات اور ساختیاتی ڈھانچے کو مدّنظر رکھتے ہوئے اِس کی ابتدا سے متعلق مدلّل مطالعہ پیش کیا ہے۔ اختلافِ رائے کی بنا پر یہ ماہرین مزید دو گرہوں میں منقسم ہیں۔ پہلا گروہ اردو کو آریائی الاصل زبان تصور کرتا ہے اور کبھی بالواسطہ تو کبھی براہِ راست اِسے 'کھڑی بولی' سے ماخوذ بتاتا ہے۔ اِن کے برعکس دوسرا گروہ اردو کو سرے ہی سے آریائی زبان نہیں مانتا۔ اُن کی دانست میں آریا اقوام کے برِصغیر ورود سے قبل یہاں پہلے مُنڈا اور بعدازاں دراوڑی تہذیبیں پوری شان وشوکت کے ساتھ موجود تھیں، جن کی زبانیں بھی اپنے اپنے دور میں ترقی یافتہ اور معیاری زبانیں تھیں، تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ باہر سے آنے والی قوم کی زبان ہندوستان کی کسی بھی جدید زبان کی ماخذ ہو؟ مزید یہ کہ اگر ہندوستان آنے والے مسلم فاتحین اور بعدازاں تجارت کی غرض سے آنے والی یورپی اقوام کی زبانیں یہاں کی زبان کو بنیادی سانچہ فراہم نہیں کرسکتیں تو پھر آریا ہی کیوں یہ کر پائے؟ اِن ماہرین کے خیال میں نہ صرف اردو بلکہ دیگر ہندوستانی زبانیں اور بولیاں بھی اصل میں ہندآریائی نہیں بلکہ دراوڑی النسل ہیں۔

اِس سلسلے میں اہم نقطہ یہ ہے کہ زبان کوئی ٹھوس شے نہیں کہ اِس کی پیدائش کسی خاص دور میں، خاص وقت پر ایک خاص نقطے سے ہوئی ہو۔ درحقیقت زبانوں کو معلوم صورت اختیار کرنے تک صدیوں کے ارتقائی سفر سے گزرنا پڑتا ہے اور ظاہر ہے صدیوں کی تاریخ اپنی اصلی حالت میں میسّر نہیں آسکتی کہ جس سے کسی زبان کی آفرینش کے اسرار منکشف ہوسکیں۔

اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کی تلاش کے حوالے سے نہ صرف مقامی اہلِ علم نے توجہ اور انہماک کا ثبوت دیا بلکہ اُن مستشرقین نے بھی اِس سلسلے میں خصوصی دل چسپی ظاہر کی جو تجارت کی آڑ میں ہندوستان پر تسلط اور حکم رانی کا خواب لے کر برِصغیر میں داخل ہوئے۔ یورپی اقوام اور بالخصوص انگریزوں کے ہندوستان سے متنوع سیاسی، تجارتی اور مذہبی مفادات وابستہ تھے۔ برِصغیر ورود کے بعد انگریزوں کو بہ حیثیت حکم ران مسلمانوں سے سابقہ پڑا۔ لہٰذا مسلمانوں کے مکمل استیصال کے لیے ضروری تھا کہ اُن کی مروّجہ سرکاری زبان، فارسی کی حیثیت کو نیست ونابود کردیا جائے۔ اِس مقصد میں کام یابی کے لیے دوراندیش برطانوی قیادت کی نظرِ خاص فارسی کے برخلاف اُس وقت ہندوستان کی ابھرتی ہوئی زبان، اردو کی طرف اُٹھی۔ وہ اردو زبان سیکھنے اور اسے فروغ دینے کے لیے سرگرم ہوگئے۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے اردو قواعد ولغات کی طرف رجوع کیا۔ اہلِ زبان کا دامن اِس تالیفی سرمایے سے خالی پا کر وہ خود اِس کام میں منہمک ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے پہل مستشرقین اردو قواعد ولغت کی تالیف وتدوین کی طرف متوجہ ہوئے۔

اردو قواعد اور اردو لغات کی تدوین کے حوالے سے ابتدائی دور کی بعض لغات نما ڈائریوں سے قطع نظر ان کی دیگر نگارشات گراں قدر ہیں۔ اِن میں جان شیکسپیئر، ڈنکن فاربس، فیلن، گل کرسٹ، ولیم ہنٹر اور پلیٹس کے لغات آج بھی اردو لغت نویسی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِن سب میں بھی فیلن اور پلیٹس کے لغات کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اردو قواعد کی ترتیب وتالیف کے حوالے سے مستشرقین کی مساعی کی ایک بنیادی خامی یہ تھی کہ انھوں نے اردو کے تالیفی سرمائے کی بنیاد زیادہ تر یا تو مروّجہ عربی ڈھانچے پر رکھی یا پھر اُس زبان پر جسے وہ یورپ سے بہ حیثیت مادری زبان اپنے ساتھ ہندوستان لائے تھے۔ اعلیٰ تحقیقی معیار اور عالمانہ قدرومنزلت کی حامل نہ ہونے کے باوجود مستشرقین کی یہ نگارشات اردو قواعد نویسی کو وہ سنگِ بنیاد فراہم کرتی ہیں جو اہم علمی وفکری نظریات کے ظہور اور ایک عظیم علمی روایت کا مؤجب بنا۔ اِن سے بڑا افائدہ یہ ہوا کہ مقامی لوگوں میں لغت وقواعد نویسی کی نہ صرف تحریک پیدا ہوئی بلکہ انھوں نے اِس علمی وتالیفی روایت کا باقاعدہ آغاز کیا۔

انیسویں صدی میں اہلِ یورپ کے ساتھ ساتھ برِصغیر کے اہلِ قلم نے بھی اردو قواعد نویسی کی طرف رجوع کیا۔ ۱۸۵۷ء سے بیسویں صدی کے آغاز تک تدریسی مقاصد کے لیے اردو قواعد کی اَن گنت کتب تالیف کی گئیں۔ اُس زمانے میں قواعد کے بنیادی مباحث ٹکسالی زبان اور فصاحت کی بحثوں کو محیط تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل پر پھیلے ہوئے طویل عرصے میں کتبِ قواعد کا ایک طویل سلسلہ اُن مختصر کتابچوں کی صورت میں ہے جو سکولوں میں اردو زبان کی باقاعدہ تعلیم رائج ہونے کے سبب طالب علموں کی تدریسی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ اِن قواعد کے مؤلفین نے ایک ہی انداز اور ایک ہی ڈھانچہ اختیار کیا، جو دراصل عربی کی تقلید میں فارسی قواعد کا تھا۔ اِن میں سے کسی نے بھی اردو زبان کے آریائی مزاج کو ملحوظ نہیں رکھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ

بیسویں صدی تک آتے آتے اردو قواعد نویسی کی عمارت دو بنیادوں پر استوار تھی؛ ایک یورپی اور دوسری عربی۔ اس دور میں جتنے بھی قواعد مرتب ہوئے وہ یورپی اور عربی قواعد نگاری کے تتبع میں مرتب ہوئے۔ بیسویں صدی میں اور اکیسویں صدی کے آغاز میں نسبتاً معیاری اور جدید طرزِ مطالعہ کی حامل قواعد تالیف کی گئیں، جن میں قواعدِ اردو (مولوی عبدالحق)، جامع القواعد: حصہ صرف (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)، اردو قواعد (ڈاکٹر شوکت سبزواری)، نئی اردو قواعد (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان)، اردو صرف و نحو (ڈاکٹر اقتدار حسین)، اردو صرف و نحو (انصار اللہ)۔ نظامیاتِ اردو (ڈاکٹر سہیل بخاری) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اِن سب میں بھی مولوی عبدالحق کی 'قواعدِ اردو' کی انفرادیت اس حوالے سے ہے کہ اس میں پہلی بار عربی کے تتبع کی عام روایت اور روش سے ہٹ کر قواعد نویسی کی طرف توجہ کی گئی، اور بعد کے قواعد نویسوں نے اِس سے بہت استفادہ کیا۔

جدید لسانیات میں قواعد کا شعبہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ لسانیاتی قواعد، روایتی قواعد سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لیے اردو قواعد پر تحقیق بہت کم کی گئی ہے۔ موجودہ اردو قواعد کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اِن پر عربی، فارسی اور بہت کچھ انگریزی قواعد کے اثرات اب بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس انداز میں زبان کے نظام کو جامعیت اور قطعیت کے ساتھ پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ اِن قواعد کی تالیف کی بنیاد دراصل پہلے سے موجود بنے بنائے سانچے پر ہوتی ہے اور جس زبان کے قواعد مرتب کیے جانے مقصود ہوں، اُس زبان کی انفرادی ساخت سے قطع نظر اُسے بنے بنائے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دراصل جدید لسانیاتی ضوابط کے مطابق اردو قواعد اُسی صورت تالیف کی جا سکتی ہے جب سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر زبانوں سے الگ اردو کو باقاعدہ ایک مکمل زبان کی حیثیت سے پرکھا جائے اور جاننے کی کوشش کی جائے کہ اردو کی انفرادی خصوصیات کیا ہیں؟ اس کے اپنے لسانی تقاضے کیا ہیں؟ اردو قواعد کے سلسلے میں خاص طور پر 'A Descriptive Theory of Grammar' اور 'Transformational Theory' کے پیشِ نظر اردو زبان کا صرفی و نحوی مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اصطلاحات کے بہ جائے حسبِ ضرورت نئی اصطلاحات وضع کی جائیں۔

اسی طرح اردو لغت نویسی کے اوّلین نقوش برِصغیر پاک و ہند میں ابتدائی زمانے کی لکھی جانے والی فارسی کتب اور فارسی لغات میں ہندوی/ہندی/اردو الفاظ اور محاورات کی شکل میں ملتے ہیں، جو بہ ہر حال بے قاعدہ ہیں اور انھیں اردو لغت نویسی کا باقاعدہ آغاز نہیں کہا جا سکتا۔ بعد ازاں اردو لغت نویسی کا دوسرا مرحلہ 'نصاب ناموں' کی صورت میں ہے، جن کا آغاز عہدِ جہاں گیری میں ہوا۔ پہلے پہل اِن منظوم لغات کی تدوین کا آغاز عربی زبان میں ہوا تھا اور اِس کی تقلید میں فارسی میں بھی اِس سے کام لیا گیا۔ اردو میں منظوم لغات نویسی کی ابتدا آج سے قریباً چار سو سال قبل ہوئی۔ اِن منظوم نصاب ناموں کا برِصغیر میں خاصا رواج رہا۔ اِن کی تصنیف کا سلسلہ بیسویں صدی کے اوائل تک جاری رہا۔

اہلِ زبان کی طرف سے اردو لغات کی تدوین و تالیف کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی سے قبل عہدِ عالم گیری سے ہوتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُس دور میں تالیف کیے گئے اردو لغات پر سابقہ دور کے منظوم نصاب ناموں کی گہری چھاپ ہے۔ اُس دور میں علما نے بڑے پیمانے پر لغات مرتب کیے جو قریباً تمام دولسانی یعنی اردو سے فارسی میں یا فارسی سے اردو میں ہیں۔ اس دور میں منظرِ عام پر آنے والے لغات میں قابلِ ذکر غرائب اللغات (میر عبدالواسع ہانسوی)، نوادرالالفاظ (سراج الدین علی خان آرزو)، نفائس اللغات (مولوی اوحدالدین بلگرامی) وغیرہ ہیں۔ سترھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک اِس طرز پر بے شمار لغات مرتب ہوئے۔ البتہ انھیں عموماً درجہ استناد نہیں ملا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کو اردو لغت نویسی کا جدید دور کہا جا سکتا ہے۔ اِس دور کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اردو لغت نویسی کو بہت ترقی ہوئی اور خاصی بڑی تعداد میں لغات تالیف ہوئے۔ اِن میں یک جلدی لغات بھی ہیں اور ایک سے زیادہ جلدوں پر مشتمل لغات بھی۔ اس دور کے اہم لغات میں فرہنگِ آصفیہ (سیّد احمد دہلوی)، نور اللغات (مولوی نورالحسن نیّر کاکوروی)، جامع اللغات (خواجہ عبدالمجید لاہوری)، اردو لغت: تاریخی اصول پر (بائیس جلدوں پر مشتمل اردو ڈکشنری بورڈ کے زیرِ نگرانی مرتب ہوا)، مہذب اللغات (چودہ جلدوں پر مشتمل از مہذب لکھنوی)، فرہنگِ عامرہ (محمد عبداللہ خان خویشگی)، علمی اردو لغت (وارث سرہندی) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی لغت نویسی کے غائر جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ تر لغات ایک دوسرے کے تتبع میں تالیف کیے گئے۔ بالخصوص فرہنگِ آصفیہ کی اشاعت کے بعد اس کے نمونے پر بعد کے مؤلفین نے اپنی تالیفات کی بنیاد رکھی۔ تقلید و تتبع کے اِس سلسلے کی بڑی خامی یہی ہے کہ لغت در لغت اغلاط بہ آسانی منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر اَن گنت اردو لغات منظرِ عام پر آئے، جنھیں بلا تردّد ایک دوسرے کا چربہ کہا جا سکتا ہے۔ تکرار، تعقید اور نقل در نقل سے

تالیفات کا ایسا انبار لگا دیا گیا ہے کہ اردو کے بین الاقوامی معیار کے حامل کسی ایک مستند لغت کا سراغ نہیں ملتا۔ اردو لغت بورڈ کا کام مفید ہے لیکن نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ اِس سلسلے مین وارث سرہندی کی تالیفی کاوش گراں قدر ضرور ہے لیکن وہ بھی اردو زبان کے کسی ایسے جامع و معیاری عمومی لغت کی تدوین کا مؤجب نہ بن سکی جو بول چال کے تقاضوں پر تحقیق کو ملحوظ رکھے۔ تدوینِ لغت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو زبان کے ایک ایسے معیاری لغت کی اشد ضرورت ہے جو بین الاقوامی معیار کا حامل ہو۔ خاص طور پر وہ پاکستانی اردو اور مروّجہ محاورہ اور روزمرّہ کا ترجمان ہو۔

لسانی ترقی تحقیق سے وابستہ ہوتی ہے۔ لسانی تحقیق اب چومسکی (C h o m s k y) کے نظریات سے بھی آگے ہالیڈے (Halliday) کے تصورات کی ترویج میں لگی ہوئی ہے۔ یہ اور بات کہ اردو میں تو ابھی ساختیاتی قواعد ہی سمجھ میں نہیں آرہے۔ اِس حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے علما نے تراجم کے ذریعے تنقیدی سطح پر ساختیات / پس ساختیات پر چند کتابیں پیش کی ہیں مگر جامعات میں اردو زبان پر تحقیق اور لسانیات، سماجی لسانیات اور لسانی ترقی جیسے موضوعات پر تحقیق کا ذکر بھی بہت کم ملتا ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کی اردو کی تدریس میں زبان اور اِس کے متعلقات (لسانیات، اصطلاحات سازی، ترجمہ کاری وغیرہ) کی تدریس ہر سطح کے نصاب میں شامل کی جائے۔

جامعات اور مقتدرہ جیسے ادارے درج ذیل منہاج پر اردو کی لسانی تحقیق کا فریضہ ادا کریں:

☆ محضری تجزیے (Discourse Analysis) ☆ آزاد لسانی پالیسی (Free Language Policies)

☆ سماجی لسانیات (Sociolinguistics) ☆ علمِ ترجمہ (Translatology)

☆ عوامی رائے اور رجحانات (Public Opinion and Trends) اور اِس کے علاوہ خاص طور پر اردو کے تدریسیاتی پہلو (Pedagogy) پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو زبان کی ترقی کے ضروری ہے کہ اردو کی ادبی اور لسانی حیثیت کو علاحدہ علاحدہ شعبوں کے تحت تسلیم کرتے ہوئے ان کی ترقی اور ترویج کے حوالے سے منصوبہ بندی کی جائے اور ضروری اقدامات کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ لسانی ترقی کے اداروں اور ادبی ترقی کے اداروں میں حدِّ فاصل کھینچنا، اردو کی بہ حیثیتِ مجموعی بین الاقوامی ترقی کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔

اکیسویں صدی عیسوی کو بجا طور پر 'اطلاعاتی ٹکنالوجی' (Information Technology) یا 'اطلاعیات' (Informatics) کی صدی کہا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر کے لائے ہوئے انقلاب نے قریباً ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا ہے۔ زبانوں پر بھی اِس نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ٹکنالوجی کے میدان میں اردو زبان نے اگرچہ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں قدم رکھا البتہ اِس کی ترقی اور پیش رفت کی باقاعدہ بنیاد بیسویں صدی کی آخر میں رکھی گئی۔ تاہم ۱۹۸۰ء کے عشرے میں جمیل احمد مرزا اور مطلوب الحسن سیّد کے تیار کردہ نوری نستعلیق کے پروگرام نے اردو طباعت اور اشاعت میں انقلاب برپا کر دیا ہے، اور اخبارات میں کتابت کمپیوٹر پر ہونے لگی ہے۔ مشینی کتابت درحقیقت تکنیکی میدان میں اردو کی بہت بڑی کامیابی ہے، جس نے اِسے تکنیکی دنیا میں بقا اور ثابت قدمی کی ضمانت فراہم کی ہے۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کو جدید ٹکنالوجی سے متعارف کرانے والے ماہرین کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ نہ صرف زبان اور لسانیات کے جدید مباحث سے آگاہ ہیں بلکہ مابعد چومسکی لسانیات (Post-Chomskyan Linguistic) کی مبادیات سے بھی واقف ہیں۔

علاوہ ازیں مقتدرہ قومی زبان نے بھی مائکروسوفٹ کے تعاون سے اردو زبان کو جدید لسانیاتی، سائنسی و تکنیکی دور سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کچھ اہم تکنیکی امور کو اردو میں متعارف کرانے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ اِس حوالے سے ایک اہم پیش رفت اردو انگریزی مشینی ترجے کی سہولت کی فراہمی کو ممکن بنانے کی کاوش ہے۔ دوسری کوشش 'Optical Character Recognition' ہے۔ جس کی مدد سے ہاتھ سے لکھی عبارت کو کمپیوٹر کی کمپوز کی ہوئی عبارت میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ تیسرا اہم کام اردو الفاظ و تراکیب کے استعمال کی اَن گنت مثالوں کو کمپیوٹر میں محفوظ کر کے اِسے عام استفادے کے لیے آن لائن کرنے کا منصوبہ ہے۔ گویا یہ اردو کا کارپس 'Corpus' ہے۔ اِس کارپس کو پہلے 'Urdu Data Bank' کا نام دیا گیا اور پھر اِس کا متبادل اردو نام 'اردو مثال گھر' رکھا گیا۔

اِن حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان سائنس اور ٹکنالوجی کے اِس انقلاب کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی ہے، کیوں کہ یہی روّیہ نہ صرف اکیسویں صدی بلکہ آنے والی صدیوں میں بھی اردو زبان کی بقا کا ضامن ہے۔

خاتمۂ کلام کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں لسانی اور لسانیاتی تحقیق کا جو کام تین چار صدیوں پہلے شروع ہوا، وہ انیسویں صدی میں کسی قدر

باقاعدگی کی طرف گامزن ہے۔ بیسویں صدی میں ترقی یافتہ ممالک کے لسانی علم سے استفادے کا رجحان عام ہونے لگا۔ متعدد محققین نے لسانیات کے بہت سے پہلوؤں پر تحقیق کا آغاز سائنسی انداز میں کیا۔ اب گزشتہ چند برسوں میں اردو کے محققینِ لسانیات نے لسانی تحقیق میں جدید ٹکنالوجی سے مدد لینا شروع کی ہے۔ یہ احساس بھی عام ہونے لگا ہے کہ جامعات کو لسانیات کے الگ شعبے قائم کرنا چاہئیں۔ اِس سلسلے میں کچھ پیش رفت دیکھنے میں بھی آئی ہے۔ توقع کی جانا چاہیے کہ مستقبل قریب میں ہمارے ہاں بھی لسانیات میں معیاری تحقیقی کام سائنسی بنیادوں پر کیا جانے لگے گا۔

کتابیات

(Bibliography)

اردو کتب:

آرزو، سراج الدین علی خان: نوادرالفاظ، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۵۱ء)۔

آزاد، جگن ناتھ: اردو، نئی دہلی: مکتبہ جامع، (۱۹۶۶ء)۔

آزاد، محمد حسین: آبِ حیات، لاہور: خزینہ علم وادب، (۲۰۰۱ء)۔

______: سخن دانِ فارس، لاہور: بک ٹاک، (۲۰۰۶ء)۔

آمنہ خاتون: ریاستِ میسور میں اردو، بنگلور: برقی کوثر پریس، (۱۹۶۰ء)۔

______: دکنی کی ابتدا، بنگلور: ہم درد پریس، (۱۹۷۰ء)۔

آئی آئی قاضی، ڈاکٹر: ادبی رابطے لسانی رشتے، حیدرآباد: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۷۶ء)۔

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، (۱۹۶۲ء)۔

__________: ادب اور لسانیات، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، (۱۹۷۱ء)۔

__________: تاریخ زبانِ اردو، کراچی: مکتبہ دانش، (۱۹۷۱ء)۔

__________: ہندوستانی گرامر از بنجمن شلزے، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۷۷ء)۔

__________: اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۱ء)۔

__________: جامع القواعد، لاہور: اردو سائنس بورڈ، (۲۰۰۴ء)۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری، ڈاکٹر: اردو اصطلاحات سازی (کتابیات)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۴ء)۔

______________: کتابیاتِ لغاتِ اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۶ء)۔

اُتم اہلووالیہ، ڈاکٹر: ہماچل میں اردو، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (۲۰۰۶ء)۔

اجمل مہار ابنِ اکبر: حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق (لسانی نظریات۔تقابلی جائزہ)، اسلام آباد: ادارہ فروغِ قومی زبان، (۲۰۱۲ء)۔

احتشام حسین، سیّد: ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، لکھنؤ: دانش محل، (۱۹۶۳ء)۔

________: داستانِ اردو، کراچی: الکتاب، (۱۹۶۵ء)۔

________: اردو لسانیات کا مختصر خاکہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۱۹۷۷ء)۔

________: اردو کی کہانی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۱۹۸۰ء)۔

________: اردو زبان کی ابتدا، لاہور: چودھری غلام رسول اینڈ سنز پبلی شرز، (۲۰۰۹ء)۔

احسن مارہروی: تاریخِ نثر اردو، علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی، (۱۹۳۰ء)۔

احمد خان، چودھری (علیگ):اردو سرکاری زبان، لاہور:انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۹۱ء)۔
احمد خان، سرسیّد: آثارالصنادید، جلداوّل (مرتبہ خلیق انجم)، دہلی: اردو اکادمی، (۱۹۹۲ء)۔
احمد دہلوی، سیّد: محاکمہ مرکز اردو، دہلی: شمس پریس، (۱۹۱۱ء)۔
احمد دین: سرگزشتِ الفاظ، اسلام آباد: پورب اکادمی، (۲۰۰۸ء)۔
ادیب، میرزا: تنقیدی مقالات (جلداوّل)، لاہور: لاہور اکیڈمی، (۱۹۶۰ء)۔
اشرف کمال، ڈاکٹر: لسانیات۔زبان اور رسم الخط، فیصل آباد: مثال پبلی شرز، (۲۰۰۹ء)۔
اعجاز راہی: روداد سیمینار۔قومی زبان کی ترقی میں صوبوں کا حصہ (مرتبہ)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۵ء)۔
افتخار حسین، آغا: یورپ میں تحقیقی مطالعے، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۶۷ء)۔
۔۔۔۔۔۔ : یورپ میں اردو، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، (۱۹۶۸ء)۔
اقتدار حسین خان، ڈاکٹر: لسانیات کے بنیادی اصول، علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی، (۱۹۸۵ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔: صوتیات وفونیمیات، نئی دہلی: ترقیِ اردو بیورو، (۱۹۹۴ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔: اردو صرف ونحو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۲۰۱۰ء)۔
اکمل ایوبی: اردو کے ترکی عناصر، علی گڑھ، (۱۹۸۴ء)۔
الماس خانم، ڈاکٹر: اردو میں لسانی اور لسانیاتی تحقیق (مختصر جائزہ)، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، (۲۰۱۵ء)۔
الٰہی بخش اختر اعوان، ڈاکٹر: کشاف اصطلاحاتِ لسانیات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۵ء)۔
امداد صابری: فرنگیوں کا جال، دہلی، (۱۹۴۹ء)۔
امن، دہلوی میر: باغ وبہار، لاہور: پاپولر پبلشنگ ہاؤس، (۱۹۹۱ء)۔
انشاءاللہ خان انشاء: دریائے لطافت (مترجم۔پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی)، نئی دہلی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۸۸ء)۔
انصاراللہ، محمد: اردو کے حروفِ تہجی، ادارۂ مخدوم، (۱۹۷۲ء)۔
۔۔۔۔۔ : تاریخِ ارتقاز بان وادب (پہلا حصہ: ابراہیم لودھی کے عہد تک)، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (۲۰۰۶ء)۔
۔۔۔۔۔ : اردو صرف ونحو، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (۲۰۱۴ء)۔
انصاراللہ نظر، ڈاکٹر: اردو پر تمل کے اثرات، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (۱۹۹۴ء)۔
انعام الحق جاوید، ڈاکٹر: بیرونی ممالک میں اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۶ء)۔
انعام الحق کوثر، ڈاکٹر: بلوچستان میں اردو، لاہور: ترقی اردو بورڈ، (۱۹۶۸ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔: بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تقابلی مطالعہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۵ء)۔
انوار حسین آرزو لکھنوی، سیّد: نظام اردو، لکھنؤ: اردو اکیڈمی، (۱۹۷۹ء)۔
انور سدید، ڈاکٹر: اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، (۱۹۹۸ء)۔
ایوب صابر، پروفیسر: پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۵ء)۔

اے۔ایچ کوثر:اردو کی ترقی میں سرسیّداوراُن کے رفقائے کار کا حصہ،کراچی:لائبریری پروموشن بیورو،(۱۹۸۴ء)۔
باقر محمد،آغا: تاریخ نظم ونثر اردو،لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب،(۱۹۴۵ء)۔
۔۔۔۔۔ :مقالاتِ محمد حسین آزاد،لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب،(۱۹۶۶ء)۔
۔۔۔۔۔ :اردوئے قدیم۔دکن اور پنجاب میں،لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب،(۱۹۷۲ء)۔
بشیر احمد خان:اردو۔پاکستان کی قومی زبان،کراچی:انجمنِ ترقیِ اردو،(۱۹۹۷ء)۔
پانڈے چندر بلی:مغل بادشاہوں کی ہندی،کاشی: ناگری پرچارنی سبھا،(۱۹۴۰ء)۔
پدم سنگھ شرما:اردو، ہندی اور ہندوستانی،الہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی،(۱۹۳۲ء)۔
پرکاش مونس،ڈاکٹر:اردوادب پر ہندی ادب کا اثر،نئی دہلی:انجمنِ ترقیِ اردو،(۱۹۷۸ء)۔
پری شان خٹک،پروفیسر:لسانی رابطہ،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،(۱۹۸۷ء)۔
تبسم کاشمیری،ڈاکٹر:اردوادب کی تاریخ(ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک)،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،(۲۰۰۳ء)۔
تقی،سیّد محمد:ہندوستان(پس منظر،پیش نظر)،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،(۲۰۰۲ء)۔
تمنا عمادی مجیبی پھلواردی:افعالِ مرکبہ،کراچی: مکتبہ اسلوب،(۱۹۶۱ء)۔
ثریا حسین:گارساں دتاسی۔اردوخدمات،علمی کارنامے،لکھنؤ:اترپردیش اردو اکیڈمی،(۱۹۸۴ء)۔
جابرعلی سیّد:لسانی وعروضی مقالات،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،(۱۹۸۹ء)۔
جالبی،ڈاکٹر جمیل:قدیم اردو کی لغت،لاہور:مرکزی اردو بورڈ،(۱۹۷۳ء)۔
جاوید احمد بھٹی:اردو ہندی(ایک تاریخی جائزہ)،لاہور:دارالکتاب،(۲۰۰۴ء)۔
جعفر،پروفیسر سیّدہ:ڈاکٹر زور(ہندوستانی ادب کے معمار)،نئی دہلی:ساہتیہ اکیڈمی،(۱۹۹۰ء)۔
جمیل احمد رضوی:ذخیرہ شیرانی میں اردو مخطوطات،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،(۱۹۸۶ء)۔
جمیل جالبی،ڈاکٹر:قومی زبان۔یک جہتی،نفاذ اور مسائل،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،(۱۹۸۹ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔:تاریخ ادبِ اردو،لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب،(۲۰۰۵ء)۔
جیلانی کامران:انگریزی زبان وادب کی تدریس میں قومی زبان کا کردار،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،(۱۹۸۵ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔:قومیت کی تشکیل اور اردو زبان،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،(۱۹۹۲ء)۔
جین،ڈاکٹر گیان چند:لسانی مطالعے،نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،(۱۹۷۳ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔ :عام لسانیات،نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغِ اردو،(۱۹۸۵ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔ :تحقیق کا فن،لکھنؤ:اترپردیش اکادمی،(۱۹۹۰ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔ :لسانی رشتے،لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،(۲۰۰۳ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔ :ایک بھاشا دولکھاوٹ دوادب،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،(۲۰۰۵ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔ :لسانی جائزے،لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،(۲۰۰۵ء)۔

حامد حسن قادری: داستانِ تاریخِ اردو، کراچی: اردو اکیڈمی، (۱۹۸۸ء)۔
حبیب اللہ غضنفر، پروفیسر: زبان و ادب، لاہور: بُک ٹاک، (۲۰۰۳)۔
حبیب کیفوی: کشمیر میں اردو، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، (۱۹۷۹ء)۔
حمید الدین شاہد، خواجہ: اردو میں سائنسی ادب، کراچی: ایوانِ اردو کتاب گھر، (۱۹۶۹ء)۔
حمید الدین قادری شرفی، سیّد: ہندآریائی اور اردو، حیدرآباد: الیاس ٹریڈرز، (۱۹۸۶ء)۔
حمید الفت ملغانی: پاکستانی زبانوں کا ادب، ملتان: بیکن بکس، (۲۰۰۷)۔
حمید اللہ ہاشمی: مختصر تاریخ زبان و ادب پنجابی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۹ء)۔
خاطر غزنوی: اردو زبان کا مآخذ ہندکو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۴ء)۔
خلیق انجم: پروفیسر مسعود حسین خان (ایک جامع حیثیات شخصیت)، نئی دہلی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۹۶ء)۔
خلیل احمد بیگ، مرزا: اردو زبان کا صوتیاتی اور تجزِ صوتیاتی مطالعہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، (۱۹۸۶ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔: لسانی تناظر، علی گڑھ، (۱۹۹۷ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔: ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی، علی گڑھ، (۲۰۰۷ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔: اردو زبان کی تاریخ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، (۲۰۰۷ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔: اردو کی لسانی تشکیل، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، (۲۰۰۸ء)۔
خلیل الرحمان داؤدی (مرتب)، میر بہادر علی حسینی (مؤلف): گل کرسٹ۔ قواعدِ زبانِ اردو، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۶۲ء)۔
خلیل صدیقی: زبان کا مطالعہ، مستونگ: قلات پبلی شرز، (۱۹۶۴ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔: زبان کا ارتقا، کوئٹہ: زمرّد پبلی شرز، (۱۹۷۷ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔: لسانی مباحث، زمرّد پبلی شرز، (۱۹۹۱ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔: آواز شناسی، ملتان: بیکن بُکس گلگشت، (۱۹۹۳ء)۔
حنیف خلیل: مختصر تاریخ زبان و ادب پشتو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۹ء)۔
خلیق انجم، ڈاکٹر (مرتب): مولوی عبدالحق (ادبی اور لسانی خدمات)، دہلی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۹۲ء)۔
خورشید حمرا صدیقی، ڈاکٹر: اردو زبان کا آغاز (مختلف نظریے اور حقائق)، جموں و کشمیر: ریڈر شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی، (۱۹۹۳ء)۔
ذکاء اللہ، منشی محمد: تاریخِ ہند (حصہ سوم)، دہلی: مطبع مرتضوی، (۱۸۷۹ء)۔
رام آسرا راز، ڈاکٹر: اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، (۱۹۷۵ء)۔
رام بابو سکسینہ: تاریخِ ادبِ اردو، لکھنؤ، (۱۹۵۲ء)۔
ربانی آگرو (مرتب): بھارت میں اردو، اسلام آباد: اکادمی ادبیاتِ پاکستان، (۱۹۸۷ء)۔
رشید اختر ندوی: ارضِ پاکستان کی تاریخ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۶ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔ : پاکستان کا قدیم رسم الخط اور زبان، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، (۱۹۹۵ء)۔

رشید حسن خان: زبان اور قواعد، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۱۹۷۹ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔: باغ و بہار (میر امن دہلوی)، لاہور: نقوش، (۱۹۹۲ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔: عبارت کیسے لکھیں، لاہور: اظہار سنز، (۲۰۰۷ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔: انشا اور تلفظ، لاہور: اظہار سنز، (۲۰۰۷ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔: اردو املا، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۲۰۰۷ء)۔
رضیہ نور محمد، ڈاکٹر: اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، (۱۹۸۵ء)۔
رفعیہ سلطانہ، ڈاکٹر: اردو نثر کا آغاز و ارتقا، کراچی: کریم سنز، (۱۹۷۸ء)۔
روبینہ ترین، ڈاکٹر: ملتان میں لسانی تشکیلات کا عمل اور دوسرے مضامین، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۴ء)۔
روح الامین، سیّد (مرتب): اردو تاریخ و مسائل، گجرات: عزت اکادمی، (۲۰۰۷ء)۔
رؤف پاریکھ، ڈاکٹر: اردو لغت نویسی (تاریخ، مسائل اور مباحث)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۱۰ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔ : اردو میں لسانی تحقیق و تدوین، کراچی: اکادمی بازیافت، (۲۰۱۳ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔ : لغوی مباحث، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۲۰۱۵ء)۔
ریاض الدین عطش، خواجہ: اردو کا شجرۂ نسب، اسلام آباد، (۱۹۹۸ء)۔
ریاض صدیقی: اردو زبان و ادب کے مسائل، کراچی: نفیس اکیڈمی، (۱۹۸۹ء)۔
زکریا، ڈاکٹر خواجہ محمد: اکبرالہٰ آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۲۰۰۳ء)۔
زور، محی الدین قادری ڈاکٹر: اردو شہ پارے، حیدرآباد، (۱۹۲۹ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ : ہندوستانی صوتیات، لاہور، (۱۹۳۰ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ : گارسیں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہانِ اردو، حیدرآباد دکن، (۱۹۶۱ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ : اردو کے اسالیبِ بیان، لاہور: مکتبہ معین الادب، (۱۹۶۲ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ : دکنی ادب کی تاریخ، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، (۱۹۸۵ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ : ہندوستانی لسانیات، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۰۹ء)۔
سدھیشور رراؤ ورما: آریائی زبانیں، حیدرآباد (دکن): اعظم اسٹیم پریس، (۱۹۴۲ء)۔
سرفراز ظفر، پروفیسر محمد: قواعدِ پنجابی زبان، لاہور، (۱۹۸۹ء)۔
سعید، ایڈورڈ ڈبلیو: شرق شناسی (مترجم: محمد عباس)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۵ء)۔
سلطان احمد، مرزا: زبان، لاہور: مرغوب ایجنسی، (۱۹۲۳ء)۔
سلطان محمود حسین، سیّد ڈاکٹر: یورپ میں اردو کے مراکز، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۸۴ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ : خطباتِ گارسیں دتاسی، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۸۷ء)۔
سلیم احمد، شیخ: گھر جو تقسیم ہو گیا، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (۲۰۰۷ء)۔

سلیم اختر، ڈاکٹر: اردو زبان کیا ہے؟ لاہور: سنگِ میل پبلی شرز، (۱۹۹۹ء)۔
۔۔۔۔۔۔ : اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلی شرز، (۲۰۰۸ء)۔
سلیم الدین قریشی: اٹھارویں صدی کی اردو مطبوعات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۳ء)۔
سلیم فارانی، پروفیسر: اردو زبان اور اس کی تعلیم، لاہور: پاکستان بک سٹور، (۱۹۵۳ء)۔
سلیمان اطہر، ڈاکٹر محمد: ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۱۲ء)۔
سلیمان ندوی، سیّد: نقوشِ سلیمانی، کراچی: مکتبہ الشرق، (۱۹۵۱ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔: عرب ہند کے تعلقات، کراچی: اردو اکیڈمی، (۱۹۸۷ء)۔
سمیع اللہ، ڈاکٹر: انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے، بھارت: سلطان پور، (۱۹۸۸ء)۔
سُنیتی کمار چیٹر جی: ہند آریائی اور ہندی، دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۱۹۷۷ء)۔
سونیا چرنیکوا: اردو افعال، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، (۱۹۸۹ء)۔
سہیل بخاری، ڈاکٹر: اردو کا رُوپ، لاہور: آزاد بک ڈپو، (۱۹۷۱ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔: اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، (۱۹۷۱ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔: اردو کی کہانی، لاہور: مکتبہ عالیہ، (۱۹۷۵ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔: لسانی مقالات (حصہ سوم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۱ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔: اردو کی زبان، کراچی: فضلی سنز، (۱۹۹۷ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔: نظامیاتِ اردو، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (۱۹۹۹ء)۔
سہیل عباس بلوچ، ڈاکٹر: بنیادی اردو قواعد، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۱۰ء)۔
شان الحق حقی: لسانی مسائل و لطائف، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۶ء)۔
شانتی رجن بھٹا چاریہ: بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات، کلکتہ، (۱۹۷۶ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔ : اردو ادب اور بنگالی کلچر، کلکتہ، (۱۹۸۲ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔ : بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ (ایک لسانی مطالعہ)، لکھنؤ: نصرت پبلی شرز، (۱۹۸۸ء)۔
۔۔۔۔۔۔۔۔ : مغربی بنگال میں اردو زبان اور اس کے مسائل، نئی دہلی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۸۹ء)۔
شاہ محمد مری، ڈاکٹر: مختصر تاریخ زبان و ادب بلوچی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۹ء)۔
شاہ عالم گورکھپوری، مولانا: اردو زبان و ادب، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (۲۰۱۲ء)۔
شاہدہ بیگم، ڈاکٹر: سندھ میں اردو، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، (۱۹۸۰ء)۔
شبیر علی کاظمی: پراچین اردو، کراچی: مکتبہ اسلوب، (۱۹۸۲ء)۔
شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر: تعارف تاریخِ اردو، لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو، (۱۹۶۳ء)۔
شرف الدین اصلاحی: اردو سندھی کے لسانی روابط، لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، (۱۹۷۶ء)۔

شمس الرحمٰن فاروقی: لفظ و معنی، الہٰ آباد: شبِ خون کتاب گھر، (۱۹۶۸ء)۔

ـــــــــــــ: اردو کا ابتدائی زمانہ، کراچی: آج کی کتابیں، (۱۹۹۱ء)۔

شمس اللہ قادری، حکیم: اردوئے قدیم، کراچی: جنرل پبلشنگ ہاؤس، (۱۹۶۳ء)۔

شمیم رجز، سیّد: حروف کی آوازیں اور اِن کے اثرات، کراچی: ادارہ تصنیف و تالیف، (۱۹۸۶ء)۔

شمیم طارق، ڈاکٹر: پاکستانی اردو لغات (جامع) کا تقابلی جائزہ، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۲۰۱۲ء)۔

شوکت سبزواری، ڈاکٹر: اردو زبان کا ارتقا، ڈھاکہ: پاک کتاب گھر، (۱۹۵۶ء)۔

ـــــــــــــ: داستانِ زبانِ اردو، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۶۰ء)۔

ـــــــــــــ: لسانی مسائل، کراچی: مکتبہ اسلوب، (۱۹۶۲ء)۔

ـــــــــــــ: اردو لسانیات، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۱۰ء)۔

ـــــــــــــ: قواعدِ اردو، کراچی: مکتبہ اسلوب، (۱۹۸۲ء)۔

شہاب الدین ثاقب: بابائے اردو مولوی عبدالحق (حیات و خدمات)، پاکستان: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۸۵ء)۔

شہناز ملک، ڈاکٹر: پنجابی لسانیات، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، (۱۹۷۷ء)۔

شیر علی خان سرخوش: اعجازِ سخن (بابِ زبانِ اردو)، حصہ اوّل، دہلی: فروغِ ادبِ اردو،

شیما مجید (مرتب و مدون): لسانی مذکرات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۶ء)۔

صدیق خان شبلی: اردو کی تشکیل میں فارسی کا حصہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۴ء)۔

صفدر رشید: مغرب کے اردو لغت نگار، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۲۰۱۵ء)۔

طاہر فاروقی، پروفیسر: ہماری زبان (مباحث و مسائل)، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۹۶ء)۔

عترت اکبرآبادی، میر محمدی: کمالِ عترت، (اردو فارسی کا ایک قدیم لغت)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۹ء)۔

عبدالباری، سیّد: آزادی کے بعد اردو زبان و ادب، نئی دہلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو سٹڈیز، (۱۹۹۸ء)۔

عبدالجلیل بسمل: سلہٹ میں اردو، کراچی، (۱۹۸۱ء)۔

عبدالحق مولوی، ڈاکٹر: مرحوم دہلی کالج، دکن: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۳۲ء)۔

ـــــــــــــ: اردو صرف و نحو، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۴۰ء)۔

ـــــــــــــ: اردو بہ حیثیت ذریعہ تعلیم سائنس، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۵۱ء)۔

ـــــــــــــ: قدیم اردو، کراچی، (۱۹۶۱ء)۔

ـــــــــــــ: خطباتِ عبدالحق (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی)، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۶۴ء)۔

ـــــــــــــ: اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیا کرام کا کام، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۷۷ء)۔

ـــــــــــــ: اردو لغات اور لغت نویسی، کراچی، (۱۹۸۹ء)۔

ـــــــــــــ: قواعدِ اردو، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۲۰۰۹ء)۔

عبدالستار دلوی، ڈاکٹر: ادبی اور لسانی تحقیق (اصول اور طریقِ کار)، ممبئی: ممبئی یونی ورسٹی، (۱۹۸۴ء)۔

ــــــــــــ : نئی تحریریں، دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، (۱۹۸۶ء)۔

ــــــــــــ : دکنی اردو، ممبئی: ممبئی یونی ورسٹی، (۱۹۸۷ء)۔

ــــــــــــ : دوزبانیں دو ادب (اردو اور ہندی کے تناظر میں)، ممبئی: ممبئی یونی ورسٹی، (۲۰۰۷ء)۔

عبدالسلام، ڈاکٹر: عمومی لسانیات، رائل بک کمپنی، (۱۹۹۳ء)۔

عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر: زبان و مسائلِ زبان، (۱۹۷۴ء)۔

ــــــــــــ : لسانی و تحقیقی جائزے، (۱۹۷۵ء)۔

عبدالغفور نساخ، مولوی: رسالہ تحقیقِ زبانِ ریختہ، لکھنؤ، (۱۸۹۰ء)۔

عبدالقادر سروری، پروفیسر: زبان اور علمِ زبان، حیدرآباد دکن، (۱۹۷۰ء)۔

عبداللہ، ڈاکٹر سیّد: مباحث، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۵۶ء)۔

ــــــــــــ : پاکستان میں اردو کا مسئلہ، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، (۱۹۷۶ء)۔

عبداللہ گیانی: گرو گرنتھ اور اردو، لاہور، (۱۹۶۶ء)۔

عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر میمن: لسانیاتِ پاکستان، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۲ء)۔

عبدالودود، ڈاکٹر: اردو سے ہندی تک، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، (۱۹۷۶ء)۔

عبدالوحید، خواجہ: جائزہ زبانِ اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۵ء)۔

عبیدہ بیگم، ڈاکٹر: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، لکھنؤ: نصرت پبلی شرز، (۱۹۸۳ء)۔

عتیق احمد صدیقی (مترجم): توضیحی لسانیات (مصنف۔ ایچ اے گلیسن)، دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۲۰۰۲ء)۔

عتیق صدیقی، محمد: گل کرسٹ اور اِس کا عہد، علی گڑھ، (۱۹۶۰ء)۔

عصمت جاوید، ڈاکٹر: لسانیاتی جائزے، (۱۹۵۵ء)۔

ــــــــــــ : نئی اردو قواعد، دہلی: ترقی اردو بیورو، (۱۹۸۵ء)۔

عطش درّانی، ڈاکٹر: مشرقی ممالک میں قومی زبان کے ادارے، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۵ء)۔

ــــــــــــ : اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۱۹۸۷ء)۔

ــــــــــــ : اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد: انجمنِ شرقیہ علمیہ، (۱۹۹۴ء)۔

ــــــــــــ : جدید رسمیاتِ تحقیق، لاہور: اردو سائنس بورڈ، (۲۰۰۵ء)۔

ــــــــــــ : اردو۔ جدید تقاضے نئی جہتیں، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۶ء)۔

ــــــــــــ : اردو کی لسانی ترقی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۱۱ء)۔

ــــــــــــ : ادبی و لسانی تحقیق، لاہور: ایجوکیشنل پبلی شرز، (۲۰۱۴ء)۔

عین الحق فرید کوٹی: اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، (۱۹۹۶ء)۔

غازی علم الدین، پروفیسر: لسانی مطالعے، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۱۲ء)۔

غضنفر: لسانی کھیل، دہلی: بشرا پبلی کیشنز، (۲۰۰۷ء)۔

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۵ء)۔

غلام مصطفیٰ تبسم، صوفی: اردو اور تدریسِ اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۴ء)۔

غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر: علمی نقوش، کراچی: اعلیٰ کتب خانہ، (۱۹۵۷ء)۔

ـــــــــــــــــ: ادبی جائزے، کراچی: اعلیٰ کتب خانہ، (۱۹۵۹ء)۔

ـــــــــــــــــ: اردو پر فارسی اثر، کراچی: اعلیٰ کتب خانہ، (۱۹۵۹ء)۔

ـــــــــــــــــ: ثقافتی اردو، کراچی: مکتبہ نیا دور، (۱۹۶۱ء)۔

ـــــــــــــــــ: جامع القواعد (حصہ نحو)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، (۲۰۱۲ء)۔

فتح محمد خان جالندھری، مولوی: مصباح القواعد (حصہ نحو)، جلد دُوم، امرت سر: آزاد بک ڈپو، (س ن)۔

ـــــــــــــــــ: مصباح القواعد (حصہ صرف)، جلد اوّل، رام پور: اشاعت خانہ رام پور، (۱۹۴۵ء)۔

فتح محمد ملک، پروفیسر: پاکستان میں اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۶ء)۔

ـــــــــــــــــ: اردو زبان اور رسم الخط (لسانی تغیر اور روحانی تفسیر)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۲۰۰۸ء)۔

فرخندہ لودھی: اردو اور فارسی میں نقلِ حرفی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۶ء)۔

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: ہندی اردو تنازع، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، (۱۹۷۷ء)۔

ـــــــــــــــــ: قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۶ء)۔

ـــــــــــــــــ: زبان اور اردو زبان، لاہور: آئینہ ادب، (۱۹۷۳ء)۔

ـــــــــــــــــ: اردو تدریس، لاہور: الوقار پبلی شرز، (۲۰۰۴ء)۔

ـــــــــــــــــ: اردو زبان و ادب، لاہور: گنج شکر پریس، (۲۰۰۵ء)۔

فضل الحق، ڈاکٹر: اردو لسانیات، دہلی: دہلی یونی ورسٹی، (۱۹۸۱ء)۔

فضل الٰہی عارف: زبان دانی، لاہور: اردو اکیڈمی، (۱۹۴۰ء)۔

فیروز احمد، ڈاکٹر: راجستھانی اور اردو، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، (۲۰۱۰ء)۔

قادر بخش صابر، مرزا: گلستانِ سخن (مرتب۔ ڈاکٹر وحید قریشی)، لاہور، (۱۹۶۶ء)۔

قاسم نوری، محمد: ہندوستانی زبان، لاہور: درد اکادمی، (۱۹۶۹ء)۔

قدرت نقوی، سیّد: لسانی مقالات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۸ء)۔

کارل مارکس، فریڈرک اینگلز: ہندوستان (تاریخی خاکہ)، احمد سلیم (ترتیب و تعارف)، لاہور: تخلیقات، (۲۰۰۲ء)۔

کامل قریشی، ڈاکٹر: اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، دہلی: اردو اکیڈمی، (۱۹۸۷ء)۔

کیفی، برجموہن دتاتریہ: کیفیہ، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۵۰ء)۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔:منشورات، کراچی: سٹی بُک پوائنٹ، (۲۰۰۴ء)۔

گلیری، چندردھر شرما: پرانی ہندی، کاشی: ناگری پرچارنی سبھا، (۱۹۶۱ء)۔

مبارک علی، ڈاکٹر: برطانوی ہندوستان، لاہور: ایکشن ایڈ انٹرنیشنل، (۲۰۰۷ء)۔

مجیب السلام، ڈاکٹر: دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی علمی خدمات اور اردو زبان پر اِس کے اثرات، دہلی، (۱۹۸۷ء)۔

محبوب عالم خان: اردو کا صوتی نظام، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۷ء)۔

محمد خان اشرف، ڈاکٹر: اردو ادب (تنقیدی و تحقیقی مطالعہ)، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، (۲۰۰۳ء)۔

محمود الرحمٰن، ڈاکٹر: قائدِ اعظم اور اردو، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، (۱۹۹۶ء)۔

محمود شیرانی، حافظ: پنجاب میں اردو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۱۹۸۲ء)۔

مسعود حسن رضوی ادیب، سیّد: اردو زبان اور اِس کا رسم الخط، لکھنؤ: دانش محل، (۱۹۴۸ء)۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔: نظامِ اردو، لکھنؤ: نظامی پریس، (س ن)۔

مسعود حسین خان، ڈاکٹر: تاریخ زبانِ اردو: لاہور: اردو مرکز، (۱۹۶۶ء)۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔:شعر و زبان، حیدرآباد، (۱۹۶۶ء)۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔:اردو زبان اور ادب، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، (۱۹۸۳ء)۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔:اردو لفظ کا صوتیاتی و تجز صوتیاتی مطالعہ، (مترجم: ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ)، علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، (۱۹۸۶ء)۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔:اردو زبان۔ تاریخ، تشکیل، تقدیر، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، (۱۹۸۸ء)۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔: مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، (۲۰۱۱ء)۔

مسعود ہاشمی، ڈاکٹر: اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، (۱۹۹۲ء)۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔:اردو لغت نویسی کا پس منظر، دہلی، (۱۹۹۸ء)۔

مصطفیٰ کمال، سیّد ڈاکٹر: حیدرآباد میں اردو کی ترقی (تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے)، دہلی، (۱۸۹۷ء)۔

مظفر اقبال، ڈاکٹر: بہار میں اردو نثر کا ارتقا، پٹنہ، (۱۹۸۰ء)۔

مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد ہفتم (تنقید پرتھی راج راسا)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۷۶ء)۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ : حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی ادبی خدمات، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۹۳ء)۔

معین الدین: اردو زبان کی تدریس، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۱۹۸۳ء)۔

۔۔۔۔۔۔: ہم اردو کیسے پڑھائیں؟ لاہور: نذیر سنز پبلی شرز، (۱۹۸۹ء)۔

معین الدین دردائی، محمد: ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط ہونے کا حق کِسے حاصل ہے؟، پٹنہ: شاد بُک ڈپو، (۱۹۴۷ء)۔

معین الدین عقیل: تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۲۰۰۸ء)۔

مہر عبدالحق، ڈاکٹر: ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق، بہاول پور: اردو اکادمی، (۱۹۶۷ء)۔

نارنگ، گوپی چند ڈاکٹر: اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، دہلی، (۱۹۶۴ء)۔

ــــــــــــــــ: اردو زبان و لسانیات، رام پور: رضا لائبریری، (۲۰۰۶ء)۔

ــــــــــــــــ: ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۲۰۱۰ء)۔

ــــــــــــــــ: تپش نامۂ تمنا (تنقیدی و تحقیقی مضامین)، لاہور، (۲۰۱۲ء)۔

ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر: مابعد نوآبادیات (اردو کے تناظر میں)، کراچی: اوکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، (۲۰۱۳ء)۔

نجیب اشرف ندوی: لغاتِ گجری (مقدمہ)، بمبئی: ادبی پبلی شرز، (۱۹۶۲ء)۔

نذیر آزاد: کشمیری پر اردو کے اثرات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (۲۰۱۲ء)۔

نسیم امروہوی: جامع نسیم اللغاتِ اردو (مقدمہ)، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، (۱۹۸۳ء)۔

نصیر احمد خان، ڈاکٹر: اردو کی بولیاں اور کرخنداری کا عمرانی لسانیاتی مطالعہ، دہلی، (۱۹۷۹)۔

ــــــــــــــــ: اردو لسانیات، نئی دہلی، اردو محل پبلی کیشنز، (۱۹۹۰ء)۔

ــــــــــــــــ: لسانیات کیا ہے؟، دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۲۰۱۰ء)۔

نصیر الدین ہاشمی: دکنی ہنی اور اردو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۱۹۱۴ء)۔

ــــــــــ: دکنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین، دہلی: آزاد کتاب گھر، (۱۹۶۳ء)۔

ــــــــــ: دکن میں اردو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (۲۰۱۱ء)۔

نصیر حسین خان خیال: داستانِ اردو، حیدرآباد (دکن): ادارہ اشاعتِ اردو، (۱۹۱۶ء)۔

ــــــــــــــ: مغل اور اردو، اردو مرکز، (۱۹۵۶ء)۔

نعیم اللہ خیالی، محمد: اردو ایک ہمہ گیر زبان، لکھنؤ: دانش محل، (۱۹۸۵ء)۔

وارث سرہندی: کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ ا (جلد اوّل)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۴ء)۔

ــــــــ: کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ ا (جلد دُوم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۶ء)۔

ــــــــ: کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ ا (جلد سِوم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۷ء)۔

ــــــــ: زبان و بیان (لسانی مقالات)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۹ء)۔

ــــــــ: کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد ہفتم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۹۵ء)۔

وحید الدین سلیم، محمد: وضع اصطلاحات، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۱۹۵۲ء)۔

ــــــــــــ: افاداتِ سلیم، لاہور: مکتبہ عالیہ، (۱۹۸۷ء)۔

وحید قریشی، ڈاکٹر: پاکستانی قومیت کی تشکیلِ نو، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، (۱۹۸۴ء)۔

وفا راشدی، ڈاکٹر: بنگال میں اردو، دہلی: اردو پبلشنگ ہاؤس، (۱۹۵۴ء)۔

ــــــــــــ: مہران نقش، کراچی: مکتبہ اشاعتِ اردو، (۱۹۸۶ء)۔

ــــــــــ: اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، (۱۹۹۴ء)۔

ہادی حسین، محمد: زبان اور شاعری، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، (۱۹۸۴ء)۔
یوسف بخاری، سیّد: کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، (۱۹۸۲ء)۔

رسائل و جرائد:

اخبارِ اردو، جلد ۵، شمارہ ۳، اسلام آباد: مارچ (۲۰۰۲ء)۔
اخبارِ اردو، جلد ۲۰، شمارہ ۲، اسلام آباد: فروری (۲۰۰۴ء)۔
اخبارِ اردو، اسلام آباد: (۲۰۱۱ء)۔
رسالہ ہندوستانی الہ آباد (۱۹۳۱ء۔۱۹۴۸ء سے انتخاب)، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، (۱۹۹۳ء)۔
سیپ، شمارہ ۴، کراچی: (۱۹۶۵ء)۔
صحیفہ، لاہور، اپریل (۱۹۶۸ء)۔
صحیفہ، شمارہ ۶۰، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، جولائی (۱۹۷۲ء)۔
صحیفہ، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، مارچ۔اپریل (۱۹۷۶ء)۔
فنون، لاہور: اکتوبر (۱۹۶۶ء)۔
قومی زبان، جلد ۳۰، شمارہ ۵، کراچی: انجمِ ترقیِ اردو، مئی (۱۹۶۷ء)۔
قومی زبان، جلد ۵۲، شمارہ ۸، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، اگست (۱۹۸۲ء)۔
قومی زبان، جلد ۵۵، شمارہ ۳، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو، مارچ (۱۹۸۵ء)۔
معیار (تحقیقی و تنقیدی مجلّہ)، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی (شعبۂ اردو)، جولائی۔دسمبر (۲۰۱۲ء)۔
معیار (تحقیقی و تنقیدی مجلّہ)، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی (شعبۂ اردو)، جولائی۔دسمبر (۲۰۱۳ء)۔
نقوش، شمارہ ۱۰۲، لاہور: مئی (۱۹۶۵ء)۔
نقوش، لاہور: سال نامہ (۱۹۶۲ء)۔
نقوش، لاہور: جنوری (۱۹۷۶ء)۔
نقوش، شمارہ ۱۴۲، لاہور: سال نامہ (۹۴ء۔۱۹۹۳ء)۔

غیر مطبوعہ تحقیقی و تنقیدی مقالہ:

عبدالغفور ساہی: اردو میں لسانیات کے مباحث، مملوکہ: گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور، (۲۰۱۳ء)۔

لغات اور انسائیکلو پیڈیا:

اردو انسائیکلو پیڈیا، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، (۱۹۸۴ء)۔
اردو لغت (تاریخی اصول پر)، کراچی: ترقی اردو بورڈ، (۱۹۷۷ء)۔

جامع نسیم اللغاتِ اردو، مرتبہ: نسیم امروہوی، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، (۱۹۸۳ء)۔
فرہنگ، عامرہ، مرتبہ: محمد عبداللہ خان خویشگی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، (۱۹۸۹ء)۔
قدیم اردو کی لغت، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، (۱۹۷۳ء)۔
کلاسیکی ادب کی فرہنگ (پہلی جلد)، مرتبہ: رشید حسن خان، نئی دہلی: انجمنِ ترقیِ اردو، (۲۰۰۳ء)۔

English Books:

☆ Abercrombie, David: *Studies in Phonetics and Linguistics,* Lindon,(1965).

☆ Abdul Muhammad: *A History of the Persian Languge and Literature at the Mughal Court (With a Brief Survey of the Growth of the Urdu Language)*, Ilahabad: Indian Press, (1929).

☆ Adrian Akmajian, Richard A. Dcmers, Ann K. Farmer, Robert M. Harnish: *Linguistics (An Introduction to Language and Communication),* New Delhi: PHT Learning, (2012).

☆ Ainul Haq Faridkoti: *Pre-Aryan Origins of the Pakistani Languages (A Monograph)*, Lahore: Orient Research Centre, (1992).

☆ Alston, William P.: *Philosophy of Language*, Prentice Hall,(1964).

☆ Anderson, Stephen, R.: *Languages (A Very Short Introduction),* New York, Oxford University Press, (2012).

☆ Baig, Mirza Khalil Ahmad: *Urdu Grammar (History and Structure)*, New Delhi, (1988).

☆ Baig, Mirza Khalil Ahmad: *Sociolinguistcs (Perspective of Hindi and Urdu in India*, New Delhi: Bahri Publications, (1996).

☆ Bailey, T. Grahame: *A History of Urdu Literature*, New York: Oxford University Press, (2008).

☆ Beams, John: *A Comparative Grammar of the Modern Aryan Lanuages*, Delhi, (1966).

☆ Bell, R.: *Sociolinguistcs(Goals, Approaches and Problems), Batsford*, (1976).

☆ Bernard Comire: *The World's Major Languages*, London, (1987).

☆ Bernstein, Basil: *A Sociolinguistic Approach to Social Languages*, Penguin

Books, (1965).

☆ Bhatacharjee, Arun: *A History of Modern India (1707-1947)*, New Delhi: Ashish Publishing House, (1988).

☆ Bhatia, Tej Krishna: *A History of the Hindi Grammatical Tradition (Hindi-Hindustani Grammar, Grammarians and Problems)*, Leiden: E.J. Bell, (1987).

☆ Bloch, Bernard and Tiger, G.: *Outline of Linguistic Analysis*, Waverly Press, (1942).

☆ Bloomfield, L.: *Language*, London: Gorge Allen & Unwin ltd, (1973).

☆ Buke, S.M, Salim-Ud-Din Quraishi: *The British Raj in India (A Historical Review)*, Karachi: Oxford University Press, (2000).

☆ Baker, Anne E., Hengeveld, Kees: *Linguistics*, U.K: Wiley-Blackwell Publishing, (2012).

☆ Burrow, Thomas: *The Sanskrit Language*, London, (1965).

☆ Caroll, David W.: *Psychology oh Language*, USA: Wadsworth, (2004).

☆ Caroll J.B.: *The Study of Language*, Cambridge, (1953).

☆ Chafe, Wallece, L.: *Meaning and Structure of Language*, Chicago, (1970).

☆ Chatterji, S.K.: *Languages and Literature of Modern India*, Bengal Publishers, (1963).

☆ Chomsky, N.: *Syntactic Structure*, The Hague-Mouton, (1957).

☆ Chomsky, N.: *Current Issues in Linguistic Theory*, The Hague-Mounton, (1964).

☆ Chomsky, N.: *Cartesian Linguistics*, Harper and Row, (1966).

☆ Chund, Tara, Dr.: *The Problem of Hindustani*, Ilahabad, (1944).

☆ Chund, Tara, Dr.: *Influence of Islam on Indian Culture*, Ilahabad, (1976).

☆ Corder, Pit, S.: *Introducing Applies Linguistics*, Penguin, (1973).

☆ Crystal, David: *What is Language?* London, (1969).

☆ Culstad, Daniel, E.: *A Modern Theory of Language*, The Hague, (1973).

☆ David, P.W.: *Modern Theories of Languages*, Prentice Hall, (1973).

☆ Dixon, Robert, M.W.: *What is Language? A New Approach to Linguistic Description*, London, (1965).

☆ Dodwell H.H.: *The Cambridge History on India*, London, (1922).

☆ Eric Gans: *The Origin of Language*, U.S.A, (1981).

☆ Finch, Geoferry: *Linguistics (Terms and Concepts)*, London, (2000).

☆ Finegan, Edward: *Language, Its Structure and Use*, America:Wadsworth, (2004).

☆ Fishman, J.A: *Sociolinguistics (A brief introduction)*, Newbury House, (1971).

☆ Fishman, J.K: *The Sociology of Language*, Newbury House, (1972).

☆ Foder and Katz: *The Structure of Language*, Prentice Hall, (1964).

☆ Francis, W.N.: *Dialectology (An Introduction),* New York: Longman, (1983).

☆ Friedrich, Johanns: *Extinct Languages*, New york, (1957).

☆ Fromkin, V and Rodman R: *An Introduction to Language*, Winston, (1974).

☆ Gilchrist, J.B: *Hindustani Philology*, London, (1810).

☆ Lepschy, Giulio: *History of Linguistics (The Eastern Traditions of Linguistics, vol-1)*, England: Longman Group ltd, (1994).

☆ Gleason, H.A. Dr.: *An Introduction to Descriptive Lnguistics*, Winston, (1961).

☆ Green Beger, Allen J.: *The British Image of India (A Study In the Literature of Imperialism, 1880-1960)*, The University of Michigan: Oxford U.P, (1969).

☆ Grierson, G.A.: *Linguistic Survey of India*, Motilal Banarsidas: Delhi, (1916).

☆ Hall, Christopher J.: *An Introduction to Language and Linguistics (Breaking the Language Spell)*, New York: Continuum International Publishing Group, (2008).

☆ Halliday, M.A.K.: *Explorations in the Functions of Lanuages*, Arnold, (1973).

☆ Halliday, M.A.K.: *Language as Social Semiotic*, London, (1978).

☆ Harvey, Robert Clive: *The Life and Death of the British Empror*, Hodder and Stoughton, (1998).

☆ Hill, A.A.: *Introduction to Linguistic Structure*, New York, (1958).

☆ Hochett, Chalrles, F.: *A Course in Modern Linguistics*, New York, (1958).

☆ Hoernle, Augutus:Fredric Rudolf: *Comparative Grammar of the*

Gaudian Languages, New Delhi, (1880).

☆ Hudson, R.A.: *Sociolinguistics*, Cambridge University Press, (1980).

☆ Janson, Tore: *The History of Languages (An Introduction)*, New York, Oxford University Press, (2012).

☆ Jesperson, Otto: *Language, Its Nature, Development and Origin,* Allen and Unwin, (1922).

☆ Jesperson, Otto: *Mankind, Nation, and Individual*, Bloomington, IN: Indian University Press, (1925).

☆ Katrey, S.M.: *Prakrit Languages and Their Contribution to Indian Culture,* Poona, (1964).

☆ Katz, J.: *An Integrated Theory of Linguistic Description*, Cambridge, (1964).

☆ Katzner, Kenneth: *The Language of thw World*, New York, (1995).

☆ Katz, J.: *The Philisophy of Linguistics*, Oxford University Press., Cambridge, (1966).

☆ Keay, John: *The Honouable Company (A History of the Eglish East India Company)*, Harper Collins, (1993).

☆ Khalid Ahmad: *The Bridge of Words (Between East and West)*, Lahore: Vanguard Books, (2001).

☆ Khalil Ahmad Beg, Mirza: Urdu Grammar (History and Structure), New Delhi: Bahri Publications, (1988).

☆ King, Cristopher R.: *One Language, Two Scripts(The Hindi Movement in 19th Centuary*, Mumbai, (1994).

☆ Kripa Shankar Singh: *Readings in Hindi Urdu Linguictics*, Oxford, (1978).

☆ Krishna Swami, N. and Verma, S.K.: *Modern Linguistcs*, Oxford, (1989).

☆ Labov, W.: *Sociolinguistics Patterns*, Basil Black Well. (1972).

☆ Ladefoged, P.: *A Course in Phonetics*, Harcourt Brace, (1983).

☆ Lado, Robert: *Linguistics Across Cultures*, Michigan-U.P, (1957).

☆ Lehmann, Winferd, P.: *Historical Linguistics (An Introduction),* Winston, (1973).

☆ Liberman, Philip: *The Biology and Evolution of Language,* London: Harvard University Press, (1984).

☆ Lyons, Tohns: *New Horizons in Linguistics*, England: Penguin Books, (1970).

☆ Lyons, Johns: *Language and Linguistics*, UK: Cambridge University Press, (1981).

☆ Majumdar, R.C., Ray Chaudhuri, H.C., Datta, Kalikinkar: *An Advanced History oh India, (Vol.2)*, Lahore: Aziz Publishers, (1980).

☆ Masica, Colin: *The Indo Aryan Languages*, Cambridge, (1991).

☆ Mathews, P.H,: *Linguistics (A Very Short Introduction),* New York, Oxford University Press, (2003).

☆ Mathews, P.H.: *Concise Dictionary of Linguistics*, New York: Oxford University Press, (2007).

☆ Muller, Max: *Lectures on the Science of Language*, London, (1891).

☆ Nida, Eugene, A.: *Language Structure and Translation*, California, Standford University Press, (1975).

☆ Ostler, Nicholas: *Empires of the Word (A Language History of the Wold),* New York, (2005).

☆ Paul L, Garvin: *Methods and Theory in Linguistics*, The Hague, (1970).

☆ Pederson, Holger: *The Discovery of Language*, Bloomington, (1972).

☆ Pei, Mario: *The Story on Language*, New York: The New American Library, (1965).

☆ Platts, T. John: *A Grammar of Hindustani or Urdu Language*, London (1901).

☆ Prasad, Tarni: *A Course in Linguistics*, New Delhi: PHI Learning, (2012).

☆ Rehman, Tariq: *An Introduction to Linguistics*, Lahore: Vanguard (1997).

☆ Rehman, Tariq: *Linguistics for Beginers (Basic Concept)*, New York: Oxford University Press, (2010).

☆ Robins, R. H.: *A Short History of Linguistics,* England: Longman, (1979).

☆ Roy, Amrit: *A House Devided (The Origin and Development of Hindi-Urdu*, Delhi, (1984).

☆ Ruhlen, Meritt: *On the Origin of Languages, California*: Standford University Press, (1994).

☆ Said, Edward W.: *Orientalism*, London: Penguin Books, (1995).

☆ Smith M. Esellie: *Studies in Linguistics*, The Hague, (1972).

☆ Spear, Percival: *A History of India (Vol.2)*, New York: Penguin Books, (1990).

☆ Sturtevant, E.H.: *An Introduction to Linguistic Science*, Yale University Press, (1960).

☆ Tagliamonte, Sali A.: *Variationist Sociolinguistics (Change, Observation, Interpretation)*, U.S.A: Wiley-Blackwell Publication, (2012).

☆ Trence Moore and Christine Carling: *Understanding Language (Towards A Post-Chomskyan Linguistics)*, London: Macmillan Press, (1982).

☆ Trudgill, Peter: *Sociolinguistics (An Introduction)*, England: Penguin Books, (1974).

☆ Vant, Sturte: *Linguistic Change*, Chicago, (1981).

☆ Victoria Fromkin, Robert Rodman, Nina Hyams, Peter Collins, Mengistu Amberber: *An Introduction to Language*, Australia, (2005).

☆ Whatmough, Joshua: *Language (A Modern Synthesis)*, New York, (1956).

☆ Whitney: *Language and Study of Language*, London, (1884).

☆ Winkler, Elizabeth Grace: *Understanding Language*, New York: Continuum, (2007).

☆ Yule, George: *The Study of Language (An Introduction)*, New York Cambridge University Press, (2010).

Dictionaries and Encyclopedia:

☆ *The Oxford English Dictionary*,vol.III(N-Poy), Oxford: Clarendon Press, (1933).

☆ *The New Lexicon Webster's Dictionary Of The English Language,* New York: Lexicon Publishers, (1978).

☆ *A Dictionary of Linguistics & Phonetics*, Edited by David Crystal, Oxford: Blackwell publishing, (1979-4th Ed).

☆ *Hobson-Jobson (A Dictionary of Colloqu Anglo-Indian Words and Phrases*, Edited by Henry Yule & Burnell Arther, New Delhi, (1986).

☆ Dictionary of Languages, by Andrew Dalby, New York: Columbia University Press, (1998).

☆ *Oxford Concise Dictionary of Linguistics*, Edited by P.H. Mathews,

U.K: Univwerisy Press, (2007).

☆ The Cambridge Encyclopedia of Languages, Editd by David Crystal,
Isalamabad: National Book Foundations, (1962).